دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماھنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ

کراچی

مئی 2014

نگرانِ اعلیٰ

معراج رسول

نئی سلسلے وار کہانی

آوارہ گرد

اس شمارے میں پہلی قسط

جاسوسی ڈائجسٹ

مدیرِ اعلیٰ

جلد 44 • شمارہ 05 • مئی 2014 • زرِ سالانہ 700 روپے
• قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200
فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021)
E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

آوارہ گرد

عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پُتلا نہیں تھا جوان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحریر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

جہاں میں تھا، وہاں کی دنیا ہی الگ تھی۔ یہ نہ جیل خانہ تھا، نہ یتیم خانہ اور نہ ہی اس کا تعلق جرائم سے تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی دنیا تھی، سب سے الگ تھلگ جہاں ہم سب مل جل کر اور خوش رہتے تھے۔ یہ خوشی، چاہے تلخ حقائق کو مان کر یا انہیں سہہ کر یا پھر مصلحت کوشی کے نام پر سہی... بس! ہم سب مل جل کر اور خوش رہتے تھے۔

یہاں ہمیں کھانے کو بھی ملتا، پینے کو بھی اور پہننے کو بھی۔ ہمیں یہاں پڑھایا لکھایا بھی جاتا تھا۔ کسی حد تک دینی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہاں کی منتظمہ کا جانے کیا نام تھا مگر سب بچوں میں وہ ''آپا جی'' کے نام سے مشہور تھیں۔ ان کا رویہ بھی ہم سے محبت بھرا ہوتا تھا۔ ان کی عمر چالیس، پینتالیس کے بیچ رہی ہوگی۔ جسم بھاری، رنگ گورا اور نازک پر نظر کے چشمے نے ان کی شخصیت کو پُرکشش بنا دیا تھا۔ وہ بڑی نرم آواز میں ہم سب سے مخاطب ہوتیں، قد بھی بوٹا سا تھا۔ ہم بارہ بارہ، تیرہ تیرہ سال کے بچے، ان کے برابر کے

ہی قد میں نظر آتے۔

ایک باقاعدہ نظم وضبط یہاں پایا جاتا تھا۔ مہینے میں ایک بار ہمیں باہر بھی سیر وتفریح کی غرض سے لے جایا جاتا۔ اس مقصد کے لیے کوسٹر استعمال ہوتی تھی۔ ایک بڑے سے ہال میں ٹی وی بھی دکھانے کا بندوبست تھا۔ ہفتے میں ایک بار کوئی اچھی سبق آموز فلم دکھائی جاتی تھی۔

ان سب باتوں کے باوجود .... دیگر بچوں کی طرح میرے ذہن میں بھی ایک اداس کردینے والا سوال ضرور اُبھرتا تھا ..... کہ اولاد تو ماں باپ کی آنکھ کا تارا ہوتی ہے۔ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا قرار ہوتی ہے، ان کا مان اور ان کا فخر ہوتی ہے تو پھر... پھر کیوں... وہ ہمیں زبردستی... ہماری مرضی کے خلاف ہمیں روتا دھوتا یہاں چھوڑ گئے تھے؟

میرا اپنا باپ بھی مجھے یہاں چھوڑ گیا تھا۔ جب میں اس کے ساتھ اس کی انگلی تھامے گھر سے خوشی خوشی نکلا تو میں بہت مسرور تھا کہ وہ مجھے باہر سیر وتفریح کی غرض سے لے کر نکلا ہے۔ ہم ایک بس میں بیٹھے اور پھر ایک طویل سفر شروع ہوگیا۔ ''ابا! ہم کدھر جارہے ہیں؟'' بس میں ساتھ بیٹھے اپنے باپ سے میں نے پوچھا تو اس کے چہرے پہ نظر پڑتے ہی میرا معصوم سا ذہن ذرا چونکا۔ مجھے باپ کے چہرے پر درد کی اَن گنت لکیریں سی گڈمڈ ہوتی دکھائی دیں۔ بہت کرب تھا اس کی آنکھوں میں۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں خاموش رہا۔ پتا نہیں کیوں ابا آج مجھے کچھ بدلا بدلا سا نظر آرہا تھا۔ گھر میں ایک وہی تو تھا جو مجھ سے بہت پیار کرتا تھا۔ مجھے کاندھے پر بٹھاتا۔ میرے لیے میٹھی گولیاں لاتا۔ شام گئے تھکا ہارا کام سے لوٹتا مگر مجھے دیکھتے ہی اور میری ضد پر ذرا بھی ستائے بغیر مجھے باہر لے جاتا، چیزیں دلاتا، میٹھے انڈوں کا پیکٹ میں ضرور لیتا تھا۔

بچپن کے دھندلے دھندلے شعور میں مجھے ایسی ہی پیار کرنے والی ایک اور شخصیت کا خاکہ بھی ابھرتا تھا۔ وہ بھی مجھے بہت چاہتی تھی، بہت پیار کرتی تھی، مجھے ساتھ سلاتی تھی... میں اس کی چھاؤں میں بڑی ٹھنڈک اور سکون و آرام محسوس کرتا تھا... پر نہ جانے کیا ہوا کہ اچانک اس کی جگہ ایک دوسری عورت نے لے لی۔ یہ پہلی والی سیدھی سادی عورت سے بہت مختلف تھی۔ اس کا رویہ بھی میرے ساتھ بڑا ناگوار ہوتا تھا، ایک معصوم بچہ... محبت ونفرت کی زبان خوب سمجھتا ہے۔ میں بھی سمجھ گیا۔ پہلے والی عورت مجھ سے بے حد محبت کرتی تھی جسے میں ماں کہتا تھا۔ وہ عورت... جو بڑی بج دھج کے ساتھ اور بنک سک سے رہتی تھی، مجھ سے نفرت کرتی تھی۔ پھر اس نے میری ماں کی جگہ کیوں لی؟ میری ماں کہاں گئی؟ پہلی بار دوسری عورت سے مار کھانے کے بعد میں نے باپ سے روتے ہوئے پوچھا تھا۔

''بتا کیوں نہیں دیتے رشید کہ اس کی ماں مرچکی ہے۔'' اس عورت نے جل کر میرے باپ سے کہا۔ باپ جو شاید تنگ آگیا تھا۔ ''ہاں... ہاں... تیری ماں مرگئی ہے۔''

میں مرنے کے مفہوم سے بھی نہ آشنا تھا۔ کیسی عجیب بات ہے، بعض معنی اپنے آپ ہی...... سمجھ میں آجاتے ہیں۔

میں بھی سمجھ گیا تھا۔ مجھے پیار کرنے والی، مجھے اپنے سینے سے لگانے والی ماں مجھ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ چکی ہے۔ میں وہ خلا اپنے باپ کی ذات سے بھرنے کی کوشش کرنے لگا کیونکہ وہ بھی مجھے پیار کرتا تھا۔ لیکن ماں تو پھر ماں تھی، تاہم ایسے میں مجھے باپ کا دم بھی غنیمت تھا۔ بس ایک مقام پر رک گئی۔ باپ مجھے لے کر نیچے اتر آیا۔ یہ عجیب سی جگہ، شہر سے دور... ہم ایک بائک نما رکشے میں سوار ہوئے جسے آج کل چنگ چی کہا جاتا ہے۔

وسیع وعریض رقبے میں پھیلی ہوئی اس عمارت کے گیٹ سے اندر داخل ہوکر اترے۔ یہاں اور بھی میری عمر کے بچے نظر آئے، باپ پوچھتا پاچھتا مجھے ایک کمرے میں لے آیا۔ وہاں ایک خاتون میز کرسی لگائے بیٹھی تھی۔ یہی ''آپاجی'' تھیں۔

انہوں نے ایک رجسٹر میں میرا نام درج کیا۔ پھر جب میرا باپ مجھے چھوڑ کر جانے لگا تو میں نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا...

''ابا! مجھے چھوڑ کر کہاں جارہے ہو؟ تم تو مجھے باہر گھمانے پھرانے کے لیے لائے تھے؟''

میں نے دیکھا، میری بات پر باپ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ ہولے سے میرا ہاتھ چھڑا کر بولا۔

''اب تم یہیں رہوگے، میں تم سے ملنے آتا رہوں گا۔'' پھر اس سے کھڑا نہیں رہا گیا۔ فوراً چلا گیا۔ میں رونے لگا۔ ابا... ابا... کہتا... اس کے پیچھے دوڑا۔ ''ابا۔ ماں تو مرگئی... تو تو زندہ ہے۔ پھر کیوں مجھے خود سے الگ کررہا ہے؟''

وہ چلا گیا۔ آپاجی نے مجھے تھام لیا۔ میں ہچکیوں سے

رونے لگا۔ وہ مجھے پچکارنے.... پھر دیگر بچوں کے پاس لے آئی، میں گھبرا گیا۔ مگر یہاں بہلانے کی بہت چیزیں تھیں۔ کھلونے تھے، جھولے تھے۔ میں بچہ ہی تو تھا، بہل گیا۔ یہاں بچوں کو بہلانے کے لیے سب کچھ تھا مگر ماں باپ نہیں تھے۔ ادارے کی ایک اور اچھی بات تھی جو بچہ نیا نیا آتا یا لایا جاتا، آپاجی اسے چند دن اپنے ساتھ ساتھ رکھنے کی کوشش کرتی تھیں تاکہ بچہ زیادہ اداسی محسوس نہ کرے اور جلدی بہل جائے۔ اب آپاجی ہی ہماری ماں تھیں۔

میں نیا بچہ تھا، اس لیے آپاجی مجھے اپنے قریب رکھتی تھیں۔ میں شروع میں تو چپ چپ رہا پھر مختلف سوالات کرتا آپاجی کا سر کھانا شروع کردیا۔ مگر آفرین ہے اس خاتون پر... ایک ذرا بل تک اپنی پیشانی پہ نہیں لائیں اور بڑی محبت، بڑے پیار سے میرے سارے سوالات کے جواب دیتیں۔

ایک دن میں نے پوچھا۔ ''آپاجی! کیا ہم اس طرح ساری عمر ادھر ہی رہیں گے؟'' وہ جواباً بولیں۔

''جب تک اللہ چاہے گا تم سب یہاں ہنسی خوشی رہوگے۔''

''ہمارے ماں باپ ہمیں یہاں کیوں چھوڑ جاتے ہیں؟ ہم شرارتی ہوتے ہیں اس لیے؟''

''ان کی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں اس لیے۔''

میں نے اپنی عمر اور معصومانہ فہم وفراست کے مطابق آپاجی سے کہا۔

''آپاجی! بچے تو شرارتی ہوتے ہی ہیں بلکہ شرارتی بچے تو اپنے اماں ابا کو زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔''

آپاجی میرے سوال پر مسکرادیتیں۔ وہ مجھے بہت پیار کرتی تھیں۔ میں تھا بھی دوسرے بچوں سے مختلف، اپنی عادات واطوار کے حوالے سے ہی نہیں بلکہ فہم وادراک سے بھی... کئی بار میں ایسے بڑے بڑے پرمغز سوال داغ دیا کرتا تھا کہ ایک لمحے کو آپاجی بھی حیرت آمیز پریشانی میں مبتلا ہوجاتیں۔ مثلاً ایک دن میں نے کہہ دیا۔

''آپاجی! مجھے پتا ہے کہ ہمارے ماں باپ ہمیں یہاں کیوں چھوڑ جاتے ہیں؟ انہیں بچوں سے زیادہ اپنی غرض اور اپنی خوشیاں عزیز ہوتی ہیں... ہیں نا... آپاجی؟'' میں معصومیت اور بھولپن سے ان کا چہرہ تکتا۔ دکھ اور کرب کی ایک لکیر ان کے چہرے پر ابھرتی پھر فوراً ہی وہ ہمیشہ کی حلیم طبع مسکراہٹ سے کہتیں۔

''بیٹا! اس طرح مت سوچا کرو۔ بس! خوش رہا کرو۔'' پھر وہ بات بدلتے ہوئے مجھ سے کہتیں۔

''آؤ... آج تمہیں بڑے بچوں سے ملواتی ہوں۔''

''بڑے بچے؟'' میں گومگو انداز میں بڑبڑا کر رہ جاتا۔

آپاجی مجھے باؤنڈری وال کے..........

...اندر ہی بنی ہوئی ایک دوسری بلڈنگ میں لے آئیں۔ یہاں پہنچ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یہاں مجھے بوڑھے ضعیف لوگ نظر آئے۔ کوئی کھانس رہا تھا، کسی نے اپنی کمر پکڑ رکھی تھی۔ کوئی دھوپ سینک رہا تھا۔ کچھ کرسی پر بیٹھے کتاب یا اخبار کے مطالعے میں مصروف تھے۔

''آپاجی! یہ تو سب بڑے ہیں۔'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں! یہ بڑے ہیں مگر بوڑھے ہیں۔ بچوں اور بوڑھوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔'' وہ جواباً کہتیں۔

میرا معصوم ذہن ان بوڑھوں کو یہاں دیکھ کر بری طرح الجھ سا گیا۔ میں نے پوچھا۔

''آپاجی! کیا ان کے بھی ماں باپ...'' میں اتنا ہی کہہ پایا۔ اور آپاجی ایک درد میں ڈوبی آواز میں بولیں۔

''نہیں، یہ تو بے چارے خود کسی کے ماں باپ ہیں۔''

''تو کیا ان کے بچوں نے انہیں گھر سے نکال دیا؟'' میرے فہم وادراک نے جوش مارا۔

''ہاں۔''

''اچھا کیا، بہت اچھا کیا۔ یہ ہمیں گھر سے نکال کر یہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ اب ان کے بچے بھی انہیں یہاں چھوڑ گئے۔ بہت اچھا کیا۔''

میرے اندر سے ایک خوابیدہ آتش فشاں کا غبار سا ابلتا۔ آپاجی مجھے ٹوکتیں۔

''ایسا مت کہو... بیٹے! یہ بُری بات ہے۔''

''یہ بری بات نہیں ہے۔ یہ بچہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔''

دفعتاً عقب سے ایک کمزور آواز ابھری۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ سفید بے داغ اور عام سے شلوار کرتے میں وہ ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔ رنگت سانولی، جسم کمزور، سر کے بال سفید اور اُڑے اُڑے سے تھے۔ بھویں اور مونچھیں بھی سفید تھیں۔ قد لمبا تھا۔ تاہم اس عمر میں بھی

ان کی کمر سیدھی تھی۔

''ارے سرمد بابا..... کیسے ہیں آپ؟'' آپا جی انہیں دیکھ کر خوش دلی سے بولیں۔

''ٹھیک ہوں بیٹی۔'' سرمد بابا نامی وہ بوڑھا بولا مگر ہنوز ان کی گھنی سفید بھوؤں سے ڈھلکی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

''بہت پیارا بچہ ہے اور سینٹر میں شاید نیا آیا ہے۔'' وہ نہایت شفقت اور پیار سے میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر بولا۔

''جی ہاں۔'' آپا جی نے مختصراً جواب دیا۔

''کیا نام ہے اس پیارے بچے کا؟''

''شہزاد احمد خان۔'' آپا جی نے میرا نام بتایا۔

''مگر ہم اسے شہزاد احمد خان عرف شہزی کہیں گے۔'' سرمد بابا نامی اس عمر رسیدہ شخص نے بڑے عجیب سے لہجے میں میری طرف دیکھ کر کہا۔

جانے کیوں مجھے اس طرح اپنا نام دہرانے پر.... فخر سا محسوس ہوا جیسے میں کوئی بڑا تیس مار خان ہوں۔

''یہ ہمارے ادارے کا سب سے پیارا، معصوم اور ذہین بچہ ہے بابا!'' آپا جی نے گویا فخر سے بتایا تو سرمد بابا بغور مجھے تکتے ہوئے بولے۔

''بے شک اس کے چہرے اور آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہے۔''

وہ دونوں میرے بارے میں باتیں کر رہے تھے اور مجھے اپنی تعریفیں سننے میں مزہ آرہا تھا۔ بچوں کی نفسیات ہوتی ہے۔ گھر میں اس کے بارے میں اس کی موجودگی میں باتیں ہو رہی ہوں تو بچے کو بہت خوشی محسوس ہوتی ہے۔

آپا جی کے بعد مجھے اب سرمد بابا بھی اچھے لگنے لگے تھے۔ انہوں نے تو باقاعدہ میری طرف دوستی کا بھی ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ اس روز کے بعد سے میری ان سے بڑی پکی دوستی ہوگئی۔ میں روزانہ ان سے ملتا تھا۔

بوڑھے اور بچے کی... دوستی کا یہ امتزاج بہت عجیب اور انوکھا تھا۔

''بابا جی! آپ کی عمر کتنی ہے؟'' اب میرے سوالوں کی توپ کا رخ سرمد بابا کی طرف ہوگیا تھا۔

''پینسٹھ سال... مگر ہائے بڑھاپا... اپنی عمر سے زیادہ نظر آتا ہوں۔ مگر یہ بات بھی نہیں، شاید دکھ نے میری طبعی عمر کے مقابلے میں میری جسمانی عمر بڑھا دی ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولے۔

''بابا! آپ کو کیا دکھ ہے؟''

''شہزی بیٹا... بسا اوقات بات دکھ کی بھی نہیں ہوتی، دکھ کی نوعیت کی ہوتی ہے۔ کچھ دکھ وقت کے ساتھ بھلا دیے جاتے ہیں لیکن ہرے رہتے ہیں۔ مجھے اس بات کا دکھ نہیں کہ میرا اپنا جوان سگا بیٹا مجھے یہاں چھوڑ گیا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی دکھ نہیں کہ اس نے بڑی چالاکی سے میرا سارا روپیا پیسا، میرا کاروبار اپنے نام کروالیا تھا۔ باپ ہوں نا۔ کوئی غیر میری دولت ہتھیا لیتا تو مجھے زیادہ دکھ ہوتا، اپنے بیٹے نے کیا نا... مجھے کوئی دکھ نہیں۔ یوں بھی میرا سب کچھ اسی کا ہی تھا۔''

''تو پھر آپ کو کس بات کا دکھ ہے بابا...؟'' مجھے ان کی عجیب دلفریب باتوں میں مزہ آرہا تھا۔

''تم بھی جب تک بات کی تہ تک نہ پہنچ چکے نہیں بیٹھ سکتے... سنو۔'' وہ مسکرا کر بولے۔

''دکھ مجھے خود اپنے آپ پر ہے کہ میں نے بھی اپنے ماضی میں اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ یہی کچھ کیا تھا۔''

''مگر سرمد بابا... مجھے میرا باپ اس عمر میں کیوں ..... یہاں چھوڑ گیا؟ میں نے تو کچھ...''

''بیٹا! تقدیر کی طرفہ کاری اسی کو کہتے ہیں۔ یہ کبھی الٹی گنگا بہاتی ہے، کبھی سیدھی۔'' وہ بڑے گہرے لہجے میں بولے۔

''ہم سب اپنی اپنی لکھی ہوئی تقدیروں کے جال میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ماہ و سال کی گردش کے ساتھ ہم سب ایک طرح کے مکافاتِ عمل کی زد میں بھی رہتے ہیں۔ اچھائی کرنے والوں کو اچھا صلہ اور برائی کرنے والوں کو برا صلہ ملتا ہے... اور ضرور ملتا ہے۔''

مجھے سرمد بابا کی کچھ بات سمجھ میں آئی، کچھ نہیں۔ میں بولا۔ ''تو بابا، میں نے کیا برائی کی تھی جو میرا اپنا باپ مجھے یہاں چھوڑ گیا؟''

''برائی تم نے نہیں کی... تم تو خود ابھی بچے ہو... معصوم بچے... فرشتہ صفت... برائی تمہارے باپ نے کی جو اپنے لختِ جگر کو خود سے جدا کر کے تمہیں جیتے جی یتیم کر ڈالا۔''

سرمد بابا... پہلے آدمی تھے جنہوں نے میرے باپ کو برا کہا تھا۔ ورنہ آپا جی میرے باپ کے اس عمل کو مجبوری کہہ کر ٹال دیا کرتی تھیں۔

کچھ روز گزرے، میرا باپ مجھ سے ملنے آیا۔ وہ میرے لیے بہت ساری چیزیں لایا تھا، میں سب کچھ بھلا کر

باپ سے لپٹ گیا۔ اس نے بھی مجھے خود سے لپٹا لیا اور مجھے بہت پیار کرتا رہا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

''ابا! اب مجھے یہاں سے لے جاؤ نا... اب میں شرارتیں نہیں کروں گا۔ نئی امی کو بھی تنگ نہیں کروں گا۔ اب میں شریف بچہ بن گیا ہوں۔''

میں کہتا رہا۔ اپنے باپ کو کسی طرح مناتا رہا۔ اس کا چہرہ درد سے بھرتا رہا۔ وہ بولا۔ ''میرے بچے! تم گندے کب تھے؟ تم تو اچھے بچے ہو مگر ابھی تم یہ سب نہیں سمجھو گے۔''

وہ ایک بار پھر مجھے روتا دھوتا چھوڑ کر چلا گیا۔ میں پھر اداس اور غمگین ہوگیا۔ باپ جب بھی آتا اور ایسے لوٹ جاتا تو میری یہی کیفیت ہوجاتی۔ مگر پھر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ بہل جاتا۔

میری شخصیت میں واضح طور پر تبدیلی اس وقت رونما ہوئی جب میرے باپ نے بھی رفتہ رفتہ آنا چھوڑ دیا۔ پہلے وہ ہفتے چند دن میں آجایا کرتا تھا۔ پھر مہینے بھر بعد آنے لگا۔ پھر ایک سال گزرنے کے بعد... اور میں اکیلا رہ گیا۔ اس نے آنا ہی چھوڑ دیا۔ میں باپ کو یاد کرتا رہا۔ باپ نے ساتھ چھوڑا تو ماں کی یاد آئی مگر ماں تو پہلے ہی مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔

پھر اس کے بعد سے میری فطرت، میرا مزاج دیگر بچوں سے مختلف ہونے لگا۔ میں خاموش اور کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ آپا جی نے ہی نہیں، سرمد بابا نے بھی میری ان کیفیات کو محسوس کرلیا۔ آپا جی تو خیر شروع ہی سے میرے لیے مہربان خاتون تھیں۔ وہ مجھے دوسرے بچوں کی بہ نسبت زیادہ چاہتی تھیں۔ بہ قول ان کے میں اس ادارے کا سب سے پیارا اور معصوم صورت بچہ تھا۔ اور اب اداس اور خاموش طبیعت نے تو مجھے دیگر بچوں سے اور بھی مختلف بنا دیا تھا۔ اب آپا جی کے بہلانے سے بھی میرا دل نہیں بہلتا تھا۔ مگر سرمد بابا وہ واحد آدمی تھے جن سے کچھ نہ کچھ میری طبیعت بہل جاتی تھی دیگر بچے دوسری تفریحات میں اپنا دل بہلایا کرتے تھے، میں سرمد بابا کے پاس آجاتا تھا۔ سرمد بابا سے میرے دل لگنے کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان کی شخصیت میرے احساسِ محرومی کا کسی حد تک مداوا کرتی تھی۔ ماں تو میری مرچکی تھی مگر باپ زندہ ہوتے ہوئے بھی مرگیا تھا۔ مرے ہوئے پر صبر آجاتا ہے مگر زندہ آدمی کا منہ موڑ لینا دل کو بہت تکلیف دیتا ہے۔

انہی دنوں دو نئے مزید بچوں کا اضافہ ہوا۔ وہ بھی تقریباً میرے ہم عمر ہی تھے۔ ایک کا نام اشرف معلوم ہوا، دوسرے کا بلال... ابتدا میں وہ بھی روئے، اداس ہوئے پھر رفتہ رفتہ آپس میں گھل مل گئے۔ میری ان سے دوستی ہوگئی۔ چند دنوں میں ہی بلال اور اشرف نے پر پُرزے نکال لیے۔ وہ ادارے کے شرارتی بچوں کے طور پر مشہور ہونے لگے۔ آپا جی کا ناک میں دم کر دیتے۔ مگر ایسے بچوں کو سدھارنے کے لیے دو آدمی... رکھے ہوئے تھے جو بچوں کی عمر کے مطابق انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرتے۔ چھوٹی موٹی سزا بھی دیتے۔ مجھے ان سے کچھ پوچھنے کا اشتیاق ہوا۔ بلال نے اپنے بارے میں بتایا کہ اس کے ماں باپ کے درمیان اکثر لڑائیاں ہوتی تھیں۔ اسی لڑائی میں باپ اشتعال میں آکر مجھے بھی پیٹنے لگتا۔ ماں تڑپ جاتی اور باپ سے لڑنا بھول کر اسے سنبھالنے کو لپکتی، پھر باپ کا یہی وتیرہ بن گیا۔ لڑائی ماں سے ہوتی، وہ مجھے مارنے لگتا۔ اس طرح وہ میری ماں کو بلیک میل کیا کرتا تھا۔ پھر تنگ آکر ماں مجھے یہاں چھوڑ گئی۔ اشرف کی کہانی زیادہ لرزہ خیز اور ڈراؤنی تھی۔

اشرف کا تعلق بھی بہت ہی غریب گھر سے تھا۔ جہاں پہلے ہی اس کے بھائی بہن موجود تھے۔ اس نے اپنے بارے میں یہ لرزہ خیز انکشاف کیا کہ ایک روز بابا رات گئے مزدوری کر کے گھر لوٹے۔ ماں کے ساتھ تو اکثر جھگڑا کرتے ہی تھے۔ غصے کے بھی بہت تیز تھے۔ اس روز رات کو گھر پہنچے تو خلافِ توقع میری ماں سے انہوں نے جھگڑا کیا، نہ بچوں کے ساتھ مار پیٹ کی، کھانا بھی نہیں کھایا۔ بس کھوئے کھوئے سے رہے اور صحن میں بچھی چارپائی پر لیٹ گئے۔

میرے علاوہ دو بھائی اور ایک بہن بھی تھی جو مجھ سے چھوٹے تھے۔ تین جھلنگا چارپائیوں میں ہم سوتے تھے۔ کسی آہٹ پر رات کے نصف پہر میری آنکھ کھلی تو میں بری طرح دہل گیا۔ میں نے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی ذبح کی ہوئی لاشیں چارپائیوں پر پڑی دیکھیں اور باپ اس وقت مجھے قصائی کے روپ میں نظر آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبے پھل والا خون آلود چھرا تھا۔ میں لیٹے لیٹے بھنچی ہوئی آنکھوں سے یہ خوفناک منظر دیکھ رہا تھا۔ میں اپنی جگہ سُن ہوگیا تھا۔ باپ میری طرف بڑھنے لگا۔ اچانک میری ماں کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میرے خونی باپ نے اس کی گردن دبوچ لی۔ ماں بھی کم صحت مند نہ تھی، اپنے جگر کے ٹکڑوں کو اس حالت میں دیکھ کر وہ بھی بپھری ہوئی شیرنی بن گئی۔ اس نے اپنی جان کی پروا کیے

بغیر، چلا کر مجھے بھاگ جانے کو کہا۔ میں نے گھر سے نکلتے ہوئے باپ کے یہ الفاظ سنے تھے جو وہ میری ماں کو قتل کرنے کے دوران کہہ رہا تھا۔ ''تو حرافہ عورت، تیرا ابھی یہی حشر کروں گا۔ کس کے بچے تھے... یہ... یہ میرے بچے نہیں تھے۔''

''پھر میری ماں کی گلی کے باہر تک ایسی چیخ سنائی دی جیسے اسے ذبح کیا جا رہا ہو۔

اشرف یہ بتا کر چپ ہو گیا۔ ہمارے معصوم ذہن تھے، ابھی ہمیں ان باتوں کا کیا پتا تھا۔

بلال اور اشرف یہاں بہت خوش تھے، میری ان سے دوستی ہو گئی تھی۔

''اطفال گھر'' نامی اس ادارے میں صرف ہم بچے ہی نہیں تھے، بچیاں بھی تھیں۔ جب ہم تیرہ چودہ برس کی عمروں کو پہنچے تو ان بچیوں کا الگ پورشن بنا دیا گیا جس کی دیوار ہمارے پورشن کے ساتھ ہی ملحق تھی۔ بچپن میں ہی ساتھ کھیلے کودے تھے، ان سے بھی انسیت ہو گئی تھی۔ جب انہیں ہم سب سے الگ کر دیا گیا تو ہمارا اداس ہو جانا ایک فطری بات تھی۔ میری بھی ایک بچی سے دوستی تھی، اس کا نام عابدہ تھا۔ اس کی کہانی پتا نہیں کیا تھی۔ مگر وہ مجھے اچھی لگتی تھی، اس نے مجھے اپنا نام عابدہ بتایا تھا۔

عابدہ، پتا نہیں کون تھی۔ آپا جی نے بتایا کہ اسے کسی نے اغوا کیا تھا... اور پھر کسی طرح یہاں پہنچی۔ (قوت گویائی سے محرومی۔) عابدہ سے مجھے بہت گہری انسیت تھی، بچپن کے جذبات انسیت کے نام پر ہی پہچانے جاتے ہیں۔ پورشن الگ ہونے کے باعث ہم اداس تو ہوئے تھے مگر یہ اداسی وقتی ثابت ہوئی تھی... کیونکہ ہم بہرحال رہتے تو ایک ہی جگہ پر تھے۔

ایک روز سرمد بابا بیمار پڑ گئے۔ وہ ہر وقت اپنے وارڈ کے ایک کونے پر چارپائی پکڑ کر بیٹھ جاتے اور اپنا سینہ پکڑے کھانستے رہتے۔ میں نے آپا جی سے سرمد بابا کی حالتِ زار کا ذکر کیا۔ میری کچھ کوششوں سے وہاں ڈاکٹر کو بلوایا گیا۔ ڈاکٹر نے ان کا معائنہ کیا۔ اپنے میڈیکل باکس سے ایک انجکشن نکال کر بھی انہیں بازو پر لگایا پھر کچھ دوائیں تجویز کر کے چل دیے۔ دوائیں اگلے دن منگوائی گئیں۔ میں زیادہ تر وقت سرمد بابا کے ساتھ گزارنے لگا۔ ان کی تیمارداری کرتا، ان کا خیال رکھتا۔ وہ مجھ سے بہت متاثر ہوئے۔ میری توجہ اور دیکھ بھال کے باعث وہ جلد ہی روبہ صحت ہو گئے۔ وہ مجھے پیارے کاکا کہنے لگے۔ بولے۔

''میں اپنے بیٹے حامد کو بھی کاکا ہی کہتا تھا۔ تم بھی اب میرے لیے... میرے اپنے بیٹے کی طرح ہو... بلکہ اس سے بڑھ کر۔''

کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ میں اس کی وجہ جانتا تھا۔ یونہی بھولپن اور معصومیت میں پوچھ لیا۔

''بابا! کیا آپ اب بھی اپنے بیٹے حامد سے پیار کرتے ہیں؟'' وہ جواباً ایک گہری سانس بھرتے ہوئے بولے۔

''ہاں بیٹا... بھلا ماں باپ اپنی اولاد سے نفرت کر سکتے ہیں؟''

''اس کے باوجود بھی بابا... کہ اس نے آپ کو اپنے گھر سے نکال دیا؟'' میرے لہجے میں معصومانہ حیرت تھی۔

''ہاں کاکا! اس کے باوجود بھی۔''

''آپ کو اپنا بیٹا یاد آتا ہے؟''

''ہاں مگر مجھے اپنے دو چھوٹے پوتا پوتی بہت یاد آتے ہیں۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، بہت مانوس تھے مجھ سے... میرے بغیر تو وہ بھی اداس رہتے ہوں گے۔''

میں چپ ہو گیا۔ میں سرمد بابا کو زیادہ دکھی ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا اس لیے انہیں کم ہی اس سلسلے میں کریدا کرتا۔

☆☆☆

وقت کا کام چلتے رہنا ہے... رکنا نہیں، ورنہ پھر اسے وقت ہی کیوں کہا جاتا۔ کوئی قلم تھی جو اپنی ابتدا سے انتہا کی طرف گامزن تھی۔ ایک دور تھا جو بیت رہا تھا ایک عہد تھا، جو اپنے ارتقا کے سفر پر رواں دواں تھا۔ ایک زمانہ تھا جو گزر رہا تھا۔ ''اطفال گھر'' بھی وقت کے اِن بدلتے انداز و اطوار کی زد سے نہ بچ سکا۔

اطفال گھر کے بچے لڑکپن میں داخل ہونے لگے تھے۔ ان میں چند ایسے خوش نصیب بچے بھی تھے جنہیں بعد میں ان کے ماں باپ یا وارث واپس لے جا چکے تھے بہت سوں کے تو مر بھی چکے تھے، یا لاپتا تھے۔ لاپتا ماں باپ میں میرا باپ بھی شامل تھا...

بات صرف وقت کی تبدیلی کی ہی نہ تھی بلکہ انسانوں کی تبدیلی کی بھی تھی۔ ہمارے اندر بھی تبدیلی آنے لگی زندگی کے محسوس کرنے والے سارے رنگ اب ایک نئے ڈھنگ میں بدلنے لگے تھے۔ میری مسیں بھیگنے لگی تھیں، محسوسات کو اظہار کی زبان ملنے لگی تھی۔ شعور میں لڑکپن کی

چنچلی سی در آنے لگیں۔ دل میں کچھ کرنے کی امنگیں بیدار ہونے لگی تھیں۔ آٹھ سال کی عمر سے بارھویں سال میں قدم رکھنے کے بعد جب اٹھارھویں سال میں قدم رکھا تو... میں اپنی تبدیلی پر خود حیران تھا۔ وقت کی یہی تو طرفہ کاری ہوتی ہے، کہاں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وقت گزر ہی نہ رہا ہو... رکا ہوا ہو... اور پھر کھٹ سے گویا ایک زقند بھرتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے ابھی کل ہی کی تو بات ہو۔

☆☆☆

''اطفال گھر'' نامی اس ادارے کے روحِ رواں ملک کے ایک معروف سماجی شخصیت حاجی محمد اسحاق تھے۔ ہم نے انہیں پہلی بار دیکھا۔ درمیانہ قد، باریش چہرہ، سادہ لباس... اپنی وضع قطع سے وہ پرہیزگار اور متقی انسان نظر آتے تھے۔

اس روز ''بڑے بچوں'' کی چھانٹی ہو رہی تھی۔ ان میں ''بڑی بچیاں'' بھی شامل تھیں۔ ان کا باقاعدہ الگ رجسٹر تیار کیا جا رہا تھا۔ اور نئے سرے سے اندراج ہو رہا تھا اور یہ ساری کارروائی، حاجی محمد اسحاق کی موجودگی میں ہو رہی تھی اور ان کے آنے کا مقصد بھی یہی تھا۔

یہ ایک ہال کمرا تھا۔ پہلے ''بڑے بچوں'' کو نمٹایا جا رہا تھا۔ ایک صوفے پر حاجی صاحب براجمان تھے۔ ان کے چہرے پر موٹے سیاہ فریم کی عینک چڑھی ہوئی تھی۔ انہوں نے خود بھی ایک ڈائری اپنی گود میں کھول رکھی تھی۔ ان کے بائیں ہاتھ پر بڑی سی میز تھی۔

وہاں ایک پختہ عمر کا شخص بیٹھا تھا۔ اس نے ایک بڑا سا رجسٹر کھول رکھا تھا۔ یہ مشتاق صاحب تھے، حاجی صاحب کے سیکریٹری۔ ان کے ساتھ والی کرسی پر آپا جی براجمان تھیں۔ انہوں نے بھی ایک ایسا ہی رجسٹر کھول رکھا تھا۔ ایک عمر رسیدہ خاتون کے علاوہ دو اور افراد بھی تھے۔

ہر لڑکے کا باری باری نام پکار کے بلایا گیا۔ پھر ہال میں میرا نام پکارا گیا۔ میں آگے بڑھا۔ ایک شخص جو پیمائش وغیرہ کر رہا تھا، میرے قریب آ گیا۔ وہ مجھے ایک قریب کی دیوار کی طرف لے گیا۔ پھر بہ آوازِ بلند میرا اندراج ہونے لگا۔

عام لڑکوں کے مقابلے میں میرا ڈیل ڈول غیر معمولی تھا۔

پھر مجھے جانے کی اجازت مل گئی۔

یہ عمل لگ بھگ صبح دس بجے شروع ہوا اور ایک بجے تک نمٹا لیا گیا۔ حاجی صاحب اپنی لمبی سی گاڑی میں چلے گئے۔

عابدہ نے بھی خوب رنگ روپ نکالا تھا۔ کتابی چہرہ، ستواں ناک، حسنِ دل آرا میں معصومیت کی آمیزش... بڑی بڑی کجراری آنکھیں، بال گھنے اور ہلکے بھورے مائل، سرو قد اور متناسب جسامت۔

میں اگر اپنے ڈیل ڈول اور وجاہت کے لحاظ سے اپنے لڑکوں کے گروپ میں نمایاں تھا تو وہ بھی اپنی غیر معمولی خوبصورتی اور پُرکشش شخصیت کے باعث لڑکیوں میں ممتاز تھی۔ یہ عجیب اتفاق کی ہی بات تھی کہ جس روز حاجی صاحب آئے تھے، اس روز ہماری گروپ بندی بھی کر دی گئی تھی جس کے مطابق ہم جوان لڑکوں کا گروپ کا مانیٹر مجھے بنایا گیا تھا جبکہ لڑکیوں کے گروپ کی پرفیکٹ عابدہ کو بنایا گیا تھا۔ وہ اپنی عمر کے سولھویں برس میں قدم رکھ چکی تھی۔

عابدہ تو میرے بچپن کی پسند تھی اور میں بھی اسے اتنا ہی پسند تھا۔

بلال اور اشرف میرے قریبی دوست تھے مگر ان دونوں کا مزاج مجھ سے مختلف تھا۔ بہرحال کوئی تو وجہ تھی جس کی وجہ سے ہم تینوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔

آپا جی ہی کی زبانی ہمیں پتا چلا کہ بہت جلد حاجی صاحب دوبارہ دورے کے لیے اطفال گھر آنے والے ہیں۔ اس بار ان کے دورے کی وجہ بہت اہم تھی۔ آپا جی کے اس اعلان کے بعد لڑکوں میں ہی نہیں، لڑکیوں میں بھی ایک بے چینی اور سنسنی پھیل گئی۔ ایک افواہ سی تھی جو گردش کرنے لگی تھی مثلاً اس بار حاجی صاحب... جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے مستقبل اور اگلے ٹھکانے کا بندوبست کریں گے یا پھر انہیں ''اطفال گھر'' سے کسی طریقے سے بے دخل کر دیا جانے والا تھا وغیرہ۔ کیونکہ ظاہر ہے اب ہم ''اطفال'' نہیں رہے تھے۔

''یار! کچی بات ہے، میرا یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔''

بلال نے کہا تو اشرف اس کی تائید میں بولا۔ ''کہتا تو ٹھیک ہے، اب یہاں رہنے کی ہمیں عادت سی ہو گئی ہے۔'' بلال دبلا پتلا اور دبے ہوئے قد کا لڑکا تھا جبکہ اشرف نسبتاً لمبے قد کا اور میری طرح کسرتی بدن کا مالک تھا۔

''تو کیا کہتا ہے شہزی؟'' اشرف نے مجھے ٹہوکا دیا۔ اس کی رنگت بھی سانولی تھی۔ دونوں ہر وقت دوسرے گروپ کی لڑکیوں ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہتے

تھے۔ تاہم عابدہ کے سلسلے میں محتاط رہتے تھے کیونکہ جانتے تھے کہ وہ میری پسند ہے۔

میں نے کہا۔ ''یار! زندگی عمل کا نام ہے۔ ہمیں اب اطفال گھر کے ''پنگوڑے'' سے نکلنا چاہیے۔ اپنے زورِ بازو پر کام کرنا چاہیے۔ مجھے اب یہاں مزہ نہیں آتا۔''

میری بات پر بلال بولا۔ ''ابے باہر کی زندگی بڑی مشکل ہے۔ یہاں ہم مزے میں ہیں۔ فکر نہ فاقہ عیش کرے کاکا۔''

''صحیح۔'' اشرف بھی اپنے مخصوص لہجے میں اس کی تائید میں کہتا۔

''کھانا، پینا، نہانا، سونا، سب فری۔ چھوٹا موٹا کام کرنے پر خرچی بھی مل جاتی ہے۔ چوکیدار کے ہاتھ میں چند نوٹ تھما کر باہر کی دنیا بھی گھوم آتے ہیں۔ بس، لڑکیوں کے معاملے میں تھوڑی سختی ہوتی ہے۔ ورنہ تو نغمانہ، ثمرین اور نوشین بھی ہمارے ساتھ باہر جانے کو تیار ہیں۔''

''یار شہزی! تمہارا دل نہیں کرتا، عابدہ کے ساتھ باہر نکلنے کو؟'' اشرف آخر میں مجھ سے کہتا۔

''یہ بدھو ہے۔ کسی لڑکی کو باہر کیا لے کر جائے گا۔ خود تو پہلے باہر نکل کر دکھائے۔'' بلال نے مجھ پر طنز کیا تو میں نے کہا۔

''خاطر جمع رکھو۔ اب تمہارے یہ سارے مزے ختم ہونے والے ہیں۔ عنقریب حاجی صاحب ہمارے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے والے ہیں۔ اب ہم یہاں رہنے کے اہل نہیں رہے ہیں۔''

''اس کا حل بھی ہم نے سوچ رکھا ہے۔'' اشرف معنی خیز لہجے میں بلال کی طرف دیکھ کر رازدارانہ مسکراہٹ سے بولا۔ گویا، بلال بھی اس کا رازداں تھا مگر میں چونک گیا۔

''کیسا حل؟''

''اگر اس بڈھے کھڑوس نے ایسا کوئی فیصلہ کیا بھی تو ہم بائیکاٹ کر دیں گے۔ یہاں سے نہیں جائیں گے۔'' بالآخر اشرف نے کہا۔ حاجی صاحب کے بارے میں ان کا یوں مذاق اڑانا مجھے سخت ناگوار گزرا تھا مگر انہیں سمجھانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں چپ رہا۔

''اطفال گھر'' میں لڑکوں اور لڑکیوں سے ملنے کی سختی سے ممانعت تھی مگر پھر بھی ہم تینوں چھپ چھپا کر یہ کام کر جاتے تھے۔ اشرف اور بلال کی تو کئی لڑکیوں سے دوستی تھی لیکن میں صرف عابدہ سے ہی ملتا تھا۔ اب وہی میرا سب کچھ تھی اور میں اس کا۔

اس معاملے پر وہ بھی کچھ متوحش اور فکر مند تھی۔ اس روز جب ہم کھڑکی کے راستے... چوری چھپے باتیں کر رہے تھے تو اس نے اپنے خدشے کا اظہار مجھ سے کیا۔

''شہزی! میں نے سنا ہے، ہمیں اب یہاں سے نکالا جانے والا ہے۔''

''سنا تو میں نے بھی یہی ہے لیکن...... کم از کم لڑکیوں کے لیے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا جا رہا۔'' میں نے کہا۔

''لیکن تم۔'' اس کی آنکھوں میں اتری ہوئی بے چینی اور تشویش میرے نام کی تھی۔ میں اس کی بے قراری اس کی آنکھوں سے بھانپ گیا تھا۔

''تم کیوں پریشان ہوتی ہو؟ میں بھلا تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں گا؟'' میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ وہ بھی مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ میں اب ایک طمانیت کا احساس تھا۔ ہم تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے۔ سلاخوں والی کھڑکی کے راستے میں اس کے نرم نرم ہاتھوں کو سہلاتا رہا۔ پھر میں اپنے پورشن کی طرف لوٹ آیا۔

ان ماہ و سال نے سرمد بابا سے بھی خراج وصول کیا تھا۔ وہ اور زیادہ ضعیف اور کمزور ہو گئے تھے تاہم خود کو فٹ رکھنے کے لیے وہ روزانہ واک کرتے۔ اس سلسلے میں میں نے سرمد بابا سے بھی ذکر کیا تھا کہ ان کے خیال کے مطابق حاجی صاحب ہمارے بارے میں کیا فیصلہ کرنے والے تھے؟ ظاہر ہے وہ بھی قیاس آرائی کے علاوہ اور کیا کر سکتے تھے۔

انہی دنوں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

ہم لڑکوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ ہنر وغیرہ بھی سکھایا جاتا تھا۔ تاکہ ہم عملی میدان میں بھی قدم رکھ سکیں۔ اس مقصد کے لیے... ہمیں مختلف ٹولیوں میں بانٹ کر... مختلف کارخانوں اور فیکٹریوں میں بھی کام پر لے جایا جاتا تھا۔ ہماری دو لڑکوں کی ٹولی میں بلال شامل تھا جبکہ اشرف دوسری ٹولی میں تھا۔ وہاں سے ہمیں ڈیلی ویجز کے طور پر کچھ پیسے مل جایا کرتے تھے۔ ہم ایک ٹیکسٹائل مل میں کام کرتے تھے۔

اس روز ہم شام گئے واپس لوٹے۔ میں ہر روز عابدہ سے ہی نہیں سرمد بابا سے بھی ضرور ملاقات کرتا تھا۔ اس شام عابدہ سے کھڑکی میں ملاقات کرنے کے بعد جب میں سرمد بابا سے ملنے پہنچا تو ہمیں ایک چونکا دینے والی خبر ملی۔

آج صبح ہی کوئی خاتون، دو بچوں کے ساتھ اطفال گھر آئی تھیں اور سرمد بابا کو اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ مجھے

تشویش ہوئی۔ میں الجھا الجھا سا آپا جی کے آفس روم میں آیا مگر وہ آرام کرنے کے لیے اپنے پورشن میں جا چکی تھیں۔

ناچار میں واپس اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ میں ایک تجسس آمیز الجھن کا شکار تھا۔ بابا ایسے کیسے چلے گئے؟ وہ عورت کون تھی؟ شاید ان کی جاننے والی ہو۔ مگر وہ کم از کم مجھے تو کچھ بتا کر جاتے۔ ایسے کیسے چلے گئے تھے وہ؟ تاہم یہ خوشی کی بات بھی تھی، کہ چلو... بابا جہاں گئے ہوں گے اپنی خوشی سے ہی گئے ہوں گے۔ بھلا میرا ان کے ساتھ رشتہ ہی کیا تھا۔ اب تک اطفال گھر میں ایسا ہوتا آیا تھا، لوگ آتے جاتے ہی رہتے تھے۔ یہ کوئی انہونی بات نہ تھی۔ بہر طور... میں خوش بھی تھا کہ چلو بے چارے اپنوں میں ہی گئے ہوں گے، شاید ان پر کسی کو رحم آ گیا ہو۔ اب آخری عمر اپنوں میں گزاریں گے۔

☆☆☆

انسان کے دل ہی میں نہیں سوچ اور ذہن میں بھی ایک طرح کی نزاکت ہوتی ہے۔ انسان کو سماجی درندہ ایسے ہی نہیں کہا گیا۔ یہ اپنے جیسے انسانوں میں مل جل کر رہنا پسند کرتا ہے۔ اطفال گھر میں بھی ہم سب مل جل کر رہتے آئے تھے۔ کئی لوگوں سے پرانی انسیت بھی ہو گئی تھی۔ کوئی اچانک ساتھ چھوڑ دیتا تو دکھ سا ہوتا۔ یہی سبب تھا کہ سرمد بابا کے یوں اچانک چلے جانے سے میں بھی اداس تھا۔ عابدہ بھی اداس تھی۔

حالات اشارہ کر رہے تھے کہ اطفال گھر کے حالات بدلنے والے تھے... اس کا اندازہ اس جانکاہ خبر کے بعد ہوا۔

جن دنوں حاجی صاحب نے اطفال گھر کا دوبارہ دورہ کرنا تھا اور بڑے بچوں اور بڑی بچیوں سے متعلق حتمی فیصلہ آنا تھا، اس کے ایک روز قبل ان کا ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔

پھر تو جیسے پورے اطفال گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ کیا بوڑھے، کیا بچے کیا جوان... حتیٰ کہ ادارے کے عملے کے افراد بھی حاجی صاحب کی اچانک موت پر پریشان اور تشویش زدہ ہو گئے۔ ایک سوالیہ نشان تھا جو ہر ایک کے حلق میں گویا آنکڑے کی طرح اٹک کر رہ گیا تھا کہ... اب کیا ہوگا؟ اب اس ادارے کا والی وارث کون ہوگا؟ اور اب جو ہوگا، وہ کون ہوگا؟ کیسا ہوگا؟ وغیرہ۔ کیونکہ حاجی صاحب کی زندگی میں ہر کوئی بہت خوش اور آرام و سکون سے تھا۔

بے چارے بوڑھوں کو زیادہ اپنی فکر ہو رہی تھی کہ پتا نہیں اب ان کا اس عمر میں کیا بننے والا تھا؟ جبکہ آپا جی کو بچوں کی فکر ستا رہی تھی اور جوان لڑکیوں کی بھی۔ جبکہ ہم نوجوان اس فکر و تشویش سے قدرے آزاد تھے کیونکہ اب ہم نے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھ لیا تھا۔ تاہم ایک بے نام سا تجسس تھا کہ اب کیا ہونے والا تھا؟

اس ادارے میں اب جو کچھ ہونے والا تھا، وہ ہماری سوچ سے بھی زیادہ مکروہ، کریہہ اور بھیانک تھا۔

حاجی صاحب کی موت کے بعد سب کچھ ایک دم ہی بدلا تھا۔ اطفال گھر کی چونکہ ایک الگ دنیا تھی، بہت آرام دہ اور پُرسکون جگہ... جیسے یہاں کسی مہربان اور رحم دل بادشاہ کی حکمرانی ہو۔ مگر اب جیسے کوئی سخت گیر حکمران نے اس کی باگ ڈور سنبھال لی تھی۔ بہت واضح تبدیلی دیکھنے میں آنے لگی۔ جیسے کوئی ہماری اس پُرسکون، آرام دہ اور پُرامن دنیا پر غاصبانہ قبضہ کرنا چاہ رہا ہو اور جلد سے جلد اپنا تسلط جمانے کی کوشش و جستجو میں ہو۔

سب سے پہلے عملے کے وہ لوگ رفتہ رفتہ تبدیل کیے گئے... بہ الفاظِ دیگر نکالے جانے لگے... جو عرصے سے یہاں کام کر رہے تھے۔ ان کی جگہ عجیب و غریب صورت افراد نے لے لی تھی، چند عورتیں بھی تھیں جو انہی مردوں کی طرح خرانٹ صورت تھیں۔ آپا جی تو اس طرح غائب کر دی گئیں کہ جیسے کبھی اطفال گھر میں کبھی ان کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ حالانکہ وہ سب بچوں کی ''ماں'' کہلاتی تھیں اور ہم سب بھی گویا ان کی گود میں کھیل کر جوان ہوئے تھے۔

ایک خوف کی فضا تھی جو اس ادارے پر دھیرے دھیرے طاری ہوتی جا رہی تھی۔ ہر کوئی جیسے اپنے اردگرد کے ماحول سے ڈرا ڈرا اور سہما سہما ہوا تھا جیسے ابھی کچھ ہونے والا تھا۔

بالخصوص جوان لڑکیوں کا گروپ زیادہ متوحش اور سراسیمہ تھا۔ وہ ہم سے زیادہ خوف اور تشویش آمیز بے یقینی کا شکار تھیں۔ بالخصوص عابدہ... مگر اس کی نگاہیں مجھ پر تھیں جبکہ خود میری اپنی دل و دماغ کی کیفیات اگرچہ ان سب سے مختلف نہ تھیں لیکن میرے دل و دماغ میں خوف کی جگہ پریشانی اور تفکر تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اب یہاں کچھ غلط ہو رہا تھا یا ہونے والا تھا۔ عملے کے نام پر جو افراد یہاں متعین کر رکھے تھے، وہ ہمیں ہمدردی کی نگاہ سے کم قصائی کی نظر سے زیادہ دیکھا کرتے تھے۔ ان کی صورتیں بھی ایسی

تھیں کہ دیکھ کر خوف آتا تھا۔ سب کے سب ہٹے کٹے مشٹنڈے اور چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ یہی نہیں ہمیں تو ان کے پاس اسلحے کی جھلک بھی نظر آئی تھی۔ آپاجی کی جگہ جو عورت آئی تھی، وہ شکل وصورت سے انہی کے قبیل کی نظر آتی تھی، نہایت کالی موٹی اور بھدی، مگر یہاں کا سارا نظام بہ الفاظ دیگر... نگرانی... ایک لحیم شحیم اور سیاہ رنگت کے حامل شخص کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ان سب کا سرغنہ تھا۔ بعد میں ہمیں اس کا نام مع عرفیت کے معلوم ہوا جو اس کی شخصیت سے ہم آہنگ تھا، دلشاد خان عرف استاد کگل... وہ ہمیں ایسی نظروں سے گھور کے دیکھا کرتا تھا جیسے ہمیں نظروں ہی نظروں میں تول رہا ہو۔

ہمیں اب کام پر بھی نہیں بھیجا جاتا۔ نہ ہی باہر لے جایا جاتا۔ گیٹ اور چہار دیواری کے اوپر خاردار باڑھ نصب کردی گئی تھی۔ پہرے پر انہی کے بدمعاش صورت آدمی رہا کرتے تھے۔ ٹی وی، پڑھنا لکھنا، کتابیں اور ایسی دیگر مہربان چیزیں عنقا کی جاچکی تھیں۔ بوڑھوں کو تو ابتدائی چند دنوں میں ہی نکال باہر کیا گیا تھا۔ البتہ بچے اور ہم لڑکے لڑکیاں اپنی تعداد میں موجود تھے۔

مجھے دال میں کالا نظر آنا شروع ہوگیا تھا۔ یہ اطفال گھر... اب اطفال گھر نہ رہا تھا گویا ایک جیل خانہ بن کر رہ گیا تھا۔ یا پھر اوباش اور گینگسٹر لوگوں کا اڈا۔

مجھے سب سے زیادہ فکر عابدہ کی.... ہونے لگی۔ اس صورتِ حال سے وہ بہت زیادہ خوف زدہ اور متوحش تھی۔ ایک دن میں نے یونہی گیٹ سے باہر نکلنا چاہا تو وہاں متعین ایک خرانٹ صورت پہرے دار نے مجھے خونخوار لہجے میں جھڑک دیا اور تنبیہ بھی کرڈالی کہ میں دوبارہ ان کی اجازت کے بغیر گیٹ سے باہر تو کجا گیٹ کے قریب بھی آنے کی جرأت نہ کروں۔

اب میری چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجانا شروع کردی۔ ہمیں ہال کمرے میں ہر وقت بند کرکے رکھا جانے لگا تھا، گویا ہم قیدی ہوں۔ میں عابدہ سے ملنے کے لیے بے چین تھا مگر کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ ایک روز میں نے سب لڑکیوں کے پورشن کا چوری چھپے رخ کیا تو عین اس وقت جب میں پورشن کی دیوار والی مطلوبہ کھڑکی سے چند قدموں کے فاصلے پر تھا کہ میری کمر پر چابک پڑا۔ میں درد اور اذیت سے بلبلا کر رہ گیا۔ ایک سرخ لکیر تھی جو میری پیٹھ پر نمودار ہوگئی تھی، جس کی جلن میں کئی دنوں تک سہتا رہا تھا۔

اب مجھے احساس ہوگیا تھا کہ یہ اطفال گھر اب بردہ فروشوں کا اڈا بن چکا تھا۔ ہم سے بیگار لیا جانے لگا۔ ہمیں صبح سویرے ایک بند کنٹینر والے ٹرک سے کسی نامعلوم مقام پر لے جایا جاتا، وہاں پتھر کوٹنے کا سخت کام لیا جاتا تو کہیں اینٹوں کے بھٹے پر سخت کوشی کروائی جاتی۔ میں تو خیر ان سختیوں کو جھیل ہی رہا تھا مگر بلال اور اشرف کی حالت زیادہ پتلی ہورہی تھی۔ کیونکہ وہ دونوں آرام طلب تھے۔ یہ سختیاں جھیلنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ بھی انکشاف سننے میں آیا کہ چھوٹے معصوم بچوں سے بھیک منگوانے کا بھی کام لیا جاتا تھا۔

انہی دنوں میں نے بلال اور اشرف کو ساتھ ملایا... کہ ہمیں یہاں سے فرار ہونا چاہیے۔

اس کی ہم نے باقاعدہ منصوبہ بندی کی۔ میرا ارادہ سب کو یہاں سے آزاد کروانے کا تھا مگر اشرف اور بلال نے اختلاف کیا کہ یہ ابھی مشکل ہوگا۔ لہٰذا فی الحال پہلے خود آسانی کے ساتھ اس جہنم سے فرار ہوا جائے، اس کے بعد... باہر نکل کر پولیس سے مدد لی جاسکتی تھی۔ اس کی بات میں وزن تھا، میں نے اختلاف نہیں کیا... مگر... میں عابدہ کو ان بھیڑیا صفت لوگوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ لہٰذا میں نے بلال اور اشرف سے اس بارے میں صاف صاف کہہ دیا۔ وہ کچھ سوچ کر راضی ہوگئے۔

گویا جان جوکھم میں ڈال کر ایک دن چوری چھپے میں نے عابدہ سے کھڑکی کی طرف ملاقات کرہی لی اور اسے اپنے منصوبے کے بارے میں بتایا۔

ساتھ ہی اس نے بھی کئی لرزہ خیز انکشافات کرتے ہوئے مجھے یہ بتا کر جان لیوا تشویش میں مبتلا کرڈالا کہ... یہ بدکردار لوگ ان پر بھی بُری نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ چند جوان لڑکیوں کو جانے کدھر غائب بھی کرچکے ہیں۔ شنید تھی کہ پہلے ان معصوم لڑکیوں کو انہوں نے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا، اس کے بعد کہیں فروخت کردیا تھا۔

عابدہ کی زبانی یہ سب سننے کے بعد میں نے اسے لے کر یہاں سے فرار ہونے کا پختہ عزم کرلیا تھا اور قسم کھائی تھی کہ چاہے جان چلی جائے اپنے ارادے سے ہرگز نہیں آؤں گا۔

''شہزی! مجھے اب یہاں بہت ڈر لگنے لگا ہے۔'' سب بتانے کے بعد عابدہ خوف سے لرزتے لہجے میں بولی۔ کھڑکی کی ٹھنڈی ٹھار سلاخوں سے اس نے اپنا... مرمر

ہاتھ نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کے نرم و نازک ہاتھ کی کپکپاہٹ نے جیسے میرے وجود تک کو لرزہ براندام کر دیا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ وقت کم تھا۔ قصائی صورت کوئی پہرے دار ہمیں کھڑکی سے یوں باتیں کرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔

”عابدہ! تم حوصلہ رکھو، اب تم ہی میری ہمت اور میرا عزم ہو جس کے بل بوتے پر آج رات ہی میں نے تمہارے ساتھ اس جہنم سے فرار کا منصوبہ بنایا ہے۔ میں تمہیں یہی بتانے آیا ہوں۔“

میری بات پر اس کی کاجل آنکھوں میں سمٹی ہوئی سراسیمگی قدرے ماند پڑی۔ وہ بولی۔ ”کیا واقعی... تم سچ کہہ رہے ہو شہزی؟“ لیکن... یہ سب کیسے ممکن ہوگا؟ یہاں اب ان خوفناک صورت والے سفاک پہرے داروں نے تو ایک دوسرے سے بات تک کرنے پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔“ اس کے لہجے میں غیر یقینی در آئی۔ میں نے ازراہِ تشفی کہا۔

”مجھے بھی معلوم ہے لیکن ہم نے ساری پلاننگ کر لی ہے۔ یہاں تک بھی آن پہنچا ہوں تو یہ بھی ہماری منصوبہ بندی کا ایک حصہ ہے۔“

”ہم کون؟... کیا اور بھی...؟“

”ہاں! بلال اور اشرف بھی میرے ساتھ ہیں۔“

”مگر ہمارے ہال کمرے کا دروازہ تو لاک ہوتا ہے؟“

”یہ کام اشرف بہ آسانی کر لے گا۔ اسے بند تالے کھولنے کا ہنر آتا ہے۔“

”کیا؟“ پہلی بار عابدہ کے چہرے پر خوشی امید بن کر چمکی تھی۔

”بس! اب میں چلتا ہوں... ابھی کسی سے اندر ذکر مت کرنا۔ ایک بار باہر نکل جائیں تو یہاں پھنسے ہوئے سب لوگوں کو آزاد کروا لیں گے۔“

میں نے کہا اور پھر اس کا نازک ہاتھ تھپتھپا کر اپنے پورشن میں آ گیا۔

ہم تینوں ہال کے ایک کونے میں اپنے بستروں پہ بیٹھے تھے۔

”تسلی کروا آئے ہو عابدہ کی۔“ بلال نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اشرف عجیب سی مسکراہٹ سے بولا۔ ”بے چاری عابدہ! میرا خیال ہے، اسے تمہاری مہم جوئی کا یقین نہیں آ رہا ہوگا؟“

”ہاں یار! تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ میں نے چبھتی مسکراہٹ سے تائیداً کہا۔ وہ پھر عجیب سے انداز میں ہنسا مگر بولا کچھ نہیں۔

”مگر میں نے اس کی تسلی کروا دی ہے۔“ پھر تشفی طلب انداز میں باری باری بلال اور اشرف کی طرف دیکھ کر بولا۔

”یار... تم دونوں کو کیا لگتا ہے؟ ہم چاروں بہ آسانی آج رات نکل جائیں گے نا یہاں سے؟“

”ہمارا منصوبہ بے داغ ہے۔ تم کیوں فکر کرتے ہو؟“ بلال نے بے لاپروائی سے کہا۔

”صرف تالے کھولنے کی بات ہے۔ وہ میرے ذمے، بس تم اور عابدہ وقت کا خیال رکھنا۔ ایک منٹ بھی ضائع مت کرنا۔ تمہیں معلوم ہے نا... کیا کرنا ہے تمہیں؟“

”بالکل یاد ہے۔“ میں نے جوش سے کہا۔

مجھے صرف یہ کرنا تھا کہ رات کے ایک مقررہ پہر... لڑکیوں کے پورشن کی طرف جا کر عابدہ کو نکالنا تھا۔ بہ قول اشرف کہ وہ اس سے ذرا دیر قبل اس طرف جا کر لاک کھول دے گا۔ پھر بلال سے جا ملے گا جو عمارت کی چہار دیواری کے جنوبی سمت والے اس دروازے پر زور آزمائی کرنا چاہتا تھا جہاں سے روزانہ کچرا اٹھانے والی ٹریکٹر ٹرالی اندر داخل ہوتی تھی۔ وہاں صرف ایک ہی پہرے دار تھا جو گاہے بگاہے گشت کے دوران بیڑی یا حقہ پینے کے لیے ذرا فاصلے پر بنی ایک کوٹھڑی کا رخ کرتا تھا۔ وہاں تین مزید پہرے داروں کی رہائش تھی۔ یہی وہ موقع ہوگا، جب بلال یا اشرف، دروازے پر زور آزمائی کا ارادہ رکھتے تھے۔

”فرار“ کا یہ منصوبہ خالصتاً بلال اور اشرف کا ترتیب کردہ تھا۔ مجھے صرف اپنے ہاتھ پاؤں ہلانا تھے۔ غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی بات پر ان سے متفق ہوا تھا ورنہ تو میں پہلے ہی یہ ذکر کر چکا ہوں کہ میری ان دونوں کی سوچ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نہ صرف سوچ بلکہ مزاج اور فطرت کے حوالے سے وہ دونوں ایک تھے اور ایک فطرت بھی۔ جب سے اطفال گھر کے ”حالات“ تبدیل ہوئے تھے، میں نے محسوس کیا تھا، کہ اس ماحول سے بلال اور اشرف کے مزاج اور اطوار میں کچھ ایسی تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ جسے میں بہ آسانی کسی حمایت یا تائید سے تشبیہ دے

سکتا تھا۔ مطلب یہ کہ وہ اس بدلتے ماحول سے خوش تھے۔ اس کا اندازہ مجھے تب ہوا... جب دونوں نے قصائی صورت پہرے داروں اور بالخصوص استاد گگل کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے کی کوشش چاہی تھی۔ بلال اور اشرف نے ان کے ساتھ گھلنے ملنے کی کوشش کے ساتھ ان کا بندۂ بے دام یا واضح الفاظ میں ان کا ”کارپرداز“ بننے کا اشارہ دیا تھا۔ میرے نزدیک یہ ضمیر فروشی اور اپنی عزت نفس، اپنی آزادی کو ایک جابر اور مطلق العنان آدمی کے پاس گروی رکھنے کے مترادف تھا۔

یہ محسوس کر کے مجھے ان دونوں سے نفرت سی ہونے لگی تھی مگر میں نے ابھی اس کا دونوں کے سامنے اظہار نہیں کیا تھا۔ ممکن تھا کہ میں غلطی پر ہوں مگر جب ان دونوں نے ایک روز اچانک فرار کے منصوبے پر میری رائے لینا چاہی تو میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ بے شک ایسا منصوبہ تو میرے دل و دماغ میں بھی پل رہا تھا لیکن... جب بلال اور اشرف نے پہل کی تھی، تو میں اس پر سوچے بغیر نہ رہ سکا۔ اور ان دونوں کے بارے میں مجھے اپنے تجزیے کی نفی کرنا پڑی تھی۔

بہرطور... رات کا بے چینی سے انتظار کیا جانے لگا... اوائل سرما کی سرد راتیں تھیں اور شام میں ہی رات کا گماں ہوتا تھا۔ تاہم رات کے ایک مقررہ پہر... جب اطفال گھر کے در و دیوار پر ٹھٹھرتے سناٹے اترنے لگے اور ہال کمرے کی بتیاں بجھا دی گئیں تو منصوبے کے مطابق سب سے پہلے اشرف حرکت میں آیا۔ دیگر بستروں پر ہماری عمروں کے لڑکے گہری نیند میں مستغرق تھے۔ اشرف دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر کی سن گن لی پھر سیدھے ہاتھ کی دیوار کی جانب سرک گیا۔ میں اور بلال اپنے کونے والے بستروں پہ دبکے اس کی حرکات و سکنات کو بہ غور دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک کھڑکی کے قریب گیا جہاں آہنی سلاخیں نصب تھیں۔ بعد میں پتا چلا وہ اور بلال چند روز پہلے ہی سے اس پر زور آزمائی کر چکے تھے اور اب صرف انہیں اپنی جگہ سے اکھیڑنے کی دیر تھی۔ اشرف یہ کام نمٹا کر کھڑکی کے راستے دوسری طرف کود گیا۔ ہال میں مدھم روشنی تھی۔ میرے چہرے پہ سنسنی کے آثار تھے اور میں بڑی حیرت اور تشویش کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اشرف کی یہ مہم جوئی دیکھ رہا تھا، جبکہ بلال کے چہرے پر ایسے تاثرات عنقا تھے، جس پر مجھے حیرت تھی۔ وہ شاید مطمئن تھا، مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ بلال اور اشرف عملی میدان کے صحیح معنوں میں کھلاڑی تھے، اور مجھے ان سے اختلاف بھلا کر کے ان سے کچھ سیکھنا چاہیے تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی اشرف لوٹ آیا اور میرے قریب آ کر سرگوشی میں بولا۔

”چلو، نکلو باہر... اب تمہاری باری ہے۔ جیسا کہا ہے، ویسا ہی کرنا ہے۔ چلو اٹھو۔“ ان کی کارکردگی دیکھ کر میرے اندر جوش و جذبہ جاگا۔ میں فوراً حرکت میں آ گیا۔ کھڑکی کے راستے باہر نکلا، اور پتلی گلی کی دیوار سے چپکا چپکا لڑکیوں والے پورشن کی طرف بڑھا۔ اشرف کی ہدایت کے مطابق دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں پہرے دار نہ تھا، شاید وہ سرگشت کرتا ہوا تھوڑی دیر کے لیے اپنے ساتھیوں کے پاس جا چکا تھا۔ میں پھرتی کے ساتھ کھڑکی کی طرف بڑھا۔ کھڑکی بند تھی۔ سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے چھوا تو حیران رہ گیا۔ وہ ڈھیلی تھیں، بس اکھیڑنے کی دیر تھی۔ اشرف کی بتائی ہوئی ساری باتیں درست ثابت ہو رہی تھیں۔ اس نے بڑی چابک دستی، ہوشیاری اور مہارت سے ان سلاخوں کو بھی ہلا جلا کر ڈھیلا کر دیا تھا۔ دروازے پر میں نے ہلکے سے دستک دی۔ سب اشرف کے .... طے شدہ منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا۔ دروازہ کھلا، عابدہ کا چہرہ نمودار ہوا۔

”میں سلاخیں اکھیڑ رہا ہوں، تم باہر نکلنے کو تیار ہو؟“ میں نے عابدہ کا چہرہ دیکھتے ہی سرگوشی کی۔ وہ کچھ نروس سی تھی۔ بس اثبات میں سر ہی ہلا سکی۔ میں نے بہ آہستگی مگر بڑے آرام سے چار پانچ سلاخیں نکال دیں۔ ہال میں خاموشی تھی، شاید باقی لڑکیاں گہری نیند میں تھیں۔ دفعتاً مجھے عابدہ کے عقب میں ایک اور چہرہ دکھائی دیا۔ میں اسے پہچانتا تھا۔ اسے کیا... بلکہ میں تو ہال کی ساری لڑکیوں کو ہی پہچانتا تھا مگر جانتا صرف عابدہ کو ہی تھا۔ مگر اس وقت عابدہ کے ساتھ میں کسی شناسا لڑکی کا چہرہ دیکھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے بری طرح چونک پڑا... اور سرگوشی سے عابدہ سے بولا۔ ”یہ کیا؟“ میرے اس مختصر سے استفسار نما جملے میں تنبیہ بھی تھی۔

”یہ... یہ... میری عزیز اور قریبی سہیلی شکیلہ ہے۔“

”لیکن میں اس وقت اسے بھی... میرا مطلب ہے...“ مجھ سے کچھ نہ کہا گیا۔ وقت کم تھا... عابدہ نے پتا نہیں کیوں یہ حرکت کر ڈالی تھی۔

”تم غلط سمجھے ہو شہزی!“ عابدہ میرا اضطراب بھانپ

کر بولی۔ ”شکیلہ تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتی ہے۔“

”جلدی کہو، وقت کم ہے اور تم... باہر آؤ پہلے۔“ میں نے کہا مگر شکیلہ سامنے آ کر مجھ سے دھیمی آواز میں بولی۔

”شہزی بھائی! اللہ آپ کو کامیاب کرے، مجھے عابدہ نے سب بتا دیا ہے۔ آپ لوگ ہماری بھی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن پلیز... کیا آپ شوکت کو اعتماد میں لے سکتے ہو؟“

”شوکت؟“ میں زیرلب بڑبڑایا۔ پھر مجھے شوکت حسین عرف شوکی یاد آ گیا۔ میں بولا۔ ”دیکھو شکیلہ! میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ پتا نہیں تم کیا کہنا چاہتی ہو؟ مگر تسلی رکھو ہم یہاں سے نکلنے کے بعد...“ اچانک مجھے گلی سے باہر ہال کمرے کے نیم تاریک برآمدے کی جانب سے ہلکے قہقہے کی آواز سنائی دی۔ میں ٹھٹک گیا۔ عابدہ نے جلدی سے شکیلہ کو پرے ہٹایا۔ اس سے کچھ کہا۔ پھر کھڑکی کے راستے باہر آ گئی۔ مجھے سلاخیں بھی دوبارہ نصب کرنا تھیں۔ یہ منصوبے کا حصہ تھا۔ چند ثانیے کی دھڑکتی خاموشی کی سن گن لینے کے بعد میں جلدی جلدی اکھڑی ہوئی سلاخیں دوبارہ کھڑکی کی چوکھٹ میں نصب کرنے لگا۔ اس اثنا میں شکیلہ نے کواڑ بند کر دیے تھے۔

”یہ کیا بے وقوفی تھی؟“ میں نے ہولے سے عابدہ کے کان میں سرگوشی کی۔ ”یہ لڑکی ہمارا راستہ کھوٹا کر سکتی تھی۔“

”ایسی بات نہیں ہے... میں تمہیں سمجھا دوں گی۔“ موقع محل کی نزاکت سے عابدہ کی ہوشیاری لوٹ آئی تھی، اس نے بتایا کہ شکیلہ بھی شوکت حسین نامی ایک لڑکے کے ساتھ یہاں سے فرار ہونے کا منصوبہ بنا رہی تھی اور اس کا ارادہ تھا کہ شوکت حسین بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائے لیکن وہ پہلے ہماری کارروائی کا انجام دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ شوکت حسین جو اس وقت ہال میں اپنے بستر پر کسی کونے میں بظاہر سو رہا تھا، درحقیقت ہمارے منصوبے سے آگاہ تھا مگر... یہاں میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا تھا کہ اگر وہ واقف تھا تو پھر اس نے ہم سے اب تک بات کیوں نہیں کی؟ شوکت حسین عرف شوکی مجھے یاد آ گیا تھا، گویا شکیلہ اس کی محبوبہ یا دوست تھی، اور عابدہ نے اسے بھی اپنے راز میں شامل کر لیا تھا۔ میری تنبیہ پر عابدہ نے بتایا کہ شکیلہ کو اس منصوبے کے بارے میں بتانا اس کی ایک جذباتی مجبوری تھی۔ ان تین بدنصیب لڑکیوں والے بہیمانہ واقعے کے بعد شکیلہ بہت مایوس اور خوف زدہ تھی۔ وہ اپنی کلائی کی نس کاٹ کر خودکشی کرنا چاہتی تھی۔ ایک دو اور لڑکیوں نے بھی یہ سعی کی تھی مگر عابدہ نے انہیں یہ سب بتا کر جینے کا حوصلہ دیا تھا اور لرزہ خیز اقدام سے انہیں باز رکھنے کی خاطر بتا دیا تھا کہ وہ اور میں یہاں سے فرار ہونے کے بعد ان کی آزادی کے لیے بھی کچھ کر پائیں گے۔

عابدہ نے یہ غلط کہا تھا یا صحیح، ابھی اس پر تجزیہ کرنے کا وقت نہ تھا۔ میں منصوبے کے مطابق عابدہ کو لے کر چلا اور دونوں پورشن کے درمیان والی مختصر سی جگہ سے ہوتا ہوا... اس مقام پر جا کر دبک گیا جہاں مجھے بلال کا انتظار کرنا تھا۔ پھر اس کے ساتھ ہم نے مذکورہ دروازے کی جانب پائیں باغ کی آڑ کا سہارا لیتے ہوئے بڑھنا تھا۔

ہمیں وہاں دبکے جب کافی دیر گزر گئی اور بلال نہ آیا تو مجھے پریشانی کے ساتھ تشویش لاحق ہونے لگی۔ بلال کیوں نہیں آیا تھا؟ اس کا جواب وہی دے سکتا تھا۔ اب تک میں بلال اور اشرف کی سوچ کے مطابق قدم اٹھا رہا تھا، جب وہ نہ آیا تو میں نے خود ہی آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ جب میں پائیں باغ کا سہارا لیتے ہوئے مذکورہ چور دروازے کے قریب پہنچا تو مجھے حیرت و پریشانی کا دوسرا جھٹکا لگا۔ وہاں منصوبے کے مطابق اشرف کو راستہ صاف کرنے کے لیے پہلے سے موجود ہونا تھا مگر وہ بھی وہاں سے غائب تھا۔ کئی سنسناتے ہوئے خیال بجلی کے قمقموں کی طرح میرے اندر جلنے بجھنے لگے۔ یہی وہ وقت تھا، جب مجھے احساس ہوا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ اب سب کچھ میری صوابدید پر تھا۔ فرار کے اس منصوبے میں اب عابدہ اور میں تنہا تھے۔ ایک بات میرے حق میں تھی۔ وہ یہ کہ دروازے کی جانب کوئی پہرے دار نہ تھا۔ یقیناً وہ کہیں کھسک گیا تھا۔ اس وقت میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ بلال اور اشرف کی عین وقت پر ناموجودگی میں مجھے خود فیصلہ کرنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ تاہم وقت اور حالات نے مجھے یہ کرنا بھی سکھا دیا۔ میں نے عابدہ کو وہیں دبکے رہنے کا کہا اور خود پودوں کی آڑ لیتا ہوا چور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ میں پہلے دروازے کا جائزہ لینا چاہتا تھا کہ آیا میں اسے کھولنے کی پوزیشن میں ہوں بھی یا نہیں۔

دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے اس کا جائزہ لیا۔ اس پر تالا پڑا ہوا تھا مگر اس طرح کہ اس کا کنڈا لٹکا ہوا تھا۔ مجھے خوشی بھی ہوئی اور اچنبھا بھی، یہ کیا چکر تھا۔ کیا اشرف اپنا ”کام“ کر چکا تھا؟ یعنی تالا کھولنے کی ذمے داری اس کی تھی پھر وہ کہاں گیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے

آنے میں دیر کر دی تھی اور وہ ہمیں دیکھنے کے لیے پلٹ گیا تھا؟ میرے پاس اب ایک ہی آپشن تھا کہ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاؤں اور عابدہ کو لے کر نکل جاؤں۔ بلال اور اشرف کا کچھ پتا نہ تھا، یوں بھی وہ جہاں کہیں ہوں گے، نکل آئیں گے اور پھر میں یہاں سے فرار ہونے کے بعد کون سا چپکا بیٹھا رہوں گا۔ باہر رہ کر میں ان سب کی آزادی کے لیے بہت کچھ کر سکتا تھا۔

یہ ساری باتیں چند لمحوں میں سوچنے کے بعد میں پلٹا اور عابدہ کو دور ہی سے آنے کا اشارہ کر دیا۔ وہ میری جانب ہی متوجہ تھی، اشارہ پا کر میری جانب لپکی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور دروازے کی طرف بڑھا۔ ابھی ہم دروازے سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھے کہ اچانک گویا روشنی کا طوفان ہم پر آن پڑا۔ ہماری آنکھیں ہی نہیں، اس تیز ”فلڈ لائٹ“ میں ہماری ٹھٹکے ہوئے وجود بھی گویا خیرہ ہو گئے۔ بے چاری عابدہ کے حلق سے تو دبی دبی چیخ بھی خارج ہو گئی۔

دلشاد خان عرف استاد گگل اپنے پانچ چھ خونخوار حواریوں کے ساتھ ہم سے محض چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ ایک حواری کے ہاتھ میں بڑی سی چارجنگ لائٹ تھی۔ استاد گگل کے ہونٹوں پر بڑی سنگدلانہ مسکراہٹ تھی۔ اس کے حلق سے حظ اٹھاتی طنز سے آمیز... آواز برآمد ہوئی۔

”بہت پکی جوڑی ہے دونوں کی... لیلیٰ مجنوں یاد آ گئے۔“ مجھے اس کی آواز زہر میں ڈوبی محسوس ہوئی۔

اس کے ساتھ حواریوں نے ہم پر گنیں تان رکھی تھیں۔ میں اور عابدہ اپنی جگہ بن کھڑے رہ گئے۔ عابدہ کا لرزیدہ بدن میرے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ پھر استاد گگل کے ایک اشارے پر تین حواری ہماری جانب بڑھے۔ ایک نے بڑی بے رحمانہ خونخواری سے عابدہ کو مجھ سے کھینچ کر علیحدہ کیا۔ وہ چیخی، میں نے اسے کھینچنے والے کے جبڑے پر گھونسا رسید کرنا چاہا مگر شاید اسے پہلے ہی مجھ سے اس حملے کی توقع تھی۔ اس سے پہلے اس کی لات حرکت میں آ چکی تھی جس نے مجھے لڑکھڑا کر اس کے دونوں ساتھیوں کی طرف دھکیل دیا۔ میری سنبھلنے کی کوشش کے دوران ہی وہ مجھ پر پوری طرح حاوی ہو چکے تھے۔ میں بے بس تھا۔ اور بڑی زخمی نظروں سے عابدہ کو ان کے شکنجے میں مچلتا تڑپتا دیکھ رہا تھا۔ جیسے کوئی چڑیا شکرے کے چنگل سے نکلنے کی بے بس سعی کر رہی ہو۔

”چھوڑ دو... اس کو... چھوڑ دو...“ عابدہ کی حالت دیکھ کر میرے حلق سے جس قسم کی وحشت خوں رنگ انداز کی غراہٹ برآمد ہوئی تھی، وہ خود میرے لیے اجنبی تھی۔

گگل خان میری بے بسی پر شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ چند قدم قریب آیا اور اپنے بھاری ہاتھ کا ہتھوڑا نما گھونسا میرے جبڑے پر رسید کر دیا۔ میرے حلق سے مارے اذیت کے کرب ناک سی کراہ خارج ہو گئی اور پورا دماغ کیا میرا وجود جھنجنا کر رہ گیا۔ سر سینے کی طرف جھول گیا... اور میری باچھیں میرے ہی خون سے رنگین ہو گئیں۔ مجھے تکلیف میں دیکھ کر عابدہ چیخ پڑی تھی اور گگل خان سے میرے لیے رحم کی بھیک مانگنے لگی... گگل خان نے پلٹ کر اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ عابدہ کی آواز بند ہو گئی۔ ”لے جاؤ اس کو۔“ وہ غرا کر اپنے ساتھی سے بولا۔ میرا دماغ گھونسے لگنے کے باعث ابھی تک جھنجنایا ہوا تھا۔ میں خاصی دیر تک بے حواس رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں پہلے کبھی ایسے حالات سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ بھلا ایک ”اطفال گھر“ میں رہنے والے بچے سے جوان ہونے تک لڑکے میں کتنا حوصلہ ہو سکتا تھا۔ پھر بھی میں نے خود کو بے ہوش ہونے نہیں دیا تھا۔ عابدہ کے بے سدھ وجود کو شیطانی حواری کے سہارے جھولتا دیکھ کر میرے وجود میں چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔ اس وقت گگل خان نے بڑے وحشیانہ انداز میں اپنے ایک ہاتھ سے میری گردن دبوچ لی اور اپنا بھاری چیچک زدہ مکروہ چہرہ میری ڈوبتی نظروں کے سامنے لاتے ہوئے درندوں کی سی غراہٹ سے بولا۔ ”میں تجھے عبرت کا نشان بنا دوں گا، تاکہ دوسرے یہ غلطی کرنے کی جرأت ہی نہ کر سکیں... لے جاؤ اسے بھی۔“

ایک تنگ و تاریک بند کوٹھری میں مجھے پھینک دیا گیا۔ تھوڑی دیر تک میں اسی طرح مڑے تڑے بے سدھ سے وجود کی طرح پڑا رہا۔ پھر ہلکی سی چٹ کی آواز ابھری۔ کمرے میں روشنی ہو گئی۔ پتا چلا یہ آٹھ بائی دس کا مستطیل نما کمرا تھا جس کی چھت قدرے بلند تھی۔ اس بلندی پر ایک روشن دان تھا۔ لائٹ انہی دونوں میں سے ایک نے آن کی تھی، جو مجھے یہاں لائے تھے۔ گگل خان بھی وہاں آ گیا تھا۔ عابدہ کو پتا نہیں ان ظالموں نے کہاں رکھا تھا۔ گگل

خان نے اپنے ان دونوں مذکورہ حواریوں کو اشارہ کیا۔ چابی بھرے کھلونے کی طرح دونوں حرکت میں آ گئے۔ کمرے میں جو اجالا بکھرا ہوا تھا، اس سے کچھ خوفناکی کا تاثر ابھرتا تھا۔ اب پتا چلا تھا کہ یہ کمرا کس لیے استعمال ہوتا تھا۔ میرے منہ پر پٹی باندھ دی گئی۔ ہاتھ پاؤں بھی ریشمی ڈور سے باندھ دیے گئے۔ میں نے مزاحمت کرنا چاہی تو اس کے جواب میں مجھ پر تابڑتوڑ گھونسوں کی بارش کر کے نڈھال کر دیا گیا۔ ساری رات مجھے بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور پھر علی الصباح مجھے میدان میں لکڑی کا عارضی آٹھ فٹ لمبا چوکھٹا بنا کر الٹا لٹکا دیا گیا۔ اس پر بھی بس نہ ہوا تو مجھ پر ایک حواری نے ہنٹروں کی بارش کر دی۔ میں پہلے ہی ادھ موا ہوا جا رہا تھا، اب یہ ایک نئی اذیت تھی۔ دل و دماغ پہلے ہی ماؤف تھے۔ مجھے پہلے رات گئے تک اتنی سخت اذیتوں اور تشدد سے گزارا گیا تھا کہ اب پورا جسم ہی سن ہو کر بے حس ہو گیا تھا۔ اب کسی نئی اذیت یا تکلیف کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔

گگل خان نے اس طرح گویا میری حالتِ زار کو اور مجھے نشانِ عبرت بنا کر دیگر لڑکوں کے سامنے پیش کیا تھا کہ وہ کبھی ایسی جرأت نہ کر سکیں۔ اس کے بعد مجھے دوبارہ اس ہال کمرے میں پھینک دیا گیا۔ زخم جب تک گرم رہے۔ اتنی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا، پھر جیسے جیسے وقت گزرتا ہے تو شدید ٹیسوں کی صورت میں جاگنے لگتا ہے۔ یہی حال میرا ہوا۔ جسم میں خون کی گردش اور تیزی معمول پر آئی تو پورا بدن جیسے پھوڑا بن گیا۔ میرے حلق سے مارے درد و اذیت کے چیخیں تک نکل گئیں۔ میں کونے کے بستر پر کسی زندہ لاش کی طرح پڑا رہا۔ کچھ لڑکے ہمدردی کے لیے مجھ سے پتا نہیں کیا کیا کہتے رہے۔ مجھے اس کا بھی ہوش نہ تھا۔ مگر رفتہ رفتہ مجھے یوں لگا جیسے میرے زخمی وجود میں ٹھنڈک بھرنے لگی ہو۔ کوئی تھا جو جانے کہاں سے میرے لیے دوائی اور مرہم پٹی کا سامان چرا لایا تھا اور باقاعدگی سے مجھے مرہم پٹی کرتا تھا۔ یہی نہیں اور درد کش دوا بھی مجھے کھلاتا تھا۔

تیسرے چوتھے روز میری حالت سنبھلی تو میں نے اپنی نیم جان آنکھوں کے سامنے ایک نیم شناسا چہرہ دیکھا اور جیسے یکلخت میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دوبارہ سے عود کر بحال ہونے لگی۔

اپنے فرار کی ناکامی کا میرے ذہن میں جو پہلا سبب ابھرا تھا، وہ یہی شخص تھا۔ یعنی شوکت حسین... یہ شکیلہ کا بوائے فرینڈ تھا۔ اور اس روز رات کو عابدہ نے مجھے شکیلہ اور شوکت حسین کے بارے میں بتایا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ راز دونوں کی مخبری کے باعث افشاں ہوا ہوگا۔

اطفال گھر کی چار دیواری میں محدود زندگی گزارنے والے آدمی کی عقل بھی اس حد تک کام کر سکتی تھی کہ اس نے بغیر سوچے سمجھے شوکت حسین اور شکیلہ کو اس کا قصوروار ٹھہرا دیا۔ حالانکہ سوچتا تو یہ بات میری سمجھ میں آ سکتی تھی کہ انہیں یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہم سب تو ایک ہی کشتی کے سوار تھے اور پھر میرے اور عابدہ وغیرہ کے فرار سے خود ان کے لیے بھی تو فائدہ تھا۔ پھر ان تین دنوں میں شوکت حسین ہی تھا جس نے میرا خیال رکھا اور اب میری حالت قدرے بہتر تھی۔ فطری طور پر ایک غلط فہمی دل میں گھر کرتی ہے، لیکن میں زود فہم بھی تھا، عقلِ سلیم بھی استعمال کرنا آتی تھی۔ جب میں نے شوکت حسین سے اپنی نفرت کا اظہار کرنا چاہا تو وہ ناراض ہونے کے بجائے مسکرا دیا۔ بہ دستور میرے ساتھ دوستانہ لب و لہجہ اپنائے رکھتے ہوئے بولا۔ ”شہزی! مجھے غلط مت سمجھو۔ شکیلہ نے مجھے پہلے ہی سب بتا دیا تھا۔ میں چاہتا تو خود بھی تمہارے فرار کا منصوبے میں شمولیت اختیار کر لیتا۔ شکیلہ کا مجھ پر یہی دباؤ تھا مگر میں نے ایسا دانستہ نہیں کیا تھا۔“

”کیوں؟“ میں نے اسے نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”اس لیے کہ اگر اس منصوبے میں صرف تم اور عابدہ ہوتے تو یقیناً میں اور شکیلہ تمہارے ساتھ شامل ہونے میں کوئی عار نہیں سمجھتے... مگر تمہارے ساتھ... بلال اور اشرف کو دیکھ کر میں نے مصلحتاً چپ سادھ رکھی تھی اور پھر میرا شک درست ثابت ہوا۔“

بلال اور اشرف کے ذکر پر میں نے ان کے متعلق سوچنا چاہا۔ ”ان دونوں پر تمہیں کس بات کا شبہ تھا؟“

”پہلے یہ سوپ پی لو دوست! بڑی مشکل سے تمہارے لیے کچن سے چرا کر لایا ہوں...“ شوکت حسین نے مسکرا کر کہا اور ایک پیالہ میری طرف بڑھا دیا۔ مجھے اپنے اندر طاقت کی بحالی کا احساس ہوا۔

میں نے شوکت .... کی باتوں پر غور کیا تھا۔ وہ جھوٹ نہیں کہہ رہا تھا کیونکہ اس کی باتوں میں مجھے وزن محسوس ہوا تھا۔

میرے سوال دہرانے پر اس نے ایک نظر ہال پر ڈالی۔ ہال میں ہم دو ہی تھے، بولا۔ ”کمال ہے دوست!

اشرف اور بلال تو تمہارے قریبی دوست تھے تم ان کی فطرت و اطوار کو نہ سمجھ پائے؟“

”میں سمجھ رہا ہوں تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔“ میں نے کہا اور بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے جسم کو ورزشی انداز میں توڑ مروڑ کر وارم اپ کرنے لگا۔ وجود میں ابھی تک ٹیسیں اٹھ رہی تھیں مگر اب قابلِ برداشت تھیں۔ زخم بھی قدرے بھر گئے تھے۔ میں نے شوکت حسین کا شکریہ ادا کیا اور بولا۔ ”دوست! تم نے مجھ پر بلاشبہ احسان کیا... اور میں نے اپنی کم عقلی کے باعث تم پر شبہ... رہی بات بلال اور اشرف کی تو میں ان کی فطرت وغیرہ کو اچھی طرح جانتا ہوں... مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ ایسی غداری کے مرتکب کیونکر ہو سکتے ہیں لیکن ابھی میں ان دونوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے عابدہ کی فکر لاحق ہو رہی ہے۔ تم عابدہ کے بارے میں کچھ جانتے ہو... کہ وہ کس حال میں ہے؟“

میری بات پر شوکت .... مسکرایا... پھر بولا۔ ”اشرف اور بلال کے بارے میں تمہیں سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ان دونوں کے مکروہ چہرے ہم سب کے سامنے بے نقاب ہو چکے ہیں۔ رہی بات عابدہ کی تو شکیلہ کے مطابق وہ بالکل ٹھیک ہے۔“

مجھے عابدہ سے متعلق اس کی بات پر ذرا بھی یقین نہیں آیا۔ کیونکہ گگل خان اور اس کے خونخوار حواریوں سے خیر کی کوئی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ میرے چہرے پر الجھن کے تاثرات بھانپ کر شوکت بولا۔ ”عابدہ کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا... مگر دوست! اصل بات تشویش و فکر کی اور ہے، جو شکیلہ نے مجھے بتائی ہے...“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ہال کمرے کے دروازے پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ ہم دونوں چونک کر دروازے کی طرف تکنے لگے۔ پھر گگل خان اور اس کے دو حواریوں کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر شوکت حسین فوراً میرے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا اور سر جھکائے اپنے بستر کی جانب بڑھا۔

”کیوں بے لنڈے! اب تیری باری ہے۔“ راستے ہی میں گگل خان نے اس کی گردن پر ہاتھ جما دیا اور غراتی ہوئی آواز میں بولا پھر اسے لات رسید کر دی۔ شوکت ہال کے پختہ فرش پر جا گرا...... لوہے کے بیڈ کا کونا اس کی پیشانی سے ٹکرایا تھا۔ اس کی پیشانی سے خون بہنے لگا۔ گگل خان نے ایک اور لات اسے رسید کر دی۔ اور اسے فرش پر چت لٹا کر اپنے پاؤں کے موٹے سول والے بوٹ کی ایڑی اس کے جبڑے پر رکھ دی۔

”خبردار جو آئندہ میں تم دونوں کو کھسر پسر کرتے دیکھوں۔“

پھر وہ میری جانب خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے بڑھا۔ میں اپنے بستر کے قریب خاموش کھڑا ہو کر اس کے چہرے کی طرف تکنے لگا۔

وہ وحشیانہ نظروں سے مجھے چند ثانیے گھورتا رہا۔ پھر بہ غور میرا نیچے سے اوپر تک جائزہ لینے کے بعد بولا۔ ”بڑا ڈھاکڑ جوان ہے رے تو... اتنی مار پڑنے کے باوجود اپنے پیروں پہ کھڑا ہے۔“ میں کچھ نہیں بولا اور منتظر رہا کہ وہ مزید مجھ سے کیا کہنے والا ہے۔

”اب دوبارہ تو ذلیل حرکت نہیں کرے گا... نا؟“ مجھے اس بار اس کے لہجے میں نرمی کا احساس ہوا۔ میں تب بھی چپ رہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا آخر تجھے یہاں کیا تکلیف ہے؟ تیـــرا پورا بچپن یہاں گزرا ہے۔ پھر... کیوں یہاں سے فرار ہونا چاہتا ہے؟“ وہ خبیث کسی مقصد کے لیے شاید دھیرے دھیرے اپنی کینچلی بدل رہا تھا۔

بوڑھے سرمد بابا کے ساتھ رہتے ہوئے میں نے ان سے عقل و سوجھ بوجھ اور دنیاداری کی بھی بہت سی باتیں سیکھی تھیں۔ وہ اب وقت کے ساتھ ساتھ... ”ایکسپریس“ ہو رہی تھیں۔ گگل خان کے اس طرح کینچلی بدلنے پر میں پہلے حیران ہوا تھا۔

”دیکھو شہزی! تم دوسرے کاکوں (لڑکوں) کے مقابلے میں مجھے زیادہ جی دار، صحت مند اور قد آور جوان لگتے ہو اور سخت جان بھی... تمہاری یہ خوبیاں مجھے پسند آئی ہیں لیکن... یہاں سے جانے یا نکلنے کا خیال... دل سے نکال دو۔“

”کیا ہمیں ساری عمر قیدی بنا کر یہاں رکھا جائے گا اور... بیگار لی جاتی رہے گی ہم سے؟“ بالآخر ہمت کر کے میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ میں پہلی بار آج آمنے سامنے گگل خان سے مخاطب ہو کر بولا تھا۔ گویا اس کے سامنے اڑنے کی ایک خم ٹھونک دی تھی میں نے۔

”ساتھی بن کر بھی رہ سکتے ہو... جیسے تمہارے وہ دونوں ساتھی...“ وہ روا روی میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”بلال اور اشرف کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے اس کی ادھوری بات کا مطلب جان کر کہہ دیا۔

”ہاں۔“ اس کا جواب اثبات میں پا کر میرے پورے وجود میں اشرف اور بلال کے لیے نفرت کی ایک لہر

دوڑ گئی۔ گویا شوکت ..... کا کہنا درست ثابت ہوا تھا۔ اور اب میرا یہ تجزیہ بھی کہ درحقیقت بلال اور اشرف نے خود کو گنگل خان وغیرہ کے سامنے سرخ رو کرنے کے لیے یہ سارا ڈراما رچایا تھا۔ مجھے اور عابدہ کو فرار پر اکسا کر۔ ان خبیثوں نے ہمیں استعمال کیا تھا، گنگل خان کی ہمدردیاں سمیٹنے کے لیے۔ یہ طاقت کی نہیں مکاری کی جنگ تھی۔ بلال اور اشرف نے دماغ کی جنگ لڑی تھی اگر مجھے یہ جنگ جیتنا تھی تو خود کو زبردست کے سامنے زیردست بنائے رکھنا تھا۔

گنگل خان تھوڑی دیر بکواس کرنے کے بعد چلا گیا۔ میں شوکت..... کی طرف بڑھا۔ میں اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ سچا آدمی تھا۔ میں نے فوراً بستر کی ایک چادر کا ٹکڑا پھاڑ کر اس کی پیشانی والے زخم پر رکھ دیا اور اسے سنبھالا۔ ”میری وجہ سے تمہیں یہ چوٹ آئی۔ میں اس پر شرمندہ ہوں۔“ میں نے کہا۔ وہ مسکرا کر بولا۔

”کوئی بات نہیں، نہ جانے کتنی اور ایسی چوٹیں میرے مقدر میں لکھی ہیں۔ تم نے دیکھ لیا نا بلال اور اشرف کا اصل چہرہ۔“

”ہاں۔“ میں نے مختصراً کہا۔

”مجھے ابتدا ہی سے ان دونوں پر شبہ تھا۔ انہوں نے خود کو ان خبیث درندہ صفت شیطانوں کی غلامی میں دے دیا ہے۔“

شوکت..... نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر کہا اور اپنی پیشانی کی چوٹ سہلانے لگا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

بلال اور اشرف اب ہمارے ساتھ نہیں رہتے تھے یعنی ہم سے الگ کر دیے گئے تھے۔ وہ اب گنگل خان کے حواریوں میں شمار ہونے لگے تھے۔ مگر ابھی ان دونوں کی حیثیت ان کے نوکروں اور غلاموں کی سی تھی۔ تاہم یہ کیا کم بات تھی کہ دونوں نے گنگل خان کا اعتماد جیت کر پالا مارا تھا۔ میں عابدہ سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ مگر ہم پر اور بالخصوص مجھ پر کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی۔ اچھے وقتوں کے انتظار میں صبر اور مستقل مزاجی عقل و فراست کے اعلیٰ اصولوں میں شمار ہوتی تھی۔ سرمد بابا کی اس نصیحت پر میں اب کاربند رہتے ہوئے کوئی مضبوط پلاننگ بنانا چاہتا تھا۔ کیونکہ..... ہم پر مسلط کیا جانے والوں کی طاقت کا مجھے اب اچھی طرح اندازہ ہو چلا تھا۔

اس روز میری بلال اور اشرف سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ ہمیں ایک بڑے سے بند ٹرک میں کہیں لے جایا گیا تھا۔ یہ معمول کی بات تھی۔ ایک ویرانے میں لا کر ہمیں اتارا گیا۔ ہمارے پیروں میں فولادی زنجیروں کے کڑے ڈالے ہوئے تھے۔ ایک خشک نالے کی ریت بجری کھود کر..... وہاں پہلے سے موجود ٹریکٹر ٹرالیوں پر لادنا محنت طلب کام تھا۔ مگر ہمارے لیے اب یہ سخت کوشی نئی بات نہیں رہی تھی۔ اینٹوں کے بھٹوں پر ہم نے اس طرح کی جان گسل جفاکشی کی تھی۔ پتھر بھی توڑے تھے، مٹی..... کا کام کیا تھا۔ آسمان پر دھوپ چمک رہی تھی، میں ذرا ستانے کے لیے ایک طرف بیٹھ گیا۔ گنگل خان کے خونی حواری ہاتھ میں ہنٹر نما چابک لیے ہم پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ کچھ کے ہاتھوں میں اسلحہ بھی نظر آتا تھا۔ صرف تھوڑی دیر کے لیے ستانے کی اجازت دی جاتی، مقررہ مدت سے ایک سیکنڈ بھی دیر ہو جاتی تو چابک نما ہنٹر ہماری پشت پر پڑتا اور بلبلا کر ہم دوبارہ جان توڑ مشقت میں لگ جاتے۔ میں اپنی قلیل مدت کی مہلت پر ایک طرف خشک بھٹے کی ڈھلان پر جا بیٹھا۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ آج مجھے تکلیف کا کچھ زیادہ ہی احساس ہو رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ وہ تشدد تھا جو کچھ دن پہلے مجھ پر کیا گیا تھا۔

میری ستانے کی مہلت ختم ہو گئی تھی مگر مجھ سے اٹھا تک نہیں جا رہا تھا۔ دفعتاً میں نے بھٹے کی ڈھلان پر ایک گرانڈیل شخص کا سایہ ابھرتے دیکھا اور یکلخت تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت ”شائیں“ کی سنسناتی آواز فضا میں ابھری تھی۔ جہاں تھوڑی دیر پہلے میں نیم دراز پڑا لمبے سانس لے رہا تھا، عین اس جگہ پر ہنٹر کی ضرب پڑی تھی۔ میں دوبارہ کام میں جت گیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ بروقت ہنٹر کی جاں کش ضرب سے محفوظ رہا۔

”بڑے بُرے حالوں میں ہو پیارے!“ کام کے دوران ایک زہر بجھی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں نے آواز کی سمت دیکھا۔ وہ دونوں مردود میرے سامنے کھڑے تھے، بلال عرف بالا اور اشرف۔ بالے نے مجھ سے یہ الفاظ کہے تھے۔ دونوں نے چست پینٹ شرٹ چڑھا رکھی تھی۔ پیروں میں اچھے جوتے تھے۔ ہاتھ میں سگریٹ، اشرف نے سیاہ چشمہ بھی لگا رکھا تھا۔ دونوں کی ”ٹور“ دیکھ کر لگتا تھا وہ اب ہماری طرح قیدی یا بیگاری نہیں رہے تھے اور خوب مزے میں تھے۔

میں نے بہ مشکل اپنی اندرونی کھولتی ہوئی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے ان کی طرف مسکرا کر یوں دیکھا جیسے مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں اور بولا۔ ”جو قسمت میں لکھا ہو دوست! وہی بھگتنا تو پڑتا ہے، سو بھگت رہے ہیں۔“

”کیا بات ہے، شاعری بھی شروع کر دی ہے...“ اشرف ہنسا۔ پھر سگریٹ کا گہرا کش لیا اور فلسفیانہ لہجے میں بولا۔ ”قسمت وسمت کچھ نہیں ہوتی، سارا کھیل دماغ کا ہے پیارے!“ اس نے اپنی انگلی سے اپنی کنپٹی ٹھونکی۔ ”تم بھی اپنا دماغ استعمال کرو..... اور ہماری طرح مزے کرو۔“

”بلکہ استاد کو تو تم پسند بھی آ گئے ہو۔“ اس بار بالے نے کہا۔ اس کی بات پر میں اندر سے چونکا۔ گویا گنگل خان کی طرف سے خاصی قرابت داری استوار ہو چکی تھی۔ جواباً میں اس طرح گرم توے پر میٹھی روٹی جیسی مسکراہٹ سے بولا۔

”ہاں یار، باتیں تو تمہاری بھی سچ ہی ہیں مگر میں شاید تمہارے استاد کے معیار پر پورا نہ اتر سکوں۔“

”ارے ہم کون سا تیس مار خان تھے پھر ان کے گینگ میں شامل ہو کر پیداگیری ہمیں بھی آ چکی ہے۔ تم بھی استاد کے دل و دماغ پر اپنا اعتماد بٹھانے کی کوشش کرو۔“ اشرف مکارانہ..... مسکراہٹ سے بولا۔

میرا مقابل زبردست تھا اور میں زیردست۔ مجھے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا تھا۔ اب میرا مقصد صرف عابدہ نہیں رہی تھی بلکہ میں نے یہاں رہنے والے ان سب قیدی لڑکا لڑکیوں اور بچوں کو چھڑانے کا عزم کر رکھا تھا۔ کیونکہ یہ ظالم لوگ نہ صرف ہم سے بلکہ معصوم بچوں سے بھی بیگار لیتے تھے۔ یہی نہیں، ان بچوں سے بھیک بھی منگواتے تھے۔ بہ قول شوکی کہ اصل لوگ یہ نہیں تھے جو عملے کی صورت میں نظر آ رہے تھے، ان کی پشت پر بااثر لوگ تھے۔ گنگل خان وغیرہ تو محض ان کی کٹھ پتلیاں تھے۔

”کیا سوچنے لگے؟“ بالے نے مجھے ٹہوکا دیا۔ میں خیالات کے جنگل سے نکلا۔

”میں یہی سوچ رہا تھا کہ کس طرح میں تمہارے استاد پر اپنا اعتماد قائم کروں کہ اسے میری وفاداری پر یقین آ جائے۔ اور میں بھی تم دونوں کی طرح خوب مزے کروں۔ سچ پوچھو تو میں اپنی موجودہ زندگی سے تنگ آ چکا ہوں۔“

”یہ ہوئی نا..... شیروں والی بات۔“ اشرف چہک کر بولا۔ بالے کے چہرے پہ بھی معنی خیز مسکراہٹ آئی۔ دونوں بے خبر تھے کہ میرے دل و دماغ میں ان کے لیے کھولتا ہوا لاوا ابل پڑنے کو بے چین تھا۔ میرا بس چلتا تو ان دونوں حرام کے پلوں کی گردنیں مروڑ دیتا۔

”اس کے لیے تمہیں بہت آسان کام کرنا پڑے گا۔“ بالا بولا۔ ”اپنے لڑکوں پر نظر رکھو اور پھر کسی کی فرار ہونے کی کوشش ناکام بنا دو۔“

”یعنی اس طرح دھوکے سے ان کی مخبری کر دوں، جس طرح تم دونوں نے میرے اور عابدہ کے ساتھ کیا تھا؟“ ...میرے اندر کا آتش فشاں آخر پھٹ ہی پڑا۔

”دوست، مطلب براری کے لیے ایسا کرنا پڑتا ہے۔“ اشرف ... ڈھٹائی سے بولا۔

میں نے خود پر قابو پایا..... اور جبراً مسکراہٹ سے بولا۔ ”ہاں، میں نے تمہی سے ہی یہ سبق سیکھا ہے۔ اپنے مقصد کے لیے دوسرے کو قربانی کا بکرا بناؤ۔ میں اس طرح اپنا مقصد حاصل کروں گا۔ مجھے تم دونوں سے کوئی شکایت کوئی گلہ نہیں ہے بلکہ تم دونوں کا مشکور ہوں کہ تم نے مجھے یہ سب سکھایا۔ مجھے لگتا ہے کچھ لڑکے فرار کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ میں ان پر نظر رکھوں گا۔“

”یہ کی نا جی داروں والی بات۔ لگے رہو۔ ایک دن ہماری جگہ آنے پر کامیاب ہو جاؤ گے۔“ دونوں یہ کہہ کر ہنستے ہوئے چلے گئے۔ میں نے دل ہی دل میں ان دونوں پر لعنت بھیجی اور کام میں لگ گیا۔

ایسا سب کچھ میں نے دانستہ اور دونوں سے کہا تھا تاکہ وہ اپنے استاد یعنی گنگل خان سے میرے سلسلے میں اس طرح کی باتیں کرتے رہیں۔ اور وہ مجھ پر ہی نہیں عابدہ پر بھی نرمی کا ہاتھ رکھیں..... مگر ایسا کب تک چلتا... مجھے جلد از جلد کچھ کرنا تھا۔

میں نے رفتہ رفتہ اشرف اور بالے سے راہ و رسم بڑھانی شروع کر دی۔ میں انہیں کریدنے کی زیادہ کوشش کرتا تھا۔ ان دونوں کا درپردہ کام ہی یہی تھا کہ وہ ہم پر نظر رکھے ہوئے تھے اور میں نے ان دونوں کو اپنی حمایت کے لیے رکھا ہوا تھا۔ ان سے باتوں باتوں میں پوچھنے کی کوشش کرتا تھا کہ آخر یہ لوگ ہیں کون؟ آیا کہ بس یہی لوگ تھے یا ان کی پشت پر اور بھی لوگ تھے..... تو وہ کون تھے اور کہاں تھے؟

غرضیکہ وہ دونوں بھی مجھے اس سلسلے میں بتانے سے معذور تھے۔

لیکن سوچنے کی بات میرے نزدیک یہی تھی کہ اچھا بھلا مشہور و معروف اور معزز نظر آنے والا ادارہ ”اطفال گھر“ حاجی اسحاق کے مرحوم ہوتے ہی یکدم جرائم پیشہ افراد کے ہتھے کیسے چڑھ گیا تھا؟ اور اگر چڑھ بھی گیا تھا تو ابھی تک معمول کے مطابق یہاں شہر کی کسی اعلیٰ معتبر اور معزز شخصیت

نے بھی کوئی وزٹ نہیں کیا تھا؟ حالانکہ اس سے پہلے شہر ہی کی نہیں بلکہ ماضی میں ملک کی بڑی اہم سیاسی وغیر سیاسی اور سماجی شخصیات نے دورہ کیا تھا بلکہ ادارے کی ترقی و ترویج کے لیے خطیر رقم عطیہ بھی کی جاتی رہی تھی۔

ابھی میں اس سلسلے میں غور و فکر کر ہی رہا تھا کہ ایک غلغلہ مچ گیا۔ شہر کی ایک بڑی کاروباری شخصیت ادارے کو ایک بڑی رقم کے چندے کا چیک دینے کے لیے عنقریب دورہ کرنے والی تھی۔

اس خبر پر مجھے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آرہا تھا۔ میری طرح دوسرے بھی حیران تھے اور خوش بھی۔ ہمیں ایسا لگتا تھا جیسے ہمارا کوئی نجات دہندہ آنے والا ہو... جو ہمیں اس جہنم سے نکالنے والا تھا۔ حیرت اس بات پر تھی کہ آخر ککل خان اور اس کے حواری یہ کیونکر چاہیں گے کہ باہر کا کوئی آدمی اور وہ بھی شہر کی کوئی معروف کاروباری شخصیت یہاں کا دورہ کرے اور ان کے کالے کرتوتوں سے آگاہ ہوسکے کیونکہ یہاں سب جو کچھ ہورہا تھا یا کیا جارہا تھا، وہ سب بیرونی دنیا سے خفیہ رکھا جارہا تھا۔ تو پھر یہ لوگ اتنا بڑا رسک کس طرح لے رہے تھے اور کیوں؟ ایک ہی بات سمجھ میں آتی تھی، خطیر رقم کی صورت ملنے والے چندے کا لالچ یا پھر وہ کسی اعلیٰ شخصیت کو دورے سے منع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

ہم اس نجات دہندہ کے بے چینی سے منتظر تھے بلکہ آپس میں بھی ہم نے ایک خفیہ نشست جمانے کے دوران یہ تہیہ کررکھا تھا کہ آنے والی شخصیت کو حلق پھاڑ پھاڑ کر ان درندوں کے کالے کرتوتوں کے بارے میں بتادیں گے۔ کیا یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ممکن تھا؟ کیا دلشاد خان عرف استاد ککل واقعی ہی بے وقوف تھا؟

اشرف اور بالے کی مہربانی سے میں نے عابدہ سے کھڑکی کی طرف چوری چھپے ملاقات کی۔ اس رات ناکامی کے بعد سے میری عابدہ سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس کا چہرہ پژمردہ تھا، مجھے دیکھ کر کھل اٹھا۔ شکیلہ بھی اس کے عقب میں کھڑی تھی۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ ”عابدہ! تم ٹھیک تو ہونا... تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی ان بھیڑیوں نے؟“

”نہیں... لیکن... شہزی! حالات بہت خراب ہونے والے ہیں۔“ عابدہ نے گویا انکشاف کیا۔ نہ جانے کیوں ہر بری خبر مجھے اپنے حوالے سے کم عابدہ کے حوالے سے زیادہ پریشان کردیتی تھی۔

”کیا ہوا، خیریت؟ کیا ہونے والا ہے؟“ میں نے پریشان لہجے میں دریافت کیا۔

اس نے ایک نگاہ اپنے ساتھ کھڑی شکیلہ پر ڈالی، گویا اسے بولنے کا خاموش اشارہ کیا۔ وہ کھڑکی کے قریب آکر بولی۔ ”شہزی بھائی! پہلے یہ تو بتائیں شوکی کیسا ہے؟“

”وہ بالکل ٹھیک ہے۔ میرا بہت اچھا دوست بن گیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ عنقریب وہ بھی تم سے ملنے آئے۔“ میں نے اسے شوکت حسین کے سلسلے میں تسلی دی، پھر پوچھا۔ ”شکیلہ بہن کیا ہونے والا ہے... خیریت تو ہے؟“

”ہمیں شبہ ہے خدا کرے غلط ہو۔ عنقریب ہم میں سے چند خوبصورت لڑکیوں کو کسی نامعلوم مقام کی طرف لے جایا جانے والا ہے۔“ اس کی بات پر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ”کک... کیا مطلب؟ اور... اور... تمہیں... اس بات کا شبہ کیسے ہوا؟“

”اب تک تو شبہ ہی ہوا ہے مگر خطرہ کچھ ایسا ہی ہے۔“ وہ بتانے لگی۔ ”میں نے اور عابدہ نے ان دونوں موٹی کالی عورتوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا بھی تھا۔“ یہی نہیں بلکہ چند دنوں میں دوبار کچھ لوگ اندر آئے تھے جنہوں نے ان سب لڑکیوں کو بڑی تولتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس وقت ہمیں قطار کی صورت میں کھڑا کردیا جاتا تھا۔ ہمیں بڑی تشویش ہوئی... پھر جب ہم نے نگراں عورتوں کی باتیں سنیں تو انہیں یہی کہتے سنا نہ جانے کن پانچ خوبصورت لڑکیوں کی قسمت پھوٹنے والی ہے۔ دوسری ہنستے ہوئے جواباً بولی۔ پانچ میں سے دو تو پکی ہیں۔ ایک عابدہ اور دوسری شکیلہ۔“ وہ اتنا بتا کر خاموش ہوگئی۔ شکیلہ کے مقابلے میں عابدہ کمزور دل کی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ وہ ایک دم ہی ہراساں نظر آنے لگی۔ شکیلہ نے جو کچھ بتایا تھا، اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ [illegible] ہونے والا تھا... کب؟ یہ ابھی پتا نہیں چل سکا تھا۔

میرے پاس وقت کم تھا۔ دوسری بار اگر پکڑا جاتا تو میرے ساتھ یقیناً ان دونوں کی بھی شامت آجاتی۔ میرے پاس عابدہ کو اور پھر شکیلہ کو تسلی دینے کے سوا اور کیا تھا۔ میں واپس لوٹ کر شوکت حسین کو یہ خبر دی۔ وہ بھی پریشان تو ہوا مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مجھ سے سخت خفا ہے۔ جب میں نے اس کی وجہ پوچھی تو وہ بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ مجھ سے اس بات پر خفا تھا کہ میں نے اشرف اور بالے سے ابھی تک دوستانہ تعلقات استوار کر رکھے

تھے، جبکہ ہر لڑکا جان گیا تھا کہ اب وہ دونوں ہم میں سے نہیں رہے تھے۔ ہم پر مسلط کیے جانے والے درندہ صفت انسانوں کے آلۂ کار بن چکے تھے۔ میں نے شوکت حسین کی ناراضگی دور کرنے کی غرض سے کہا۔

”ان دونوں نے میرے اور عابدہ کے ساتھ بہت برا کیا۔ مگر اس سے بھی بڑا جرم ان کا یہی ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ مل گئے ہیں جنہوں نے ہم پر عرصۂ حیات تنگ کررکھا ہے۔ اس کے باوجود اگر میں نے ان کے ساتھ تعلقات استوار کررکھے ہیں تو اس میں ایک مصلحت ہے۔ ایک کڑوی مصلحت، بالکل اسی طرح جیسے کسی بیماری کو دور کرنے کے لیے کڑوی گولی نگلی جاتی ہے۔“

”صاف اور سیدھی بات کرو شہزی!“ شوکی سنجیدگی سے بولا۔ ”کیا تم بھی ان کے زر خرید ساتھی بننا چاہتے ہو؟ کیا تم بھی اشرف اور بالے کی طرح ہم میں سے کسی کی مخبری کرکے...“

”مجھے تم سے یہ امید نہ تھی کہ تم ایسی ناسمجھی والی باتیں کروگے۔ شوکی!“ میں نے بڑے دکھ کے ساتھ اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ہماری گرماگرم بحث پر ہال میں موجود اور لڑکے بھی ہمارے گرد جمع ہونے لگے تھے۔ وہ بالخصوص میری طرف کڑوی اور غصیلی نظروں سے گھور رہے تھے۔ شوکی نے بہت ناوقت یہ فضول بحث چھیڑ دی تھی۔

”اس سے اب بچ کر رہنا چاہیے۔ یہ ہمارا دشمن ہے۔“ ایک لڑکے نے کہا۔

”تم لوگ مجھے غلط سمجھ رہے ہو... ایسا نہیں ہے۔“ میں نے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی۔ مگر شوکی سمیت کوئی میری بات سننے کو تیار نہ تھا۔ سب مجھے اپنا دشمن سمجھ رہے تھے، جبکہ ان نادانوں کو کیا پتا تھا کہ میں تو خود ان سب کو اس جہنم سے نجات دلانے کی فکر و پریشانی میں مبتلا تھا۔ میں انہیں صاف بات بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ... یہ میری ایک چال ہے۔

بعض جوشیلے قسم کے نوجوانوں کو مجھ پر طیش آیا اور وہ مجھے مارنے کو بھی لپکے مگر شوکت حسین نے انہیں ایسا کرنے سے منع کردیا۔ تاہم وہ بھی اب مجھ سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اس نے میرے زخموں پر مرہم رکھا اور تشدد کے بعد میری تیمارداری کی تھی۔ اس کا یہ احسان میں نہیں بھول سکتا تھا مگر ایک ذرا سی غلط فہمی کے باعث اس نے مجھے بھی ان درندہ صفت لوگوں میں شمار کرلیا تھا۔

میں ان سے مایوس ہوکر اپنے کونے والے بستر پر

اور ان کی بیگم آپس میں بہت محبت کرتے تھے لیکن ان کے ماموں نے ان کا جینا حرام کررکھا تھا۔ وہ ان کے ساتھ دس برس رہے۔ ایک دن بیمار پڑے اور بیماری بڑھنے سے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ طارق صاحب کفن دفن کے بعد گھر واپس آئے تو بیوی سے کہا۔ ”اللہ تمہارے ماموں کو جنت میں جگہ دے مگر انہوں نے کبھی ہمیں چین نہیں دیا۔“

”کیا؟“ بیگم حیرت سے بولیں۔ ”اُف خدا میں تو آج تک یہی سمجھتی رہی کہ وہ تمہارے ماموں ہیں۔“

مرسلہ۔ نشو کرن۔ راولپنڈی

جا بیٹھا۔ اب ان کا لیڈر میں نہیں شوکت حسین تھا۔ یہ لوگ اب جب بھی آپس میں سر جوڑ کر بیٹھتے، مجھے خود سے دور رکھتے۔ نہ مجھ سے کوئی بات کرتے، نہ کسی گفتگو وغیرہ میں شامل کرتے۔ یہ مجھے غدار اور اپنا دشمن سمجھنے لگے تھے۔ یہی حال شوکی کا بھی تھا۔ تنگ آکر میں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

جس کاروباری شخصیت نے یہاں کا دورہ کرنا تھا، اس کا نام... مجھے اشرف اور بالے کے ذریعے سیٹھ منظور وڑائچ معلوم ہوا تھا۔ اسے تین چار روز میں ----- یہاں کا دورہ کرنا تھا۔ میں نے اشرف اور بالے سے یہ بات معلوم کرنا چاہی تھی کہ کیا ایسا ہونا ان کے ”مفادات“ کے خطرے کا باعث نہیں بن سکتا تھا؟ اس پر جواب دینے کے بجائے ان دونوں نے محض معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا تھا۔ وہ وقت قریب آیا تو حالات نے ایک دم پلٹا کھایا۔ نہ جانے کدھر سے مزید بچے، نوجوان لڑکے لڑکیاں، گاڑیاں بھر بھر کے لائے گئے، جبکہ ہمیں یعنی پرانے لوگوں کو ایک الگ ہال کمرے میں بند کردیا گیا۔ یہ ہال کمرا کم گودام زیادہ نظر آتا تھا۔ نہ اس کی دیواروں میں کھڑکیاں تھیں، نہ دروازے، بس ایک بڑا سا چوبی گیٹ تھا۔ اور بلند چھت کے قریب والی دیوار پر چھوٹا سا روشن دان... یہاں اندھیرا کردیا گیا تھا۔

پھر وزٹ والے دن ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے۔ ہونٹوں پر اسکاچ ٹیپ چپکا دیا گیا۔ ساتھ ہی ہمیں دھمکیاں بھی دی گئیں کہ کسی نے بھی کوئی غلط حرکت کی تو اس کی خیر نہ ہوگی۔ مجھے ان کی چالاکی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی

تھی مگر اب بھی میں الجھا الجھا سا تھا۔

سارے لڑکے رن بستہ حالت میں کونوں میں دبک گئے تھے۔ تاہم میں ذرا ہمت کر کے بند دروازے کی باریک متوازی جھری سے آنکھ چپکائے سب کچھ دیکھتا رہا۔ مجھے اب باہر کا سارا ماحول ہی بدلا بدلا نظر آنے لگا۔ رنگ برنگی جھنڈیاں لگائی جارہی تھیں۔ نئے آنے یا لائے جانے والے بچے، جوان لڑکیاں، لڑکے آزادی کے ساتھ باہر میدان میں گھوم پھر رہے تھے اور بہت خوش نظر آرہے تھے۔ گگل خان اور اس کے حواری بھی ڈھنگ کی حالت میں تھے۔ یعنی ان کے پاس خلاف معمول کوئی اسلحہ نظر نہیں آرہا تھا اور وہ شریفانہ لباس اور شریفانہ صورتیں بنائے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ مجھے اب سب سمجھ میں آرہا تھا۔ ہمیں اس لیے یہاں ڈرا دھمکا کر بند کر دیا گیا تھا کہ کہیں ہم آنے والی شخصیت سے ان کے کالے کرتوتوں کی شکایت نہ کر دیں اور ان کے مکروہ چہرے بے نقاب نہ کر دیں۔

ہمارے گودام نما قید خانے کے بڑے سے چوبی گیٹ کے سامنے ہی وہ میدان تھا جہاں اسٹیج اور ڈائس وغیرہ لگانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ میں بند دروازے کے قریب ہی بیٹھا باہر کی کارروائی کا منظر دیکھتا رہتا تھا۔ امید کی جوت جاگی تھی، وہ بھی اب بجھ گئی تھی۔ شوکت حسین بھی میری طرح یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ ان لوگوں نے اپنے بھیانک چہرے پر کس چالاکی اور مکاری سے نہ صرف نقاب ڈالی تھی بلکہ اس کاروباری شخصیت یعنی سیٹھ منظور وڑائچ سے ایک بھاری رقم چندے کی صورت میں بھی وصول کرنے والے تھے۔

بہرحال وہ وقت بھی آگیا جب اس شخصیت نے دورہ کرنا تھا۔ اسٹیج پر صوفے اور کرسیاں لگائی جاچکی تھیں۔ مجھ سمیت چند اور لڑکے بھی میری تقلید کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح گھسٹ کر بند گیٹ کی طرف آن پہنچے۔ ان میں شوکی بھی تھا۔ میں دم سادھے اپنی آنکھ جھری سے چپکائے سامنے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ یہاں سے باہر مرکزی گیٹ تک کا بھی منظر واضح تھا۔

سب لوگ جن میں "عملے" کے لوگ بھی تھے، مہمان کے استقبال کے لیے ہاتھ میں پھولوں کے گل دستے تھامے کھڑے تھے۔ اشرف اور بالا بھی ان میں شامل تھے۔ معاً ایک لمبی سی نئے ماڈل کی چمچماتی کار اندر داخل ہوئی، میری نظر کار پر تھی۔ یقیناً میری طرح یہاں موجود اور لڑکوں کی آنکھوں میں بھی حسرت سمٹ آئی تھی۔ اس بات کی کہ ہم کتنے بے بس تھے اور اپنے نجات دہندہ سے چیخ چیخ کر اپنی حالتِ زار اور یہاں پر ہونے والے مظالم کی داستان بھی اسے سنانے سے قاصر تھے۔

کار رک گئی، باوردی ڈرائیور اُترا۔ اس نے جھک کے دروازہ کھولا تو ایک عمر رسیدہ شخص بیش قیمت سوٹ میں برآمد ہوا۔ اس کے ہمراہ ایک اور سیکریٹری ٹائپ آدمی بھی اترا تھا مگر میری نظریں اس معزز مہمان پر جم کر رہ گئی تھیں جو اپنی وضع قطع سے مہمان خصوصی ہی نظر آرہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی یکلخت جیسے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آرہا تھا۔ میری دم بہ خود نظریں متوحش معزز مہمان سیٹھ منظور وڑائچ پر جم کر رہ گئی تھیں، جو کوئی اور نہیں سرمد بابا تھے۔

☆☆☆

سرمد بابا... کو پہچانتے ہی میری آنکھوں کی بے بسی اور حسرت انتہا کو پہنچ گئی۔ فرطِ جوش سے میرا وجود بھی مرتعش ہونے لگا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ لکڑی کے اس موٹے بند دروازے کو دیوانہ وار اپنے سر کی ٹکروں سے توڑ ڈالوں رن بستہ وجود کو ایک بھری ہوئی انگڑائی لے کر جکڑ بندوں سے آزاد کر دوں۔ اور میں نے ایسی کوشش کرنا بھی چاہی تھی کیونکہ اب ہم بچے کہاں رہے تھے، میں خود ایک گبرو اور کڑیل نوجوان کے روپ میں ابھرا تھا۔ میرے ساتھی بھی جوان مرد بن چکے تھے۔ چاہتے تو مل کر اپنے راستے کی دیوار توڑنے یا گرانے کی کوشش کر سکتے تھے، مگر یہ ممکن نہ تھا شاید شوکت نے آنکھوں ہی آنکھوں سے میرے اندر کی بپھری ہوئی بے چینی بھانپ لی تھی مگر دوسرے ہی لمحے ذاتی مخاصمت اور غلط فہمی کے باعث پروان چڑھتی شقاوت قلبی کے باعث فوراً اس نے میری طرف سے نظریں پھیر لیں۔

سرمد بابا المعروف سیٹھ منظور وڑائچ اب ڈائس پر کھڑے، خطاب کر رہے تھے۔ ان کے سامنے لاوارث اور یتیم بچوں کو باقاعدہ کرسیوں پر بٹھایا گیا تھا۔ اور سرمد بابا اس ادارے کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ اب یہ اطفال گھر ایک جرائم پیشہ لوگوں کا اڈا بن چکا تھا۔

ایک مضبوط امید میرے اندر جاگی۔ ہاں... سرمد بابا... کو ان نئے لائے جانے والے لڑکے لڑکیوں کے بھیس دکھا کر دھوکا تو دیا جاسکتا تھا مگر اس تعلق کو اس رشتے اور جذبے کو کس طرح دھوکا دے سکتے تھے جو میرے اور سرمد بابا کے بیچ بہت پہلے سے استوار ہو چکا تھا... مجھے یاد تھا

اچھی طرح سے کہ سرمد بابا نے مجھے اپنے سگے بیٹے سے بھی بڑھ کر کہا تھا۔ یہ بات گنگل خان اور اس کے ساتھی حواریوں کے سان وگمان میں بھی نہ تھی کہ سیٹھ منظور وڑائچ یعنی سرمد بابا اور میرے بیچ کیا رشتہ تھا۔ بے شک سرمد بابا نے یہاں اپنے بڑھاپے کے چند سال بتائے مگر ان چند سالوں میں انہوں نے مجھے برسوں کا مان دیا تھا۔

میں اب حیرانی سے جھری کے پار ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہاں سے جانے کے بعد وہ جہاں بھی رہے تھے اب تک یقیناً نسبتاً اچھے حالوں اور اچھے ماحول میں رہیں ہوں گے۔ جبھی اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی ان کی صحت ٹھیک ٹھاک نظر آ رہی تھی۔ وہ زندہ دل انسان تھے۔ یقیناً پہلے کے مقابلے میں اب انہیں جسمانی اور ذہنی آرام وخوشی نصیب ہوتی رہی تھی۔

سرمد بابا یعنی سیٹھ منظور وڑائچ یہی ان کا اصل نام رہا ہوگا۔ وہ تقریر کرنے کے دوران مائیک پر کہہ رہے تھے۔ ”شاید بہت کم لوگ یہ حقیقت جانتے ہوں گے کہ میں نے بھی ماضی قریب کے چند سال یہاں گزارے ہیں مگر میں دیکھ رہا ہوں ان چند سالوں میں عملے کے پرانے لوگ نظر نہیں آ رہے۔ خیر... جو نئے ہیں میں انہیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں کہ وہ حاجی صاحب کے انتقال کے باوجود اس ادارے کا نظم ونسق بہ احسن خوبی درست خطوط پر قائم رکھے ہوئے ہیں۔ گنگل خان وغیرہ نے بھی باری باری مختصراً خطاب کیا۔ اس کے بعد سرمد بابا کو وزٹ کرانے کے لیے ادارے کے مختلف پورشن میں لے گئے۔ اپنے خطاب کے آخر میں انہوں نے ادارے کو اپنی جانب سے ایک خطیر رقم کا چیک بہ طور چندہ بھی دیا تھا۔

سرمد بابا میری نظروں سے غائب ہو گئے تھے اور ایک بار پھر مایوسیوں کے اندھیرے میرے اندر کالے بادلوں کی طرح چھانے لگے۔ مجھے سرمد بابا سے پوری امید تھی کہ وہ اپنے خطاب کے دوران میرا ذکر ضرور کریں گے۔ وہ یہاں کے منتظمین کو جب مجھے ان سے ملانے کا کہیں گے تو ان کے پیروں تلے زمین سرک جائے گی۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ”کیا سرمد بابا مجھے بھول گئے تھے؟“ ایک تکلیف دہ خیال میرے ذہن میں ابھرا تھا۔

کافی دیر بعد میں نے سرمد بابا کو کچھ لوگوں کی معیت میں دوبارہ نمودار ہوتے دیکھا اور اس بار وہاں بارعب چہرے پر الجھن کے تاثرات تھے۔ وہ اسٹیج پر رکھے صوفے پر براجمان ہو گئے تھے۔ ان کا سیکریٹری گنگل خان سے کچھ باتیں کر رہا تھا اور گنگل خان کا انداز کسی بے دام غلام کی طرح تھا۔ پھر اس کے بعد اس نے آخر میں سرمد بابا سے جھک کر کچھ کہا اور اسٹیج سے نیچے اتر آیا۔ پھر میں ہی نہیں، بند دروازے سے یاس زدہ آنکھیں چپکائے ہوئے دیگر لڑکے بھی بری طرح ٹھٹک گئے۔ پھر جیسے یک لخت کھلونوں میں چابی بھر گئی۔ جکڑ بندوں کے باعث ہم سب جتنی تیزی کے ساتھ رینگ رینگ کر دروازے سے دور ہو سکتے تھے ہوتے رہے کیونکہ اسٹیج سے اترنے کے بعد گنگل خان کا رخ اس گودام کی طرف تھا۔ تھوڑی دیر بعد دھڑ سے دروازہ کھلا۔ گنگل خان اندر داخل ہوا۔ بدنما چہرے کی خونخواری یک لخت لوٹ آئی تھی پھر اس کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ وہ میری طرف لپکا۔ ذرا ہی دیر بعد اس کے تین حواری بھی اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے دو اشرف اور بالا تھے۔

”تم... شہزاد احمد خان میری بات غور سے سنو۔ اب تک کی ساری صورت حال تمہاری سمجھ میں آ گئی ہوگی۔ اس لیے میں کچھ بات نہیں کروں گا۔ سیٹھ صاحب تمہیں یاد کر رہے ہیں۔ کیا کہتے ہو تم؟“ گنگل خان نے کھردرے اور فیصلہ کن لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ مگر میں نا سمجھ میں آنے والی ایکٹنگ کرنے لگا۔ ”تم سمجھاؤ اسے اچھی طرح...“ گنگل خان نے مجھے الجھن میں مبتلا دیکھ کر تحکمانہ انداز میں اشرف اور بالے سے کہا تو وہ دونوں فوراً حکم کے غلام بنے میری جانب بڑھے۔ سب سے پہلے بالا مجھ سے بولا۔

”سنو شہزی! یہی وقت ہے تمہاری استاد گنگل خان کے ساتھ وفاداری دکھانے کا۔ ہمیں بھی یہ حقیقت معلوم ہے کہ سیٹھ منظور سرمد بابا کے نام سے یہاں چند سال گزار گئے تھے اور تمہاری ان سے بہت قرابت داری تھی۔ اب وہ ضد ہیں کہ تمہارے سلسلے میں انہیں مطمئن کیا جا سکے۔“ وہ رکا تو یہاں سے اشرف نے بات اچک لی اور مجھ سے بولا۔

”ہم نے تمہارے سلسلے میں سرمد بابا کو پہلے یہی بتایا کہ تم یہاں سے جا چکے ہو۔ مگر چونکہ ہم یہ کہہ کر بھی جان نہیں چھڑا سکتے تھے کہ تم بھاگ گئے ہو۔ اس طرح ان کی نظروں میں ادارے کی بنی بنائی ساکھ خراب ہو سکتی تھی۔ اس لیے ہمیں یہ بہانہ کرنا پڑا کہ تم اب ادارے سے نکل کر کہیں اچھی جگہ نوکری کر رہے ہو۔ اور اپنی زندگی سے خوش ہو۔ مگر سرمد بابا یہ ضد ہیں کہ اگر تم جا چکے تھے تو اس کا ریکارڈ موجود ہونا چاہیے تھا، سو ہمیں اس سلسلے میں انہیں اثبات میں ہی جواب دینا پڑا۔ اب ہم تمہیں خاموشی اور آزادی کے ساتھ یہاں سے باہر نکال رہے ہیں۔ اس کے بعد تمہیں کار میں بٹھا کر

مین گیٹ سے اندر لے جایا جائے گا۔ اور سرمد بابا سے ملوا کر ان کی تسلی کروادی جائے گی لیکن تم نے انہیں وہی کچھ کہنا ہوگا جو تمہیں پہلے سے بتایا گیا ہے۔“

”اور یاد رکھنا اگر تم نے ذرا بھی چالاکی کرنے یا ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی تو بھیانک انجام تو تمہارا مقدر ہوگا ہی مگر اس سے پہلے تمہاری معشوقہ کا حشر برا کر کے رکھ دیں گے۔“ آخر میں گنگل خان نے بڑے بھیانک لہجے میں مجھے تنبیہ بھی کر دی۔

میرے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ ”شہزاد... یہی وقت ہے دماغی جنگ لڑنے کا۔ وقت تمہارے ہاتھ میں ہے اور قوتِ فیصلہ بھی۔ آگے تمہاری قسمت۔“

میں نے فوراً ہامی بھرتے ہوئے گنگل خان سے کہا۔ ”استاد! تم تو مجھے پہچان ہی نہ سکے۔ اب تک اشرف اور بلال کی طرح میں بھی تمہاری وفاداری کا دم بھرنے کے لیے تیار تھا۔ مگر افسوس اب تک مجھے اس کا موقع نہ مل سکا۔ مگر اب میں اس سنہری موقع سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔“

”کیا کہتا تھا میں استاد!“ دفعتاً اشرف نے گنگل خان سے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”یہ ہماری بات مان جائے گا۔“

”ہاں، ویسے بھی اس کے پاس ہماری بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“ گنگل خان نے طاقت کے زعم اور پُرغرور لہجے میں کہا۔ مجھے تھوڑی سی مایوسی تو ہوئی، تاہم ناامید نہ ہوا۔

یہ سب باتیں مجھے ایک کونے میں لے جانے کے بعد سرگوشیوں میں ہوئی تھیں۔ جبکہ باقی لڑکوں کو مجھ سے دور کر دیا گیا تھا۔ اب وہ سب شوکی سمیت یقیناً یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ میں اپنی آزادی کی خاطر ان کے ساتھ کوئی خفیہ قسم کی ساز باز کر رہا ہوں۔

مجھے نہایت ہوشیاری اور راز داری کے ساتھ گودام سے باہر نکالا گیا۔ ظاہر ہے اب میرے ہاتھ پاؤں آزاد کر دیے گئے تھے۔ سامنے اسٹیج تھا، اس لیے اب درمیان میں ایک اور قناعت کھڑی کر کے دیوار سی بنادی گئی تھی۔ یہ کام گنگل خان کے حواری پہلے ہی کر چکے تھے۔

مجھے ایک نسبتاً بہتر کمرے میں لایا گیا۔ یہاں میں نئے کپڑے پہن کر جتنی جلدی تیار ہو سکتا تھا، ہو کے دوسرے دروازے سے باہر آ گیا۔ میرے ہمراہ خود گنگل خان اور اس کے حواری بھی تھے۔ پھر ان کا ایک حواری کار لے آیا۔ مجھے اس میں سوار کیا گیا۔ اور کار گھما کر مین گیٹ کے راستے دوبارہ مجھے عزت واحترام کے ساتھ اندر لایا گیا۔ اسٹیج کے سامنے کار روک دی گئی۔ مجھے اتارا گیا اور پھر میں اس اسٹیج کے مختصر قدمچے طے کرتا ہوا اوپر سرمد بابا کے پاس جا پہنچا۔ بابا نے مجھے دیکھتے ہی گلے لگانے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے اور میں جیسے ان کے بازوؤں میں بھر گیا۔ میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔ میں نے دیکھا سرمد بابا کی بوڑھی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئی تھیں۔ سرمد بابا سے بہ ظاہر میرا کوئی خون کا رشتہ نہ تھا۔ مگر انسان کے قابلِ احترام جذبات کو محض انسانی رشتوں ناتوں میں نہیں تولا جاتا

سرمد بابا نے بھی مجھے اپنی سگی اولاد کی طرح خود سے بھینچ لیا تھا۔ ہمیں بہت سی باتیں کرنا تھیں مگر وقت نہیں تھا۔ گنگل خان نے کچھ ہدایتیں مجھے بعد میں کار میں سوار ہوتے وقت بھی دی تھیں۔

سرمد بابا کو میں نے وہی کچھ بتایا جو مجھ سے کہا گیا تھا اور انہیں میرے بارے میں جیسا بتایا گیا تھا... جبکہ میرے استفسار کرنے کے باوجود بابا نے اپنے بارے میں ابھی کچھ نہیں بتایا تھا کہ ان کی اچانک کس طرح کایا کلپ ہوئی تھی۔ نیز وہ مہربان عورت کون تھی جو ایک دن ان کا سہارا بنی اور انہیں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ بابا مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے پھر کسی وقت کا کہہ کر ٹال دیا۔ انہوں نے مجھے اپنا سیل فون نمبر لکھ کر دیا۔ وہ میں نے ذہن نشین کر لیا۔ اس دوران میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں بابا سے مدد کا کہہ سکوں۔ کیونکہ میں دیکھ رہا تھا کہ گنگل خان، اس کے حواری اور مردود اشرف اور بالا کی ”نگراں“ نظریں نہ صرف میری ایک ایک حرکات و سکنات پر جمی ہوئی تھیں، بلکہ وہ میری آواز کا بھی دھیان رکھے ہوئے تھے کہ میں سرمد بابا سے ایک ذرا سرگوشی بھی نہ

کرسکوں۔ یہ کیسی بے بسی تھی۔ بابا... میرے ہی نہیں یہاں قید ہم سب بدنصیبوں کے لیے نجات دہندہ بن سکتے تھے میں انہیں ایک لفظ تک بھی مدد کے لیے نہ کہہ سکا۔

یوں بھی اگر بھانڈا پھوٹ بھی جاتا، تو ان بھیڑیا صفت لوگوں سے خیر کی کوئی امید نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ میرے ہردل عزیز سرمد بابا کا دیا ہوا سیل فون نمبر میرے لیے امید کی ایک کرن ضرور تھا جسے میں نے فوراً اور اچھی طرح ذہن نشین کرلیا تھا، بعد میں میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ سرمد بابا کے رخصت ہوتے ہی مجھ سے وہ کاغذ چھین لیا گیا تھا جس پر ان کا سیل... نمبر درج تھا۔

☆☆☆

اس اہم ترین مرحلے سے گزرنے کے بعد بھی میں اب تک گگل خان پر اپنا اعتماد اور (جھوٹی) وفاداری نہیں بٹھا سکا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ایک بار یہاں سے فرار کی کوشش کرچکا تھا۔ گویا مجھے اب بھی قیدیوں کی طرح ہی بیگار پر رکھا جارہا تھا۔ میرے ہم جولیوں نے اگرچہ مجھ سے بات چیت ترک کررکھی تھی۔ اور مجھے ہر وقت ان کی چبھتی ہوئی نظروں کا سامنا رہتا تھا۔ مگر اس روز شوکت عرف شوکی مجھ سے بات کیے بنا نہ رہ سکا۔ ایک زہر آلود اور طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔

''اب کون سی نئی ساز باز کررہے ہو ان لوگوں کے ساتھ؟''

''میں کوئی ساز باز نہیں کررہا۔'' میں نے مختصراً جواب دیا۔ میں اس وقت اپنے بستر پر بیٹھا تھا۔ شوکت حسین نے میرے بیڈ کی پائنتی پر ایک پاؤں ٹکادیا تھا اور بڑے اسٹائل کے ساتھ بات کررہا تھا۔ یہ لوہے کی پائپوں والے اسپرنگ کے بیڈ تھے۔

''اچھا؟'' وہ بہ دستور طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''کوئی تو نئی کھچڑی تم ان کے ساتھ مل کر پکا ہی رہے ہو۔ کہاں لے کر گئے تھے تمہیں یہ لوگ اس دن؟''

''تم سے مطلب؟'' اس کے مستقل طنزیہ اور روکھے لہجے نے... بالآخر میرے خون کو بھی گرما دیا تھا۔ ''اچھا اب تم اپنی ٹانگ ہٹاؤ میرے بیڈ پر سے بستر کی چادر میلی ہورہی ہے۔''

شوکت اپنا پاؤں ہٹانے کے بجائے انتہائی بے دردی سے اپنے جوتے کو میرے بستر کی چادر سے صاف کرنے لگا اور انتہائی نفرت آمیز لہجے میں..... بولا۔ ''جن کا ضمیر ہی میلا ہوا نہیں بھلا چادر کے میلے ہونے کا کیا غم ہوسکتا ہے۔''

''شوکی! میں کہہ رہا ہوں میرے بستر سے اپنا پاؤں ہٹاؤ۔'' اس بار میرے اندر لاوا کھولنے لگا تھا اور میں نے خوب چبا چبا کر یہ الفاظ ادا کیے..... میری نظریں اس کے چہرے پہ جم کر رہ گئی تھیں۔ اس نے پھر بھی اپنا پاؤں نہیں ہٹایا تو... جیسے میرے اندر غیظ و غضب کی آگ سی بھرگئی۔ میں اس سے بھڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس کے بہ دستور نفرت اور تضحیک آمیز رویے نے مجھے اس سے بھڑنے پر مجبور کر ہی دیا۔ میں بیڈ پر بیٹھے بیٹھے حرکت میں آیا اور ایک زوردار ٹانگ کی ٹھوکر اس کی ٹانگ پر رسید کردی۔ جو میرے بیڈ پر ٹکی ہوئی تھی۔ نتیجتاً شوکی کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ وہ لڑنے پر اتر آیا تو میں بھی بستر سے اٹھ کر اس کے مدمقابل آن کھڑا ہوا۔ صحت میں وہ مجھ سے کچھ زیادہ تھا البتہ قد میں مجھ سے مار کھاتا تھا۔ اپنے لیڈر کے ساتھ مجھے بھڑتے دیکھ کر باقی لڑکے جو مجھ پر پہلے ہی ادھار کھائے بیٹھے تھے، مشتعل جتھے کی صورت میں میری طرف لپکے تو شوکی نے فوراً ایک ہاتھ کے اشارے سے ان کی میری طرف پیش قدمی کو روک دیا۔

''اس ضمیر فروش بزدل آدمی کے لیے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔'' اس کے ان الفاظ نے میرے تن بدن میں آگ لگادی اور پھر میں اس پر دیوانہ وار جھپٹ پڑا۔

میرے ایک ہاتھ کا گھونسا اس کے چہرے پہ پڑا۔ ضرب زوردار ثابت ہوئی، وہ اپنے حلق سے کراہ آمیز آواز نکالتا ہوا چند قدم پیچھے کو لڑکھڑا گیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی خون کی سرخی نمودار ہوئی۔ اور وہ وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ مجھ پر لپکا۔ اور اپنے جسم کی ٹھوکر لگائی، شکر تھا کہ میرے عقب میں بستر تھا۔ میں اس پر پشت کے بل جاگرا۔ وہ مجھ پر کودا تو تب تک میں اپنی دونوں ٹانگیں اوپر اٹھا چکا تھا۔ شوکت حسین میری ٹانگوں سے ٹکرایا تو میں نے اسے پرے اچھال دیا۔

دوبدو لڑائی یا ہاتھا پائی میں یہ بات فطری ہوتی ہے کہ انسان لڑائی بھڑائی کا ماہر نہ بھی ہو مگر اپنے دفاع اور چوٹ کھانے پر اپنے ہاتھ پاؤں ہلاتا ہی ہے۔ یہی حال میرا تھا۔ میں بھی کوئی ماہر جنگجو نہ تھا تاہم میری فطرت میں قدرتی طور پر ایک ٹھہراؤ اور ہوش مندی کا دخل زیادہ تھا۔ ایسی فطرت کے لوگ ہوتے ہیں جنہیں غصہ بہت کم آتا ہے مگر جب آتا ہے تو پھر اس کی انتہا بھی دیکھنے کی ہوتی ہے۔ قدرت نے میری فطرت میں یہ دونوں خوبیاں رکھی تھیں۔

اپنے دونوں پیروں سے شوکی کو میں نے اچھالا تو وہ

سیدھا اپنے ساتھیوں کے قدموں تلے جاگرا۔ میں بستر سے اتر کر کھڑا ہوگیا۔ شوکی کا چہرہ طیش سے سرخ ہورہا تھا۔ یہی حالت اس کے ہم خیال لڑکوں کی تھی۔ شوکت اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور جارحانہ نظروں سے میری طرف گھورنے لگا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ہوش میں آؤ شوکی! میں لڑائی سے ڈرتا نہیں ہوں لیکن ہمارے بیچ لڑائی مناسب نہیں۔''

مگر وہ پھر مجھ پر جھپٹا اور میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ میں نے اس کا گریبان پکڑلیا ہم دونوں اپنے وجود کا زور لگا کر ایک دوسرے کو دھکیلنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم کوئی ماہر لڑاکا نہ تھے۔ یہ خالصتاً ''دیسی مارکہ'' لڑائی تھی، مگر جب میں نے شوکی کو دوبارزک پہنچائی تو میرے اندر ایک ولولہ جاگا۔ ایسا ولولہ جو لڑنے والے کو خوداعتمادی بخشتا ہے۔ شوکی نے مجھے اڑنگا لگانے کی کوشش کی، اس میں وہ کامیاب بھی رہا کیونکہ میں گرنے کے انداز میں لڑکھڑا گیا۔ مگر پتا نہیں یہ میری عقل مندی تھی یا پھر عام سی لڑائی میں اپنا دفاع کرنے کا فطری انداز تھا کہ میں نے اس کا گریبان نہ چھوڑا تھا، نتیجتاً شوکی بھی میرے ساتھ گرا تو میرے بجائے وہ زد میں آگیا۔ وہ زمین پر جا پڑا۔ میں اس کے اوپر تھا۔ اس کے سر کا پچھلا حصہ پختہ فرش سے ٹکرایا یقیناً اسے چکر آگئے ہوں گے۔ میں نے اس کے سینے پر سوار ہوکے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔ اب دیگر لڑکوں سے میرے ہاتھوں اپنے لیڈر کی پٹائی نہیں دیکھی گئی۔ وہ شور مچاتے ہوئے بیک وقت مجھ پر پل پڑے۔ میں اتنے ساروں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ سب غصے اور جنون میں بھرے ہوئے تھے۔ مجھے اٹھا اٹھا کر پٹخ رہے تھے۔ میں حلق کے بل چیخنے لگا تو میری چیخ و پکار سے کئی حواری ہاتھوں میں ہنٹر نما چابک لیے اندر داخل ہوئے۔ ان میں بالا اور اشرف بھی تھے۔ ہنٹر مار مار کر انہوں نے مجھے لڑکوں سے چھڑایا۔ میں نیم بے ہوش سا ہوگیا تھا۔ اشرف اور بالے نے مجھے سنبھالا دیا۔

''یہ... یہ.... لوگ اس شبہے پر مجھے ماررہے تھے کہ میں تم لوگوں کا ساتھی اور مخبر ہوں۔'' میں نے ہانپتے ہوئے انہیں بتایا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ نسبتاً ایک بہتر کمرے میں لاکر مجھے بستر پر لٹادیا گیا۔ وہاں استاد گگل خان موجود تھا۔ بالے اور اشرف نے میری طرف داری میں اسے ساری بات سمجھائی۔ شاید اب گگل خان مجھ سے کچھ متاثر نظر آنے لگا تھا۔ مجھے چند دن اس کمرے میں رہنے دیا۔ اچھا کھانا پینا اور دیکھ بھال کی گئی۔ مجھے ان دنوں بیگار پر بھی نہیں لے جایا گیا۔ پھر اشرف اور بالا نے آکر مجھے بتایا کہ استاد گگل خان تم سے خوش ہے۔ اب تم بھی ہم دونوں کے ساتھ کام کروگے۔ میں نے پہلے تو دل ہی دل میں گگل خان پھر بالا اور اشرف پر لعنت بھیجی اور بظاہر خوشی سے بولا۔

''تم دونوں نے دوستی کا حق ادا کردیا۔ میں خوش ہوں تمہارے ساتھ رہ کر۔'' لیکن بالا اور اشرف نے واضح لفظوں میں مجھے یہ بھی بتادیا کہ ابھی ان کی... اپنی حیثیت ویسی نہیں ہوئی جیسی کہ گگل خان کے اپنے حواریوں کی تھی بلکہ بالا اور اشرف خود ابھی تک گگل خان کے حواریوں کے تابع تھے۔ اور انہیں یعنی بالا اور اشرف کو ویسی آزادی بھی نہ تھی کہ وہ بغیر کسی کو بتائے عمارت کی اس چار دیواری سے باہر قدم بھی رکھیں وغیرہ... ان کی باتیں سن کر مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی تھی تاہم میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ مجھے کم از کم بیگار کرنے اور اس ہال کمرے سے آزادی مل گئی تھی۔ میں چار دیواری کے اندر سہی مگر آزاد گھومتا پھرتا تھا۔ تاہم اندر کے چھوٹے موٹے کام بجالانا میری ذمے داری میں تھا۔ یہاں پر کھانا چائے بنانے اور صفائی کرنے والے بھی گگل خان کے اپنے ہی آدمی تھے، مگر اب یہ کام ہم تینوں کو کرنا پڑتے تھے۔ میں اس میں بھی خوش تھا۔ ہم تینوں کو رہنے اور سونے کے لیے ایک ہی بڑا کمرا دیا گیا تھا۔ اچھی سہولت کی ہر شے موجود تھی۔ سگریٹ وغیرہ تو میں نہیں پیتا تھا۔ اب ہمارا کام بیگار پر لڑکوں اور بچوں کی نگرانی کرنا بھی ہوتا اور ساتھ ساتھ حواریوں کو پانی پلانے کا کام بھی ہمارے ذمے ہوتا۔ ظاہر ہے جاں گسل بیگار کاٹنے سے یہ کام قدرے بہتر تھا۔ مگر میں محسوس کرتا تھا کہ اشرف اور بالا کی باتیں غلط نہ تھیں۔ ہمیں واقعی ابھی وہ حیثیت حاصل نہ تھی جو گگل خان کے حواریوں کو تھی۔ خیر... سردست میرے لیے یہ بھی بہت تھا کہ چار دیواری کے اندر سہی، ہاتھ پاؤں ہلانے کی تو آزادی تھی۔ اس دوران میں نے عابدہ سے بھی ایک بار ملنے کی کوشش کی تھی۔ جب چھپتے چھپاتے کھڑکی کے نزدیک پہنچا تو مجھے دیگر لڑکیوں کی جھلک دکھائی دی۔ ایک شناسا لڑکی کو رازداری سے پاس بلاکر میں نے دھڑکتے دل سے عابدہ کے بارے میں پوچھا تو ایک سنسنی خیز اور دل ہلادینے والا انکشاف سامنے آیا۔ یہ ثریا تھی، وہ بولی۔

''شہزاد بھائی! عابدہ سمیت پانچ لڑکیوں کو راتوں رات غائب کردیا گیا ہے۔''

''کک کیا؟'' یہ سن کر میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ ''یہ... یہ... کیا کہہ رہی ہو تم؟ کک... کب ہوا یہ سب...؟'' میں نے لکنت زدہ لہجے میں پوچھا۔

''کل رات کی بات ہے۔'' وہ بتانے لگی۔ ''ہم سب سو رہے تھے کہ اچانک شور کی آواز سے سب سے پہلے میری ہی آنکھ کھلی تھی۔ وہ نگراں عورتیں تین ہٹے کٹے مردوں کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھیں انہوں نے شاید پہلے ہی سے پانچ لڑکیوں کا انتخاب کر رکھا تھا۔ ہم سب خوف زدہ تھے۔ ہمیں خوفناک گنیں دکھا کر خاموش رہنے اور اپنے اپنے بستروں پہ پڑے رہنے کا حکم دیا گیا۔ پھر ہم میں سے پانچ بدنصیب لڑکیوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ کھینچ کر وہ لوگ اپنے ساتھ لے گئے۔''

''کدھر لے جا رہے تھے وہ انہیں؟'' میں نے ڈوبتے دل سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔ ''ہم نہیں جانتے۔ لیکن اندازہ ہے ان لڑکیوں کو کوئی لینے کے لیے آیا تھا۔ اور... وہ...'' ثریا کا دل ڈوب گیا۔ اپنا جملہ نامکمل چھوڑ کر وہ رو پڑی۔ شاید اسے اپنا انجام بھی ایسا ہی نظر آ رہا تھا۔ میں اسے طفل تسلی ہی دے سکتا تھا۔ ثریا نے سنبھلنے کے بعد مجھے عابدہ سمیت لڑکیوں کے نام بھی بتائے تھے، شکیلہ بھی ان میں شامل تھی۔ یہ شوکت حسین عرف شوکی کی محبوبۂ دلنواز تھی۔ ثریا روہانسی ہو کر مجھ سے بولی۔ ''شہزی بھائی! تم کچھ کرو نا... عابدہ اور شکیلہ نے تو تمہارے سلسلے میں ہمیں بڑی تسلی دے رکھی تھی کہ تم... اور شوکت بھائی (شوکی) مل کر ہم سب کو یہاں سے نکالنے کا عزم کیے ہوئے ہو۔''

اس کی بات سن کر میرے دل پہ گھونسا لگا۔ ان بے چاریوں نے مجھے پتا نہیں کیا سمجھ لیا تھا۔ سچ کہا ہے کسی نے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا... میں بھی تو تنکا ہی تھا ان کے لیے... کیونکہ میں ایک بار عابدہ کے ساتھ یہاں سے فرار ہونے کی ناکام کوشش کر چکا تھا۔ ظاہر ہے اگر میں اور عابدہ اس رات منحوس چار دیواری سے نکل جانے میں کامیاب ہو جاتے تو ان سب کے لیے بھی کچھ کر سکتے تھے۔ ابھی میں روتی دھوتی ثریا سے تشفی آمیز جملے کہنا ہی چاہتا تھا کہ ایک زوردار بھاری ہاتھ میری گدی پر پڑا۔ میرا دماغ جھنجھنا گیا۔ ثریا چیخ مار کر پرے ہٹ گئی۔ وہ ایک ہٹا کٹا حواری تھا جس نے مجھے ثریا سے باتیں کرتے چھاپ لیا تھا۔ اس نے مجھے اسی طرح گردن سے پکڑ کے گگل خان کے سامنے پیش کر دیا۔ وہاں اشرف اور بالا بھی موجود تھے مگر ان کے بشروں پر سرد مہری طاری تھی جبکہ گگل خان میری طرف... خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا... پھر اسی لہجے میں غرا کر بولا۔

''کیوں بے لمڈے! ادھر کھڑکی میں کس سے ملنے گیا تھا؟ تیری معشوقہ تو اب گئی تیرے سے دور... پتا چل گیا تجھے یا نہیں۔''

میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''استاد! میری معشوقہ تو اس دن سے ہی مجھ سے ناراض ہو گئی تھی جب میں نے اسے فرار کرانے کے لالچ میں اس کے ساتھ یاری گانٹھی تھی۔ اب ایک نئی لڑکی پھنسائی ہے۔''

''ہوں۔'' میری بات سن کر گگل خان نے مکروہ مسکراہٹ سے ہنکارا بھرا۔ میں نے کوشش چاہی تھی کہ کسی طرح اس مردود کو میرے اور عابدہ کے درمیان تعلق خاطر کی بھنک نہ پڑے، لیکن میں اشرف اور بالا کی طرف سے کچھ خائف تھا کیونکہ یہ دونوں خبیث عابدہ کے میرے ساتھ تعلق کی سنجیدگی سے بہ خوبی واقف تھے۔

''بڑی کھول بازیاں کرتا ہے، کڑیوں کے ساتھ۔'' گگل خان ہنسا۔ میں خوش تھا۔ وہ میرے جھانسے میں آ رہا تھا، ورنہ مجھے ڈر تھا کہیں اس جرم میں مجھ سے یہ قلیل آزادی بھی نہ چھین لی جائے مگر دوسرے ہی لمحے گگل خان کا بھاری ہاتھ حرکت میں آیا اور ''چٹاخ'' کی زوردار آواز کمرے میں گونج گئی۔ میرے دائیں گال پر گگل خان کے بھاری تھپڑ کا نشان چھپ گیا تھا۔

''خبردار! جو آئندہ کھڑکی کی طرف بھی گیا... ورنہ چیر کر رکھ دوں گا تجھے۔'' وہ وحشیانہ غراہٹ سے بولا۔

''معاف کر دو استاد! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔'' اپنے اندر کے غبار پر قابو پاتے ہوئے میں نے اس کی منت کی۔

پھر وہ قریب کھڑے اشرف اور بالے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے تحکمانہ بولا۔ ''سنبھالو اپنے لمڈے کو... اسے میں نے تم دونوں کی سفارش پر باہر نکالا ہے۔ اب اگر اس نے دوبارہ کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو اس کے ساتھ تم دونوں کی بھی خیر نہ ہوگی۔''

اشرف اور بالا مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے آئے اور غصے سے مجھے بستر پر پٹخ دیا۔

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ یہ کیا کر رہے تھے تم۔ اپنے ساتھ ہمیں بھی مرواؤ گے۔'' اشرف نے غصیلے لہجے میں کہا۔

بالے نے بھی مجھ پر برہمی نکالتے ہوئے کہا۔ ''کان کھول کر سن لو شہزی، اب اگر تم نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو تمہیں دوبارہ قیدی بنا دیا جائے گا سمجھے تم۔''

''یار! ہم آزاد کب ہیں؟'' میں نے بستر پر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا... اب مجھے اپنے غبار پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا اور میں بالآخر پھٹ پڑا تھا۔ ''یہ بھی کوئی زندگی ہے تمہاری؟ جو قید سے بھی بدتر ہے۔ یہ غلامی کی زندگی ہے۔ کیا تم دونوں کے ضمیر مردہ ہو گئے ہیں؟ یہاں اتنے معصوم لوگ قیدی بنا لیے گئے اور ہر روز ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔ تمہیں ان معصوموں پر ذرا بھی ترس نہیں آتا؟ اللہ سے ڈرو۔ وہ گناہگار اور تمہارے جیسے ضمیر فروشوں کی رسی دراز ضرور کرتا ہے مگر ڈھیلی نہیں کرتا۔ جب کھینچتا ہے تو پھر کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔ وقت کے آنے سے پہلے خدارا سنبھل جاؤ اور میرا ساتھ دو۔ یہاں معصوم جوان لڑکیاں بھی ہیں۔ جن کی پاک دامنی کو یہ مکروہ شیطان لوگ کھلونا بنا کر کھیلتے ہیں۔ ان کا ساتھ دینے پر یہ گناہ بھی تمہارے سر جائے گا۔ تم بھی ان کے برابر کے شریکِ گناہ ٹھہرائے جاؤ گے۔ خدا کے لیے ہوش کے ناخن لو۔ اور مجھے بتاؤ، کل رات ان پانچ معصوم جوان لڑکیوں کو کہاں لے جایا گیا ہے جن میں عابدہ بھی شامل تھی۔'' میں کہتے کہتے ہانپ گیا۔ وہ دونوں بہ غور میرے چہرے پر نظریں جمائے... کھڑے تھے۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد اشرف میری طرف چند قدم بڑھا اور ایک ٹانگ بستر پر جما کر قدرے جھک کر مجھ سے بولا۔

''تم کس ضمیر نام کی چڑیا کی بات کر رہے ہو، شہزی! پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ ان لوگوں کا ضمیر کہاں سو گیا تھا، جو ہمیں جنم دینے کے بعد یہاں پھینک گئے تھے۔ تم بھی تو تھے، تمہارا تو اپنا سگا باپ تمہیں یہاں چھوڑ گیا تھا۔ ہمیں یاد ہے تم سے جب ملنے آتا تھا تو کس طرح مگرمچھ کے آنسو بہایا کرتا تھا۔ پھر اس نے آنا بھی چھوڑ دیا۔ یہ دنیا صرف اپنے اپنے مفادات کو عزیز رکھنے کا ٹھکانا ہے۔ رہی بات آزادی کی تو ہم اب بھی آزاد ہیں۔ کھلا کھاتے پیتے ہیں۔ موج کرتے ہیں۔ تھوڑے دنوں بعد ہمیں باہر بھی آزادی سے آنے جانے دیا جائے گا۔''

اشرف نے اپنی بات پوری کی... تو بالا بھی میری طرف بڑھا۔ اور بولا۔ ''عابدہ کو بھول جاؤ، ہوش کے ناخن لو۔ اور وہی کرو جس کا یہ لوگ حکم دیں۔ تم نہیں جانتے یہ لوگ کس قدر طاقت ور ہیں اور یہی طاقت ہی عیش و آرام کی زندگی کی ضمانت ہے۔ تمہیں بھی ہمارا یہی مشورہ ہے، بے وقوفی کی روش چھوڑ دو۔ ان کے ساتھ پنگا نہ کرو، پھر دیکھو تم کس طرح عیش اور مزے کرو گے۔''

ان دونوں کی باتوں پر مجھے ازحد افسوس ہوا، تب مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں۔ عارضی عیش و آرام نے ان کو بے حس بنا دیا تھا، ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو زنگ لگا دیا تھا۔ انہیں مزید سمجھانا بے کار تھا۔ اس لیے میں نے بھی چپ سادھ لی مگر وہ دونوں خاموش نہیں ہوئے۔ اشرف بولا۔ ''دیکھو شہزی! اگر تمہارے یہی خیالات ہیں تو کوئی گڑبڑ کرنے سے پہلے ہم سے دور ہو جاؤ۔ بے شک ہم بچپن سے جوانی تک ساتھ رہے ہیں مگر اب حالات مختلف ہیں۔ اب ہمارے بیچ مفادات کی جنگ چھڑ چکی ہے۔ ہم تمہیں صاف صاف یہ بات بتا دینا چاہتے ہیں کہ اگر تم نے ذرا بھی کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو استاد گگل یا ان کے حواریوں سے پہلے ہم دونوں تمہیں کڑی سزا سے دوچار کر دیں گے۔ ورنہ تمہاری وجہ سے ہمیں ان لوگوں کا عتاب سہنا پڑے گا۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اسے بھی تم ہمارا خود پر بہت بڑا احسان سمجھو کہ تمہیں پہلے سے آگاہ

کررہے ہیں۔"

اس کی بات پر میں نے نفرت سے دونوں کی طرف دیکھا پھر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور ملتجیانہ لہجے میں بولا۔

"خدا کے لیے... مجھے عابدہ کے بارے میں بتادو... اسے کدھر لے جایا گیا ہے۔"

"ہمیں نہیں معلوم..." بالا ہاتھ جھٹک کر بولا۔ "اگر پتا ہوتا بھی تو ہم تمہیں کیوں بتاتے۔" اس کے بعد کمرے سے جاتے جاتے آخر میں بالے نے کہا۔ "اب ہمیں تمہیں بھی اپنی نگرانی میں رکھنا پڑے گا۔" پھر دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

دونوں جاتے جاتے باہر سے کمرا بند کر گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے کمرے سے باہر نکلنا چاہا تو وہ باہر سے بند پایا۔ میں دوبارہ اپنے بیڈ پر آ بیٹھا۔ عابدہ کی طرف سے مجھے شدید بے چینی اور تشویش ہونے لگی تھی۔ پتا نہیں ان خبیث شیطانوں نے عابدہ سمیت ان پانچوں لڑکیوں کا کیا حشر کیا تھا؟ مجھے سخت پچھتاوا سا ہونے لگا کہ میں اس سے پہلے کچھ نہ کرسکا اور اب بھی کیا کر رہا تھا۔ کیا تھا میرے بس میں...؟

میرے دل و دماغ کی عجیب و غریب کیفیات ہونے لگیں۔ میرے اندر خطرناک و جارحانہ جذبات ابھرنے لگے۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ اب میرے پاس وقت نہیں رہا تھا کہ میں کسی موقع کا انتظار کروں یا کسی چال کو بروئے کار لاسکوں۔ یہ لوگ میری سوچ سے بھی زیادہ مکار ہوشیار اور محتاط ثابت ہوئے تھے۔ یہی وقت تھا کچھ کرنے کا۔ فیصلہ کن عملی قدم اٹھانے کا۔ میں سوچ سوچ کر پاگل ہوا جارہا تھا۔

کھڑکی سے باہر شام اُتر رہی تھی اور میری بے چینی فزوں تر ہورہی تھی۔ میں کمرے میں اس طرح ٹہلنے لگا جیسے سب کچھ میرے حکم کے ایک اشارے پر منتظر ہو مگر میں تو خود حکم کا غلام تھا۔

جب باہر شام گہری ہونے لگی تو اشرف اندر داخل ہوا... بالا اس کے ہمراہ نہیں تھا مگر میں اشرف کو دیکھ کر چونک پڑا۔ کیونکہ میں نے آج پہلی بار اس کے ہاتھ میں ایک کلاشنکوف رائفل دیکھی تھی۔ اس کا چہرہ مسرور سا نظر آرہا تھا۔ وہ بار بار گن پر یوں ہاتھ پھیر رہا تھا جیسے وہ اس کا کوئی بہت ہی پالتو جانور ہو۔

"یہ گن کہاں سے لی تم نے؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس سے پوچھا۔ وہ اس وقت خوشی کے نشے سے چور تھا، بولا۔ "استاد نے دی ہے۔ یہ اب میری ملکیت ہے۔ یہ پہلا موقع ہوگا کہ آج رات استاد مجھے اپنے ساتھ ایک خاص مہم پر لے جارہا ہے۔" فخر و انبساط سے اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ میں مہم والی بات پر چونکے بنا نہ رہ سکا۔ اور پوچھ بیٹھا۔

"مہم؟ کیسی مہم؟"

"تم سے مطلب؟ اپنے کام سے کام رکھو تم۔" وہ یکدم سنبھل گیا اور درشت لہجے میں بولا۔ پھر گن ایک طرف دیوار سے ٹکا کر رکھ دی۔ میں نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"واہ... میرے یار! لگتا ہے تمہاری خوب ٹور بن گئی ہے مگر تمہیں تو یہ گن چلانی نہیں آتی۔"

"تم سے کس نے کہہ دیا کہ مجھے گن نہیں چلانی آتی۔" وہ میری طرف گھور کر بولا۔ "یہ کلاشنکوف ہے، سب سے خطرناک گن مگر استعمال میں بھی سب سے آسان... صرف اس کا میکنزم سمجھ کر بھی اسے بہ آسانی چلایا جاسکتا ہے۔"

"اچھا!" میرا انداز بہ دستور توصیفی تھا۔ "کیا تم نے سمجھ لیا اسے چلانا؟"

"ہاں! یہ دیکھو..." اس نے فخر سے کہا اور دوبارہ گن اٹھالی۔ پھر مجھے بتانے لگا کس طرح میگزین اٹیچ کیا جاتا ہے۔ کب اور کیسے اسے برسٹ اور سنگل شاٹ پر سیٹ کرکے فائر کیا جاتا ہے۔ اس دوران میں نے اس کے ہاتھ سے گن بھی لی، وہ خاصی وزنی تھی۔ اسلحہ اٹھانے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ کسی آتشیں ہتھیار کا لمس پاتے ہی اپنے آپ مجھے ایک طاقت کا نشہ سا محسوس ہونے لگا۔ یہی تو وہ ایک طاقت تھی جو اگر کمزور اور لاغر انسان کے ساتھ ہو تو وہ اپنے سے کئی گنا زیادہ طاقت ور اور زور آور پر غالب آسکتا ہے۔

پھر اس نے گن میرے ہاتھ سے لے کر دوبارہ دیوار سے ٹکادی۔ پھر اپنی قمیص اوپر کو اٹھادی۔ میری آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کی شلوار کے نیفے میں چار پانچ فالتو میگزین بھی اڑسے ہوئے تھے۔

"واہ میرے یار! تم تو بڑے دھانسو انسان بن گئے ہو۔" میں اس کی تعریف کرتا رہا اور وہ مسرور سا وہ سب بتاتا رہا جو میں اس سے جاننا چاہتا تھا۔ اس نے بتایا بالا بھی اس کے ہمراہ تھا۔ پانچ حواری اور تھے۔ تھوڑی دیر گزری کہ بالا بھی اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بھی گن تھی۔ مگر میں

اس کا چہرہ دیکھ کر چونک گیا۔ اس کے چہرے پر وہ جوش اور مسرت نہیں تھی جو اشرف کے چہرے سے واضح تھی۔ اس کی جگہ پریشانی اور خوف آمیز تشویش طاری تھی۔ "کیا بات ہے بالے؟ تم اس مہم پر جانے سے خوش نہیں نظر آتے؟" میں نے دانستہ اسے بھی کریدا۔ میری بات کا جواب دینے کے بجائے صرف ایک نظر ڈالنے کے بعد وہ اشرف سے مخاطب ہوا۔

"کیا تم نے اسے بتادیا ہے؟"

"میرے ہاتھ میں گن دیکھ کر یہ صرف اتنا ہی سمجھ سکا ہے۔" اشرف بے پروائی سے بولا۔ "زیادہ تفصیل نہیں پتا ہے اسے۔"

"ہمیں فالتو راؤنڈز کے طور پر استعمال کرنے کے لیے لے جایا جارہا ہے، اشرف!" بالا مجھ سے پہلو تہی کرتے ہوئے بہ دستور اشرف سے مخاطب رہا۔ اس کے لہجے سے بددلی اور تلخی عیاں تھی۔

"اب ان کے ساتھ رہتے ہوئے یہ تو کرنا پڑے گا۔" اشرف کا انداز بہ دستور لاابالی تھا۔

"یہ ہمیں قربانی کا بکرا بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں اس مہم میں۔" بالا نے اسے ہوش دلایا۔

"ہم اکیلے کب ہیں۔ یہ لوگ بھی تین سے چار ہوں گے۔ تم ایسے ہی خوف زدہ ہورہے ہو۔ استاد ہمیں ٹرینڈ کرنا چاہتا ہے، ایسی مہمات میں بھیج کر۔ میں استاد کو جانتا ہوں، چلے ہوئے کارتوسوں کے علاوہ وہ نئے کارتوسوں پر بھی بھروسا کرتا ہے۔ اس مہم کی کامیابی کے بعد مجھے پورا یقین ہے ہماری حیثیت بدل جائے گی۔ پھر استاد گگل خان کے سوا کوئی ہم پر حکم نہیں چلاسکے گا۔"

"اگر اس مہم سے زندہ بچے تو۔" بالا نے کہا۔

جب رات سر پر اتری تو وہ دونوں اپنی گنیں تانے کمرے سے نکل گئے اور جاتے ہوئے کم بخت حسب معمول باہر سے دروازے کو بولٹ کرگئے۔ میرے اندر... ساری رات ہلچل مچی رہی۔ پتا نہیں یہ لوگ کیسی مہم پر گئے تھے؟ اور کیا بدخصلت گگل خان واقعی اشرف اور بالے کو اس خطرناک مہم میں استعمال کرنا چاہتا تھا؟

وقت تیزی سے گزر رہا تھا، نیند میری آنکھوں سے دور تھی۔ کھڑکی کے راستے ہی میں سامنے آکر کبھی کبھی باہر کا جائزہ لے لیا کرتا تھا جہاں چند حواریوں کے گشت کرنے کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ باقی عمارت میں اندھیرا تھا۔ وسیع و عریض میدان تھا۔ احاطے میں روشنی نظر آتی تھی۔ میں

ایک بٹا دو

تین دیہاتی بس میں سوار ہوئے۔ بس میں رش کی وجہ سے ان میں سے ایک چھت پر چڑھ گیا۔ کنڈیکٹر نے باقی جو دو بس کے اندر تھے۔ پوچھا۔ "کتنی سواری؟"

ایک دیہاتی نے جواب دیا۔ "ایک بٹے دو۔"

کنڈیکٹر نے حیران ہوکر پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

دیہاتی پھر بولا۔ "ایک اوپر، اور دو نیچے۔"

(مرسلہ: مسعود افضل کراچی)

واپس بیڈ پر آکر لیٹ گیا۔ میں کچی پکی نیند کے زیرِ اثر رہا اور غالباً دو ڈھائی گھنٹے گزرے ہوں گے کہ شور سے میں جاگ پڑا۔ کھڑکی کے راستے کسی گاڑی کی تیز روشنی میرے کمرے کی اندرونی دیوار پر بڑا سا روشن ہالہ بنا کر غائب ہوگئی۔ میں بستر چھوڑ کر کھڑکی کے پاس پہنچا۔ دو گاڑیاں تھیں۔ ایک کار ایک جیپ۔ بغیر ہڈ والی جیپ کے اندر سے حواری اترے، ان میں اشرف بھی تھا، بالا نظر نہیں آرہا تھا۔ سب اسلحہ بردار تھے۔ جیپ میں دو حواری اور اشرف سوار تھے، وہ جیپ سے اترے اور کار کی طرف لپکے۔ کار کے اندر سے بھی دو حواری اترے۔ عقبی دروازہ کھلا... اور کسی شخص کو بازوؤں سے پکڑ کر باہر نکالا گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے اور وہ معمولی زخمی نظر آرہا تھا۔ ایک ہی خیال میرے تھکے ہوئے ذہن میں ابھرا تھا۔ یہ لوگ کہیں مار اماری کرکے کسی کو زبردستی اغوا کرلائے تھے۔ مگر بالے کو غائب پاکر مجھے تشویش سی ہونے لگی۔

میں نے اپنے کمرے کی لائٹ گل کررکھی تھی اور واپس بستر پر آکر بیٹھ گیا اور اشرف کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

کافی دیر بعد اشرف تھکا تھکا سا لوٹا۔ اس کے چہرے سے فتح اور خوشی کا جوش بھی تھا اور بجھی بجھی آنکھوں میں دکھ بھی۔

"بالا کدھر ہے؟" میں نے فوراً اس سے پوچھا۔ اندر آتے ہی میں نے کمرے کی لائٹ آن کردی تھی۔

"تم ابھی تک سوئے نہیں؟" وہ مجھ سے قدرے چونک کر بولا اور تھکے انداز میں اس نے گن دیوار سے لٹکادی۔

"میری بات کا جواب دو۔" میں نے سرد نظروں سے اسے گھورا۔

"جو ڈر گیا، وہ مر گیا۔" اشرف فلسفیانہ لہجے میں بہ

ظاہر بے پروائی سے بولا۔ مگر میں محسوس کرسکتا تھا، اس کا لہجہ کچھ ڈبڈبایا ہوا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"وہ کام آ گیا۔ مر گیا وہ۔" اشرف نے.... تنگ دلی سے کہا۔ مگر اس میں کاٹ دار غم بھی تھا اور حالات کی تلخی بھی۔ میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ کچھ بھی تھا، بالے کا ہمارا ساتھ بچپن کا تھا۔ سات آٹھ سال کی عمر میں جب پہلی بار میں یہاں لایا گیا تھا تو اس کے چند دنوں بعد بالترتیب بلال اور اشرف بھی لائے گئے تھے۔ پہلے روز گھبرا کر وہ دونوں روتے رہے تھے۔ میں نے ہی انہیں بہلانے اور باتیں کرنے کی کوشش کی تھی۔ پھر ہم گھل مل گئے تھے۔ بنیادی طور پر تو ہم تینوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ ہمارا بچپن ایک تلخ اور عبرت ناک سبق سے شروع ہوا تھا۔

"تمہیں افسوس نہیں ہوا اشرف؟ بالا ہمارا بچپن کا دوست تھا۔" میں نے اشرف کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یار تھا وہ ہمارا، بھلا دکھ کیسے نہیں ہوگا مگر شاید اس کے مقدر میں اس طرح کی موت لکھی تھی۔" وہ بولا۔

"تم تو مقدر کو مانتے ہی نہیں تھے، اب مقدر کا خیال کیسے آ رہا ہے تمہیں؟" میرے لہجے میں طنز تھا۔ "یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔"

"اچھا یار اب سو جاؤ، دماغ مت خراب کرو۔ جاؤ! اپنے بستر پر۔" اشرف بیزار کن برہمی سے بولا۔

"یہ تم کس کو اغوا کر لائے ہو؟"

"تمہیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے۔"

"یار! خفا کیوں ہوتے ہو؟ اب تو صرف ہم دونوں ہی پرانے دوست باقی بچے ہیں۔ بالا تو گیا بے چارہ۔"

میری بات پر اشرف غم سے پھٹ پڑا۔ اسے واقعی بالے کی موت کا دکھ تھا مگر اپنی فطرت سے بھی مجبور تھا۔ یہ جرائم پیشہ لوگ شاید اس کی مجبوری بن چکے تھے مگر شاید اس کے اندر تھوڑی بہت انسانیت باقی تھی۔ وہ بے اختیار میرے گلے لگ کر رو پڑا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میرے خیال میں اس طرح کے جذبات سے اشرف کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔ "یار! تو بار بار بالے کا ذکر کیوں کرتا ہے؟ سب کو مرنا ہے آخر ایک دن۔"

وہ شاید اس طرح کہہ کر خود کو ڈھارس پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے آہستگی کے ساتھ اسے خود سے علیحدہ کیا اور بولا۔ "ہاں، مرنا تو آخر سب کو ایک دن ہے ہی مگر اس طرح نہیں۔ دیدہ و دانستہ خود کو موت کے منہ میں پھینکنا، خودکشی کے ہی مترادف ہے۔"

"تو چپ نہیں رہ سکتا آج کی رات؟" وہ برہمی سے بولا۔

میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "اشرف! چھوڑ دے یہ سب کچھ۔ ایسے کاموں کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ میری مدد کر۔ میں اپنی ذاتی غرض و غایت کے لیے تم سے مدد نہیں مانگ رہا۔ یہاں موجود معصوم اور بے گناہ قیدیوں کی آزادی کے لیے تم سے مدد اور تعاون کا خواہاں ہوں۔"

"میں بہت دور نکل چکا ہوں، شہزی! میری واپسی ناممکن ہے۔ میں اپنی اس دنیا میں خوش ہوں۔" وہ بولا۔ "خبردار تم کوئی ایسی ویسی حرکت مت کرنا کہ مجھے اپنی گن تم پر بھی اٹھانی پڑ جائے۔ جاؤ اب سو جاؤ۔"

اگلے دن اشرف نے میرے لیے ایک نیا حکم نامہ تیار رکھا تھا۔ "استاد نے اس نئے قیدی کی نگرانی تمہارے حوالے کی ہے۔"

"اچھا۔" میں طنز آمیز حیرت سے بولا۔ "بھلا ایک قیدی دوسرے قیدی کی کیا نگرانی کرے گا۔"

"زیادہ ــ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں، جاؤ اپنا کام کرو۔" وہ جھلا کر بولا۔ میں تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

مجھے کیا کرنا تھا، یہ سب اشرف نے مجھے سمجھا دیا تھا۔ میں وہاں پہنچا جدھر مغوی کو رکھا گیا تھا۔ یہ ایک مختصر سا کمرا تھا۔ یہ اس پورشن کا حصہ تھا جہاں پہلے بوڑھوں کو رکھا جاتا تھا۔ انہیں نکالنے کے بعد یہ حواریوں کی رہائش کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ایسے ہی ایک کمرے میں مغوی کو قید رکھا گیا تھا۔ میں اس کمرے میں پہنچا۔ مغوی کے سوا کمرا ہر شے سے خالی تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت سے باندھے گئے تھے اور ایک کونے میں وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میں بہ غور اس کا جائزہ لینے لگا۔ اسے پکی عمر کا مرد تو نہیں کہا جا سکتا تھا، مجھ سے کچھ سال ہی بڑا تھا۔ جسم چھریرا تھا، مونچھیں باریک، ہلکے بال، رنگ سانولا قد درمیانہ تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ ایک عجیب بات جو اس کی شخصیت میں میں نے محسوس کی تھی، وہ نڈر اور دلیر معلوم ہوتا تھا۔ یہ میرا اس کے بارے میں ایک عام سا اندازہ تھا۔ وہ مغوی تھا اور یقیناً یہ کسی پرانی دشمنی کا شاخسانہ ہو سکتا تھا۔ کل رات اسے ایک خطرناک مقابلے میں اغوا کر کے ہی لایا گیا تھا مگر باوجود اس کے خوف کا ایک ذرا شائبہ تک اس کے چہرے پر نہ تھا۔

مجھے یوں اپنی جانب بہ دستور تکتا دیکھ کر وہ شاید میری ناتجربہ کاری کو بھانپ گیا۔

"تو ان کے قبیل کا تو نہیں لگتا۔ کیا نام ہے تیرا کاکے؟"

اس کی بات پر میں کچھ گڑبڑا گیا۔ وہ مجھے گھور رہا تھا۔

"شہزی۔"

"شہزی!" وہ مسکرایا۔ "یہ کیسا نام ہے بھلا۔ آدمی تو زبردست نظر آتا ہے پھر یہ شہزی، ویزی..." وہ ہنسا۔

"شہزاد احمد خان نام ہے میرا۔" میں نے اس بار جمے ہوئے لہجے میں اپنا پورا نام بتایا۔

"شاوا... یہ ہوئی نہ بات۔ شہزاد احمد خان، یعنی... شہزاد کیوں شہزادے۔ کب سے ہے ان لوگوں کے ساتھ؟"

"اب تم اپنے بارے میں بتاؤ، تم کون ہو؟ کیا نام ہے تمہارا؟ ان لوگوں کی تمہارے ساتھ کیا دشمنی ہے؟"

"او خیر..." وہ ہنس کر بولا۔ "میرا نام پوچھتا ہے، سن اول خیر نام ہے میرا۔ بجن تو میں ان کا نہیں ہوں نہ ہی یہ میرے۔"

بڑا عجیب سا نام تھا اس کا۔ میں نے پوچھا۔ "میرا آخری سوال تم گول کر گئے۔ وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں معاملہ دشمنی کا ہی ہے۔"

وہ ہنسا۔ "دشمنی والا معاملہ بہت لمبا ہے۔ تیری سمجھ میں آنے والا نہیں۔ تو بتا چودھری ممتاز جانتا ہے؟"

"نہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔

"سردار الف خان کو؟"

"نہیں۔"

"نئے پنڈ کا نام سنا ہے؟"

"نہیں۔"

"قسم مولا کی تو ان کا آدمی بھی نہیں ہے اور نہ ہی ان کا وفادار... تو تو مجھے خود ان کا قیدی نظر آتا ہے۔"

میرے بارے میں اس کا اندازہ سو فیصد درست تھا۔ وہ مجھے گھاگ آدمی لگا۔

"کیوں شہزادے؟ میں نے غلط تو نہیں کہا۔"

"تمہاری بات صحیح ہے۔" میں نے دھیرے سے کہا۔ وہ بولا۔ "یہ کون سی جگہ ہے؟ یہاں کیا ہوتا رہتا ہے؟"

مجھے حیرت تھی۔ اسے اپنی کوئی فکر نہ تھی، وہ یہاں کے بارے میں اس طرح سوال پوچھے جا رہا تھا جیسے یہاں تفتیش کے لیے آیا ہو۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں یہاں کے بارے میں بتا دیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"او خیر... چودھری ممتاز اب بے نیچ اور گھٹیا کام بھی کرنے لگا ہے۔ حیرت ہے۔ یہ بتا تو یہاں آیا ہے یا بھیجا گیا ہے، تجھے میرے پاس؟" اول خیر نامی شخص نے بھویں سکیڑ کر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"مجھے بھیجا گیا ہے۔ تم پر نظر رکھنے کے لیے۔" میں نے جواب دیا۔

"ادھر آ... یہاں بیٹھ میرے پاس۔"

"میں نہیں بیٹھ سکتا۔ مجھ پر بھی نظر رکھی گئی ہے۔" ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ میرے عقب میں دھڑ سے دروازہ کھلا۔ میں چونک کر پلٹا۔ وہاں اشرف کھڑا تھا۔ گن ہر وقت اس کے پاس یوں رہتی تھی جیسے بچے کے ساتھ اس کا کوئی پسندیدہ کھلونا ہو۔ اس نے ایک تیز سی نظر پہلے مجھ پر پھر اول خیر پر ڈالی۔ پھر درشتی سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ "تم کیا باتیں کر رہے تھے اس کے ساتھ؟"

"کچھ نہیں۔"

"کیا مطلب کچھ نہیں۔" وہ تحکم و درشتی سے بولا۔ "استاد نے تمہیں یہاں اس کی نگرانی کے لیے بھیجا ہے، اس کے ساتھ بات چیت کے لیے نہیں.. سمجھے تم؟" مجھے اشرف کا یکدم یوں مجھ پر حاکمانہ انداز میں برہم ہونا انتہائی ناگوار گزرا۔

"کچا ہے تو ابھی کرائے کے ٹٹو۔ تیری بات میں، تیرے لہجے میں ابھی وہ مردوں والی گونج نہیں آئی۔" اول خیر تضحیک آمیز لہجے میں اشرف کی طرف گھور کر بولا۔ "کیا تمہارا وہ زر خرید استاد گگل خان، گگل خان اتنا ہی کم عقل ہے کہ اس نے ایک قیدی کی نگرانی کے لیے دوسرے قیدی کو یہاں بھیج دیا۔"

اس کی بات سن کر اشرف کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور ہم دونوں کمرے سے باہر آ گئے، اندر سے اول خیر کا قہقہہ سنائی دیا۔ اشرف نے دروازہ بند کر دیا۔ پھر یکلخت اس کا رویہ بدل گیا۔ وہ معذرت خواہانہ لہجے میں مجھ سے بولا۔ "معاف کرنا یار، یہ میری مجبوری تھی۔"

"کیا مطلب کیسی مجبوری؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ دوستانہ انداز میں میرے کاندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

وہ مجھے لے کر گگل خان کے پاس پہنچا۔ خلافِ توقع

گگل خان اپنے کمرے میں اکیلا تھا اور اس کے چہرے پر برہمی کے آثار بھی نہیں تھے۔ اشرف نے آگے بڑھ کر فوراً اس کے کان میں کچھ کہا جس پر گگل خان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اپنے بیڈ پر بیٹھا تھا۔ مجھے اس نے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"دیکھو شہزی! تم ہماری وفاداری کا دم بھرتے ہونا۔ اس لیے تم پر ہمیں بھروسا کرنا ہی پڑے گا۔ میں نے جان بوجھ کر تمہیں اس قیدی کی نگرانی کے لیے بھیجا تھا۔" وہ لمحہ بھر کو رکا۔ اس کا لہجہ مجھے پُراسرار سا محسوس ہوا

وہ بستر سے اٹھا اور چند قدم چلتا ہوا میرے قریب آیا۔ اس نے ڈھیلا ڈھالا عام سا شلوار کرتہ پہن رکھا تھا۔ شاید وہ سونے کی تیاری میں تھا۔ میرے کاندھے پر اپنا بھاری بھرکم ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"دیکھو کاکا! اشرف تمہاری بہت سفارش کرتا ہے کہ تم کبھی نہ کبھی ہمارے کام آسکتا ہے۔ شاید اس کا وقت آن پہنچا ہے۔ مجھے اندازہ ہے اس بات کا کہ تم اب بھی خود کو ہمارا قیدی سمجھتے ہو۔ حالانکہ تجھ سے ہم نے بیگار لینی بھی چھوڑ دی ہے مگر اب اس کے صلے میں تم نے ہمارا ایک اہم کام کرنا ہے۔ میں جانتا ہوں تم نے اس قیدی کے ساتھ کیا باتیں کی ہوں گی۔ ضرور اپنا بھی دکھڑا اسے سنایا ہوگا کہ خود تیری اپنی بھی حیثیت یہاں ایک قیدی کی سی ہے اور یہی میں چاہتا بھی تھا۔" مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ بہت مکار اور چالاک ثابت ہوا تھا۔ جس بات پر میں حیرانگی محسوس کر رہا تھا، وہ اس کا پہلے سے علم رکھتا تھا۔ آگے بولا۔

"تم نے ابھی ہمارا بس اتنا ہی کام کرنا ہے کہ اس قیدی کے ساتھ اسی طرح ہی خفیہ قسم کے ہمدردانہ تعلقات قائم رکھو۔ اس طرح کہ بہت جلد وہ تمہیں اپنا رازداں سمجھنے لگے۔ یہاں تک کہ بہت جلد تمہاری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دے اور وہ تمہارے ساتھ یہاں سے فرار ہونے کی مشترکہ منصوبہ بندی کرنے پر بھی آمادہ ہوجائے۔" وہ رکا۔ میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ کچھ بات سمجھ میں بھی آرہی تھی۔ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ابھی فی الحال تم اتنا کرو باقی ہدایت تمہیں ملتی رہے گی۔ لیکن خبردار کسی چالاکی کو دل میں مت لانا، میرے پاس کام نکلوانے کے اور بھی طریقے ہیں۔ نہ ہی مجھ سے جھوٹی باتوں کا تبادلہ کرنا۔ جو باتیں اس کے ساتھ تم طے کرو گے اس سے مجھے آگاہ کرتے رہو گے... سمجھے تم؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر اس نے مجھے رخصت کر دیا۔ اشرف کو گگل خان نے اپنے پاس روک لیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آگیا۔

یہ سب کچھ اتنا سیدھا اور آسان نہ تھا، جو گگل خان نے مجھ سے کہا تھا۔ درون خانہ کھچڑی اور ہی پک رہی تھی، گگل خان اتنا سیدھا آدمی نہیں تھا کہ وہ مجھ پر اتنا بھروسا کرنے لگتا مگر یہ سچ نظر آتا تھا کہ وہ موقع محل کے مطابق مجھے استعمال کرنے کی ضرور کوشش کر رہا تھا۔ قیدی اول خیر سے مجھے قریب ہونے کا موقع دینا اگرچہ اس کے کسی خفیہ مفادات کا حصہ ہی تھا مگر مجھے یقین تھا کہ ہماری گفتگو کی بھی نگرانی کی جاتی ہوگی۔ مگر میں سمجھتا تھا کہ میرے لیے کچھ کرنے کا اتنا ہی موقع کافی تھا۔ میری اپنی مرضی بھی یہی تھی، اول خیر کی مدد سے یہاں سے صرف ایک بار فرار ہوجاؤں۔ اندر سے باہر کی دنیا کا باسی بن جاؤں اور کسی طرح سرمد بابا سے جاملوں۔ اس کے بعد ان سب کا شیرازہ بکھر جائے گا اور عابدہ کا بھی ان کی گرفتاری کے بعد سراغ لگانا مشکل نہ ہوگا۔ مگر یہ سب کرنے کے لیے مجھے ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔

یہ اس روز رات کا ذکر تھا۔ اشرف کافی دیر بعد کمرے میں داخل ہوا تھا۔ میں دانستہ سوتا بن گیا۔ پہلو کے بل لیٹے ہونے کے باعث میں میچی میچی آنکھوں سے اس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لے سکتا تھا۔ گن اس نے دیوار سے لٹکا دی۔ چند ثانیے کہ بعد میری طرف تکتا رہا۔ میں ہلے بغیر لیٹا رہا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرے گہری نیند میں سوئے رہنے کا یقین کرلینا چاہتا ہو کیونکہ اس نے مجھے ہولے سے دو تین بار پکارا بھی تھا مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ اس کے مجھے ہولے ہولے انداز سے پکارنے کا مطلب ہی میں سمجھ گیا تھا۔

جب اسے تسلی ہوگئی تو وہ اپنی جیبیں خالی کرنے لگا۔ جن میں رومال، کچھ روپے اور چابیاں بھی تھیں تکیے کے نیچے اپنی قمیص کی دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا تو میں نے ادھ کھلی آنکھ سے دیکھا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں ایک سیل فون نظر آیا جسے دیکھتے ہی میرے اندر سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اسے بھی اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر وہ لیٹ گیا۔ میرے اندر سائیں سائیں ہونے لگی۔ اور سیٹھ منظور وڑائچ المعروف سرمد بابا کا سیل نمبر میرے دماغ میں گردش کرنے لگا جو مجھے ابھی تک ازبر تھا۔ ایک خطرناک سنسناتا ہوا خیال میرے تھکے ہوئے ذہن میں ابھرا تھا۔ یہ سیل فون ہم سب کی آزادی کا بگل بجا سکتا تھا مگر کیسے؟ کیا یہ اتنا ہی آسان کام تھا؟ میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ مشکل کام کیے بغیر یہاں سے آزاد ہونا بھی ممکن نہ تھا اور مجھے یہ مشکل اور خطرناک کام آج رات ہی کو کرنا تھا۔

کمرے میں میرے ساتھ صرف اشرف تھا جو اب سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے سیل فون کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس قید خانے کی چابی تھی۔ یہی سبب تھا میری رگوں میں یکلخت خون کی گردش تیز تر ہونے لگی تھی۔

ہر سو خاموشی طاری تھی۔ ایسی خاموشی جیسے اچانک کوئی بڑا طوفان اٹھنے والا ہو۔ میرے اندر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ یہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کا دورانیہ میرے لیے گویا صدیوں کے برابر محسوس ہوا تھا۔ میں نے پوری آنکھیں کھول دیں۔ اور لیٹے لیٹے کروٹ کے بل ساتھ والے بستر پر اشرف کو پشت کے بل سوتے دیکھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر تھے۔ وہ خراٹے لینے کا عادی تو نہ تھا مگر اس کے سینے کا زیرو بم بتاتا تھا کہ وہ گہری نیند میں ہے۔

تب میں آہستگی کے ساتھ اٹھا۔ میں ایک خطرناک قدم اٹھانے چلا تھا۔ اس سے پہلے اللہ کا نام لینا نہیں بھولا تھا۔

جب میں آہستگی کے ساتھ اپنی چارپائی سے اٹھا تو وہ ہولے سے چرچرائی تھی۔ کمرے میں پاور والا بلب روشن تھا۔ کھڑکی بند تھی سردی کا احساس بھی کچھ کم تھا۔

میں آہستگی سے آگے بڑھا اور قدرے جھک کر ایک ہاتھ اشرف کے تکیے کے نیچے کھسکا دیا۔ اچانک اس کے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی، میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ وہ جاگا نہیں تھا۔ میری طرف اس نے کروٹ لی تھی۔ میں نے فوراً ہاتھ تکیے کے نیچے سے کھینچ لیا۔ پھر اس کے سر کے پچھلے حصے کی طرف سے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا تو میری مرتعش انگلیوں سے سیل فون ٹکرا گیا۔ میری آنکھوں میں مخصوص چمک ابھری۔ نہایت آہستگی کے ساتھ میں نے سیل فون نکال لیا۔

مجھے اعتراف تھا کہ سیل فون جیسی شے کو آج میں پہلی بار چھو رہا تھا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ مجھے اس کے بارے میں بالکل ہی پتا نہ تھا۔ یہ میں نے آپاجی کے علاوہ اس وقت کے عملے کے چند افراد کے پاس بھی دیکھا تھا اور اس کے استعمال کا بھی مجھے علم تھا۔ میں سیل فون قبضے میں کر کے سیدھا باتھ روم میں گھس گیا۔ میں نے پہلے تو بہ مشکل اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ پر قابو پایا پھر اس کے بعد دھڑکتے دل کے ساتھ سرمد بابا کے سیل فون کا نمبر پنچ کرنے لگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس وقت سرمد بابا بھی گہری نیند میں تھے یا اپنے موبائل فون کی بیل پر وہ اسے رات کے اس درمیانی پہر اٹینڈ بھی کریں گے یا نہیں۔ اگر میں موقع نہیں گنوا سکتا تھا۔ نمبر پنچ کرنے کے بعد میں نے فون کان سے لگالیا مگر دوسرے ہی لمحے میرا دل مایوسی سے بھر گیا۔ مجھ پر شدید جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی۔ کیونکہ دوسری طرف سے پاور آف ہونے کی اطلاع مل رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آیا اب کیا کروں؟ یہ فیصلہ کن گھڑی تھی موقع سے فائدہ اٹھانے کا وقت تھا۔ اب نہیں تو کبھی نہیں کے مصداق۔ دفعتاً میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ میں جتنی جلدی لکھ سکتا تھا، سرمد بابا کے سیل فون نمبر پر ایک ایس ایم ایس لکھ کر سینڈ کردیا۔ زیادہ تفصیل تو نہیں لکھ سکتا تھا تاہم دریا کو کوزے میں سموتے ہوئے مختصراً اصراحت کے ساتھ یکے بعد دیگرے دو تین ایس ایم ایس لکھ کر سینڈ کر دیے۔ اس کے بعد میں نے سب کچھ مٹا دیا۔ کیونکہ یہ سیل فون میرا نہیں تھا، اشرف کا تھا اور یقیناً یہ گگل خان کا ہی ہوگا۔ وہ اب شاید اشرف پر مکمل بھروسا کرنے لگا تھا۔ اشرف کا سیل فون ہاتھ میں پکڑے میں سوچتا رہا۔ فوری طور پر مدد کے لیے اور کسے فون کرنا چاہیے تھا؟ سرمد بابا کے سوا کسی کا نمبر مجھے نہیں معلوم تھا۔ میری معلومات بھی محدود تھی کہ کسی ایمرجنسی کال نمبر پر مدد لے سکتا تاہم مجھے امید تھی، سرمد بابا جب بھی یہ ایس ایم ایس پڑھیں گے فوراً حرکت میں آجائیں گے میں نے احتیاطاً آخر میں انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہ سیل چوری چھپے حاصل کر کے استعمال کر رہا ہوں لہٰذا دوبارہ مجھ سے اس نمبر پر رابطہ ناممکن ہی نہیں خطرناک بھی ہوگا اس لیے آپ جو کارروائی کرسکتے ہیں کرلیں۔

دل کو کچھ تسلی ہوئی اب میں یہ سیل فون اسی طرح خاموشی کے ساتھ دوبارہ اشرف کے تکیے کے نیچے رکھ دینا چاہتا تھا تاکہ میری یہ "مہم جوئی" مکمل طور پر خفیہ رہ سکے، چنانچہ یہ سوچ کر میں نے آہستہ سے باتھ روم کا دروازہ کھولا تو بری طرح ٹھٹک گیا۔ سامنے اشرف کھڑا میری طرف زہرناک نظروں سے گھور رہا تھا۔

☆☆☆

وہ شاید رات کے کسی پہر جاگ چکا تھا۔ ممکن ہے اسے بھی کوئی فطری حاجت محسوس ہوئی ہو اور وہ دروازے کے

باہر میرے نکلنے کا منتظر تھا، مگر میرے ہاتھ میں اپنا سیل فون دیکھ کر اسے صورتِ حال کا ادراک کرنے میں مطلق دیر نہ لگی تھی۔

"میرے سیل پر کس سے بات کر رہے تھے تم؟" وہ خطرناک لہجے میں بولا اور ساتھ ہی جھپٹ کر اپنا سیل فون میرے ہاتھ سے لے کر اس کا ڈیٹا چیک کرنے لگا۔ میرا بھانڈا پھوٹ گیا تھا مگر میں نے دروغ گوئی سے کام لیا اور ہنس کر بولا۔

"معاف کرنا یار! بس ایسے ہی ذرا کسی لڑکی سے باتیں کر رہا تھا۔"

میرا جھوٹ پکڑا جا چکا تھا، اس نے نفرت سے ہونٹ بھینچ کر میرے چہرے پر تھپڑ رسید کر دیا اور غصے سے بولا۔ "اب میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا، کوئی لحاظ نہیں کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اس کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ میں جو پہلے ہی اس کے تھپڑ مارنے پر بپھر چکا تھا کسی چیتے کی طرح غراتا ہوا اس پر جھپٹا اور ایک زبردست ٹھوکر اسے رسید کر ڈالی۔ وہ اس کے لیے تیار نہ تھا کہ میں اس پر یوں ٹوٹ پڑنے کی جرأت و ہمت بھی کر سکتا ہوں۔ نتیجتاً وہ سنبھل نہ سکا اور دیوار سے جا ٹکرایا۔ سیل فون ہاتھ سے چھوٹ کر پختہ فرش پر گرا اور کھل گیا۔ وہ دیوار سے ٹکرا کے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ میری طرف پلٹا اور مجھے ٹانگ رسید کرنا چاہی میں نے پھرتی کے ساتھ اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ اپنے دفاع میں بے شک یہ میری لاشعوری حرکت تھی، جو موثر ثابت ہوئی تھی۔ اس کی پکڑ کر میں نے مروڑ ڈالی۔ مگر اس نے بھی سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی اور ہم دونوں ایک بار پھر دست و گریباں ہو گئے۔

کامیابی کی خاطر میرا اشرف پر قابو پانا لازمی تھا۔ ورنہ وہ گگل خان کے سامنے میرا راز فاش کر سکتا تھا۔ بڑی ہی اذیت ناک گھڑیاں اور قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کے بعد مجھے ایک خاطر خواہ کامیابی ملی تھی۔ میں جان لڑا کر بھی اپنی اس "متوقع" کامیابی کو ضائع نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ اشرف میرا ہم عمر اور ڈیل ڈول میں میرا ہم پلہ ہی تھا۔ مگر اس وقت میرے دل و دماغ میں ایک نیک جذبے کا جوش جنون بن کر سمایا ہوا تھا۔ میں اسے پوری قوت سے دھکیلتا ہوا بیڈ پر جا گرا۔ وہ اب میرے نیچے تھا، اس نے میرے پیٹ پر گھونسا رسید کر دیا۔ درد کی لہر نے مجھے چند ثانیوں کے لیے ڈھیلا کر دیا۔ اس بدبخت کے لیے اتنا ہی موقع کافی تھا۔ وہ مجھے خود پر سے دھکیل کر یکدم دیوار سے لگی گن کی طرف لپکا۔ گن اس کے قبضے میں آ جاتی تو میں بے بس ہو سکتا تھا۔ اپنی تکلیف بھلا کر میں بھی اس کی جانب لپکا۔ تب تک اس نے گن اچک لی۔ ابھی اس کا رخ میری جانب کرنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے بے اختیار ٹانگ چلا دی، جو گن کی نال پر پڑی۔ اس کے ہاتھ کا رخ بدل گیا۔ میری دوسری ٹانگ اس کے پیٹ پر پڑی جو زوردار ثابت ہوئی، جس نے اسے دھکیل کر دیوار سے ٹکرا دیا اور ---- گن بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اسے اور تو کچھ نہ سوجھا اس نے سنبھلتے ہی دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ ٹانگ آگے کر کے اڑنگا ڈال دیا۔ وہ منہ کے بل فرش پر گرا۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ میں نے پھرتی سے گن اٹھا کر اسے نال سے پکڑا اور لٹو کی طرح گھما دی۔

گن کا ٹھوس کندا زمین بوس اشرف کے سر کے عقبی حصے پر پڑا اور آواز نکالے بغیر وہ ڈھیر ہو گیا۔ پتا نہیں وہ زندہ تھا یا مر گیا تھا۔ مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔، میرے نزدیک وہ بھی ظالموں کے ٹولے میں شامل تھا اور کسی رعایت کا مستحق نہ تھا۔ میں نے جلدی سے اس کے بے سدھ وجود کو ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور بیڈ کے نیچے سرکا دیا۔ پھر اس کے تکیے کے نیچے سے چابیوں کا گچھا اٹھایا۔ زمین پر پڑا اس کا سیل فون بھی اچک لیا۔ وہ ایک سستا والا سیٹ تھا جو گرنے سے کھل گیا تھا اور اس کی بیٹری باہر نکل آئی تھی۔ میں نے اسے اصلی حالت میں لا کر آن کر دیا اور گن اٹھا لی۔

انسان کو اپنی صلاحیتوں کا اندازہ عملی میدان میں آنے کے بعد ہی ہوتا ہے جبکہ میدانِ عمل چھپی ہوئی صلاحیتوں کو از خود ہی جلا بخشتے ہیں۔ اس وقت میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میرے روئیں روئیں میں بجلی بھر گئی تھی، میں شاید درست وقت پر درست فیصلہ کر رہا تھا۔ میں اب گن سمیت، اول خیر کے کمرے میں جانا چاہتا تھا۔ اسے میری مدد کی اور مجھے اس کی مدد کی ضرورت تھی۔ میں نے وقت دیکھا، رات کا آخری پہر تھا۔ میں نے ذرا سا دروازہ کھول کر جھری بنائی اور باہر جھانکا۔ سرد ہوا کا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔ جدھر اول خیر کو رکھا گیا تھا وہ مقام یہاں سے سامنے کی طرف چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا۔ کسی حواری کی ناموجودگی کے آثار دیکھ کر میں گن سنبھالے باہر آ گیا اور تیزی کے ساتھ چھپتا چھپاتا ہوا اول خیر والے قید خانے کی عقبی دیوار سے جا چپکا۔ چند ثانیے گن لینے کے بعد میں دھیرے دھیرے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہوا داخلی دروازے کی طرف سرکنے لگا۔ دوسری جانب دیکھنے پر مجھے مین گیٹ کے قریب چند مسلح حواری نظر آئے۔

اس طرف جانے کی مجھے بھی سختی سے ممانعت تھی۔ کمرے کے دروازے پر آ کر میں نے چابی لگائی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ مدھم روشنی میں مجھے فرش کے وسط میں اول... مڑا تڑا پڑا نظر آیا۔ شاید وہ گگل خان وغیرہ کا کوئی خطرناک دشمن تھا اسی لیے اس کے ہاتھ پاؤں سخت قسم کے جکڑ بندوں میں بندھے ہوئے تھے۔ وہ بے چارہ اس حالت میں ہی شاید سو یا پڑا تھا۔

ذرا سی آہٹ پر وہ بیدار ہو گیا۔ پھر مجھے پہچان کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ "کاکے تو؟ خیریت ہے... اس وقت اور یہ گن؟"

"اول خیر! تیاری پکڑ میں تیرے ہاتھ پاؤں کھول رہا ہوں پر مجھے دھوکا مت دینا۔ یہ صرف میرا نہیں ان کئی مظلوم اور معصوم قیدیوں کی آزادی کا سوال ہے۔ بول کیا کہتا ہے؟" میرے لب و لہجے میں عجب قسم کا جوش سرایت کر آیا تھا۔

"او خیر کاکے! میرا اندازہ غلط نہ تھا۔ تو واقعی بہادر نوجوان ہے۔" وہ توصیفی لہجے میں بولا۔ "ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔ مجھ پر بھروسا کر اول خیر کو احسان باش پائے گا احسان فراموش نہیں۔"

میں نے گن زمین پر رکھی اور جلدی جلدی اس کے جکڑ بند کھولنے لگا۔ آزاد ہوتے ہی اس نے ایک انگڑائی لی اور سب سے پہلے گن پر قبضہ جما لیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا وہ اس کے چہرے پر گہری مسکراہٹ تھی۔ بولا۔ "کاکا! تو ادھر ہی ٹھہر... میں چار کو لٹا کر آتا ہوں۔"

"ٹھہرو۔" میں نے کہا۔ "ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ ورنہ میری ساری محنت اکارت جائے گی۔ ابھی وقت ہماری مٹھی میں ہے۔ دو چار کو مارنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ یہ لوگ بہت خطرناک اور منظم حالت میں ہیں۔"

"کیا چاہتا ہے تو بول؟" اول خیر بولا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ میں اس سلسلے میں سرمد بابا کو فون کر چکا ہوں یعنی ان کے ذریعے انہیں یہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کر چکا ہوں۔

وہ سن کر بولا۔ "کاکے! تیرے سے زیادہ میں ان لوگوں کو جانتا ہوں۔ یہ خطرناک ہی نہیں بااثر بھی ہیں۔ قانون کو خریدنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پولیس کا یہاں چھاپا پڑنے سے پہلے ہی کوئی کالی بھیڑ انہیں پہلے سے خبردار کر دے گی۔" وہ رکا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "سیل فون تیرے پاس ہے اس وقت؟"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

"ادھر لا۔ ابھی لوہے کو لوہے سے کاٹتے ہیں۔" اس نے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے فوراً اپنی جیب سے سیل فون نکال کر اسے تھما دیا۔

سیل فون لے کر اس نے فوراً ایک نمبر ملایا۔ رابطہ ہوتے ہی دبے دبے جوش سے وہ دوسری طرف کسی سے باتیں کرتا رہا۔ پھر درمیان میں مجھ سے مخاطب ہو کر اس علاقے کا محلِ وقوع پوچھا جو میں نے اسے بتا دیا۔ اس کے بعد مزید تھوڑی دیر تک گفتگو کرنے کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

"تم اپنے کسی ساتھی سے باتیں کر رہے تھے؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں۔" وہ بولا۔ "وہ کسی بھی وقت آندھی طوفان کی طرح یہاں پہنچنے والے ہیں۔"

مجھے تھوڑی تشویش سی ہوئی۔ میں نے کہا۔ "اس طرح جنگ کی صورت سے معصوم قیدی زد میں آ سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گا، اول خیر۔"

"او خیر... کاکا۔" وہ مسکرا کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ "تو فکر نہ کر... میں نے اپنے ساتھیوں کو سب سمجھا دیا ہے۔ تو کیا سمجھتا ہے، وہ آتے ہی ہلا بول دیں گے... ہرگز نہیں۔ آؤ ہم تب تک اپنی کارروائی کرتے ہیں۔" اس نے مجھے بھی شامل کر لیا۔ گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ میرا خیال تھا وہ ابھی جا کر گگل خان سے بھڑ جائے گا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ باہر آتے ہی اس نے سب سے پہلے مجھ سے قیدیوں کے کمروں کا پوچھا۔ میں نے اسے بتا دیا۔

"ان سب کو پہلے ایک جگہ اکٹھا کرنا ہوگا... آؤ۔" وہ بولا۔

ہر طرف صبح کاذب کی ملگجی سی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ مسلح حواری... ہر طرف پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔ ہم دونوں اس وقت دیوار کے عقبی حصے کے ساتھ چپکے کھڑے تھے، ہمارے سامنے احاطے کی بلند و بالا دیوار تھی۔ یہی راستہ... گلی کی صورت میں تینوں ہال کمروں کی عقبی دیوار تک لے جاتا تھا۔

دفعتاً ہمیں شور کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں بری طرح ٹھٹک گئے۔ "کاکا... کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے شاید۔" اول خیر نے ہولے سے سرگوشی کی۔ میں بولا۔ "کیا تمہارے ساتھیوں نے ہلا تو نہیں بول دیا؟"

"نہیں، انہیں پہنچنے میں ابھی تھوڑا وقت لگے گا۔" وہ رکا۔ پھر بولا۔ "تم ایک کام کرو... جتنی جلدی ہو سکے،

بڑے قیدیوں کو جا کر ہوشیار اور محتاط کر دو اور خبردار بھی کہ کوئی بھی اپنے ٹھکانے سے باہر نہ نکلے۔ یہ خوش خبری بھی انہیں جا کر دے دو۔ ان کی آزادی کچھ لمحوں کے فاصلے پر ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور چھپتا چھپاتا، دیوار کی آڑ لیتا ہوا، سب سے پہلے لڑکیوں کے ہال کمرے کی کھڑکی کی جانب پیش قدمی کی۔ ایک مقام پر میں نے دیوار کی آڑ سے مرکزی احاطے کی طرف دیکھا۔ یہاں مختصر سی عمارت میں میرا اور اشرف کا کمرا تھا اور کچھ حواری وہاں جمع تھے۔ غلغلہ وہیں مچا ہوا تھا۔ میرا دل یہ سوچ کر تیزی سے دھڑکنے لگا کہ انہوں نے اشرف کو یقیناً بے ہوش یا مردہ حالت میں دیکھ لیا تھا، اور اب یقیناً میری تلاش کا ارادہ رکھتے ہوں گے۔ اب ان کے ہتھے چڑھنا میرے لیے خطرے سے خالی نہ تھا۔ میں نے اول خیر کی ہدایت پر تیزی سے عمل کیا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں ذرا دیر بعد غضب کا رن پڑنے والا تھا۔ سرمد بابا بھی یقیناً میرا ایس ایم ایس پڑھنے کے بعد اپنی کسی کوشش میں مصروف ہو گئے ہوں گے جبکہ اول خیر کے ساتھی بھی یہاں بہ قول اس کے ایک بڑے جتھے کی صورت میں پہنچنے والے تھے۔ اول خیر اور اس کے ساتھی بھی مجھے گگل خان اور اس کے حواریوں کے قبیل کے ہی لگتے تھے۔ گویا یہ جنگی گروپ یعنی کوئی پرانی گینگ وار تھی جو بہت پہلے اول خیر اور گگل خان کے مابین چھڑی ہوئی تھی۔

لڑکیوں کے ونگ میں پہنچ کر میں نے سب کو خبردار کر دیا۔ وہ سب خوش بھی تھیں اور سراسیمہ بھی کہ نہ جانے اب کیا ہونے والا تھا۔ وہاں سے میں سیدھا لڑکوں کے ونگ میں پہنچا تو ٹھٹک کر وہیں دبک گیا۔ کیونکہ دو تین مسلح حواری پہلے سے اندر موجود تھے اور ان سے درشت لہجے میں میرے بارے میں ہی پوچھ رہے تھے۔ میں ان کے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ ہال سے نکل گئے تو، میں اندر کود پڑا۔ شوکت حسین اور اس کے ساتھی مجھے دیکھ کر حیران ہوئے، میں نے یہاں بھی وہی کچھ دہرا دیا، ان کے سب کے چہرے آزادی کے جوش سے سرخ ہو گئے۔ شوکی کچھ پشیمان نظر آتا تھا، آج شاید اس کی میرے بارے میں غلط فہمی دور ہو گئی تھی۔ میں نے شوکی سے کہا۔ ''شوکی تم ایک کام نمٹاؤ ذرا جلدی۔'' وہ پورے جوش کے ساتھ تن گیا۔ میں بولا۔

''تم اپنے ساتھ چند لڑکوں کو لے کر کسی طرح بچوں اور بچیوں کے پاس پہنچو۔ انہیں سنبھالنا ضروری ہے۔ کہیں بدحواسی میں وہ باہر کی طرف نہ دوڑ پڑیں۔'' وہ میری بات سمجھ گیا۔ وقت کم تھا، میں زیادہ بات نہ کر سکا اور پلٹ گیا۔

میرا رخ اول خیر کی طرف تھا لیکن اس نے مجھے کھلے میدان میں آنے سے منع کر رکھا تھا۔ ٹھیک اس وقت برسٹ چلنے کی آواز ابھری۔ یکدم لڑکیوں کے ونگ کی طرف شور مچ گیا۔ کچھ دوڑتے قدموں اور زور زور سے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ برسٹ چلنے کی آواز مجھے اس سمت سے سنائی دی تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے میں ... خیر کو چھوڑ کر آیا تھا۔ اب پتا نہیں اس پر کسی مسلح شخص نے فائر کیا تھا... یا پھر یہ کارروائی اول خیر کی تھی۔ ابھی میں ٹھیک سے کچھ اندازہ نہیں قائم کر سکا تھا کہ دفعتاً مذکورہ سمت سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ میں نے ایک جگہ سے ابھر کر اس طرف دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ اول خیر جس مختصر عمارت کے کمرے میں مقید تھا، اب اس کی چھت پر نظر آ رہا تھا جبکہ آٹھ دس مسلح افراد اس عمارت کو گھیرے ہوئے تھے۔ وہ دو تین افراد کو لٹا بھی لٹا چکا تھا، جو مجھے زمیں بوس نظر آ رہے تھے۔ مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے تھی، ایک جنگ کی ابتدا اب ہو چکی تھی۔ پتا نہیں اول خیر سے کیا غلطی ہو گئی تھی کہ وہ وقت سے پہلے ہی ان کی نظروں میں آ چکا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا اس کے گرد مسلح اور خونی حواریوں کا مجمع بڑھتا جا رہا تھا۔ اگر یہی صورت حال رہتی تو بہت جلد گگل خان کے بھیڑیا صفت حواری اسے گولیوں سے بھون کر رکھ دیتے۔ ابھی تو وہ چھت پر تھا تو کسی حد تک محفوظ تھا۔

اچانک میں نے اپنے سیدھے ہاتھ کی دو دیواروں کے درمیانی راستے پر کسی کے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ آگے بڑھا تو کوئی مجھ سے ٹکرا گیا۔ ہم دونوں گر پڑے۔ وہ کوئی مسلح شخص تھا، اور اس کے عقب میں دو اور بھی مسلح افراد تھے۔ یہ تینوں شاید اس راستے سے دوڑ کر عمارت کی چھت پر چڑھنا چاہتے تھے، تاکہ دوسری چھت سے اول خیر کو بہ آسانی گولیوں کی زد میں لیا جا سکے۔ مگر بدقسمتی سے میں ان کے نرغے میں آ گیا۔ لیکن گرتے ہی میں نے نہ صرف اپنے حواسوں کو قابو میں رکھا تھا بلکہ زمین پر پڑی گن کی طرف جھپٹا بھی تھا، جو مجھ سے ٹکرانے والے شخص کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی جب تک اس کے باقی دو ساتھی صورت حال کو سمجھتے میں نے گن سنبھالتے ہی ان کی طرف رخ کر دیا۔ ٹریگر دبانے سے پہلے میں یہ اطمینان کر چکا تھا کہ وہ برسٹ پر سیٹ تھی، زندگی میں پہلی بار میں نے گن کا پہلا برسٹ ان دو لوگوں پر برسایا تھا۔ میری گن وحشی درندے کی طرح آتشیں انداز میں دہاڑی تھی، اور گولیوں کی پوری باڑھ نے دونوں کی ٹانگیں چھلنی کر کے رکھ دیں۔ وہ چیخیں مار کر

گرے۔ میں نے لیٹے لیٹے تیسرے زمین بوس شخص کی طرف بہ سرعت کروٹ بدلی تو وہ تب تک کھڑا ہو چکا تھا، اور مجھ پر پل پڑنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ دوسری بار ٹریگر پر میری انگلی نے جنبش کی اور ایک آتشیں قہقہہ میری گن نے اگلا۔ وہ چھلنی ہو کر مجھ سے محض چند انچ کے فاصلے پر دھپ سے گرا۔ اشرف سے میں نے جس طرح اس گن کو چلانے اور اس کا میکنزم سمجھا تھا، اب میرے کام آ رہا تھا۔

میں گن سنبھالے تیزی سے اس عمارت کی جنوبی دیوار کی سمت لپکا جس کی چھت پر اول خیر پٹاخے چھوڑ رہا تھا۔ مطلب یہ کہ وہ اب صرف اپنے دفاع کی پوزیشن میں تھا، حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ نیچے عمارت کے گرد کئی مسلح افراد اکٹھے ہو چکے تھے۔ میں جس دیوار کے ساتھ چپکا کھڑا تھا، یہ لڑکیوں کے ہال کمرے کی دیوار تھی، جنگ شاید قبل از وقت شروع ہو چکی تھی، میرا اس وقت رواں رواں فرطِ جوش سے سنسنا رہا تھا۔ رگوں میں دوڑتا لہو... کسی لاوے کی طرح اچھل رہا تھا۔ کچھ سوچ کر میں نے ان تینوں حواریوں کی پیش قدمی پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور ہال کمرے کی چھت پر چڑھنے سے پہلے میں نے فاضل میگزین بھی حواریوں کے بے سدھ وجود سے حاصل کر لیے تھے۔

چھت پر آتے ہی میں نے پوزیشن بنائی۔ چھت کے گرد تین فٹ کی چار دیواری تھی۔ بالکل سامنے مجھے مختصر سی عمارت کے کمرے کی چھت نظر آ رہی تھی، جہاں اول خیر اپنی بقا کی جنگ میں مصروف تھا۔ اچانک میں نے دیکھا۔ چند افراد سیڑھی کے ذریعے چھت کی جانب بڑھ رہے تھے، جس سے میں چھت پر پہنچا تھا۔ جبکہ اول خیر بے خبر تھا کہ اس کے عقب میں موت رینگتی ہوئی اس تک پہنچنے والی تھی۔

میں نے وہیں سے ان کا نشانہ لیا۔ اور ٹریگر دبا دیا۔ گولیوں کی مہیب تڑتڑاہٹ ابھری۔ پتا نہیں میرا نشانہ ٹھیک بھی لگا تھا یا نہیں، البتہ دیوار سے ٹکی کھڑی لکڑی کی سیڑھی ضرور ہل گئی تھی۔ ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ سیڑھی پر موجود افراد کا توازن بگڑ گیا اور پھر وہ سیڑھی سمیت نیچے آ رہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اول خیر کو اندازہ ہو گیا کہ ساتھ والی چھت پر اس کا ہمدرد یعنی میں موجود تھا۔ مگر اس فائر کے ساتھ ہی مجھ پر بھی دھنا دھن گولیاں برسائی جانے لگیں۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ... خود کو نہ صرف نیچے جھکا لیا بلکہ تابڑتوڑ فائرنگ سے گھبرا کر میں نے خود کو چھت کے فرش پر گرا لیا۔ شائیں شائیں کی سنسناتی آوازوں سے میرا دماغ جھنجھنا گیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو میری آنکھیں پھٹ

گئیں۔ جس دیوار کو تھوڑی دیر پہلے میں مورچا بنائے ہوئے تھا وہ دیوار ہی اڑ گئی تھی، اور لیٹے لیٹے بھی مجھے دوسری چھت اور اس پر پوزیشن سنبھالے بیٹھا اول خیر بھی صاف نظر آ گیا۔ غالباً اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور ہاتھ کا کوئی مخصوص اشارہ بھی مجھے کر رہا تھا۔ مجھے یہی سمجھ میں آ سکا تھا کہ وہ مجھے یا تو مزید فائرنگ سے روکنا چاہتا تھا یا پھر فوراً چھت سے اترنے کا اشارہ کر رہا تھا، تاہم میں نے اس کے اشارے کی پروا کیے بغیر تھوڑا سا آگے سرک کر نیچے کا منظر دیکھا۔ نصف سے زائد مسلح افراد میری سمت دوڑ رہے تھے۔ وہ نیچے میرے گرد گھیرا ڈالنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ مجھے دو بہ دو فائرنگ کا مقابلہ کرنے کا کوئی تجربہ نہ تھا، شاید یہی وجہ تھی کہ بے چارہ اول خیر میری اس حرکت سے تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا اور مجھے پلٹنے کا اشارہ کیے جا رہا تھا۔

میں نے چھت کا جائزہ لیا۔ یہ چھت جتنی محفوظ تھی، اتنی کمزور بھی... یہاں رہتے ہوئے میں خود کو زیادہ دیر تک محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ میرے دل میں اور تو کچھ نہیں سمایا، البتہ تیزی کے ساتھ جھکے ہوئے انداز میں اُس طرف آ گیا، جہاں سے میں اوپر پہنچا تھا۔ یعنی یہاں وہی عارضی سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ میں نے تھوڑا سا سر ابھار کر نیچے جھانکا، سردست مجھے کوئی نظر نہ آیا تو میں نے جلدی سے سیڑھی کو دونوں ہاتھوں کی مدد سے نیچے گرا دیا تاکہ کوئی اوپر نہ آ سکے۔

دفعتاً گولیوں کی گھن گرج ابھری۔ میں سینے کے بل دبک گیا۔ سر گھما کر دوسری جانب دیکھا، اول خیر جوابی فائرنگ کر رہا تھا۔ پھر وہ تیزی کے ساتھ پیچھے کو پلٹا۔ میں قدرے محفوظ تھا مگر اول خیر خطرے میں گھرا ہوا تھا، نیچے موجود مسلح افراد اس پر گولیاں داغ رہے تھے۔

اچانک ایک اور سمت سے مجھے مختصر مختصر وقفے سے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ بالکل مختلف یعنی تیسری سمت تھی۔ میں نے ذرا سر گھما کر آواز کی سمت دیکھا جہاں مرکزی گیٹ تھا۔ وہاں افراتفری کا منظر نظر آیا اور ابھی اس سلسلے میں اندازے ہی قائم کر رہا تھا کہ اچانک ایک دھماکے سے بڑا سا مرکزی لوہے کا گیٹ ٹوٹ کر گرا۔ ایک بڑا ٹرک اندر داخل ہو رہا تھا اور اس کے پیچھے دو تین بغیر ہڈ والی جیپیں تھیں۔ ان میں مسلح لوگ سوار تھے اور بڑی بے رحمی سے گولیاں برساتے ہوئے اردگرد موجود افراد کو نشانہ بنا رہے تھے۔ ذہن میں پہلا ابھرنے والا میرا خیال تھا کہ یہ لوگ اول خیر کے ساتھی تھے، گویا جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔

مجھے یہ سب کچھ کسی تاریخی فلم کا منظر ہی لگتا تھا جس میں ایک بادشاہ کی شکست کو کچھ لمحے کی دیر تھی اور دشمن اس کے قلعے کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو چکے تھے۔

یہ ''اطفال گھر'' جو کبھی لاوارث، یا والدین اور معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے معصوم بچوں کی محفوظ پناہ گاہ ہوا کرتا تھا، کبھی اس طرح خونی جنگ کا منظر بھی پیش کر سکتا تھا، اس کا میں نے سوچنا تو درکنار کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ اس وقت یہ سوچ کر میرا دل دکھ سے بھرنے لگا کہ شاید اب اس اطفال گھر کا وجود ہی نہیں، اس کی کہانی بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہونے والی تھی۔ نہ جانے اب کون ان معصوم بچوں کا پالن ہار بنے گا؟ یہ بچے اب کہاں جائیں گے۔ جو ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم اور لاوارث کہلاتے تھے۔

میری طرف بڑھنے والے حواریوں کو اب اس نئی صورتِ حال کے باعث اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے اور وہ سب تتر بتر ہو گئے تھے۔ میں نے پنجوں پر پاؤں ٹکا کر خود کو واپس زمین پر اتارا اور اس عمارت کی طرف پیش قدمی کی جہاں اول خیر بھی اس طرح کی کامیاب کوشش کرتے ہوئے نیچے اتر چکا تھا۔

میں اول خیر سے ملنے کو بے چین تھا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ گگل خان مرنے نہ پائے۔ کیونکہ مجھے اس سے عابدہ اور شکیلہ سمیت ان پانچوں بدنصیب لڑکیوں کا پتا چلانا تھا جنہیں وہ خبیث نہ جانے کہاں غائب کر چکا تھا۔

''او... خیر... کاکا! بڑا پالا مارا ہے تو نے پر ذرا آہستہ... ابھی کچا ہے تو... ٹِکا نہیں ہے۔ پکا پھل تجھے میں بناؤں گا۔''

مجھ سے ملتے ہی وہ اپنی بولی میں نہ جانے کیا کہتا چلا گیا۔ میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''اپنے ساتھیوں سے کہو گگل خان کو جان سے نہ ماریں۔''

وہ درمیان میں بول پڑا۔ ''وہ جانتے ہیں اپنا کام تو فکر نہ کر۔ بس اب نکلنے کی تیاری کر۔ آ... میرے ساتھ... ذرا گگل خان سے دو دو ہاتھ کر لیتے ہیں۔''

ہم دونوں گگل خان کی تلاش میں آگے بڑھ گئے۔ اول خیر کے جنگی گروپ نے یہاں آ کر تہلکہ مچا دیا تھا۔ گگل خان کے حواری اب اپنی جانیں بچانے کی فکر میں تھے۔ شوکت حسین میری ہدایت پر پورا پورا عمل کر رہا تھا۔ اس نے سارے چھوٹی بڑی عمر کے قیدیوں کو اپنے اپنے کمروں تک محدود اور محفوظ کر رکھا تھا۔ اول خیر کے ساتھیوں کی ایک جیپ تیزی سے ان کے قریب آئی۔

''چھوٹے استاد! وہ حرام کا پلا گگل خان اپنی کار میں فرار ہو گیا۔'' جیپ میں سوار چار مسلح افراد میں سے ایک نے اسے بتایا تو میرا دماغ گگل خان کے فرار پر سُن ہو کر رہ گیا۔

''کس طرف گیا ہے وہ؟'' اول خیر نے پوچھا۔

''جکو اور حمزہ اس کے تعاقب میں گئے ہوئے ہیں۔'' ایک دوسرے ساتھی نے بتایا۔ ''باٹا پورہ والی روڈ پر گیا ہے وہ۔''

''سب اترو جیپ سے جلدی۔'' معاً اول خیر نے حکم صادر کیا۔ وہ سب فوراً حکم کی تکمیل میں چھلانگیں مار کے نیچے اترے۔

''چل کاکا! سوار ہو جا۔'' اول خیر نے جیپ کا اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور میں نے اس کے برابر والی سیٹ۔

تھوڑی دیر بعد جب ہم اطفال گھر کے ٹوٹے ہوئے مرکزی گیٹ سے نکلے تو اچانک پولیس سائرن کی تیز آواز ہماری سماعتوں سے ٹکرائی۔ سامنے سے پولیس کی دو تین موبائل گاڑیاں ہمارے راستے کے عین سامنے سے دوڑی چلی آ رہی تھیں۔ ان کا رخ ہماری طرف تھا۔ میں نے دیکھا۔ اول خیر کے چہرے پر پہلی بار پریشانی اور تشویش کے آثار نمودار ہوئے اور میں سوچنے لگا۔ اول خیر بھی گگل خان گروپ کی طرح یقیناً جرائم کی دنیا سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے پکڑے جانے کا مطلب تھا ہمیں ایک مجرم کے ساتھی کے طور پر گردانا جاتا۔ مجھے اب اپنی پریشانی لگ گئی۔

''لے کاکے! سنبھل، سیٹ پر مضبوطی کے ساتھ ٹِک ہو جا۔ ورنہ لینے کے دینے (پریشانی) میں پڑ جائیں گے۔'' اول خیر نے کہا اور پھر بڑی پھرتی کے ساتھ اسٹیئرنگ کاٹا اور جیپ دائیں جانب ایک خشک نالے میں اتر گئی۔ عقب سے پولیس نے ہم پر فائر کھول دیا۔

''کاکے! نیچے جھک جا'' اول خیر چلایا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے سماعت میں دھماکے کی آواز ابھری۔ کوئی بھٹکی ہوئی گولی جیپ کے کسی ٹائر کو برسٹ کر گئی تھی۔ جیپ اس وقت خشک نالے کی ڈھلان اتر رہی تھی کہ ٹائر برسٹ ہونے کی صورت میں الٹ گئی۔ اول خیر کا تو کچھ پتا نہ چلا البتہ میں جیپ سے اچھل کر خشک نالے کی دلدلی زمین پر جا پڑا۔ میرے اردگرد آناً فاناً پولیس کی نفری جمع ہو چکی تھی۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرانے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

موقع شناس

سلیم انور

دیانت داری سے دوستی نبھانے کی رِیت بھی بدل چکی ہے... بعض اوقات جنہیں ہم اپنے مخلص اور محبت کرنے والے دوست سمجھتے ہیں... وہ دراصل مفادات کے نقاب میں چھپے موقع پرست... فریب کار ہوتے ہیں... مغرب کی گہما گہمیوں میں گم کردینے والے لوازمات سے بھرپور کہانی... ہر چہرے کے پیچھے ایک نیا چہرہ، نئی کہانی تھی۔

چابک دستی اور ہوشیاری سے کھیلی گئی بازی کا چونکا دینے والا اختتام

وہ چونتیس پینتیس سالہ دراز قامت دبلی پتلی عورت تھی۔ اس نے اپنی ہم عمر دو خواتین کو بار کے آخر میں بیٹھے ہوئے تاڑ لیا تھا جو دیکھنے میں دولت مند لگ رہی تھیں۔ اس نے اپنی مارٹینی کا گلاس اٹھایا اور ٹہلتے ہوئے ان کے برابر جا بیٹھی۔ ''کیا آپ خواتین کو دوستوں کی تلاش ہے؟''

وہ دونوں خواتین میری اور سلویا تھیں جنہوں نے اس نائٹ کلب کے فینسی ہونے کے باوجود بے موقع دیدہ زیب لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔

”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ میری نے جواب دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی بھانپ لیا کہ اس دراز قامت عورت کی نگاہیں اس کے سینے پر مرکوز تھیں۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ اس کے گریبان کے کٹاؤ سے اُبھرے ہوئے بھرپور سینے کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہی تھی یا چار ہزار ڈالر مالیت کے موتیوں کے ہار کا جائزہ لے رہی تھی۔

”ہائے، میں ڈولی اوٹرمین ہوں۔“ دراز قامت نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”میں میری گولڈمین ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو اس کا ڈائمنڈ بریسلٹ کمرے کی روشنی میں جگمگانے لگا۔ یہ ایک حیرت انگیز بریسلٹ تھا اور میری اس کی نمائش پر خوب اتراتی تھی۔

”اور میں سلویا پارٹوف ہوں۔“

سلویا نے جو جیولری پہنی ہوئی تھی، وہ بھی خاصی متاثر کن تھی۔

”مجھے یقین نہیں کہ میں نے تم دونوں کو اس سے پہلے کبھی یہاں دیکھا ہو۔“ ڈولی نے بے تکلفی سے مخاطب ہو کر کہا۔

”یہ میرا پہلا اتفاق ہے۔“ میری نے جواب دیا۔

”اور میرا بھی۔“ سلویا نے بتایا۔

ڈولی آگے کی جانب جھک گئی اور قدرے دھیمے لہجے میں بولی۔ ”یہ مرد ساتھی کا انتخاب کرنے کے لحاظ سے ایک بہترین جگہ ہے۔“

”واقعی؟ میں کسی عمدہ جنٹلمین سے ملاقات کرنے کی امید رکھتی ہوں۔“ میری نے بار کے ہال میں طائرانہ نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

”ویل، یقین کرو... یہ بہت آسان ہے۔ میں ہمیشہ یہی کرتی ہوں۔“ ڈولی نے بتایا۔

تب میری کی نگاہ ڈولی کی انگلی میں موجود شادی کی انگوٹھی پر چلی گئی۔ ”لیکن تم تو شادی شدہ ہو؟“

ڈولی نے شانے اچکا دیے۔ ”کسی حد تک۔“

”اس کا کیا مطلب ہوا؟“

”صرف ویک اینڈز پر۔“

”اب میں سمجھی... تمہاری اوپن میرج ٹائپ کی شادیوں میں سے ایک ہے۔“ میری نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

یہ سُن کر سلویا الجھ سی گئی۔

ڈولی نے اپنی مارٹینی کا گلاس ہونٹوں سے لگایا اور ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر دیا۔ ”کیا تم نے اس پُرکشش مرد کو دیکھا جو وہاں بیٹھا ہوا ہے؟“

”کدھر؟“ میری نے پوچھا۔

”وہ جو بوتھ میں تنہا بیٹھا ہے۔“

”اوکے، ہاں۔ میں نے اسے دیکھ لیا ہے۔“

”وہ سپر ہاٹ ہے اور دولت مند بھی۔“ ڈولی نے بتایا۔

میری نے ایک بار پھر اس شخص پر نگاہ ڈالی، پھر بولی۔ ”تو پھر وہ تنہا کیوں ہے؟“

”وہ کسی حد تک شرمیلا ہے۔ میں ایک مرتبہ اس کے ساتھ باہر گئی تھی۔ اسے اپنے ہمراہ ریبٹ رینج لے جانے کی کوشش کی تھی۔ اگر تم اس کا مطلب سمجھتی ہو۔“

”ہوں!“

”کیا تم ہوریزینٹل ہپی ڈانس سے واقف نہیں ہو؟“ ڈولی نے پوچھا۔

بارٹینڈر نے جوان کی گفتگو سن رہا تھا، میری کو بطور ترجمان اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”اس نے نوجوان کے ساتھ شب بسر کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”اوہ!“ میری نے بات کو بخوبی سمجھتے ہوئے کہا۔ ڈولی اسے قدرے آزاد خیال لگی تھی۔

”لیکن وہ اس کے لیے رضامند نہیں ہوا۔“ ڈولی نے کہا۔ ”اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اسے حقیقی محبت کی تلاش ہے۔ اس نے کیسی احمقانہ بات کہی تھی؟ اس لیے حیرانی کی بات نہیں کہ وہ تنہا بیٹھا ہوا ہے۔ سو میں نے عمدہ ڈنر کے لیے اس کا شکریہ ادا کیا اور بس پلٹ آئی۔“

”ہوں۔“ میری نے کچھ کہنے سے گریز کیا۔

”لیکن ہم میں اب بھی دوستی ہے۔“ ڈولی نے بتایا۔

”سو اب تم اس سے ملنا چاہو گی؟“

”اوہ، میں کچھ نہیں کہہ سکتی کہ میں...“

”...دیکھو، تم یہاں کسی مرد سے ملنے کے ارادے سے آئی ہو۔ درست؟ اور یہ ایک عمدہ شخص ہے... بالکل تمہاری ٹائپ کا۔ تم کیا کہتی ہو؟ مجھے رشتے جوڑنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے سلویا کی طرف دیکھا۔ ”اور پھر میں تمہارا بھی کسی نہ کسی کے ساتھ ملاپ کرا دوں گی، سلویا۔“

سلویا کے ہونٹوں پر نروس زدہ مسکراہٹ اُبھر آئی۔ ”مجھے یقین ہے کہ میرا شوہر مجھے یاد کر رہا ہے اس لیے

جا رہی ہوں۔“ اس نے اپنا پرس اٹھایا اور کھڑی ہو گئی۔

”اوکے۔“ میری نے کہا۔ ”میں سمجھتی ہوں۔“

”اب تم سے کل کلب میں ملاقات ہو گی۔“ سلویا نے کہا۔

”اوکے، بائے۔“

سلویا کے جانے کے بعد ڈولی بولی۔ ”میری تم اس سے ملنا چاہتی ہو یا نہیں؟“

”میرا خیال تو ہے۔“

”تو پھر آؤ چلیں۔“ ڈولی نے بار اسٹول پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اس کا نام پیٹرچین ہے۔“

میری ڈولی کے پیچھے پیچھے پیٹرچین کے کیبن کی جانب چل پڑی۔ اس دوران وہ ہر میز پر موجود لوگوں کے چہروں کا سرسری جائزہ بھی لے رہی تھی۔ وہ چیک کرنا چاہ رہی تھی کہ کوئی اس کی اس حرکت کو دیکھ تو نہیں رہا؟ یہاں کوئی اس کا شناسا تو موجود نہیں ہے؟

...تب اس کی نگاہ جینیفر پر پڑی۔ وہ پیٹرچین کے کیبن کے برابر کے بوتھ میں ایک اور عورت کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ میری کی قریبی سہیلیوں میں سے ایک تھی اور بطور چغلی باز عورت مشہور تھی۔ لیکن میری کو امید تھی کہ وہ آج کی رات اپنے کام سے کام رکھے گی اور اس پر توجہ نہیں دے گی۔

ڈولی نے پیٹرچین کے بوتھ میں داخل ہوتے ہوئے اسے بے تکلفی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو، پیٹرچین! آج کی شب کیسی گزر رہی ہے؟“

وہ مسکرا دیا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں، ڈولی۔“

میری نے یہ بات نوٹ کی کہ نزدیک سے وہ کہیں زیادہ ہینڈسم دکھائی دے رہا تھا۔

”ویل، میں تم سے اپنی نئی دوست کا تعارف کرانا چاہتی ہوں۔ یہ میری...“

”گولڈمین۔“ میری نے نام مکمل کرتے ہوئے کہا۔

پیٹرچین اپنے بوتھ سے کھسک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی قامت چھ فٹ کے لگ بھگ تھی اور اس کا پُرکشش جسم اس کی قامت کو اور بڑھا رہا تھا۔

”اور یہ۔“ ڈولی نے بتایا۔ ”پیٹرچین ہے... لیڈیز مین!“

یہ سن کر پیٹرچین قدرے شرما سا گیا۔ ”تم سے مل کر خوشی ہوئی میری۔“

”تو پھر، اوکے۔“ ڈولی نے کہا۔ ”میں تم دونوں کو بریڈز کو تنہا چھوڑ کر جا رہی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ پلٹ گئی۔

”ڈولی کا لب و لہجہ قدرے درشت ٹائپ کا ہے۔“ پیٹرچین نے کہا۔

”ہاں، میں نے یہ بات نوٹ کر لی ہے۔“

”پلیز، مجھے جوائن کر لیں۔“ اس نے میری کو اپنے بوتھ کی ایک نشست پیش کرتے ہوئے کہا۔

”اوکے... صرف ایک منٹ۔“ میری یہ کہہ کر اس کے مقابل بیٹھ گئی۔ اس کی پشت عین اس پارٹیشن کی جانب تھی جس کی دوسری جانب اس کی سہیلی جینیفر بیٹھی ہوئی تھی اور وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھی کہ ان کے مابین جو بھی گفتگو ہو گی وہ اس کا ایک ایک لفظ صاف سن لے گی۔

”میں چند ہفتے قبل اٹلانٹا سے یہاں منتقل ہوا ہوں۔ میں نے لنکیڈو پارک میں ایک قدیم پیارا سا گھر خریدا ہے۔“ پیٹرچین نے بتایا۔

میری کو علم تھا اس علاقے میں مکانوں کی قیمت پچاس لاکھ سے لے کر ایک کروڑ ڈالرز تک کی ہے۔

پیٹرچین نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”صاف بات یہ ہے کہ وہ مکان میرے لیے بہت بڑا ہے۔ لیکن وہ علاقہ بس میرے دل کو بھا گیا تھا۔ میں اس مکان کی تزئین و آرائش کرا رہا ہوں۔ اس وقت میں ہوٹل اومنی میں قیام پذیر ہوں۔“

”وہ تو ایک عمدہ ہوٹل ہے۔“

”ہاں، لیکن میں اس گھر میں جانے کے لیے بے تاب ہوں اور مجھ سے مزید صبر نہیں ہو رہا۔“

”صرف تم ہو، فیملی نہیں ہے؟“ میری نے سوال کیا۔

”نہیں۔ میں اب بھی مس رائٹ کی تلاش میں ہوں۔“

”پھر تو تم بے حد صابر ہو۔“

”تم نے یہ بات کیوں کہی؟ اس لیے کہ میری عمر زیادہ ہے؟“ پیٹرچین نے کہا۔

”نہیں، آئی ایم سوری۔ میں قدرے درشت ہو گئی تھی۔ پلیز، مجھے معاف کر دو۔“ میری نے کہا۔

وہ مسکرا دیا۔ ”نو پرابلم۔ درحقیقت یہ بات مجھے بہت سننے کو ملتی ہے لیکن بہت سی عورتیں جن سے میری ملاقات ہوئی ہے وہ صرف میرے امارت کی بنا پر میری طرف راغب ہوئی تھیں۔ لہٰذا مجھے اس معاملے میں احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔“

”میں سمجھتی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔“

''میرا قیاس ہے کہ تم طلاق یافتہ ہو۔''

''ہاں، دو سال ہوئے مجھے طلاق ہوئی تھی۔'' میری نے اقرار کیا۔ ''لیکن کس بات نے تمہیں یہ خیال دلایا کہ میں طلاق یافتہ ہوں؟ کیا میں تمہاری طرح نہیں ہو سکتی جو اب بھی مسٹر رائٹ کی تلاش میں ہو؟''

اس بات پر پیٹر چین نے قہقہہ لگایا۔ ''کیا تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو؟ ذرا اپنے آپ کو تو دیکھو۔ تم اتنی حسین ہو کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تمہیں کسی شخص کے ہاتھوں اپنا دل جیتنے کے لیے اتنا انتظار کرنا پڑتا۔''

''شکریہ۔''

''امید ہے کہ اس شخص نے تم سے تمہاری دولت کی خاطر شادی نہیں کی ہوگی۔''

''نہیں۔ اس کے پاس اپنی دولت تھی۔ مسئلہ یہ نہیں تھا۔ وہ بعد میں ایک بہت بڑا بے وقوف نکلا۔''

''تب تو تم خوش قسمت ہو۔''

''خوش قسمت؟''

''وہ تمہاری آدھی دولت ہتھیا سکتا تھا۔''

''ہاں، اس لحاظ سے تو میں واقعی خوش قسمت رہی لیکن میں نے سات سال بڑی اذیت میں گزارے اس لیے میں خود کو خوش قسمت محسوس نہیں کرتی۔''

''تمہاری شادی کتنے سال قائم رہی؟''

''ساڑھے سات سال۔''

وہ ہنس پڑا۔ ''تم اتنے لمبے عرصے تک اس بُری شادی کے بندھن میں کیوں جکڑی رہیں؟''

''اپنی ماں کی وجہ سے۔ مجھے اس کے الفاظ اب بھی من وعن یاد ہیں۔ اس نے کہا تھا۔ 'میں تمہیں اس سے شادی کرنے سے منع کرتی ہوں۔' پھر شادی کی تقریب کے وقت وہ مجھے کھینچ کر ایک جانب لے گئی تھی اور مجھ سے کہا تھا کہ مجھے ایک سال کے اندر ہی طلاق ہو جائے گی۔ مجھے ماں کی بات کو غلط ثابت کرنا تھا۔''

''بے شک۔ میں تمہاری بات بخوبی سمجھ رہا ہوں۔ لیکن تم اتنے برسوں تک اس کے ساتھ کیوں چپکی رہیں؟ کیا شادی ایک سال تک قائم رہنے سے تمہاری ماں کی بات غلط ثابت نہیں ہو گئی تھی؟''

''ہاں، غلط ثابت ہو جاتی۔ اگر وہ مجھے مسلسل یہ کہنا بند کر دیتی کہ میں اسے طلاق نہ دے کر اپنی حماقت کا ثبوت دے رہی ہوں۔''

وہ یہ سن کر مسکرا دیا۔ ''مجھے اس بات پر معاف کر دینا کہ تم قدرے ضدی ٹائپ کی لگتی ہو۔''

''صرف اپنی ماں کی حد تک۔''

''تو پھر تم نے بالآخر اس معاملے میں ہار کیوں مان لی اور طلاق کیوں لے لی؟''

''میری ماں مر گئی تھی۔''

''اوہ، آئی ایم سوری۔ کیا تم دونوں نے اپنے اختلافات طے کر لیے تھے؟'' پیٹر چین نے پوچھا۔

''حقیقت میں تو نہیں۔ لیکن ہم دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے۔ ہمارے مابین تکرار ایک ایسی چیز تھی جو ہم دونوں کو پسند تھی۔ اس بات کا مکمل احساس مجھے اس کے مرنے کے بعد ہوا۔ لیکن وہ ہمارے درمیان باہمی لطف اندوز ہونے کا بہترین وقت ہوا کرتا تھا۔'' میری نے بتایا۔

پیٹر چین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میں عام طور پر اس بارے میں کوئی بات نہیں کرتی... خاص طور پر پہلی...''

''ڈیٹ پر؟''

''نہیں، میرا مطلب ہے...''

''اوکے، اوکے۔ لیکن یہ حقیقت میں ڈیٹ ہی محسوس ہو رہی ہے۔ آؤ یہاں سے باہر چلتے ہیں۔''

''کہاں جائیں گے؟''

''اوہ... اچھا... رہنے دو۔ یوں لگے گا جیسے میں کوشش کر رہا ہوں کہ تم رات میرے ساتھ گزارو۔''

''کیا؟ تمہارے ہوٹل کے کمرے میں؟ نہیں۔ میرا ایسا قطعی کوئی خیال نہیں ہے۔ میں سمجھ رہی ہوں کہ تم کس قسم کے آدمی ہو۔ تم میری رفاقت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرو گے۔ اس لیے میرے گھر چلتے ہیں۔ میرے یہاں ایک بڑا آتش دان ہے۔ ہم کاؤچ پر اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے اور وائن کا لطف بھی اٹھائیں گے۔''

اس نے مسکراتے ہوئے میری کا ہاتھ تھام لیا۔ ''یہ زبردست رہے گا۔''

میری نے اپنا سیل فون نکال لیا۔

''چارلس؟ میں گھر جانے کے لیے تیار ہوں۔ میرے ساتھ ایک مہمان بھی ہے... شکریہ۔''

''جب تک ہم باہر پہنچیں گے چارلس لیموزین لے آ جائے گا۔'' میری نے کہا۔

''چارلس تمہارا شوفر ہے؟''

''شوفر اور بٹلر دونوں ہے۔ وہ برسوں سے میرے

ساتھ ہے۔'' میری نے بتایا۔

☆☆☆

میری، پیٹر چین کے ہمراہ اپنے گھر کے ایک گوشے میں چمڑے کے کاؤچ پر بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ ان کی نظریں آتش دان کے بھڑکتے ہوئے شعلوں پر مرکوز تھیں۔

چارلس مشروب کی بوتل اور دو گلاس لے آیا۔

متعدد گلاس پینے کے بعد پیٹر چین میری کے نزدیک آگیا..... اس نے پیش رفت شروع کی تو میری قدرے پگھلنے لگی۔ لیکن جب اس نے پیٹر چین کو حد سے آگے بڑھتے دیکھا تو دور ہٹ گئی۔

''نہیں، نہیں۔'' میری نے کہا۔ ''ایسی کوئی حرکت نہیں ہوگی۔ یاد رہے کہ تم نے خود کو مس رائٹ کے لیے محفوظ کر رکھا ہے۔''

''میرا خیال ہے وہ مجھے مل گئی ہے۔'' وہ اس کی جانب جھکتے ہوئے بولا۔

میری نے اسے روک دیا۔ ''دیر ہو چکی ہے۔ اب بستر پر جانے کا وقت ہے۔''

یہ سن کر پیٹر چین کا چہرہ جگمگا اٹھا۔

''میں تصحیح کر دوں۔ اب سونے کا وقت ہے۔''

''آہ کم آن بے بی۔''

''میں چارلس سے کہہ دیتی ہوں کہ وہ تمہیں گاڑی میں تمہارے ہوٹل چھوڑ آئے۔''

پیٹر چین نے رخصت ہونے سے قبل میری کو اگلے دن لنچ پر چلنے کے لیے رضامند کر لیا۔

☆☆☆

میری نے لنچ کے لیے شہر کے وسط میں واقع ایک امتیازی ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا۔

''آپ کی ایک بار پھر یہاں آمد ہمارے لیے باعثِ افتخار ہے، مسز گولڈ مین۔'' ہیڈ ویٹر نے کہا۔

میری نے اپنے لیے شیف سلاد اور پیٹر چین نے ران کے گوشت کے پارچے کا آرڈر دیا۔

''مجھے اس شہر سے عشق ہے۔'' پیٹر چین نے کہا۔

''تو تم کچھ عرصے اس شہر میں مقیم رہنے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' میری نے پوچھا۔

''یقیناً۔''

''گڈ!''

''اور میں تمہارے ساتھ بہت سا وقت گزارنے کی خواہش بھی رکھتا ہوں۔''

''ونڈرفل۔''

کھانے کے دوران میں وہ خوب باتیں بھی کرتے رہے۔ جب انہیں کھانے کا بل پیش کیا گیا تو ہیڈ ویٹران کے پاس آیا اور ان سے کھانے اور سروس کی کوالٹی کے بارے میں تصدیق کرنے کے بعد وہاں سے چلا گیا۔

''میری، ہوسکتا ہے کہ میں اصل بات نہ کہہ پا رہا ہوں۔'' پیٹر پین نے میری کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میرا خیال ہے کہ ہم مل کر کوئی انتہائی اسپیشل قسم کا جشن مناسکتے ہیں۔''

میری گرم جوشی سے مسکرادی۔ ''میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔''

پیٹر پین نے اس کا ہاتھ تھام کر اس پر بوسہ دے دیا۔

''تم ایک بات جانتے ہو؟''

''کیا؟''

''آؤ جشن مناتے ہیں۔''

''اوہ، گریٹ!''

''آؤ چلیں۔''

پیٹر پین نے میز پر دو سو ڈالر کے دو نوٹ یوں اچھال دیے جیسے وہ ردی کاغذ کے ٹکڑے ہوں۔

میری نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور وہ ریسٹورنٹ سے باہر آگئے۔ میری اسے پیدل ایک قریبی جیولری اسٹور میں لے گئی۔

جب وہ جیولری اسٹور میں داخل ہوئے تو پیٹر پین نے کہا۔ ''تو تم منگنی کی انگوٹھی کے لیے تیار ہوگئی ہو؟''

''نہیں، احمق!''

پیٹر پین کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔

''ابھی نہیں۔ شاید چند ہفتوں بعد ہم منگنی کرلیں۔'' میری نے اسے خوش کرنے کے لیے کہا۔

اس دوران ایک سیلز مین نے اپنی آنکھیں اور کان ان دونوں پر مرکوز کرلیے تھے۔

''مجھے جیولری سے عشق ہے۔'' میری نے کہا۔ ''اوہ! اس انگوٹھی کو تو دیکھو۔''

یہ سن کر سیلز مین آگے بڑھ آیا۔ اس نے گلاس کیبنٹ میں سے وہ انگوٹھی نکال کر میری کے سامنے رکھ دی۔ ''یہ آپ کے کلیکشن میں ایک پیارا اضافہ ہوگا مسز گولڈ مین۔''

''اس کی کیا قیمت ہے، جارج؟''

پیٹر پین کو یہ دیکھ کر کسی قسم کا اچنبھا نہیں ہوا کہ میری اور جیولر سیلز مین ایک دوسرے کو ناموں سے جانتے تھے۔

''پچیس میڈم۔''

میری پیٹر پین کی جانب گھوم گئی۔ ''کیا تم اسے میرے لیے خریدنا پسند کرو گے، پیٹر پین؟''

پیٹر پین نے تھوک نگلتے ہوئے حامی بھرلی۔ ''ہاں؟ کیوں نہیں۔''

میری نے اپنی آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم نے چند ہفتوں میں مجھ سے شادی کے بارے میں پوچھا اور میں نے ہاں کہہ دی تو یہ میری انگیج منٹ رِنگ ہوسکتی ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ مجھے ابھی چاہیے۔''

''نو پرابلم۔'' پیٹر پین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جارج اسے خاتون کے لیے پیک کردو۔''

جارج نے خوشی خوشی انگوٹھی پیک کردی۔

''پچیس سو، ٹھیک ہے؟'' پیٹر پین نے امریکن ایکسپریس کارڈ جارج کو تھماتے ہوئے کہا۔

''نہیں سر، پچیس ہزار۔''

''اوہ۔'' پیٹر پین کے منہ سے آہ نکل گئی۔ ساتھ ہی اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

''کیا یہ ٹھیک نہیں ہے، پیٹر پین؟'' میری نے پوچھا۔ پھر سرگوشی کے لہجے میں گویا ہوئی۔ ''اگر کوئی پرابلم ہے تو میں... ادائی کرسکتی ہوں۔''

پیٹر پین نے کھنکھارتے ہوئے اپنا گلا صاف کیا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''نو پرابلم۔''

''اسے حسبِ معمول آپ کے گھر پر ڈیلیور کردیا جائے مسز گولڈ مین؟'' جارج نے پوچھا۔

''ہاں، تھینک یو۔'' میری نے کہا۔ پھر پیٹر پین کی طرف گھوم گئی۔ ''میں ایک بیش قیمت برانڈ نیو جیولری پہن کر باہر نکلنا نہیں چاہتی... یہ لٹیروں کو خود دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ میں اسے ڈنر کے موقع پر پہنوں گی۔''

میری نے تصور کرلیا تھا کہ پیٹر پین کی جانب سے ڈنر کی پیشکش متوقع ہے۔

پیٹر پین نے اپنے ڈرائیور کو طلب کرلیا جو چند منٹ بعد ہی اس کی کرائے کی لیموزین لے کر جیولری اسٹور کے باہر آگیا۔

میری نے اپنے گھر جانے کا فیصلہ کیا تاکہ کچھ دیر ستانے کے بعد ڈنر کے لیے تروتازہ ہوجائے۔

☆☆☆

شام پانچ بجے پیٹر پین کی لیموزین میری کے مینشن کے سامنے آکے رک گئی۔

پیٹر پین درجن بھر گلاب ہاتھوں میں لیے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا اور دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجادی۔

ایک انتہائی دلکش عورت نے دروازہ کھولا جو یقینی طور پر ملازمہ نہیں تھی۔ وہ میری سے بے حد مشابہ لگ رہی تھی۔

''تم یقیناً میری کی بہن ہو۔''

''تم کون ہو؟''

''میرا نام پیٹر پین ہے۔ میری کا اور میرا آج ڈنر کا پلان ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ تم غلط پتے پر آگئے ہو۔''

''نہیں، میں آج صبح میری کے ساتھ یہاں آیا تھا اور گزشتہ شب بھی۔'' پیٹر پین نے بتایا۔

''میری کون؟''

''میری گولڈ مین۔''

وہ ایک لمحے کے لیے اسے حیرت سے دیکھنے لگی پھر بولی۔ ''یہ ناممکن ہے... اس لیے کہ میری گولڈ مین میں ہوں۔''

یہ سُن کر وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ ''کیا یہ کسی قسم کا مذاق ہے؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے اس عورت کے عقب میں دروازے سے اندر دیکھنے کی کوشش کی اور پھر آواز لگائی۔ ''میری؟''

''سر! اس گھر میں میری صرف میں ہوں۔''

''میری کے شوفر چارلس سے بات کرائیں... وہ آپ کو بتادے گا۔'' پیٹر پین نے کہا۔

''اوکے۔ اب تم یہاں سے روانہ ہوتے ہو یا میں پولیس کو فون کروں؟'' اس عورت نے کہا۔

''اوکے، سب ٹھیک ہے۔'' اندر سے ایک جانی پہچانی آواز نے کہا۔

''میری؟'' پیٹر پین نے پکارا۔

اتنے میں اس کی میری دروازے میں کھڑی میری کے پاس آگئی۔

''یہاں یہ کیا ہو رہا ہے، میری؟'' پیٹر پین نے پوچھا۔

''اصلی میری گولڈ مین میں نہیں ہوں۔ یہ ہے۔'' میری نے اس عورت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر تم کون ہو؟'' پیٹر پین نے جاننا چاہا۔

''میرا نام جینس ہے۔ تم مجھے شاید میرے گہرے بھورے بالوں کی وجہ سے پہچان لو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی سنہری بالوں کی وگ سر پر سے اتار لی۔

تاخیر کا سبب

ٹیگور کا ذاتی ملازم ایک صبح کام پر نہ آیا جب دو گھنٹے گزر گئے تو ٹیگور سوچنے لگا کہ ملازم کو کیا سزا دی جائے۔ جب پانچ گھنٹوں کے بعد بھی وہ نہ آیا تو ٹیگور نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اسے آج ملازمت سے برطرف کر دے گا۔ کامل چھ گھنٹے تاخیر سے ملازم آیا اور آتے ہی چپ چاپ کام شروع کردیا ٹیگور اس کی بے نیازی سے بہت مشتعل ہوا۔ مگر وہ بدستور خاموشی سے کام میں مصروف رہا۔ آخر وہ برس پڑا۔

''تم صبح سے اب تک کہاں تھے، یہ تمہارے آنے کا وقت ہے؟''

ملازم خاموشی سے کام میں لگا رہا۔ پھر دو تین منٹ کے وقفے کے بعد دھیمی آواز میں بولا۔

''بابوجی! آج صبح میری ننھی سی بٹیا مرگئی اس کی تجہیز و تکفین کرتے دیر ہوگئی۔''

(مرسلہ: عبدالکریم خالد ضلع جھنگ)

''میں نہیں پہچانتا کہ تم کون ہو۔'' پیٹر پین نے کہا۔ ''لیکن مجھے میری انگوٹھی واپس چاہیے۔''

''تم واقعی مجھے نہیں پہچانے؟ یہ ایک سال قبل لٹل راک کی بات ہے۔ میں نے اپنی مالکن سے ایک لباس اور چند جیولری مستعار لیے تھے اور ایک نائٹ کلب چلی گئی تھی۔ جب آپ کوئی ملازمہ ہوتی ہیں تو مالدار مردوں سے ڈیٹ لینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اگر کسی شخص نے یہ سوچا کہ میں بھی دولت مند ہوں تو وہ مجھے موقع دے سکتا ہے پھر تب ہی وہ میری شخصیت کی حقیقت سے آشنا ہو پائے گا۔''

پیٹر پین کو جینس کی یاد آنے لگی تھی لیکن اس نے اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

''اور تم نے مجھے ایک موقع دیا تھا لیکن اس رات جب تم مجھے گھر لے گئے تو تم نے مجھے کوئی خواب آور چیز کھلا دی اور میری ادھار لی ہوئی جیولری چرا کر چمپت ہوگئے۔ اگلے روز صبح ایک اسٹیٹ بروکر نے مجھے نیند سے بیدار کیا۔ وہ کسی متوقع خریدار کو وہ مکان دکھانے کے لیے آیا تھا۔ اور وہ مکان بھی تمہارا نہیں تھا۔''

''وہ میں نہیں تھا۔'' پیٹر پین نے کہا۔ ''تم مجھے کسی اور کے ساتھ ملا کر کنفیوز ہو رہی ہو۔''

''اوہ، تب تو یہ بھی عجب اتفاق ہے کیونکہ اس شخص کا نام بھی پیٹر پین تھا۔'' جینس نے کہا۔

تبھی اصلی میری گولڈ مین بول اٹھی۔ ''لہٰذا مسٹر

پیٹرچین کیا ہم انگوٹھی کے بارے میں بات چیت کے لیے پولیس کو طلب کریں؟ یا پھر تم چاہو گے کہ حساب بے باق سمجھا جائے؟"

یہ سن کر پیٹرچین نے واپس اپنی لیموزین کی جانب رخ کرلیا اور بولا۔ "تم عورتیں پاگل ہو۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کون شخص ہے جس کے بارے میں تم باتیں کررہی ہو یا وہ میرا نام کیوں استعمال کررہا ہے۔ لیکن میں حقیقت معلوم کر کے رہوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے لیموزین کا دروازہ کھول لیا۔ "اس اسٹوپڈ انگوٹھی کو تم ہی رکھ لو۔" اس نے کار میں سوار ہوتے ہوئے کہا اور دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند کر دیا۔ پھر لیموزین وہاں سے روانہ ہوگئی۔

تب دونوں عورتوں نے قہقہے لگانا شروع کردیے۔

"ہم نے اس سے خوب بدلہ چکایا، جینس۔"

"ہاں یہ صحیح ہوگیا۔ تمہاری اس مدد کا شکریہ اور تمہاری دوست سلویا کا بھی شکریہ کہ وہ گزشتہ شب میرے ساتھ جانے پر رضامند ہوگئی تھی۔ میں نہیں سمجھتی کہ اس کی مدد کے بغیر میں یہ مہم سر کرسکتی تھی۔"

"اس ڈولی نامی عورت کے بارے میں کیا کہو گی... کیا تمہارے خیال میں وہ پیٹرچین کی پارٹنر تھی؟"

"یقیناً۔ وہ صرف متوقع شکار کے انتظار میں بار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ تمہاری وہاں آمد سے قبل اس نے دیگر کئی خواتین سے بھی بات کی ہو۔ چاہے وہ شادی شدہ ہوں یا نہیں لیکن دولت مند رہی ہوں گی۔ کیا کہہ سکتے ہیں؟"

"اور پھر اس نے تمہیں اور سلویا کو بار میں داخل ہوتے دیکھا۔

"جو ٹنوں کے حساب سے جیولری پہنے ہوئے تھیں لیکن سلویا کے بغیر میں بہت زیادہ نروس ہوجاتی۔ ڈولی مجھے ایک نظر میں تاڑ لیتی اور میرے آر پار دیکھ لیتی۔ میں اداکاری کے معاملے میں بالکل ہی گھامڑ ہوں۔"

"اوہ، لیکن تم مکمل اداکارہ ہو۔"

"ویل، ہاں۔ میرا اندازہ ہے کہ میں نے ٹھیک ہی کیا۔ ہے نا؟"

"ہاں تم نے اسے اور پیٹرچین کو مکمل طور پر بے وقوف بنا دیا۔" اصلی میری گولڈ مین نے کہا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم نے کل پیٹرچین کو پہچان لیا تھا۔ تم نے اسے شناخت کرلیا یہ بات میرے لیے حیران کن ہے۔ تم صرف ایک شب اس کے ساتھ رہی تھیں۔ اور یہ بھی ایک سال پہلے کی بات ہے۔"

"کیا تم مذاق کررہی ہو، میری؟ میں اس چہرے کو کبھی نہیں بھلا سکتی۔"

"چلو... بالآخر تمہیں تمہاری رقم واپس مل گئی۔"

"مجھے چیک لکھ کردینے کا شکریہ۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ جارج وہ انگوٹھی واپس لے لے گا؟" جینس نے پوچھا۔

"اوہ ہاں، یہ کوئی پرابلم نہیں۔ ہم برسوں سے یہ بزنس کرتے آرہے ہیں۔ تم دونوں کے نکلنے کے بعد اس نے مجھے فون کیا تھا۔"

"او کے... میری کار تیار کھڑی ہے اور میرا سامان بھی اس میں لد چکا تھا۔ اب مجھے روانہ ہونا چاہیے۔" جینس نے کہا۔

"پلیز احتیاط سے کام لینا۔ اور اپنی خیر خیریت سے مطلع کرتی رہنا۔" میری نے کہا۔

"میں رابطے میں رہوں گی۔"

"شاید اس دوران تمہاری ممی کی صحت میں بہتری آچکی ہو۔ میں جانتی ہوں کہ چوبیس گھنٹے اس کی تیمارداری تمہارے لیے ایک سخت اور دشوار مرحلہ ہے۔"

"ہاں، لیکن میں اور کر بھی کیا سکتی ہوں؟ وہ میری ماں ہے۔"

دونوں عورتیں ایک دوسرے سے گلے ملیں اور پھر جینس اپنی کار کی جانب چل پڑی۔

کچھ دیر بعد اس کی کار روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

"یہ ایک پرفیکٹ پلان تھا۔ سب سے بہترین۔" جینس نے کہا جو شیورلیٹ کی فرنٹ پسنجر سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"تم ایک نہایت قابلِ یقین میری گولڈ مین ثابت ہوئی تھیں۔" ڈولی نے کہا جو عقبی نشست پر براجمان تھی۔

"میرا خیال ہے کہ ہم تینوں ہی آسکر ایوارڈز کے حق دار ہیں۔" پیٹرچین نے کہا جو دورویہ سڑک پر گاڑی دوڑا رہا تھا۔

"میں جانتی ہوں کہ تمہارے خیال میں ہمیں مین ہائی وے سے دور رہنا چاہیے، پیٹرچین لیکن یہ ایک فضول حرکت ہوگی۔" جینس نے کہا۔

"ہاں، دیکھو کتنا اندھیرا ہے۔" ڈولی نے تائید کی۔ "حتیٰ کہ چاند کی روشنی تک نہیں ہے۔ اگر کار بند ہوجاتی ہے اور بیٹری ڈیڈ ہوجاتی ہے تو ہم اپنے چہروں کے سامنے اپنے

ہاتھوں کو بھی نہیں دیکھ پائیں گے۔"

"اوہ ڈولی، پلیز اتنا سنسنی خیز منظر بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" جینس نے کہا۔

"ہمیں فی الوقت میری گولڈ مین سے جتنا ممکن ہوسکتا ہے، دور نکل جانے کی ضرورت ہے۔" پیٹرچین نے کہا۔

"پریشان مت ہو۔" جینس نے کہا۔ "میری کو کسی طور پتا نہیں چل سکتا کہ میں نے اس کی تمام جیولری مصنوعی جیولری سے بدل دی ہے۔ یہ فرق صرف کوئی جیولر ہی بتا سکتا ہے اور میری کو مہینوں تک اس تبدیلی کا علم نہیں ہو پائے گا۔ یا ہوسکتا ہے کہ برسوں لگ جائیں۔ اور اس کے باوجود بھی وہ مجھ پر کبھی شک نہیں کرسکے گی۔ ہم دونوں تو بہنوں کی طرح ہیں نا۔" اس نے قہقہہ لگایا۔

"میں تو صرف احتیاط کی خاطر کہہ رہا تھا۔" پیٹرچین نے کہا۔

اچانک ان کے عقب میں کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں جو تیزی سے نزدیک آرہی تھیں۔ اور پھر انہوں نے لائٹیں فلیش کرتی ہوئی دیکھیں اور ساتھ ہی سائرن بھی سنائی دینے لگا۔

"کیا تم رفتار کی حد سے تیز گاڑی چلا رہے ہو؟" ڈولی نے چیخ کر کہا۔

"نہیں۔" پیٹرچین نے جواب دیا۔ "شاید کوئی ٹیل لائٹ بجھ گئی ہو۔ مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اگر ہم پرسکون رہیں تو کچھ نہیں ہوگا۔ ڈولی، تم جیولری کے بیگ کو اپنے پیروں کے نیچے فلور بورڈ پر رکھ دو۔"

پیٹرچین نے کار کی رفتار سست کرتے ہوئے اسے سڑک کے کنارے روک لیا۔ انہیں عقب میں کار کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ پھر انہوں نے ایک نہایت روشن فلیش لائٹ کو عقب سے اپنی جانب آتے ہوئے پایا۔ انہیں وہ شخص دکھائی نہیں دے رہا تھا جس نے وہ فلیش لائٹ تھامی ہوئی تھی۔ وہ صرف اس کی آواز سن سکتے تھے۔

"پیٹرچین؟"

پیٹرچین کی سمجھ میں نہیں آیا کہ پولیس مین کو اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟ کیا میری گولڈ مین کو بروقت پتا چل گیا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے؟

"میں چاہوں گا کہ تم کار سے نیچے اتر کر کھڑے ہو جاؤ۔ تم تینوں کے تینوں۔"

جینس کو یوں لگا جیسے آواز جانی پہچانی سی ہو۔

پیٹر چین کیا ہم انگوٹھی کے بارے میں بات چیت کے لیے پولیس کو طلب کریں؟ یا پھر تم چاہو گے کہ حساب بے باق سمجھا جائے؟''

یہ سن کر پیٹر چین نے واپس اپنی لیموزین کی جانب رخ کر لیا اور بولا۔ ''تم عورتیں پاگل ہو۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کون شخص ہے جس کے بارے میں تم باتیں کر رہی ہو یا وہ میرا نام کیوں استعمال کر رہا ہے۔ لیکن میں حقیقت معلوم کر کے رہوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے لیموزین کا دروازہ کھول لیا۔ ''اس اسٹوپڈ انگوٹھی کو تم ہی رکھ لو۔'' اس نے کار میں سوار ہوتے ہوئے کہا اور دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند کر دیا۔ پھر لیموزین وہاں سے روانہ ہو گئی۔

تب دونوں عورتوں نے قہقہے لگانا شروع کر دیے۔

''ہم نے اس سے خوب بدلہ چکایا، جینس۔''

''ہاں یہ صحیح ہو گیا۔ تمہاری اس مدد کا شکریہ اور تمہاری دوست سلویا کا بھی شکریہ کہ وہ گزشتہ شب میرے ساتھ جانے پر رضامند ہو گئی تھی۔ میں نہیں سمجھتی کہ اس کی مدد کے بغیر میں یہ مہم سر کر سکتی تھی۔''

''اس ڈولی نامی عورت کے بارے میں کیا کہو گی... کیا تمہارے خیال میں وہ پیٹر چین کی پارٹنر تھی؟''

''یقیناً۔ وہ صرف متوقع شکار کے انتظار میں بار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری وہاں آمد سے قبل اس نے دیگر کئی خواتین سے بھی بات کی ہو۔ چاہے وہ شادی شدہ ہوں یا نہیں لیکن دولت مند رہی ہوں گی۔ کیا کہہ سکتے ہیں؟''

''اور پھر اس نے تمہیں اور سلویا کو بار میں داخل ہوتے دیکھا۔

''جوتوں کے حساب سے جیولری پہنے ہوئے تھیں لیکن سلویا کے بغیر میں بہت زیادہ نروس ہو جاتی۔ ڈولی مجھے ایک نظر میں تاڑ لیتی اور میرے آر پار دیکھ لیتی۔ میں اداکاری کے معاملے میں بالکل ہی گھامڑ ہوں۔''

''اوہ، لیکن تم مکمل اداکارہ ہو۔''

''ویل، ہاں۔ میرا اندازہ ہے کہ میں نے ٹھیک ہی کیا۔ ہے نا؟''

''ہاں تم نے اسے اور پیٹر چین کو مکمل طور پر بے وقوف بنا دیا۔'' اصلی میری گولڈ مین نے کہا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم نے کل پیٹر چین کو پہچان لیا تھا۔ تم نے اسے شناخت کر لیا یہ بات میرے لیے حیران کن ہے۔ تم صرف ایک شب اس کے ساتھ رہی تھیں۔ اور یہ بھی ایک سال پہلے کی بات ہے۔''

''کیا تم مذاق کر رہی ہو، میری؟ میں اس چہرے کو کبھی نہیں بھلا سکتی۔''

''چلو... بالآخر تمہیں تمہاری رقم واپس مل گئی۔''

''مجھے چیک لکھ کر دینے کا شکریہ۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ جارج وہ انگوٹھی واپس لے لے گا؟'' جینس نے پوچھا۔

''اوہ ہاں، یہ کوئی پرابلم نہیں۔ ہم برسوں سے یہ بزنس کرتے آ رہے ہیں۔ تم دونوں کے نکلنے کے بعد اس نے مجھے فون کیا تھا۔''

''اوکے... میری کار تیار کھڑی ہے اور میرا سامان بھی اس میں لد چکا تھا۔ اب مجھے روانہ ہونا چاہیے۔'' جینس نے کہا۔

''پلیز احتیاط سے کام لینا۔ اور اپنی خیر خیریت سے مطلع کرتی رہنا۔'' میری نے کہا۔

''میں رابطے میں رہوں گی۔''

''شاید اس دوران تمہاری ممی کی صحت میں بہتری آ چکی ہو۔ میں جانتی ہوں کہ چوبیس گھنٹے اس کی تیمارداری تمہارے لیے ایک سخت اور دشوار مرحلہ ہے۔''

''ہاں، لیکن میں اور کر بھی کیا سکتی ہوں؟ وہ میری ماں ہے۔''

دونوں عورتیں ایک دوسرے سے گلے ملیں اور پھر جینس اپنی کار کی جانب چل پڑی۔

کچھ دیر بعد اس کی کار روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

''یہ ایک پرفیکٹ پلان تھا۔ سب سے بہترین۔'' جینس نے کہا جو شیورلیٹ کی فرنٹ پسنجر سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

''تم ایک نہایت قابل یقین میری گولڈ مین ثابت ہوئی تھیں۔'' ڈولی نے کہا جو عقبی نشست پر براجمان تھی۔

''میرا خیال ہے کہ ہم تینوں ہی آسکر ایوارڈز کے حق دار ہیں۔'' پیٹر چین نے کہا جو دو رویہ سڑک پر گاڑی دوڑا رہا تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ تمہارے خیال میں ہمیں مین ہائی وے سے دور رہنا چاہیے، پیٹر چین لیکن یہ ایک فضول حرکت ہو گی۔'' جینس نے کہا۔

''ہاں، دیکھو کتنا اندھیرا ہے۔'' ڈولی نے تائید کی۔ ''حتیٰ کہ چاند کی روشنی تک نہیں ہے۔ اگر کار بند ہو جاتی ہے اور بیٹری ڈیڈ ہو جاتی ہے تو ہم اپنے چہروں کے سامنے اپنے

ہاتھوں کو بھی نہیں دیکھ پائیں گے۔''

''اوہ ڈولی، پلیز اتنا سنسنی خیز منظر بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' جینس نے کہا۔

''ہمیں فی الوقت میری گولڈ مین سے جتنا ممکن ہو سکتا ہے، دور نکل جانے کی ضرورت ہے۔'' پیٹر چین نے کہا۔

''پریشان مت ہو۔'' جینس نے کہا۔ ''میری کو کسی طور پتا نہیں چل سکتا کہ میں نے اس کی تمام جیولری مصنوعی جیولری سے بدل دی ہے۔ یہ فرق صرف کوئی جیولر ہی بتا سکتا ہے اور میری کو مہینوں تک اس تبدیلی کا علم نہیں ہو پائے گا۔ یا ہو سکتا ہے کہ برسوں لگ جائیں۔ اور اس کے باوجود بھی وہ مجھ پر کبھی شک نہیں کر سکے گی۔ ہم دونوں تو بہنوں کی طرح ہیں نا۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔

''میں تو صرف احتیاط کی خاطر کہہ رہا تھا۔'' پیٹر چین نے کہا۔

اچانک ان کے عقب میں کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں جو تیزی سے نزدیک آ رہی تھیں۔ اور پھر انہوں نے لائٹیں فلیش کرتی ہوئی دیکھیں اور ساتھ ہی سائرن بھی سنائی دینے لگا۔

''کیا تم رفتار کی حد سے تیز گاڑی چلا رہے ہو؟'' ڈولی نے چیخ کر کہا۔

''نہیں۔'' پیٹر چین نے جواب دیا۔ ''شاید کوئی ٹیل لائٹ بجھ گئی ہو۔ مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اگر ہم پرسکون رہیں تو کچھ نہیں ہو گا۔ ڈولی، تم جیولری کے بیگ کو اپنے پیروں کے نیچے فلور بورڈ پر رکھ دو۔''

پیٹر چین نے کار کی رفتار سست کرتے ہوئے اسے سڑک کے کنارے روک لیا۔ انہیں عقب میں کار کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ پھر انہوں نے ایک نہایت روشن فلیش لائٹ کو عقب سے اپنی جانب آتے ہوئے پایا۔ انہیں وہ شخص دکھائی نہیں دے رہا تھا جس نے وہ فلیش لائٹ تھامی ہوئی تھی۔ وہ صرف اس کی آواز سن سکتے تھے۔

''پیٹر چین؟''

پیٹر چین کی سمجھ میں نہیں آیا کہ پولیس مین کو اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟ کیا میری گولڈ مین کو بروقت پتا چل گیا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے؟

''میں چاہوں گا کہ تم کار سے نیچے اتر کر کھڑے ہو جاؤ۔ تم تینوں کے تینوں۔''

جینس کو یوں لگا جیسے آواز جانی پہچانی سی ہو۔

وہ تینوں کار سے نیچے اُتر آئے اور شیورلیٹ کے پیچھے جا کھڑے ہوگئے۔ انہیں وہ پولیس افسر اب بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ صرف آنکھوں کو چندھیا دینے والی فلیش لائٹ تھی جس کی روشنی پر نگاہیں جمانا مشکل ہو رہی تھیں۔

''اوکے!'' پولیس افسر نے کہا۔ ''میں تمہیں ایک موقع دینا چاہتا ہوں۔''

وہ تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ پولیس افسر کی بات کا کیا مطلب تھا۔

''میں اس سے قبل کہ شوٹنگ شروع کردوں، تین تک گنتی گنوں گا۔''

ان تینوں کے پاس ردعمل ظاہر کرنے کا قطعی وقت نہیں تھا۔ پولیس افسر نے کہا۔ ''تین'' اور فائرنگ شروع کر دی۔

جینس کے جسم نے جھکائی لی اور اس کا وجود اس برساتی نالے میں گر گیا جو سڑک کے کنارے سامنے سامنے چل رہا تھا۔ اس نے پہلے پیٹرپین اور پھر ڈولی کی چیخیں سنیں۔ پھر ان دونوں کے بے جان جسم سڑک پر ڈھیر ہو گئے۔

جینس نے اٹھ کر دوڑنے کی کوشش کی لیکن اس کے پاؤں نالے کی گیلی مٹی میں پھسلنے لگے۔ پھر اس پولیس افسر کی فلیش لائٹ کے حلقے نے اسے اپنی زد میں لے لیا۔ جینس کو احساس ہو گیا کہ اب اس کا کھیل بھی ختم ہونے والا ہے۔

''تم مجھ سے بچ کر نہیں جاسکتیں۔'' اس آواز نے کہا۔

تب اچانک جینس نے اس شخص کی آواز پہچان لی۔ وہ کوئی پولیس افسر ہرگز نہیں تھا جو ان کی شیورلیٹ کا تعاقب کرتا ہوا ان کے پیچھے یہاں آگیا تھا۔ وہ تو...

اس سے قبل کہ جینس اپنے خیال کو مکمل کرتی، پستول کی نال سے ایک شعلہ سا لپکا اور گولی جینس کی کھوپڑی کے آر پار ہوگئی۔

☆☆☆

''پلیز کیا مجھے کافی کا ایک اور کپ مل سکتا ہے، چارلس؟'' میری نے کہا۔

''جی میڈم۔'' چارلس نے تیزی سے کافی پاٹ اٹھایا اور ناشتے کی میز پر بیٹھی ہوئی میری کے کپ میں کافی انڈیلتے ہوئے بولا۔ ''بیوٹی فل مارننگ، میڈم۔''

''ہاں، بے شک یہ ایک سہانی صبح ہے۔'' میری نے اپنی کافی کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم اس بارے میں قطعی طور پر پُر یقین ہو کہ تم میامی منتقل ہونا چاہتے ہو؟ میں نے سنا ہے کہ یہاں اٹلانٹا کے مقابلے میں وہاں موسم خاصا گرم اور مرطوب ہوتا ہے۔''

''مجھے مرطوب آب و ہوا کی پروا نہیں ہے، میڈم۔''

''میں جانتی ہوں۔'' میری نے کہا۔ ''تم بس بہت پیسا کمانا چاہتے ہو۔''

''ہاں، یہ ایک زبردست موقع ہے۔ میری ہمیشہ یہی خواہش رہی ہے کہ میرا ساحل پر اپنا ایک بار ہو۔ میرے بھائی نے اس سلسلے میں ایک ڈیل تیار کر رکھی ہے۔''

''مجھے یقین ہے کہ تمہاری یہ ڈیل عمدہ ثابت ہوگی البتہ مجھے یہاں پر تمہاری بے حد کمی محسوس ہوگی۔''

''میں بھی آپ کو بے حد مس کروں گا، میڈم۔''

''اوہ نہیں، تم مس نہیں کروگے، چارلس۔'' میری نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''اب تم مجھے اپنا متبادل تلاش کرنے کے لیے دو ہفتے کی مہلت تو دے رہے ہو نا؟''

''اوہ، یقیناً میڈم! میں آپ کو کسی قسم کا پابند نہیں کرنا چاہتا۔''

''گڈ، تھینکس۔ بائی دا وے، مجھے افسوس ہے کہ تم نے کل یہاں اطراف میں ہونے والی تمام ہیجان انگیزی مس کردی۔'' میری نے کہا۔

''اوہ، آپ کا مطلب ہے جینس اور اس پیٹرپین کریکٹر کے مابین ہونے والا زبردست فیصلہ کن معرکہ؟''

''ہاں، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔'' میری نے بتایا۔ ''ہم نے خوب اس سے بدلہ لیا۔'' وہ مسکرائی اور پھر اپنی کافی کے کپ سے ایک بڑا سا گھونٹ بھر لیا۔

''واقعی، مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس معرکے کو مس کیا۔ میڈم۔'' چارلس کافی پاٹ کو واپس اس کی جگہ رکھنے کے لیے پلٹ گیا۔ ''لیکن میں نے اپنے کام سے ایک دن کی چھٹی کو خوب انجوائے کیا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ایک عیارانہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس کی پیٹھ میری کی جانب تھی۔

''واقعی؟'' میری نے پوچھا۔

''جی میڈم، خاص طور پر گزشتہ شب تو میں خوب لطف اندوز ہوا۔'' چارلس نے جواب دیا۔

اور اس کے ہونٹوں پر نمودار عیارانہ مسکراہٹ مزید گہری ہوتی چلی گئی۔

میں نے اپنی جیب سے چھوٹا تولیا نکالا اور اپنی پیشانی سے پسینا پونچھنے لگا۔ یہ آخر خزاں کا موسم تھا اور موسم بھی ٹھنڈا تھا لیکن شدید ہیجانی کیفیت کی بنا پر مجھے پسینے آرہے تھے۔

میں اس بوڑھے شخص سے کئی فٹ کے فاصلے پر کھڑا اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کسی بالائی ریاست کے دور پرے کا پروفیسر تھا اور غالباً اس کا تعلق وہاں کے فینسی اسکولز میں سے کسی ایک سے تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا ایک بڑا سا کوٹ اور سیاہ چمک دار جوتے پہنے ہوئے تھے۔ اس نے آنکھوں پر ایک بڑا سا چشمہ پہن رکھا تھا جو اس کی ناک پر ٹکا ہوا تھا اور اس کے سر کے بال گھنے اور چاندی رنگ کے تھے۔

وہ قبر کے پاس کھڑا تھا اور ایک چھوٹی نوٹ بک میں تیزی سے کچھ نوٹس لکھ رہا تھا۔

پھر اس نے نوٹ بک بند کرکے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لی اور میری جانب گھومتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری بدحواسی میرے اعصاب کو جھنجلا رہی ہے۔ تمہیں کیا پرابلم ہے لڑکے؟''

''نہیں سر۔'' میں نے جھوٹ بولا۔ میں نے اپنا چھوٹا تولیا واپس اپنی جیب میں رکھ لیا اور ساکت کھڑا رہا۔ مجھے یہ بات ناگوار گزری تھی کہ اس نے مجھے ''لڑکا'' کہا تھا جبکہ میری عمر پچیس برس سے زیادہ تھی۔ میرا خیال ہے اس بوڑھے کی عمر کے مقابلے میں، میں ایک لڑکا ہی تھا۔

اس گورکن کی مشکل جسے ایک ناگوار فریضہ انجام دینا تھا

انسان... اللہ کی تخلیق ہے... اور اس تخلیق کو ایک دن اپنے مالک کی جانب لوٹ جانا ہے... زندگی کی یہ ایک اٹل اور تلخ حقیقت ہے... سانسوں کی ڈور منقطع ہونے کے بعد انہیں اپنے آخری مرقد تک پہنچانا اس کی ذمّے داری تھی۔

گورکن

بابر نعیم

”میرا خیال ہے کہ تمھیں اس سے پہلے کبھی کسی تابوت کو قبر سے کھود کر باہر نکالنے کا اتفاق نہیں ہوا؟“ وہ اب مجھ سے صرف ایک ہاتھ کے فاصلے پر آن کھڑا ہوا تھا۔

”نہیں سر۔“ میں نے اعتراف کیا۔ میں نے اس سے آنکھیں چراتے ہوئے نظریں زمین پر مرکوز کردیں۔ ”میں قبریں کھودتا ہوں تاکہ مرنے والوں کو زمین میں سکون سے مدفون کردوں۔ میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں انہیں زمین سے کھود کر باہر نکالنے کے کاروبار سے وابستہ ہوں گا۔ یہ انتہائی ـــــ غیر فطری لگتا ہے سر۔“ میرا جی چاہا کہ میں اپنا چھوٹا تولیا نکال کر ایک بار پھر اپنی پیشانی صاف کرلوں۔

”غیر فطری، ایں؟“ اس بوڑھے نے قبر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سو میں یقین کرلوں کہ تم ایک توہم پرست ہو؟“

”میرا خیال تو یہ ہے کہ میں بس مُردوں کی عزت کرتا ہوں اور ان کی بے حرمتی نہیں چاہتا، سر۔“ میں نے جواب دیا۔

”اوکے، اس معاملے کو اس طرح دیکھو، لڑکے۔ یہ شخص چھ فٹ نیچے دفن ہے ـــــ اس کی موت قدرے پُراسرار ہے۔ اس کی موت کی وجہ کہیں درج نہیں ہے اور یہ میرا کام ہے کہ یہ معلوم کروں وہ کس طرح مرا ہے۔ لہٰذا میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ اس معاملے کو اس انداز سے دیکھو جیسے اس شخص کی زندگی کو عزت بخش رہے ہو۔ یہ اس کا حق ہے کہ اس کی پُراسرار موت کی چھان بین کی جائے۔ کیا تم اس سے اتفاق نہیں کرتے؟“

”یس سر! میرا خیال ہے کہ اگر اس سے مرنے والے کی روح کو قرار آسکتا ہے تو ٹھیک ہے۔“ اس بوڑھے نے جو صورتِ حال بیان کی تھی، اس سے مجھے قدرے تقویت مل گئی تھی۔

”میرے پاس مدفون کو قبر سے نکالنے کی کارروائی کا عدالتی حکم نامہ موجود ہے۔“ اس نے اپنے کوٹ کے بریسٹ پاکٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”تم قبر کھودو، میں لاش کا معائنہ کروں گا۔ اس طرح یہ کام ہوجائے گا۔“

یہ کہہ کر وہ بوڑھا پیچھے ہٹ گیا اور ایک قریبی درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔

اس کا اشارہ سمجھتے ہی میں نے اپنا بیلچہ اٹھایا اور قبر کھودنا شروع کردی۔

جونہی میرا بیلچہ تابوت سے ٹکرایا، بوڑھا میری مدد کو آ گیا۔ اس نے تابوت کو کھینچ کر اوپر لانے اور قبر سے باہر رکھنے میں میری مدد کی۔

تابوت حیرت انگیز طور پر ہلکا تھا۔ تب میں نے خود کو یاددلایا کہ میں تازہ لاشوں کو زمین میں دفنانے کا عادی جو کہ وزنی ہوتی ہیں اور اس شخص کو مرے ہوئے عشرے سے زیادہ وقت گزر چکا ہے اور اب اس کی ہی باقی رہ گئی ہوں گی۔

یہ خیال آتے ہی میرا بدن لرز گیا۔

وہ بوڑھا پروفیسر تابوت کے برابر میں جھک گیا فوراً ہی تابوت کا ڈھکن اٹھانے لگا۔ یہ احساس ہوتے ہی وہ کیا کرنے جارہا ہے، میں تیزی سے دور ہٹ گیا اور چہرہ دوسری طرف گھما دیا۔

”تم تو ہر وقت لاشوں کو دیکھنے کے عادی گورکن۔“ اس بوڑھے نے کہا۔

”یس سر! لیکن میں نے ایسے کسی کو کبھی نہیں جسے مرے ہوئے اتنا عرصہ گزر چکا ہو۔“ میں نے ایک پھر اپنی پیشانی پونچھتے ہوئے کہا۔

”مجھے مشکل پیش آرہی ہے۔ ڈھکن اٹھانے تمھیں میری مدد کرنا ہوگی۔“ بوڑھے نے ہانپتے ہوئے

میں نے اس کی مدد کی درخواست نظرانداز کردی

”کیا آپ یہ کام عام طور پر اپنے آفس میں نہیں کیا کرتے سر؟ اس تابوت کو یہاں قبرستان میں کھولنا کچھ مناسب لگ رہا۔“

”تمھیں اپنی رقم نہیں چاہیے کیا، لڑکے؟ اب سے کام لو اور یہاں آجاؤ۔“

میں نے اپنا چھوٹا تولیا اپنی جیب میں ٹھونسا تابوت کے پاس چلا گیا۔ ہم دونوں کو تابوت کے ڈھکن کی گرفت ڈھیلی کرنے کے لیے متعدد بار کوشش پڑی تب کہیں جاکر وہ ڈھکن ڈھیلا پڑا۔

ہم نے ڈھکن کو تابوت سے اٹھا کر نیچے ایک فرش پر رکھ دیا۔ میں نے فوراً ہی اپنا چہرہ دوسری طرف لیا۔ میں تابوت کے اندر دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

”جیسا کہ میں نے اندازہ لگایا تھا۔“ بوڑھے نے پہلے تو میں یہی سمجھا کہ وہ مجھ سے مخاطب ہے نے جواب دینے کے ارادے سے بوڑھے کی جانب لیکن اس کی تمام تر توجہ تابوت پر مرکوز تھی۔

تب میں نے تابوت میں جھانکا کہ وہ بوڑھا کس بات کا حوالہ دے رہا تھا۔

میرے وجود میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

تابوت خالی تھا!

تنگ آمد

مریم کے خان

انسان کا کوئی فعل انفرادی نہیں رہتا... عملی طور پر وقوع پذیر ہونے کے بعد وہ اجتماعی صورت اختیار کرلیتا ہے... ہمارے اردگرد پھیلے کچھ ایسے ہی لوگوں کا احاطہ کرتی روداد جو ہر شریف آدمی کی زندگی کو بہ آسانی کٹھن بنانے کا ہنر رکھتے تھے... غیر قانونی سرگرمیوں سے دامن بچا کر چلنا کس قدر دشوار تر ہوتا جارہا ہے... شریف اور سادہ لوح لوگوں کے لیے ایک لمحہ فکریہ!

اچھے اور برے لوگوں سے دنیا بھری پڑی ہے..... وہ بھی اپنے لیے کسی نجات دہندہ کا منتظر تھا

میں ایک شریف آدمی ہوں۔ اتنا ہی شریف جتنا اس ملک میں کوئی بیوی بچوں والا ملازم پیشہ شخص ہوسکتا ہے۔ گھر میں بیوی باس ہوتی ہے اور دفتر میں تو باس ہوتا ہی ہے۔ مجھے دونوں جگہ صرف سننا اور حکم کی تعمیل کرنا ہوتی ہے۔ محلے والوں سے بھی نہایت شریفانہ اور انکسارانہ سلام دعا ہے۔ پیدا ہونے سے لے کر زندگی کے تیس سال ایک ہی گھر اور ایک ہی محلے میں گزارے مگر بچپن کی چھوٹی موٹی لڑائیوں... جن میں ہمیشہ مجھے ہی مار پڑتی تھی، بچوں

سے بھی اور اس کے بعد گھر میں اماں ابا سے بھی، کے سوا یاد نہیں کہ کسی سے ہاتھا پائی والی لڑائی کی ہو۔ بلکہ منہ زبانی جھگڑے بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ محلے کے ہر شخص سے سلام دعا اور ملنا جلنا ہے۔ اس معاملے میں بعض امن پسند لوگ میری مثال بھی دیتے ہیں کہ بندہ ہو تو شریف الدین جیسا۔ جی ہاں! نام بھی شریف ہے۔ کبھی کبھی بیوی مذاق میں کہتی ہے کہ ملک کے سارے شریف نامی گرامی اور جانے پہچانے ہیں، صرف ایک آپ ہیں جن کو بس محلے والے جانتے ہیں۔

مجھے بھی ایسا لگتا تھا کہ میں مرتے دم تک ایسا ہی شریف رہوں گا۔ کسی کو تکلیف پہنچانا تو دور کی بات تھی، اس کا سوچ کر ہی میرے ہاتھ پاؤں اور دل کانپنے لگتا تھا۔ عرفِ عام میں مجھ جیسے شخص کو بزدل کہا جاتا ہے مگر لوگ میری سادہ دلی اور سب سے بنا کر رکھنے کی پالیسی کی وجہ سے مجھے شریف کہتے ہیں۔ میں اتنا بے ضرر ہوں کہ شر پسند افراد بھی مجھ سے الجھنا اور میری دل آزاری سے گریز کرتے ہیں اور میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ اس کے باوجود کبھی کوئی زیادتی کر گزرتا ہے تو میں درگزر سے کام لیتا ہوں۔ میں اس کی زیادتی کو یوں ذہن سے نکال دیتا ہوں جیسے کسی نے میرے ساتھ کچھ غلط کیا ہی نہ ہو۔

والد صاحب نے کسی سستے زمانے میں یہ گھر لے لیا تھا۔ اس وقت یہ کالونی نئی نئی آباد ہو رہی تھی۔ انہوں نے اپنی محدود آمدنی سے بچت کر کے یہ جگہ خریدی اور پھر تھوڑا تھوڑا کر کے اس پر پہلے ایک کمرا بنایا اور بیوی بچوں سمیت یہاں آگئے۔ پھر رفتہ رفتہ مکان بناتے رہے۔ کرائے سے جو بچتا تھا، وہ مکان پر لگاتے رہے۔ والدہ سادہ طبیعت کی خاتون تھیں اور وہ شوہر کا پورا ساتھ دیتی رہیں۔ اسی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ ہمارے سروں پر چھت قائم ہوئی اور ہم بہن بھائیوں نے تعلیم بھی حاصل کی۔ میں سب سے بڑا تھا اور مجھ سے چھوٹی دو بہنیں تھیں۔ امی ابو کا خیال تھا کہ پہلے بیٹیوں کی شادی کریں گے اور دوسری بیٹی کی شادی کے ساتھ ہی رفیعہ کو لے آئیں گے جو میری پھوپی کی اکلوتی بیٹی تھی اور بچپن سے مجھ سے منسوب تھی۔

مگر ہوا یہ کہ اچانک پھوپی کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ ابو سے اصرار کرنے لگیں کہ ان کی زندگی کا کچھ پتا نہیں اور وہ اپنی زندگی میں رفیعہ کو اپنے گھر کا دیکھنا چاہتی ہیں۔ ابو بہن سے بہت محبت کرتے تھے اور یوں میری اور رفیعہ کی شادی ہوگئی جبکہ ابھی مجھے نوکری کرتے ہوئے ایک سال بھی نہیں ہوا تھا اور در حقیقت میں کیریئر کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ نوکری کے ساتھ ہی شام کو پڑھ کر ایم کام یا ایم بی اے کرلوں تو آگے اچھی نوکری مل جائے گی۔ مگر رفیعہ آئی تو شام اس کے نام ہوگئی اور اب پڑھنا بہت مشکل ہوگیا۔ پھوپی ماشاء اللہ آج بھی حیات ہیں اور انہیں وہ دوسرا ہارٹ اٹیک نہیں ہوا جس کا ذکر کر کے انہوں نے ابو کو جذباتی کر دیا تھا۔ بیٹی کو گھر میں آباد دیکھ کر ان کا دل بالکل ٹھیک ہوگیا۔ البتہ میرا کیریئر بنانے کا منصوبہ ادھورا رہ گیا۔

صرف بی کام کی بنیاد پر میں کتنا آگے جا سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے میری کمپنی کا مالک اچھا آدمی ہے اس نے ملازموں کی تنخواہ کا معاملہ اپنی انتظامیہ پر چھوڑنے کے بجائے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور وہ خود کارکردگی کا جائزہ لے کر ہر سال مناسب اضافہ کرتا ہے ورنہ اگر یہ چیز میرے باس پر چھوڑ دی جاتی تو شاید تین سال بعد جا کر میری تنخواہ میں اضافہ ہوتا۔ سال بہ سال اضافے سے یہ ہوا کہ میں مہنگائی کا مقابلہ کرنے کے قابل رہا۔ ابو نے ریٹائرمنٹ پر ملنے والی رقم سے دونوں بہنوں کی ایک ساتھ شادی کر دی اور ہلکے ہوگئے۔ پھر پرانے زمانے کے وضع دار لوگوں کی طرح جب کرنے کو کچھ نہیں رہا تو دنیا سے چلے گئے۔ ایک رات اچھے بھلے سوئے اور اگلی صبح امی کی چیخوں پر بھی نہیں جاگے۔

ابو کے بعد مجھے پتا چلا کہ وہ میرے لیے کیا تھے۔ اب میں گھر کا سربراہ تھا اور مجھے وہ سب دیکھنا تھا جو ابو دیکھتے تھے۔ یہ گھر بھی ان کا احسان تھا مگر ابو گئے تو مجھے لگا کہ میں گھر کے ہوتے ہوئے بھی بے چھت کا ہو گیا ہوں۔ وہ میرا سائبان تھے۔ کچھ عرصے بعد صبر آگیا اور پھر رفتہ رفتہ عادت ہوگئی۔ شادی کے دو سال بعد پہلی بیٹی ہوئی اور اس میں دل لگ گیا۔ پھر ایک بیٹا اور پھر ایک بیٹی ہوئی۔ مہنگائی اور خاندان بڑھا تو گزارہ مشکل سے ہونے لگا مگر اللہ نے عزت رکھی۔ کبھی کسی ذمے داری کے لیے قرض ادھار کی نوبت نہیں آئی۔

شہر کے حالات تو میرے بچپن سے خراب رہے ہیں۔ کبھی چند سال کے لیے پُرسکون ہو جاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ پرانا دور واپس آگیا ہے لیکن پھر سیاسی حالات کروٹ لیتے ہیں اور پھر وہی مار اماری اور قتل و غارت گری شروع ہو جاتی ہے۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ الیکشن ہوئے، نئی حکومت آئی اور سیاسی حالات بدلتے ہی امن و امان کے حالات بھی بدل گئے۔ روز لوگ مرنے لگے۔ کھلے عام

ٹارگٹ کلنگ ہونے لگی اور کسی ایک کا قاتل بھی پکڑا نہیں جاتا۔

اس لیے جب ایک روز دفتر سے واپسی پر میرے سامنے موٹر سائیکل پر سوار دو افراد نے ایک گاڑی والے کو قتل کیا تو میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ اس واقعے کا کسی سے ذکر تک نہیں کروں گا کیونکہ بات زبان سے نکلنے کے بعد پرائی ہو جاتی ہے۔ میں بائک سے محلے کی طرف جانے والی سڑک پر مڑا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک پارک تھا۔ سامنے سے کار نمودار ہوئی اور اس کے پیچھے بائک والے تھے۔ انہوں نے کار کے سامنے آکر اسے روکا اور پھر اسکرین پر فائر کر کے اندر موجود شخص کو قتل کر دیا۔ مارے جانے والے کو مزاحمت کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس ٹارگٹ کلنگ کی خاص بات یہ تھی کہ قاتل میرا جانا پہچانا اور میرے ہی علاقے کا تھا۔

ندیم احسان صرف بیس بائیس سال کا تھا۔ چند سال پہلے تک وہ میٹرک کا ذہین اور ہونہار طالبِ علم تھا۔ اس کا باپ ٹھیکے داری کرتا تھا اور اسی علاقے میں کام کرتا تھا۔ دو بڑے بھائی بھی باپ کے ساتھ کام کرتے تھے۔ ندیم تیسرے نمبر پر تھا۔ اس نے بہت اچھے اسکول سے میٹرک کیا۔ میٹرک میں اس کا اے ون گریڈ آیا تھا۔ متوسط طبقے میں یہ رجحان ہے کہ بچوں کو بہترین اسکول میں تعلیم دلائی جائے۔ بھلے ان اسکولوں میں فیس ہزاروں میں ہو۔ لیکن اس کے بعد انہیں ڈاکٹر انجینئر بنانے کا خواب دیکھتے ہوئے کسی سرکاری کالج میں داخل کرا دیا جاتا ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ اب اکثر سرکاری کالج سیاسی پارٹیوں کے گڑھ بن چکے ہیں اور وہاں نصابی سرگرمیاں ہوں یا نہ ہوں، پارٹی سرگرمیوں میں ہر طالبِ علم کو لازمی حصہ لینا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو بچہ میٹرک میں اے ون گریڈ لیتا ہے، وہ کالج میں پہلے سال ہی کئی پیپرز میں رہ جاتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اس کی ذہانت ختم ہو جاتی ہے یا پڑھنے سے اس کا دل ہٹ جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اسے پڑھنے والا ماحول نہیں ملتا۔ اس کے برعکس کردار خراب کرنے والا ماحول ملتا ہے۔

ندیم کا باپ چند جماعت پڑھا تھا اور اسے تعلیم کا شعور بھی نہیں تھا۔ اس کے بڑے بھائیوں نے بڑی مشکل سے میٹرک کیا اور پھر باپ کے ساتھ کام پر لگ گئے۔ صرف ندیم کو شوق تھا لیکن جب اس نے بہت اچھے نمبروں سے میٹرک کرلیا تو اس کے باپ نے اسے آگے پڑھانے کا فیصلہ کیا۔ جس سرکاری کالج میں اس کا نام آگیا، اسے وہاں بھیج دیا۔ کالج کا ماحول وہی تھا۔ کلاسوں میں تالے لگے تھے مگر دوسری قسم کی کلاسز لازمی ہوتی تھیں۔ لیکچر دیے جاتے تھے اور لڑکوں کو مجبور کیا جاتا کہ وہ پارٹی سرگرمیوں میں شامل ہوں اور یہ سرگرمیاں سارے سال جاری رہتی تھیں۔ لڑکے اس وقت خام حالت میں ہوتے ہیں، جیسی صحبت ملتی ہے ویسے ہو جاتے ہیں۔

ندیم چھوٹے قد کا خوش شکل اور صحت مند لڑکا تھا۔ کوئی غلط سلط چیز نہیں کھاتا تھا جس کی گواہی اس کے موتی کی طرح چمکتے دانت بھی دیتے تھے۔ مگر کالج جانے کے ایک مہینے کے اندر اس کے دانت رنگین ہوگئے۔ اکثر گلی میں سگریٹ کا دھواں اڑاتا نظر آتا۔ باپ اور بھائیوں کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہیں تھی کیونکہ وہ خود پان گٹکے اور سگریٹ کے عادی تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ندیم کے دوستوں کا حلقہ بدل گیا۔ وہ جن کے ساتھ پل اور کھیل کر جوان ہوا تھا، ان میں سے اکثر اب اس سے ملنے سے گریز کرتے تھے۔ وہ اچھے کالجوں میں جا چکے تھے اور اب اپنا کیریئر بنانے میں لگے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ندیم کا اٹھنا بیٹھنا علاقے میں قائم سیاسی پارٹی کے دفتر میں ہونے لگا تھا۔ کچھ عرصے بعد اس نے کالج جانا ترک کر دیا اور ہمہ وقت وہیں پایا جاتا۔ اس کا تعلیمی سفر بھی کامیابی سے جاری رہا حالانکہ وہ کتاب اٹھا کر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کرتا تھا مگر ہر سال آسانی سے پاس ہو جاتا۔

وہ تین سال میں ترقی کر کے پارٹی میں ایک اوپری عہدے پر پہنچ گیا لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس حد تک پہنچ گیا ہوگا۔ اس نے آدمی کو قتل کیا اور پھر پلٹ کر دیکھا کہ کون آ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک پستول تھا جس سے اس نے فائرنگ کی تھی اور اس کے پاس سے گزرتے ہوئے میری جو حالت تھی، وہ بیان سے باہر ہے۔ مجھے لگا کہ ابھی وہ مجھے بھی شوٹ کر دے گا مگر ایسا نہیں ہوا اور میں... بحفاظت اس کے پاس سے گزر گیا۔ گھر آتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ یہ بات ہمیشہ کے لیے اپنے سینے میں رکھوں گا۔ اس لیے میں کچھ دیر کے لیے محلے کے جنرل اسٹور پر رک گیا تاکہ اپنی اڑتی ہوائیوں پر قابو پا سکوں۔ میں نے بلاوجہ کچھ خریداری کی اور جب میرا دل ذرا تھما تو گھر آیا۔ اس پر بھی رفیعہ نے فوراً تاڑ لیا۔ اس نے گھر میں گھستے ہی کہا۔ ”کیا بات ہے؟ کچھ ہوا ہے جو یوں دکھائی دے رہے ہیں؟“

www.paksociety.com

”کیا... کیسا دکھائی دے رہا ہوں؟“
رفیعہ نے مجھے پکڑ کر آئینے کے سامنے لا کھڑا کیا۔ میری آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور ان سے خوف جھانک رہا تھا۔ چہرے کا رنگ سانولے کے بجائے سفید ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”وہ اصل میں آتے ہوئے بائک ایک گاڑی سے ٹکراتے بچی۔ اگر ٹکر ہو جاتی تو بچنا مشکل تھا۔“
”اللہ نہ کرے۔“ رفیعہ نے جلدی سے کہا۔ ”اللہ نے خیر کی، میں ابھی صدقہ نکالتی ہوں۔“
میں نے سکون کا سانس لیا کہ اس نے شک نہیں کیا اور میرے جھوٹ پر یقین کر لیا۔ اس واقعے کے بعد کئی دن تک میرا دل ہولتا رہا کیونکہ میں اس قتل کا عینی گواہ تھا۔ مارا جانے والا بھی پارٹی سے منسلک تھا اور اس کے جنازے میں سب شامل تھے۔ شاید ندیم بھی تھا۔ اندرون خانہ کوئی چکر تو تھا جس کی پاداش میں وہ یوں مارا گیا تھا۔ اگر ندیم اور اس کے ساتھیوں کو خیال آجاتا کہ میں ان کے لیے خطرہ ہوں تو وہ ایک گولی اور خرچ کرنے میں قطعی نہ ہچکچاتے۔ جب چند دن ایسا نہیں ہوا تو میرا خوف رفتہ رفتہ کم ہونے لگا اور ایک ہفتے بعد میں نارمل ہو گیا۔ ورنہ باہر آتے جاتے میرا دل دھڑکتا تھا۔ یہ اس واقعے سے کوئی دس دن بعد کی بات تھی۔ میں دفتر سے آنے کے بعد کچھ سامان لینے محلے کے جنرل اسٹور تک گیا تھا۔ سامان لے کر نکل رہا تھا کہ بائک پر ندیم وہاں آگیا۔ اگرچہ اس سے پہلے ہمارے درمیان کبھی سلام دعا سے زیادہ بات نہیں ہوئی تھی مگر اس روز وہ بہت گرم جوشی سے ملا۔
”شریف بھائی، کیا حال ہے؟“
میں گڑبڑایا لیکن پھر جلدی سے کہا۔ ”اللہ کا شکر ہے۔ تم سناؤ کیسے ہو؟“
بہ ظاہر میں پُرسکون تھا لیکن اندر سے میری جو حالت ہو رہی تھی، اس سے میں واقف تھا یا میرا خدا واقف تھا۔
”بس شریف بھائی، اللہ کا شکر ہے یہاں بھی۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”آپ سے ایک کام تھا۔“
”کہو۔“
”میرے ساتھ چلیں۔“
”تمہارے ساتھ؟“ میں نے مرے ہوئے لہجے میں کہا۔
”ہاں، بس دس منٹ لگیں گے۔“
”وہ میں یہ سامان لینے آیا تھا گھر کے لیے...“
”آیئے سامان دے کر چلتے ہیں۔“
اس بار کوئی بہانہ نہیں تھا۔ مجبوراً میں اس کے ساتھ بائک پر بیٹھا اور گھر پہنچ گیا۔ میں شاپرز سنبھالتا ہوا اترا۔ ”ابھی آتا ہوں۔“
”میں انتظار کر رہا ہوں۔“ اس نے پھر معنی خیز انداز میں کہا۔ میں اندر آیا تو رفیعہ نے ایک بار پھر چہرے سے بھانپ لیا۔
”خیریت ہے، کیا کوئی بھوت دیکھ کر آرہے ہیں؟“
”نہیں... وہ محلے کا لڑکا ندیم ہے نا...“
”وہ تو ابھی زندہ ہے، اس کا بھوت نہیں دیکھ سکتے۔“
رفیعہ کی بے وقت کی شوخی سے میں جھنجلا گیا۔ ”میرا مطلب ہے وہ مجھے کہیں لے جا رہا ہے، کہہ رہا ہے کوئی کام ہے۔“
”تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟“
”تم جانتی ہو، وہ پارٹی کا آدمی ہے۔“
”ہاں تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ اچھا لڑکا ہے، آتے جاتے کہیں ملے تو ادب سے سلام کرتا ہے۔“
مصیبت یہ تھی کہ میں رفیعہ کو بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ ”تم جانتی ہو میں ایسے لوگوں سے ذرا گریز کرتا ہوں۔“
”کب تک آئیں گے؟“
”دیکھو... کہہ تو رہا ہے کہ دس منٹ کا کام ہے۔“ میں نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ندیم منتظر تھا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے بائک دوڑا دی۔ چند منٹ بعد ہم علاقے کے پارٹی دفتر میں تھے۔ ندیم مجھے پچھلے حصے کے ایک کمرے میں لایا۔ یہاں اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور ایک کولڈ ڈرنک لے آیا۔
”شریف بھائی، میں سوچ رہا تھا کہ آپ سے بات کروں لیکن دل نہیں مان رہا تھا کہ آپ جیسے شریف بندے کو تنگ کروں لیکن اب مسئلہ ایسا ہو گیا کہ مجھے بات کرنی پڑی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ معاملہ میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔“
”کیسا معاملہ؟“ کولڈ ڈرنک میرے حلق میں اٹکنے لگی۔
”وہی جو اس دن آپ نے دیکھا تھا پارک کے ساتھ۔“ اس نے واضح اشارہ دیا اور پھر ہاتھ سے پستول چلا کر دکھایا۔ ”میرے ساتھ شکیل بھائی بھی تھے۔“
”ہاں، ایک آدمی اور تھا لیکن اس نے ہیلمٹ پہن رکھا تھا۔“ میں نے کہا۔ ویسے میں شکیل کو بھی جانتا تھا، وہ بھی اسی دفتر میں ہوتا تھا۔

”شکیل بھائی آپ کو اتنا نہیں جانتے ہیں اس لیے وہ فکرمند تھے کہ کہیں آپ پولیس...“
”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”یقین کرو، میں نے اپنی بیوی تک کو نہیں بتایا ہے۔“
”مجھے آپ کی بات کا یقین ہے لیکن شکیل بھائی نہیں سمجھ رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ خطرہ باقی نہیں رہنا چاہیے... آپ سمجھ رہے ہیں نا؟“
میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔ میں اس کی بات سمجھ رہا تھا۔ شکیل میرے قتل کی بات کر رہا تھا کیونکہ میں عینی گواہ تھا، انہیں پکڑوا سکتا تھا۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ ”اللہ کے واسطے... میرے چھوٹے بچے ہیں اور میرے سوا کوئی نہیں ہے جو میرے گھر کو چلا سکے۔ مجھے کچھ ہوا تو میری ماں تو فوراً مر جائے گی۔“
”آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔“ اس نے مجھے تسلی دی۔ ”میں نے اسی لیے یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ شکیل بھائی کو میں نے کہہ دیا ہے کہ آپ میری ذمے داری ہیں۔“
میری جان میں جان آئی اور مجھے محسوس ہوا کہ فوری طور پر میری جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں نے سچ مچ شکر گزاری سے کہا۔ ”ندیم! میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے میرا فیور کیا۔“
”اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن شریف بھائی آپ کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔“
”ساتھ؟“ میں پھر گھبرا گیا۔ ”کس کام میں؟“
”میں کسی غلط کام کی بات نہیں کر رہا ہوں۔“ اس نے مجھے تسلی دی۔ ”آپ کو کچھ عرصے شام کو یہاں پارٹی دفتر آکر بیٹھنا ہوگا۔ زیادہ نہیں بس ایک دو گھنٹے کے لیے... آپ پڑھے لکھے ہیں چھوٹے موٹے کام کر لیجیے گا ورنہ اس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بس آکر بیٹھ جایا کریں۔“
میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہاں آنے کا مطلب تھا کہ آدمی پھنس جائے۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ ایک بار آدمی جہاں اٹھنے بیٹھنے لگتا ہے، اس پر ہمیشہ کے لیے اس جگہ کی چھاپ لگ جاتی ہے۔ لازمی بات تھی، میں بھی اسی سیاسی پارٹی کا شمار ہونے لگتا اور بعد میں اس حوالے سے مجھ پر بھی آفت آسکتی تھی۔ ندیم کے ہاتھوں مارے جانے والا انجام میرے سامنے تھا۔ وہ بھی اسی دفتر میں بیٹھتا تھا اور بہ ظاہر سیاسی کارکن تھا۔ ندیم مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے یاد دلایا۔ ”شریف بھائی، آپ کی ذمے داری میں نے لی ہے۔“
”میں منع نہیں کر رہا ہوں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”لیکن تم جانتے ہو میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ آج تک کسی چکر میں نہیں پڑا۔ اب میں یہاں بیٹھنا شروع کر دوں تو لوگ مجھ سے سوالات کریں گے۔“
وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”شریف بھائی، کوئی آپ سے سوال نہیں کرے گا، کس میں اتنی جرأت ہے؟“
وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ایک بار میں یہاں بیٹھنا شروع کر دیتا تو لوگوں میں ہمت نہیں ہوتی کہ وہ مجھ سے سوال یا کوئی الٹی سیدھی بات کریں۔ بادل ناخواستہ میں نے اقرار کیا۔ ”ٹھیک ہے، میں آیا کروں گا لیکن زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکوں گا۔ گھر بار بچوں والا ہوں۔ صبح سے شام تک دفتر میں ہوتا ہوں اور چھ سات بجے گھر آتا ہوں۔“
”دفتر کی آپ فکر نہ کریں اگر وہاں کوئی اڑی تڑی کرتا ہے تو بس ایک فون کال کافی ہوگی۔ آپ ٹھیک پانچ بجے اٹھ جانا۔“
”نہیں، وہاں کوئی ایسا نہیں ہے۔ اصل میں اکاؤنٹس میں ہوں نا تو سارا دن کا کام نمٹا کر اٹھنا پڑتا ہے ورنہ اگلے دن جمع ہو جاتا ہے۔ میں مینیج کر لوں گا۔“ میں نے ڈر کر کہا کہ کہیں یہ میرے دفتر تک نہ پہنچ جائے۔
”بس تو آپ کل آٹھ سے دس بجے تک آکر بیٹھنا۔ ادھر والا کمرا جس میں پبلک آتی ہے۔“ ندیم نے برابر والے کمرے کی طرف اشارہ کیا پھر مجھے لے کر باہر آیا۔ وہاں شکیل بیٹھا تھا۔ ندیم نے اسے بتایا کہ اب میں بھی پارٹی کے لیے کام کروں گا۔ شکیل نے خوش اخلاقی سے کہا۔ ”خوش آمدید شریف بھائی... اگر آپ ہماری پارٹی میں شامل ہوں گے تو اس سے ہماری ساکھ اچھی ہوگی۔“
”بالکل ورنہ لوگ ہمارے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں، آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔“ ندیم نے کہا۔ ”آیئے میں آپ کو گھر تک چھوڑ دوں۔“
”تم زحمت نہ کرو، میں چلا جاؤں گا۔“ میں نے منع کیا لیکن ندیم اصرار کر کے تقریباً زبردستی مجھے گھر تک چھوڑنے آگیا۔ رفیعہ انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔
”کیوں لے گیا تھا وہ...؟“
میں نے سوچا اور رفیعہ کو صحیح بات بتانے کے بجائے بہانہ کیا۔ ”پارٹی دفتر میں اکاؤنٹس کا کچھ کام ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں شام کو ایک دو گھنٹے دے دیا کروں تو یہ کام ہو جائے گا۔“

”ان لوگوں کا حساب کتاب سے کیا تعلق؟“ رفیعہ طنزیہ انداز میں بولی۔

”ہوتا ہے، دفتر کے معاملات ہوتے ہیں... اس کا حساب کتاب تو رکھنا پڑتا ہے۔“

”تو آپ نے کیا کہا؟“ وہ فکر سے بولی۔ ”پہلے ہی آپ دفتر سے تھکے ہوئے آتے ہیں۔“

”کیا کہتا... انکار کر نہیں سکتا تھا اس لیے مجبوراً ماننا پڑا۔ اب کل سے جاؤں گا۔“

رفیعہ نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس کا خیال تھا کہ بس چند دن کا کام ہے اور پھر میں نہیں جاؤں گا۔ اسے کیا پتا تھا کہ یہ مصیبت نامعلوم مدت کے لیے میرے گلے پڑ چکی تھی۔ اگلے دن دفتر سے آ کر میں نے بس منہ ہاتھ دھویا اور کپڑے بدل کر ایک کپ چائے پی۔ میری چھوٹی بیٹی صوفیہ مجھ سے بہت مانوس ہے۔ شام سے ہی اس کی نظریں دروازے پر لگ جاتی ہیں کہ ابھی پاپا آئیں گے اور ہر دستک یا کال بیل پر وہ پاپا کہتی ہے۔ جب میں آتا ہوں تو ایک ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے میری جان نہیں چھوڑتی۔ خود مجھے بھی اس سے بہت پیار ہے۔ گھر میں آتے ہی سب سے پہلے اسے تلاش کرتا ہوں۔ لیکن اس روز وہ رفیعہ کی گود میں مچلتی رہ گئی اور میں گھر سے نکل گیا۔ پارٹی دفتر پہنچا تو وہاں ندیم موجود تھا۔ اس نے تمام لوگوں سے میرا تعارف کرایا حالانکہ میں سب کو اور سب مجھے جانتے تھے۔ ان لوگوں نے مجھے پارٹی میں شمولیت پر باقاعدہ مبارک باد دی اور مٹھائی منگوا کر سب کا منہ میٹھا کیا۔

میں ایک گھنٹا وہاں بیٹھا اور پھر اٹھ آیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ میں روز وہاں جاتا اور پھر میری باقاعدہ ڈیوٹی لگ گئی۔ آٹھ سے دس بجے تک میں وہاں بیٹھتا تھا۔ اس دوران میں لوگ آتے، ان کے مسئلے مسائل اور شکایتیں سنتا اور اگر ضروری ہوتا تو انہیں تحریر کر لیتا تھا۔ پھر یہ آگے بھیج دیتا اور وہاں سے ان پر کارروائی ہوتی۔ لیکن بات یہاں تک ہوتی تب بھی ٹھیک تھا۔ مجھے اپنا وقت دینا پڑ رہا تھا۔ یہ جان کی قربانی سے بہتر تھا۔ لیکن ایک دن میں وہاں پہنچا تو ندیم اور ایک اجنبی لڑکا باہر ہی مل گئے۔ ندیم نے مجھ سے کہا۔ ”شریف بھائی، آج میرے ساتھ چلو... ایک بندے کی ضرورت ہے۔“

میں فکرمند ہو گیا کیونکہ میں اب اچھی طرح جان گیا تھا کہ وہ کس طرح کے کام کرتا تھا۔ ”یار، آفس دیکھنا ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں، میں نے شکیل بھائی سے کہہ دیا ہے۔“ اس نے کہا اور مجھے بازو سے پکڑ کر بائیک پر اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ دوسرا لڑکا اپنی بائیک پر تھا۔ میں نے کہا کہ ڈبل سواری پر پابندی ہے تو وہ بے پروائی سے بولا۔ ”اس کی فکر مت کریں۔ ہمیں کوئی نہیں روکے گا۔“

واقعی ایسا ہی ہوا۔ ہم کئی جگہوں پر قانون نافذ کرنے والے محکموں کے اہلکاروں کے سامنے سے گزرے اور کسی نے رکنے کا اشارہ تک نہیں کیا۔ مزے کی بات تھی کہ کئی جگہوں پر عام لوگوں کو ڈبل سواری پر روکا ہوا تھا۔ ہم ایک تجارتی علاقے میں ایک بڑے شاپنگ سینٹر کے سامنے رکے۔ ندیم نے مجھ سے کہا۔ ”آپ یہاں بائیکس کے پاس رکیں، ہم ابھی آتے ہیں۔“

مجھے ان کے انداز سے خطرے کی بو آ رہی تھی کیونکہ وہ دونوں مسلح تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی کو دنیا سے رخصت کرنے آئے ہیں۔ میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور میرے کان فائرنگ کی آواز پر مرکوز تھے۔ لیکن کچھ دیر بعد وہ اندر سے برآمد ہوئے اور نارمل انداز میں چلتے ہوئے آئے تو میری جان میں جان آئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کوئی مارا ماری نہیں ہوئی۔ ندیم اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔ ”اچھا ہوا بڈھا شرافت سے مان گیا ورنہ آج اسے ٹپکا کر جانا تھا۔“

ندیم نے پیراشوٹ کی ہلکی سی جیکٹ پہنی ہوئی تھی جیسی کہ اکثر بائیک پر سفر کرنے والے پہنتے ہیں کہ ان کے کپڑے ٹریفک کے دھویں سے خراب نہ ہوں۔ جاتے وقت جیکٹ جسم سے چپکی ہوئی تھی لیکن اب وہ جیبوں والی جگہ سے پھولی ہوئی ہو رہی تھی۔ میں نے جب ندیم کی کمر پکڑی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی جیبوں میں نوٹوں کی گڈیاں ہیں۔ گویا وہ یہاں کسی دکان والے سے رقم وصول کرنے آئے تھے اور اگر وہ انکار کرتا تو ان کا ارادہ اسے قتل کرنے کا تھا۔ میں نے ایک بار پھر خدا کا شکر ادا کیا کہ دکان والے نے رقم دے کر اپنی جان بچا لی اور مجھے بھی کسی مصیبت میں پڑنے سے محفوظ رکھا۔ مگر ندیم نے مجھے بھتہ خوری کی ایک واردات میں ملوث کر لیا تھا۔ واپسی پر اس نے پارٹی دفتر کے بجائے مجھے گھر پر چھوڑ دیا۔ ”شریف بھائی! آج آپ سے زیادہ ہی کام لے لیا ہے، آپ آرام کریں۔“

میں فکرمند تھا اس لیے جلدی جان چھوٹنے پر زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں تو اس دلدل میں دھنستا جا رہا تھا۔ آج ندیم مجھے بھتہ لینے کے لیے ساتھ لے گیا

تھا۔ کل وہ مجھے کسی کی ٹارگٹ کلنگ میں بھی ساتھ لے جا کر ملوث کر سکتا تھا۔ اگر میں اس کے ساتھ پکڑا جاتا تو میرا کیا انجام ہوتا؟ یہ سوچ کر ہی میرا کلیجا منہ کو آنے لگتا۔ اب خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اگلے دن مجھے بخار ہو گیا۔ میں نے معمول کی دوائیں لیں مگر فائدہ نہیں ہوا۔ اگلے دن دفتر میں کام کر رہا تھا کہ چکر آ گیا۔ چند لمحے کے لیے بے ہوش ہو گیا۔ میرے ساتھی فکرمند ہو گئے اور اصرار کر کے لنچ میں مجھے دفتر کے پاس ہی ایک ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے لے گئے۔ اس نے چیک اپ کیا اور ٹائیفائیڈ کا شبہ ظاہر کیا۔ اس نے ٹیسٹ لکھ کر دیا تو اس کا شبہ درست ثابت ہوا۔ ٹائیفائیڈ کا حملہ شدید تھا۔ اس نے ایک ہفتے مکمل بیڈ ریسٹ اور کھانے پینے میں احتیاط کے ساتھ دوا کا کورس دیا۔ دفتر سے تو مجھے چھٹی مل گئی تھی، مگر میں سوچ رہا تھا کہ اس عذاب سے جان چھوٹے گی یا نہیں۔ میں نے دفتر کے نمبر پر ندیم کو کال کر کے بتایا کہ میں بیمار ہوں اس لیے دس بارہ دن دفتر نہیں آ سکوں گا۔ اس نے کمال فراخ دلی سے مجھے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں دفتر سے جان چھڑانے کی فکر میں تھا اور میری جان کس عذاب میں پھنسنے والی تھی۔ ہفتے کے دن کی وجہ سے مجھے اتوار سے اگلے اتوار تک چھٹی مل گئی اور یوں نو دن کے مسلسل آرام نے مجھے بالکل ٹھیک کر دیا۔ رفیعہ نے میری خوراک اور دوا کا پورا خیال رکھا۔ بچے خوش تھے کہ میں پہلی بار اتنے دن گھر پر رہا تھا اور میں خود ان کے ساتھ خوش رہا بلکہ ان دنوں میں نے صحیح معنوں میں جانا کہ میرا گھر میرے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے۔ امی، رفیعہ اور بچے ان کے بغیر میں کچھ نہیں تھا۔ مجھے خیال آیا کہ صرف میں ہی نہیں، میرا گھر بھی خطرے میں تھا۔ جس طرح میں اپنے گھر والوں کے بغیر کچھ نہیں تھا، اسی طرح میرے گھر والے میرے بغیر ادھورے تھے۔ ان کی خوشیاں، آزادی اور زندگی کی ضرورتیں اور آسائشیں اللہ نے میرے دم سے دی ہوئی تھیں۔ اگر میں نہ رہتا تو وہ بہت سی چیزوں سے محروم رہ جاتے اور میں انہیں اور خاص طور سے اپنے بچوں کو کسی قسم کی کوئی محرومی دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں ان کے ساتھ زندہ اور آزاد رہنا چاہتا تھا۔ پیر والے دن میں دفتر گیا اور وہاں سے واپس آ کر پارٹی دفتر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ رفیعہ نے دبے لفظوں میں کہا۔

”چھوڑیں... اگر انہوں نے بلایا تو دیکھا جائے گا۔“

رفیعہ تو سمجھ رہی تھی کہ یہ عام سا جبر ہے۔ صرف میں ہی نہیں علاقے کے اور لوگ بھی جو دل سے پارٹی کے ساتھ نہیں تھے زبردستی وہاں کی ذمے داریوں میں شامل کر لیے گئے تھے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ سیاسی دفتر کی چہل پہل اور عام لوگوں کی وابستگی دکھائی جائے۔ بہت سے اپنی خوشی سے وہاں جاتے تھے مگر ان میں اکثریت فارغ لوگوں کی تھی جو وہاں مفت کی چائے اور پان کے چکر میں بیٹھے رہتے تھے۔ کچھ میری طرح بھی تھے جو کسی وجہ سے پھنس گئے تھے اور اب پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے بلکہ میں زیادہ بُرا پھنسا تھا۔ اگر میں نہ جاتا تو امکان تھا کہ شکیل پھر مجھے خطرہ قرار دے دیتا۔ ویسے وہ بہت احترام سے ملتا تھا مگر مجھے ذرا شبہ نہیں تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ ایک منٹ میں عزت احترام اتار کر ہاتھ میں بھی دے سکتا ہے۔ یہ صرف خدشہ نہیں تھا، آئے دن میں پارٹی دفتر میں دیکھتا تھا جہاں عقبی کمرا ایسے ہی کاموں کے لیے مخصوص تھا۔ میں نے وہاں شریف اور عزت دار لوگوں کو بے عزت اور ذلیل ہوتے دیکھا تھا۔

خاندانی جھگڑے ہوں، لین دین کا معاملہ ہو یا اتفاقیہ جھگڑے ہوں، جب وہ دفتر لائے جاتے تو یہ دیکھا جاتا کہ کون سا فریق پارٹی کے قریب ہے۔ اسی کے مطابق فیصلہ ہوتا اور دوسرے کو جسمانی یا مالی سزا ملتی تھی۔ غریب گھر والوں کو مجبور کیا جاتا کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ کسی نکمے اور ناکارہ کو تھما دیں کیونکہ وہ پارٹی کا ممبر ہوتا تھا۔ شوہر کو مجبور کیا جاتا کہ وہ طلاق پر آمادہ بیوی کو طلاق دے کیونکہ بیوی کا کوئی بھائی بند یا آشنا پارٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ سب دیکھ کر مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اگر میں نے اپنی ذمے داریوں سے ذرا بھی گریز کیا تو میرے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ برا ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں رفیعہ کے منع کرنے کے باوجود وہاں چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں میری کرسی پر کوئی اور بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ایک صاحب تھے جو دل و جان سے پارٹی پر فدا تھے کیونکہ ان کے بہت سے کام پارٹی کے توسط سے ہوتے تھے اور انہوں نے پکوڑا فروشی کی دکان سے صرف چند سال میں شاندار مکان اور نمکو کی بہت بڑی دکان بنا لی تھی۔ میں وہیں دفتر میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر میں ندیم آیا اور مجھے دیکھ کر ٹھٹکا پھر اس نے مجھے نظروں سے اشارہ کیا۔ میں اٹھ کر باہر آیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”شریف بھائی! آپ سچ مچ بہت شریف آدمی ہو۔ میں اس سیٹ پر لایا تھا کہ آپ اپنا بھلا کر لو گے پر آپ نے تو کچھ کیا ہی نہیں۔“

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں نے جواب

دیا۔ ”یار تم جانتے ہو، یہ میری فطرت ہی نہیں ہے۔“

میں اس سے کہہ نہیں سکا کہ ساری عمر حلال کھایا تھا اور اپنے بچوں کو بھی حلال کھلایا تھا تو اب انہیں حرام کھلا کر اپنے ماں باپ کی ساری ریاضت تباہ کردوں مگر میں ہمت نہیں کر سکا کہ وہ خود صرف حرام کھا رہا تھا اور میری بات کو اپنے لیے طعنہ بھی سمجھ سکتا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ”آپ کی غیر موجودگی میں ریاض بھائی آگئے ہیں۔“

”تب میں کیا کروں؟“

”کچھ نہیں، آپ کی ذمے داری ختم۔“ ندیم نے کہا تو مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ میں نے شک سے پوچھا۔

”یعنی اب مجھے دفتر آکر بیٹھنا نہیں پڑے گا؟“

”ہاں، دفتر میں تو نہیں بیٹھنا پڑے گا۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے، آپ جائیں ویسے بھی آپ ابھی بیماری سے اٹھے ہیں۔“

مارے خوشی کے میں نے غور ہی نہیں کیا کہ اس نے کس انداز میں کہا تھا اور میں واپس گھر آگیا۔ رفیعہ میرے تاثرات سے سمجھ گئی کہ کوئی اچھی بات ہوئی ہے۔ اس نے پوچھا تو میں نے بتایا کہ میری جان چھوٹ گئی ہے۔ اب دفتر جاکر نہیں بیٹھنا پڑے گا۔ رفیعہ سمجھ رہی تھی کہ میں اب گھر اور بچوں کو وقت دینے کا سوچ کر خوش ہو رہا ہوں۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میری خوشی کی اصل وجہ کیا ہے۔ لیکن یہ خوشی صرف تین دن برقرار رہی۔ تیسرے دن میں دفتر سے آکر بچوں کے ساتھ لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہا تھا اور امی سے بات کر رہا تھا۔ کال بیل بجی اور میں نے باہر آکر دیکھا تو ندیم تھا۔ میں زبردستی مسکرایا اور رسمی علیک سلیک کے بعد بولا۔ ”آؤ، اندر آؤ۔“

”نہیں شریف بھائی، ایک ضروری کام ہے۔ آپ کو لینے آیا ہوں۔“

”کک... کیسا ضروری کام؟“

وہ ہنسا۔ ”اس دن جیسا نہیں ہے، آیئے میرے ساتھ۔“

مجھے اس کی بات کا یقین نہیں تھا مگر میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ مجبوراً سر ہلایا۔ ”اچھا یار! میں گھر میں بتا کر آتا ہوں۔“

میں نے رفیعہ کو بتایا تو وہ بھی فکرمند ہوگئی۔ ”یہ کون سا طریقہ ہے، آپ منع کردیں۔“

”نہیں کر سکتا، تم جانتی ہو یہ کیسے لوگ ہیں۔ ابھی خاموشی سے چلے جائیں گے اور کل میں کسی رگڑے میں آؤں گا یا راہ چلتے لٹ جاؤں گا۔ کوئی بائک چھین کر لے جائے گا۔“

اس بار میں نے رفیعہ کو اس لیے اپنا اصل خدشہ نہیں بتایا کہ مجھے تو جان کا خطرہ تھا ورنہ وہ سچ مچ مجھے جانے نہیں دیتی۔ میں باہر آیا اور ندیم کے ساتھ بائک پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے بائک ایک ٹینٹ ہاؤس کے سامنے روکی اور مجھے لے کر دکان میں داخل ہوا۔ اندر جاتے ہی اس نے سامان اور ماربل کی پلیٹیں گرانا شروع کردیں۔ ایک ملازم آگے آیا تو اس نے دو ہاتھ مارے۔ اتنے میں ٹینٹ ہاؤس کا مالک آگیا اور اس کے آگے گھگیانے لگا۔ ”ندیم بھائی... ندیم بھائی... اتنا غصہ کیوں کر رہے ہو؟ کیا خطا ہوگئی ہے؟“

”خطا کی اولاد۔“ ندیم نے اپنی سے بڑی عمر کے شخص کو بے دریغ تھپڑ مارا۔ ”تیری ہمت کیسے ہوئی بل بھیجنے کی... پتا نہیں کہ میرے دوست کی بہن کی مایوں تھی۔“

”تو کیا غلط کیا؟ اپنا معاوضہ مانگا تھا۔“ اس نے گال سہلاتے ہوئے کہا۔

”دوں تجھے معاوضہ۔“ ندیم جیسے آپے سے باہر ہوگیا۔ اس نے پھر توڑ پھوڑ شروع کردی۔ مالک اور ملازم اس کی منت سماجت کر رہے تھے مگر وہ اس کا ہاتھ روکنے کی جرأت نہیں کر پا رہے تھے۔ میں ایک طرف خاموش کھڑا تھا مگر وہ مجھ سے بھی مرعوب تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں شاید ندیم کے ساتھ ہوں اور اگر انہوں نے مزاحمت کی تو میں کوئی ہتھیار نکال لوں گا۔ شاید ندیم اسی لیے ساتھ لایا تھا ورنہ مجھ میں اتنی ہمت کہاں تھی۔ اس نے ذرا سی دیر میں دکان ملیامیٹ کردی۔ ہزاروں کا نقصان کردیا مگر اس پر بھی اس کا دل نہیں بھرا۔ اس نے جیب سے ماچس نکالی اور تیلی جلا کر وہاں رکھے ٹینٹوں کو آگ دکھانے لگا۔ مالک کے ہوش اڑ گئے۔ اس بار وہ ندیم کے قدموں میں پڑ گیا۔ ”خدا کے لیے میں برباد ہو جاؤں گا... قرض پر یہ نئے ٹینٹ لیے ہیں۔“

”بربادی کی اتنی فکر ہے۔“ ندیم نے اسے ٹھوکر ماری۔ وہ بار بار تیلی جلا کر ٹینٹ کو لگانے لگتا اور مالک کی منت سماجت پر بجھا دیتا۔ بالآخر اسے... ترس آگیا اور اس نے ماچس جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”ترس آرہا ہے تجھ پر... چل دو ہزار نکال...“

”میرے پاس دو ہزار کہاں... ہزاروں کا تو نقصان...“

”تو اس قابل ہی نہیں ہے۔“ ندیم نے پھر ماچس نکالی تو اسے دو ہزار دینے ہی پڑے۔ اس نے یوں رقم جیب میں رکھی جیسے پرانا ادھار تھا جو اب وصول کیا ہے اور اکڑتا ہوا دکان سے نکل آیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ راستے میں اس نے مجھ سے کہا۔ ”دیکھا شریف بھائی... آج کل دنیا ایسے مانتی ہے، پیار کی زبان تو سمجھتی ہی نہیں ہے۔“

اس نے دکان اور اس کے مالک کے ساتھ جو کیا تھا، اس میں پیار کا عمل دخل کہیں بھی نہیں تھا مگر مجھے اس کی تائید کرنا پڑی۔ ندیم مجھے ایک بار بی کیو ہوٹل پر لے گیا اور چرغے کا آرڈر دیا۔ میں نے منع بھی کیا کہ گھر میں کھانا بنا ہے اور میں گھر میں ہی کھاتا ہوں مگر وہ نہیں مانا۔ ”شریف بھائی! کبھی کبھی باہر کا بھی کھانا چاہیے۔“

مجھے اس کا ساتھ دینا پڑا۔ کھانے کے دوران میں ہمت جمع کر رہا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے دودھ پتی منگوائی تو میں نے کہا۔ ”ندیم، یار! تم سے ایک بات کہنی ہے۔“

”کہو شریف بھائی! اب تو آپ سے دوستی ہوگئی ہے۔“ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو یار! میں بیوی بچوں والا شخص ہوں... دوسرے میں عام آدمی ہوں۔ تم چاہو تو بزدل بھی کہہ سکتے ہو۔ میں یہ سب نہیں کر سکتا۔“

”آپ نے کیا کیا ہے؟“ اس نے مصنوعی حیرت سے پوچھا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا لیکن تمہارا ساتھ دینا بھی ممکن نہیں ہے۔“

”آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے بخش دو۔“

چائے آگئی تھی۔ اس نے پیالی اٹھائی اور پیتے ہوئے بولا۔ ”اچھا شریف بھائی، میں سوچوں گا۔ اصل میں آپ سے محبت سی ہوگئی ہے۔ چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔“

”یار! محبت ہے تو اسی کے نام پر بخش دو۔“

وہ ہنسا۔ ”اچھا چائے پئیں۔ میں سوچوں گا۔“

ندیم کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ مجھے ٹال رہا ہے۔ میں فکر سے مرا جا رہا تھا کہ اگر میں اسی طرح ندیم کے ساتھ مار دھاڑ میں شامل ہوتا رہا اور اس کے ساتھ گھومتا رہا تو جلد یا بدیر لوگوں کے ذہن میں میرا ویسا ہی امیج بن جائے گا اور اس کے بعد میں ساری عمر اس امیج سے پیچھا نہیں چھڑا سکوں گا۔ چند گھنٹے پہلے تک میں خوش تھا مگر اب ساری خوشی غارت ہوگئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ندیم نے مستقل پیچھا پکڑ لیا ہے۔ وہ ہمیشہ مجھے بتائے بغیر لے جاتا تھا کہ کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ کسی دن مجھے قتل کی کسی واردات میں لے گیا اور مجھے عین موقع پر پتا چلا تو میں کیا کرلوں گا؟ بلکہ وہ مجھے بتا کر بھی لے جاتا تو شاید میں انکار کی جرأت نہ کر پاتا۔ رفیعہ اس بار بھی میرے چہرے سے سمجھ گئی۔ رات اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں اسے سچ سچ بتاؤں کہ یہ کیا چکر ہے۔ ندیم پورے محلے کو چھوڑ کر میرے پیچھے ہی کیوں پڑ گیا ہے۔

خدا نے اس وقت مجھے عقل دی اور میں اسے بتاتے بتاتے رہ گیا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ کوئی چکر نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں جرأت مند نہیں ہوں اور ندیم اسی چیز کا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ رفیعہ کو غصہ آگیا۔ اس نے کہا۔ ”میں خود اسے منع کردوں گی۔ اب وہ آیا اور اس نے کوئی بدتمیزی کی تو اس کے گھر جاؤں گی۔“

”خدا کے لیے ہرگز نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”وہ تمہیں تو کچھ نہیں کہے گا مگر مجھے کسی چکر میں پھنسا دیا تو میں مارا جاؤں گا۔“

”آپ اس کے ساتھ نہیں جائیں گے۔“

”دیکھو، میں منہ پھاڑ کر انکار نہیں کر سکتا۔ وہ سنے گا نہیں اور میرا دشمن ہو جائے گا۔ میں آہستہ آہستہ بیوی بچوں کا حوالہ دے کر اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، آپ کوشش کرلیں۔ شریف! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ خدانخواستہ کسی دن اس نے آپ کو لے جاکر کسی کو مار دیا تو آپ بھی پکڑے جائیں گے۔“

”مجھے بھی یہی خوف ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ اگرچہ میں نے رفیعہ کو حقیقت نہیں بتائی تھی لیکن سچی بات ہے اسے بتا کر میرا دل ہلکا ہوا تھا۔ اب تک میں اکیلا ہی یہ بوجھ اٹھاتا آیا تھا۔ اب رفیعہ میرے ساتھ شامل ہوگئی تھی۔ اس کے بعد ندیم ہر چوتھے پانچویں دن یا ہفتے میں ایک بار مجھے کہیں لے جاتا تھا۔ خطرناک مواقع تو تین میں سے ایک بار ہی آتے تھے، دو بار وہ بس ایسے ہی گھومنے پھرنے اور کھانے پینے کے لیے ساتھ لے جاتا تھا۔ جن خطرناک کاموں میں لے جاتا تھا، اس میں بھی میں بس بائک کے پاس کھڑا ہوتا تھا اور اصل کام وہ خود کر کے آتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اکیلا بھی کام کر سکتا ہے مگر اسے بعض اوقات فوری فرار کی ضرورت پیش آتی ہے اس لیے وہ بائک اسٹارٹ

چھوڑ کر جاتا تھا اور اگر کوئی ساتھ نہ ہو تو امکان ہوتا ہے کہ کوئی چلتی بائک لے کر نو دو گیارہ ہو جائے گا۔ ایک بار اس نے ایک ہوٹل پر کریکر پھینکا۔ یہ خوشنما بچوں کی گیند جیسی چیز تھی، وہ بائک سے اترا تو اس کے ہاتھ میں دیکھ کر میں گیند ہی سمجھا لیکن جب اس نے پھینکا اور خوف ناک دھما کا ہوا تب میں سمجھا کہ اس نے دستی بم پھینک دیا ہے۔ کچھ دیر بعد ایک اور ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''شریف بھائی! آپ کانپ رہے ہو... وہ بس پٹاخہ تھا، اس سے نقصان نہیں ہوتا ہے۔ بم ہوتا تو میں اتنے آرام سے پھینکتا ہے؟''

میں نے بھی دیکھ لیا تھا کہ بس دھما کا ہوا تھا اور دھواں پھیل گیا تھا۔ کچھ شیشے ٹوٹے تھے اور لوگ افراتفری میں ہوٹل سے بھاگ نکلے تھے۔ ندیم نے بتایا کہ یہ مخالف سیاسی پارٹی کا اڈا تھا۔ کریکر پھینک کر ایک طرح سے ان لوگوں کو وارننگ دی گئی ہے کہ اس علاقے میں نہ آیا کریں۔ میں نے تھوک نگل کر پوچھا۔ ''اگر وہ نہ مانے تو؟''

''تو اگلی بار اصل بم پھینک سکتے ہیں۔ چار پانچ بندے مریں گے تو خود سمجھ میں آجائے گا۔'' ندیم نے بے پروائی سے کہا۔ میرا دم خشک ہو گیا۔ ایک کریکر کے دھماکے نے میرے اعصاب اس طرح منتشر کر دیے تھے کہ مجھ سے چائے کی پیالی بھی نہیں سنبھالی جا رہی تھی۔ سچ مچ کا بم دھما کا شاید میری جان لے لیتا۔ میں نے التجا کی۔

''تب پلیز مجھے مت لے کر جانا۔''

''آپ فکر نہ کریں، ایسے کاموں کے لیے ایکسپرٹ بندہ ساتھ ہونا چاہیے جو دستی بم استعمال کرنا جانتا ہو۔''

میں نے سکون کا سانس لیا۔ مگر میری جان چھوٹتی نظر نہیں آرہی تھی۔ اتنے عرصے میں میں یہ تو سمجھ گیا تھا کہ ندیم اور شکیل کو مجھ سے خطرہ ہے اور وہ اس قسم کے لوگ تھے جو اپنی ذات پر ذرا سا خطرہ بھی برداشت نہیں کرتے ہیں بلکہ میں حیران تھا کہ کون سی بات انہیں اب تک روکے ہوئے تھی۔ شاید اس لیے کہ میں اپنے گھر کا واحد مرد اور کفیل تھا۔ اگر میں نہ ہوتا تو میرے بیوی بچے اور ماں بے سہارا ہو جاتے۔ اس لیے انہوں نے میرا پتا صاف کرنے کے بجائے یہ حکمتِ عملی اپنائی تھی کہ مجھے اپنے کاموں میں شامل کر رہے تھے۔ میں رفتہ رفتہ ان کے ساتھ دیکھا جانے لگا تھا اور اگر اب میں پولیس کے پاس جاتا یا ٹارگٹ کلنگ کے بارے میں کسی کو بتاتا تو میں خود بھی پھنستا۔ یہ ان کے دل کا چور تھا۔ میرا تو یہ حال تھا کہ پولیس تو دور رہی، میں نے اپنی بیوی تک کو نہیں بتایا تھا۔ مگر وہ یہ بات نہیں سمجھ رہے تھے اس لیے مجھے زیادہ سے زیادہ پھنسانے کی کوشش کر رہے تھے۔

پھر وہ دن بھی آگیا جس کا مجھے خطرہ تھا۔ چھٹی کا دن تھا۔ میں ذرا دیر تک سوتا ہوں۔ رفیعہ نے مجھے جگایا۔ وہ فکر مند لگ رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''ندیم کسی کے ساتھ آیا ہے۔''

میں اٹھ کر باہر آیا تو ندیم کے ساتھ شکیل موجود تھا۔ ندیم نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''شریف بھائی! فٹ تیار ہو کر آجاؤ۔ ٹائم نہیں ہے۔''

''خیریت... میں نے تو منہ بھی نہیں دھویا۔''

''بس منہ دھو کر آجاؤ۔'' ندیم بولا۔ ''آدھے گھنٹے میں واپس آجائیں گے۔''

میں نے اندر آکر منہ ہاتھ دھویا اور کپڑے بدلے۔ آج سے پہلے ندیم مجھے کبھی اتنی ایمرجنسی میں لینے نہیں آیا تھا اور نہ ہی اس نے آج تک اس طرح بات کی تھی۔ میرے اندر ہول اٹھنے لگے اور میں مرے ہوئے قدموں سے باہر آیا۔ مجھے شکیل نے اپنے پیچھے بٹھایا اور بولا۔ ''ضرورت پڑنے پر بائک چلانا ہوگی۔''

''چلا لوں گا۔'' میں نے مردہ لہجے میں کہا۔ ''خیریت، آج اتنی صبح صبح کہاں جا رہے ہو؟''

''یار چپ کر کے چلو۔'' شکیل نے خطرناک لہجے میں کہا۔ ''زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

دونوں علاقے سے نکلے اور ایک مصروف کاروباری مرکز تک پہنچے۔ میں نے دیکھا راستے میں ندیم ہینڈ فری کان سے لگائے کسی سے موبائل پر بات کر رہا تھا بلکہ کر کم رہا تھا اور سن زیادہ رہا تھا۔ اس کا اندازہ اس کے ہلتے سر سے ہو رہا تھا۔ شاید اسی لیے مجھے ندیم کے بجائے شکیل نے ساتھ بٹھایا تھا کہ میں گفتگو نہ سن سکوں۔ وہ آواز دبا کر بول رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم ایک چوراہے پر رکے۔ وہ بے فکری سے مین روڈ پر رکے ہوئے تھے اور انہیں قطعی فکر نہیں تھی کہ کوئی ڈبل سواری پر روک سکتا ہے۔ یہاں ٹریفک خاصا زیادہ تھا۔ ندیم بدستور موبائل پر لگا ہوا تھا۔ پھر اس نے مڑ کر شکیل کو اشارہ کیا۔ اس نے بائک موڑی اور آگے روانہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ندیم بھی ایک سفید کار کے پیچھے آیا۔ اب شکیل اپنے ہینڈ فری پر اس سے مخاطب تھا۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ ''یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے، یہاں رش ہے... ٹھیک ہے، میں روکتا ہوں۔''

شاید ندیم اصرار کر رہا تھا کہ وہ کار والے کو روکے کیونکہ وہ کہیں اور مڑ جاتا تو شکیل سے غلطی ہو سکتی تھی۔ اسے اور اس کے ساتھ مجھے کار کو روکنا تھا۔ شکیل نے ایک تنگ جگہ دیکھ کر اچانک بائک روک دی۔ خود اس نے ہیلمٹ لگایا ہوا تھا۔ جبکہ ندیم نے بھی ہیلمٹ پہن لیا تھا۔ ان کے چہرے چھپے ہوئے تھے اور میرا چہرہ عیاں تھا۔ شکیل نے بائک اس طرح روکی کہ سفید کار کسی صورت نہیں گزر سکتی تھی۔ دوسری رو سے گاڑیاں اتنے تواتر سے گزر رہی تھیں کہ سفید گاڑی کے لیے خلا ہی نہیں بچا تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو اس کی رفتار برقرار رہی اور مجھے لگا کہ وہ آکر بائک کو ٹکر مار دے گی۔ میں بے اختیار دوسری طرف اتر گیا۔ اگرچہ ٹکر کی صورت میں میں پھر بچ نہیں سکتا تھا۔ مگر نزدیک آکر کار کی رفتار سست ہوئی اور پھر اس نے پورا بریک لگا دیا۔ شکیل نے پستول نکالتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''بائک سنبھالو، اب تم چلاؤ گے۔ جیسے ہی میں پیچھے بیٹھوں چلا دینا۔''

ہینڈل سنبھالتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور مجھے لگ رہا تھا جیسے میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔ اسی کیفیت میں میں نے فائرنگ کا شور سنا۔ شکیل گاڑی میں بیٹھے افراد پر فائرنگ کر رہا تھا اور ندیم اس کی مدد کے لیے پیچھے موجود تھا مگر اس نے فائرنگ نہیں کی۔ شکیل نے شاید اپنے پستول کا پورا میگزین خالی کر دیا تھا اور پھر وہ بھاگتا ہوا آکر میرے پیچھے بیٹھ گیا۔ اس نے چلا کر میرے کان میں کہا۔ ''چلو نکلو یہاں سے... ''

میں نے بے ساختہ ایکسلریٹر گھمایا۔ بائک تیزی سے آگے بڑھی اور ایک گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ اس کے بعد بھی راستے میں ہم کئی بار حادثات کا شکار ہونے سے صرف اس لیے بچ گئے کہ آج کے دن ہم میں سے کسی کی قضا نہیں آئی تھی۔ ایک جگہ ندیم نے پاس آکر رکنے کے لیے کہا اور یہاں بھی مجھے مشکل سے سمجھ میں آیا اور کئی بار کہنے پر میں نے بائک روکی۔ شکیل فوراً اتر گیا اور اس نے غصے سے کہا۔

''مرتے مرتے بچے... اسے ہی لانا تھا کیا؟'' اس نے ندیم سے پوچھا۔ ندیم نے آرام سے کہا۔

''تو اور کسے لاتا؟''

''کتنی بار مرتے مرتے بچے۔''

''یار مرے تو نہیں نا۔'' ندیم نے اسے ٹھنڈا کیا۔ ''یہ بتا کام ٹھیک سے ہوا نا؟''

''بالکل۔ تین تھے تینوں کو لڑھکا دیا۔ سب کو چار چار گولیاں ماری ہیں۔ کسی کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں

ایک آدمی بچے سے۔ ''بیٹا ذرا یہ رومال سونگھو۔''
بچہ۔ ''مجھے پتا ہے اسے سونگھ کر میں بے ہوش ہو جاؤں گا اور آپ مجھے بوری میں بند کر کے لے جائیں گے۔''
آدمی۔ ''یہ تمہیں کیسے پتا چلا؟''
بچہ۔ ''میرے ابو نے مجھے بتایا تھا۔''
آدمی۔ ''تمہارے ابو کون ہیں؟''
بچہ۔ ''یہ تو مجھے پتا نہیں کیونکہ وہ مجھے کہیں سے بوری میں بند کر کے لائے تھے۔''

☆☆

گاڑی کا مالک۔ ''یہ ٹائر پنکچر کیسے ہوا؟''
ڈرائیور۔ ''جناب ایک شیشی پر چڑھ گیا تھا۔''
مالک۔ ''کیا تم نے شیشی دیکھی نہیں تھی؟''
ڈرائیور۔ ''نہیں، وہ شیشی اس آدمی کی جیب میں تھی جو گاڑی کے نیچے آیا تھا۔''

انتخاب، سید اکبر شاہ، مانسہرہ

ہوتا۔'' شکیل نے فخر سے کہا۔ وہ دونوں بالکل سکون سے بات کر رہے تھے جیسے معمول کا تبادلہ خیال کر رہے ہوں۔ ان کے مقابلے میں میری حالت ہر گزرتے لمحے خراب ہوتی جا رہی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ ابھی وہاں پولیس نہ آجائے اور ہمیں پکڑ لے۔ ندیم نے مجھے دیکھا اور بولا۔

''یار! اسے گھر چھوڑنا ہوگا۔''

''میں نے پہلے ہی کہا تھا۔'' شکیل نے غصے سے کہا۔ ''اب اسے مزید گواہ بنا لیا ہے۔''

''اس بار یہ گواہ نہیں، ہمارے ساتھ شریک ہے۔'' ندیم نے ہنس کر کہا۔ ''ہم پکڑے گئے تو یہ بھی پکڑا جائے گا۔''

''اور کہیں یہ پکڑا گیا تو سب سے پہلے ہمارے بارے میں پھوٹ دے گا۔''

''ویسے نہیں پکڑا جائے گا۔'' ندیم نے اطمینان سے کہا۔ ''ہمارے ساتھ ہی پکڑا جائے گا۔''

''خدا کے لیے تم لوگ کیسی باتیں کر رہے ہو؟'' میں نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔ ''میری جان پر بنی ہے اور تم یہاں کھڑے ہو۔ صرف کچھ دیر پہلے تین بندوں کو قتل کیا ہے۔''

"تو کیا ہوا، یہاں تو کوئی نہیں جانتا کہ ہم نے تین بندے مارے ہیں۔" ندیم نے سکون سے کہا۔

"کوئی پیچھے آجائے تو؟"

"کوئی نہیں آئے گا۔ آج کل لوگ دور بھاگتے ہیں، پیچھے نہیں آتے۔"

ہم چند منٹ وہاں رکے اور یہ چند منٹ مجھ پر بہت بھاری گزرے۔ خدا خدا کر کے وہ وہاں سے روانہ ہوئے اور پہلے ایک شاپ سے کولڈ ڈرنک لے کر مجھے پلائی تاکہ میرے حواس کسی قدر بحال ہوں پھر انہوں نے مجھے گھر چھوڑا۔ رفیعہ سے بچنے کے لیے میں واش روم میں گھس گیا اور اس وقت تک نہاتا رہا جب تک میرے چہرے پر حواس باختگی کے آثار ختم نہیں ہوگئے۔ پھر میں باہر آیا تو صوفیہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اس سے کھیل کر میرا دھیان کچھ بٹا۔ اس کے باوجود میرے ذہن میں رہ رہ کر وہ منظر آرہا تھا جب شکیل نے بائیک روک کر کار والوں پر گولیاں برسائی تھیں۔ مجھے تجسس ہو رہا تھا کہ یہ خبر اب تک ٹی وی پر آچکی ہوگی لیکن میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اسے دیکھوں۔ مجھے ڈر تھا کہ میرے تاثرات میرے اندر کا احوال نہ بیان کردیں۔ اس لیے ٹی وی بھی نہ دیکھ سکا۔ مجھے شروع سے خدشہ تھا کہ وہ مجھے کسی ایسے کام میں ملوث نہ کرلیں اور آج ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ دونوں ہیلمٹ میں تھے لیکن میرا چہرہ کھلا ہوا تھا اور بہت سے لوگوں نے مجھے دیکھا ہوگا۔

یہ سوچ کر مجھے بخار چڑھ گیا کہ اگر کسی نے پولیس کو میرا حلیہ بتا دیا تو کیا ہوگا؟ ہماری پولیس مجرموں کو تو پکڑتی نہیں ہے لیکن بے گناہوں کو پکڑنے فوراً آجاتی ہے۔ میں سارا دن چادر اوڑھے منتظر رہا کہ کب دروازہ بجتا ہے اور پولیس آکر مجھے گرفتار کرتی ہے۔ یہ دن گزرا اور رات آئی، تب بھی مجھے اطمینان نہیں ہوا۔ بخار اور انتشار اگلے دو تین دن جاری رہا۔ پھر مجھے قرار آنے لگا کہ پولیس کو اس بارے میں کچھ پتا نہیں چلا۔ میرے پاس ندیم یا شکیل میں سے کسی کا نمبر نہیں تھا ورنہ ان کو کال کر کے ٹوہ لیتا۔ انہوں نے کبھی مجھے اپنا نمبر دیا ہی نہیں تھا، ضرورت پڑتی تو پارٹی دفتر کے نمبر سے مجھے کال کرلیتے تھے۔ جب سکون ہوا تو میں نے پہلی بار سنجیدگی سے سوچا کہ یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ ندیم اور شکیل نے مجھے پوری طرح اپنے جرائم میں ملوث کرلیا تھا اور کبھی کسی واردات کے دوران میں اگر وہ گھیرے میں آجاتے تو قربانی کے بکرے کے طور پر مجھے آگے کر کے خود بچ جاتے۔

ہم تینوں پکڑے نہ بھی جاتے تب بھی یہ جرائم میرے ضمیر کے لیے بوجھ تھے۔ حالانکہ میں براہِ راست کسی کام میں ملوث نہیں تھا لیکن ان کے ساتھ تو ہوتا تھا۔

رفیعہ میری پریشانی محسوس کرتی تھی۔ مجھ سے پوچھتی تو میں اسے ٹال جاتا۔ ایک دو بار میں نے اسے سختی سے جھڑکا تو وہ حیران رہ گئی۔ میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں جو کسی سے سختی سے بات کروں۔ لیکن میں صرف رفیعہ کو ہی نہیں، بچوں کو بھی ڈانٹ دیتا تھا۔ اس سے گھر کا ماحول بھی ٹینس رہنے لگا۔ اس واقعے کے بعد ندیم اور شکیل نے بہت دن تک مجھ سے رابطہ نہیں کیا لیکن اس سے بھی میری پریشانی کم نہیں ہوئی۔ دو ہفتے بعد وہ مجھے پھر لے کر گئے۔ اس بار کسی کی ٹارگٹ کلنگ نہیں بلکہ ایک گاڑیوں کے شوروم کے باہر کھڑی چند گاڑیوں کو آگ لگائی تھی۔ انہوں نے جاتے ہی پہلے ہوائی فائرنگ کی اور جب لوگ اور شوروم کے ملازمین بھاگ گئے تو انہوں نے اطمینان سے وہاں کھڑی چند نئی گاڑیوں پر پیٹرول ڈالا اور آگ دکھا کر وہاں سے نکل گئے۔ اگلے دن اخبار سے پتا چلا کہ اس واقعے میں نصف درجن قیمتی گاڑیاں جل کر راکھ ہوگئی تھیں۔ یہ کام یقیناً بھتا نہ دینے کی وجہ سے کیا گیا تھا۔

ندیم نے پھر مجھے دفتر میں بیٹھنے کے لیے بلا لیا اور میں حسبِ سابق انکار نہیں کرسکا۔ ریاض کے خلاف بہت زیادہ شکایات کی وجہ سے اسے اس سیٹ سے ہٹا دیا گیا تھا اور ندیم نے موقع سے فائدہ اٹھا کر پھر مجھے یہاں بٹھا دیا تھا۔ اس کی ریاض سے لگتی تھی اور وہ اس سے اپنی مرضی سے کام نہیں لے پاتا تھا اس لیے اس نے مجھے یہاں بٹھایا کہ میں اس کا بندۂ بے دام تھا۔ چندے اور بھتے کا حساب کتاب اس سیٹ والے کے پاس ہوتا تھا اور ندیم اس کی مرضی کے بغیر اس میں سے اپنا حصہ وصول نہیں کرسکتا تھا اس لیے وہ مجھے یہاں لے آیا اور اب وہ جیسا کہتا تھا، میں کرتا تھا۔ اس کے ہتھیار اور دوسری چیزیں بھی میری تحویل میں رہا کرتی تھیں۔ یہ چیزیں لوہے کی ایک مضبوط الماری میں ہوتی تھیں۔ اس کی چابی میرے پاس ہوتی تھی اور ایک اضافی چابی ندیم نے لے رکھی تھی۔ لیکن اس کا کسی اور کو پتا نہیں تھا۔

میں جتنا اس چکر سے نکلنا چاہتا تھا اتنا ہی اس میں پھنستا جا رہا تھا۔ محلے والے اب مجھے میری شرافت نہیں پارٹی کی وجہ سے پہچاننے لگے تھے اور بعض لوگ جو پہلے اہمیت نہیں دیتے تھے، اب بہت ادب واحترام سے جھک کر

ملتے تھے لیکن مجھے اس سے بھی تکلیف ہوتی تھی۔ مجھے لگتا وہ مجھے بے عزت کر رہے ہیں۔ اوپر سے عزت دے رہے ہیں اور اندر ہی اندر مجھے گالیاں دے رہے ہیں۔ لوگ اب راہ چلتے روک کر اپنے کام اور مسائل بتاتے تھے۔ ان میں سے بیشتر یا تو کسی کی زیادتی سے بچنا چاہتے تھے یا خود کسی کے ساتھ زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ میں ان سے کہتا کہ وہ دفتر آجائیں، وہاں دوسری پارٹی کو بلوا کر آمنے سامنے بٹھا کر تصفیہ کرا دیا جائے گا۔ یہ سن کر اکثر لوگ دوبارہ نہیں آتے تھے اور جو چند ایک آتے، میں انہیں بھی ندیم اور شکیل کے سپرد کردیتا تھا بظاہر میں یہاں ان سے بڑا تھا۔

ایک دن جب میں دفتر میں تھا تو صبح کے وقت پارٹی آفس پر چھاپا پڑا اور سیکیورٹی اہلکار وہاں سے اسلحہ اور بہت سی چیزیں برآمد کر کے چار افراد کو گرفتار کر کے لے گئے۔ ان میں شکیل بھی تھا۔ اس پر زبردست ہنگامہ ہوا اور جب میں واپس آیا تو پورا علاقہ بند تھا اور جگہ جگہ جلتے ہوئے ٹائر پڑے تھے۔ ہوائی فائرنگ کی آوازیں رہ رہ کر ابھر رہی تھیں۔ دفتر سیل کردیا گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب شاید میری جان چھوٹ گئی ہے لیکن یہ میری خام خیالی تھی۔ ایک ہفتے بعد شکیل چھوٹ کر آگیا اور پارٹی دفتر دوبارہ کھل گیا تھا۔ میں دوسرے دن گیا تو وہاں نیا فرنیچر اور دوسرا سامان بھی آچکا تھا۔ پرانا تو سب چھاپے میں برباد ہوگیا تھا۔ کمپیوٹر تک توڑ دیا گیا تھا اور اس کی ہارڈ ڈسک نکال لی گئی تھی۔ لیکن اب لگ رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے، سب پہلے کی طرح ہوگیا تھا۔

ندیم اور شکیل کا زیادہ وقت کیونکہ دفتر میں گزرتا تھا اس لیے یہاں ان کا ذاتی سامان اور کپڑے تک موجود تھے۔ اگر انہوں نے کہیں جانا ہوتا تو یہاں سے بھی کپڑے تبدیل کر کے جاتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ وہ میرے سامنے لباس تبدیل کر کے گئے۔ سردیوں کا آغاز تھا اس لیے دفتر میں شام کے وقت ہی رونق کم ہوجاتی تھی اور عشا تک تو اِکا دُکا لوگ رہ جاتے تھے۔ جب میں وہاں آتا تو تقریباً سناٹا ہوتا تھا۔ اس دن میں وہاں پہنچا تو بس ایک دو لوگ تھے۔ آج کل نو بجے دفتر بند کردیا جاتا تھا اور میری بھی جلدی گلوخلاصی ہوجاتی تھی۔ میں بیٹھا ہوا تھا کہ نو بجے جب میں اٹھنے والا تھا، ندیم اور شکیل اندر آئے۔ ندیم نے مجھ سے کہا۔ "شریف بھائی! اندر سے نائن ایم ایم کے چار میگزین نکالو... دونوں پستول بالکل خالی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ شکیل کے ساتھ اندر والے کمرے میں چلا

خدمت

ایک حمول شخص صحت یاب ہونے کے بعد اسپتال سے رخصت ہونے لگا تو وہاں کے خدمت گار سلام کرنے اور انعام پانے کے لیے اکٹھے ہوگئے۔ اس نے ہر ایک کو انعام دیا مگر چار ایسے آدمی تھے جو باقی رہ گئے۔ جنہیں اس نے دیکھا تک نہیں۔ اس نے کہا۔ "آپ چاروں نے میری کوئی خدمت نہیں کی تو پھر انعام کیسا؟"

انہوں نے کہا۔ "حضور نے موقع ہی نہیں دیا ہم تو ہر وقت حاضر تھے۔"

پوچھا۔ "وہ کیونکر؟"

"حضور ہمارے ذمے مرنے والوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگانا ہے۔" انہوں نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا۔

ناز جی اینڈ سوہا جی، لاہور

گیا۔ میں اٹھ کر الماری کے خانے سے میگزین نکال رہا تھا کہ مجھے ان دونوں کی اندر سے بات کرنے کی آواز آئی۔ میں نے کان لگا کر سنا تو شکیل کہہ رہا تھا۔ "پوری طرح تیار ہو کر جانا ہے... وہ لوگ بھی لوڈ بیٹھے ہوں گے... ذرا موقع ملا تو ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔"

"ہاں یار! ان کا اڈا ہے اور وہاں لوگ بھی زیادہ ہوں گے۔" ندیم نے اس کی تائید کی۔ "ذرا موقع دیا تو مارے جائیں گے۔"

میں آکر کرسی پر بیٹھا تو میرے کانوں میں ندیم اور شکیل کی باتیں گونج رہی تھیں۔ آج وہ کسی خطرناک مشن پر جا رہے تھے جہاں ان کی جان کے لالے پڑ سکتے تھے۔ میں نے بے خیالی میں میز کی دراز کھولی تو اس میں موجود ایک چیز نے میری توجہ کھینچ لی اور ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں چمکا لیکن جب میں نے اس کے عواقب پر سوچا تو خاصی سردی میں بھی میرے پسینے چھوٹ گئے۔ اس کے باوجود میرے اندر سے کسی نے کہا۔ یہ تیرے لیے ایک موقع ہے اور شاید آخری موقع ہے۔ زندگی میں ایک بار ہمت کرلے اور ہمیشہ کے لیے ان سے چھٹکارا حاصل کرلے۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے وہ چیز نکالی اور مجھے اس کام میں مشکل سے ایک منٹ لگا۔ حیرت انگیز طور پر نہ

میرے ہاتھ کانپے اور نہ کوئی گڑبڑ ہوئی۔ حالانکہ یہ ذرا مشکل کام تھا۔ جیسے ہی میں نے کام مکمل کر کے وہ چیز واپس دراز میں رکھی، اسی لمحے ندیم اور شکیل تیار ہو کر باہر آ گئے۔ انہوں نے لباس بدل لیے تھے۔ ندیم نے ایک میگزین اٹھایا اور اسے اپنے پستول میں فٹ کیا جبکہ دوسرا شکیل نے اپنے پستول میں لگایا اور ایک ایک اضافی میگزین انہوں نے جیبوں میں رکھ لیے۔ ندیم نے مجھ سے کہا۔ ''شریف بھائی! دفتر بند کر کے چلے جانا۔ ہمارا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

میں نے دل میں سوچا کہ مجھے کیا ضرورت ہے انتظار کرنے کی۔ میری بلا سے تم لوگ کبھی واپس نہ آؤ۔ لیکن میں نے منہ سے کہا۔ ''خیریت... آج کہاں کی تیاری ہے؟''

''ایک خاص کام ہے۔'' شکیل نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''حریف پارٹی والے کچھ زیادہ ہی ہاتھ پیر پھیلا رہے ہیں، ذرا ان کے ہاتھ پاؤں سمیٹنے جا رہے ہیں۔''

میں سن چکا تھا کہ ان کے کیا عزائم ہیں اور اب شکیل نے اپنے منہ سے تصدیق کر دی تھی۔ ان کے جاتے ہی میں نے دفتر بند کیا اور گھر چلا گیا۔ میں نے یہ کام کر تو دیا تھا لیکن ساتھ ہی مجھے پسینے آنا شروع ہو گئے تھے کہ اگر انہوں نے چیک کر لیا تو فوراً جان جائیں گے کہ یہ میرا کام ہے اور اس کے بعد میری خیر نہیں ہوگی۔ حریف پارٹی والے مارے جائیں یا نہ مارے جائیں، میری بچت نہیں ہوگی۔ وہ مجھے گھر میں قتل کر کے جائیں گے۔ جیسے جیسے میں اپنی حرکت کے ممکنہ نتائج پر غور کر رہا تھا، میری حالت خراب ہو رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے اپنے ڈیتھ وارنٹ پر خود دستخط کر دیے ہیں۔ بچے سو گئے تھے، میں آ کر کھانا کھاتے ہی ٹی وی لگا کر بیٹھ گیا۔ ان کا جو ارادہ تھا، اس سے لگ رہا تھا کہ بہت مارا ماری ہوگی۔ اس صورت میں ٹی وی پر لازمی خبر آئے گی۔ کچھ دیر بعد رفیعہ نے لاؤنج میں جھانکا۔

''خیریت... آج اس وقت ٹی وی لگا کر بیٹھے ہیں؟''

میں عام طور سے نو بجے تک بیڈ روم میں آ جاتا تھا کیونکہ رفیعہ کا کہنا تھا یہ وقت اس کا ہوتا ہے۔ وہ سارے دن کے دکھ سکھ بیان کرتی تھی اور ہم میاں بیوی اپنی باتیں کرتے تھے۔ مگر اس دن میں دس بجے ٹی وی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے بہانہ کیا۔ ''بس آج ذرا موڈ ہو رہا ہے۔ تم تھکی ہوئی ہو، جا کر سو جاؤ۔''

رفیعہ بچ تھکی ہوئی تھی اس لیے وہ چلی گئی۔ میں ٹی وی دیکھتا رہا، مختلف چینل گھماتا رہا۔ گیارہ بج گئے لیکن کسی چینل سے ایسی کوئی خبر نہیں آئی۔ جیسے جیسے تاخیر ہو رہی تھی میرا دل ڈوب رہا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا کہ ان دونوں کو پتا چل گیا تھا کہ میں نے کیا کیا تھا اور وہ کسی لمحے بھی یہاں نازل ہونے والے تھے۔ میں ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ اچانک کال بیل بجی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ دوبارہ بیل بجی تو میں لرزتے قدموں سے دروازے تک گیا۔ ہمارے ہاں اس وقت کوئی نہیں آتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ وہی موت کے فرشتے تھے۔ میں نے دروازہ کھولا اور دل کڑا کر کے باہر جھانکا تو اپنے ایک پڑوسی کو موجود پا کر میرا رکا ہوا سانس بحال ہوا۔ وہ بولے۔ ''اس وقت زحمت پر معذرت... وہ دراصل ہمارا دودھ والا آپ کے ہاں دودھ دے گیا ہوگا، ہم گئے ہوئے تھے۔''

''ایک منٹ رکیں، بیگم تو سو گئی ہیں۔ میں فریج میں دیکھتا ہوں۔ دودھ کتنا ہوگا؟''

''دو کلو ہوگا۔'' انہوں نے کہا۔ میں نے فریج میں دیکھا تو اس میں ایک دو کلو والی تھیلی رکھی تھی۔ میں نے لے جا کر ان کو دی اور واپس آیا تو ٹی وی پر خبر کی پٹی چل رہی تھی کہ ایک سیاسی پارٹی کے دفتر پر حملہ، دو افراد ہلاک ایک زخمی ہوا ہے۔ میں بے تابی سے تفصیلی خبر کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد تفصیلی خبر آئی اس کے مطابق ایک سیاسی پارٹی کے دفتر پر چند افراد نے حملہ کیا اور وہاں بیٹھے لوگوں پر فائرنگ کی۔ دفتر کے گارڈز کی جوابی فائرنگ سے دونوں حملہ آور ہلاک ہو گئے اور ایک گارڈ زخمی ہوا ہے۔ پولیس نے تفتیش شروع کر دی ہے۔ وہاں موجود عینی شاہد کا کہنا ہے کہ دونوں حملہ آور بائک پر آئے تھے۔ انہوں نے اترتے ہی وہاں بیٹھے لوگوں پر فائرنگ کی کوشش کی لیکن ان کے پستول جام ہو گئے۔ صرف ایک حملہ آور بڑی مشکل سے ایک فائر کر سکا جس سے ایک گارڈ زخمی ہوا اور پھر گارڈز کی جوابی فائرنگ سے وہ دونوں موقع پر ہلاک ہو گئے۔ خبر میں ان کے نام نہیں آئے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ ندیم اور شکیل تھے۔ ان کے پستول جام نہیں ہوئے تھے بلکہ میں نے میگزین میں جہاں گولیاں ہوتی ہیں، تھوڑی تھوڑی ایلفی ڈال دی تھی۔ اس سے گولیاں پھنس کر رہ گئیں۔ میں بہت بزدل آدمی ہوں لیکن ان دونوں نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ یہ قدم اٹھا ہی لوں...

رین اوٹس اس سڑک پر سفر کر رہا تھا جس کے دونوں طرف تاحدِ نگاہ برف ہی برف تھی۔ اس کا رخ ڈیٹرائٹ سے این آربور کی طرف تھا۔ انتہائی شمال میں مشی گن ریاست اس وقت برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ شدید برف باری کے بعد جابجا برف کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور ویرانوں میں فٹ بھر کے حساب سے برف جمع ہو گئی تھی۔ این آربور ڈیٹرائٹ سے چالیس کلومیٹرز کے فاصلے پر ہے۔ رین شہر میں داخل نہیں ہوا بلکہ باہر ہی ایک بار اور ریستوران کے

لالچ وطمع میں ایک بعد ایک گرفتار ہو جانے والوں کا المیہ

دولت کی دیوی کب مہربان ہو جائے... کیسے اور کب روٹھ جائے... پتا نہیں چلتا... احساس اس وقت ہوتا ہے... جب انسان تہی داماں رہ جاتا ہے... محنت اور کوشش سے اپنے لیے ہر راستہ، ہر رکاوٹ کو آسانیوں میں بدلنے کا عزم رکھنے والے نوجوان کی عجیب و غریب داستاں... ہر قدم اسے امتحان سے ہمکنار کر رہا تھا۔

لالچ کہانی

آصف ملک

سامنے رک گیا۔ کار سے نکلتے ہی وہ لرز اٹھا پھر جلدی سے اپنا کوٹ اور مفلر لپیٹتے ہوئے بار میں آیا جہاں اس موسم میں بھی خاصے لوگ موجود تھے۔ کچھ اسنوکر ٹیبلو پر جمع تھے اور کچھ میزوں پر بیٹھے شراب نوشی اور کھانے پینے میں مصروف تھے۔ رین نے بار کا جائزہ لیا اور ایک کونے میں بیٹھے ان دو افراد کے پاس آیا۔

ان میں سے ایک جو چالاک چہرے والا لیکن خوش شکل آدمی تھا، اس کی عمر چالیس کے آس پاس تھی۔ وہ سامنے رکھے شراب کے گلاس سے پی رہا تھا۔ دوسرا جو زیادہ عمر کا لیکن زیادہ مضبوط اور کھردرے نقوش والا تھا، سیٹ سے ٹیک لگائے بہ ظاہر سو رہا تھا۔ چالاک آدمی کا نام گیپ آسکر تھا جبکہ دوسرا جم کولسن تھا۔ گیپ نے اس کی طرف دیکھا اور دانت نکال کر بولا۔ ”پورا ایک گھنٹا...“

”کیا ایک گھنٹا؟“ رین ان کے سامنے بیٹھ گیا، وہ نروس تھا کیونکہ اس نے آج تک ایسے افراد کے ساتھ معاملات نہیں کیے تھے۔ وہ دونوں مستند جرائم پیشہ اور کئی بار کے سزا یافتہ تھے۔ ان کا تعلق شکاگو سے تھا اور وہ خاص طور سے یہاں آئے تھے۔

”ہم ایک گھنٹے سے یہاں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ گیپ بولا۔ ”میرا ساتھی سو گیا ہے۔“

”تم موسم دیکھ رہے ہو۔“ رین نے کہا۔ ”میں پچاس کلومیٹرز ڈرائیو کر کے آیا ہوں۔“

”ہم ڈھائی سو کلومیٹرز ڈرائیو کر کے آئے ہیں۔“

”تم کمانے کے لیے آئے ہو۔“ رین نے اسے یاد دلایا۔

”اوکے، تم سامان لائے ہو؟“

”تم نے بلاوجہ مجھے بلایا۔“ گیپ نے کوٹ کی جیب سے ایک بڑا خاکی لفافہ نکال کر اس کے سامنے رکھا۔ ”دو نمبر پلیٹس کا انتظام تم خود بھی کر سکتے تھے۔“

”کام تمہارا ہے اس لیے تمہیں بھی ہاتھ پاؤں چلانے چاہئیں۔“ گیپ نے دانت نکالے۔ اس نے لفافہ ذرا سا کھول کر دیکھا اور پھر بولا۔ ”تم ایڈوانس بھی لا رہے تھے۔“

اس بار رین نے کوٹ کی دوسری جیب سے ایک چھوٹا خاکی لفافہ نکالا اور وہ بھی اس کے سامنے رکھ دیا۔ ”اس میں پانچ ہزار ڈالرز ہیں... باقی کام کے بعد۔“

گیپ نے رقم کا معائنہ کیا اور سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے۔“

”میں چلتا ہوں۔“ رین کھڑا ہو گیا۔ ”یاد رکھنا۔ پرسوں صبح ساڑھے نو بجے۔“

جم بیدار ہو گیا کیونکہ سلگتا ہوا سگریٹ اس کے ہونٹوں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ”کیا ہوا؟“

”سب کچھ۔“ گیپ نے سامنے رکھا ہوا گلاس اٹھا لیا۔ رین باہر نکل گیا۔ ایک گھنٹے بعد وہ سامان کے شاپرز اٹھائے گھر میں داخل ہوا تو بیٹ کچن میں مصروف تھی۔ وہ عام سی شکل وصورت والی عورت تھی اور کچن اس کی پسندیدہ ترین جگہ تھی۔ گیپ نے شاپرز اس کے سامنے رکھے اور اس کے رخسار پر پیار کیا۔

”میک کہاں ہے؟“

”اکارڈین کی کلاس لینے گیا ہے۔“ بیٹ نے سبزیاں کترتے ہوئے کہا۔ ”پاپا آئے ہیں۔“

رین کا مسکراتا ہوا چہرہ یک دم بجھ گیا۔ اس نے لاؤنج میں جھانکا جہاں اس کا سسر نیل کارمن بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا اور اس کی سرخ شراب پی رہا تھا۔ رین نے زبردستی اپنے لہجے میں بشاشت پیدا کی۔ ”ہیلو پاپا۔“

”ہائے۔“ نیل نے ٹی وی سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔ وہ تقریباً ستر برس کا لیکن سخت چہرے اور مضبوط جسم والا بوڑھا تھا۔ وہ اس عمر میں بھی روز دس گھنٹے کام کرتا تھا اور بالکل فٹ تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ کھانے کی میز پر تھے۔ نیل کارمن کبھی کبھی اپنی بیٹی اور نواسے سے ملنے آتا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے اچانک اس نے کہا۔

”کام کیسا چل رہا ہے؟“

”بہترین۔“ رین نے کچھ دیر بعد جواب دیا۔ ”ابھی ہم نے چالیس گاڑیوں کی ایک لاٹ کینیڈا بھیجی ہے۔“

”گڈ، اس کا مطلب ہے تم اس پوزیشن میں آ گئے کہ ساڑھے سات لاکھ ڈالرز واپس کر سکو۔“ نیل نے گلاس سرخ شراب سے بھرا۔ ”تم جانتے ہو یہ خاصی بڑی رقم ہے۔ میں چالیس ہیکٹرز زرعی زمین لینا چاہتا ہوں۔“

”یہ خاصی بڑی رقم ہے۔“ رین نے سر ہلایا۔ ”ابھی رقم رننگ میں ہے۔“

”بس تو تم اسے رننگ سے نکالنا شروع کر دو۔“ نیل نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”میرا خیال ہے دو سے تین ہفتے میں یہ کام ہو جائے گا۔“

”دو سے تین ہفتے...“ رین نے کہنا چاہا۔

”بہت ہوتے ہیں۔“ نیل نے اس کی بات کاٹ

کہا۔ ”میں کسی کو ادھار دینے کا قائل نہیں ہوں۔“

”یہ ادھار نہیں ہے۔“ رین نے احتجاج کیا۔ ”یہ انویسٹ منٹ ہے۔“

نیل کارمن ہنسا۔ ”انویسٹ منٹ... اور اپنے ہی کاروبار میں؟“

بیٹ نے برتن اٹھانا شروع کر دیے تھے، وہ ان دونوں کی گفتگو سے لاتعلق نظر آ رہی تھی۔ رین کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ بہ مشکل خود پر قابو پائے ہوئے ہے۔ اس نے کہا۔ ”پاپا! جب آپ نے یہ بزنس میرے حوالے کیا تھا تو یہاں دس گاڑیوں کی ماہانہ سیل بھی نہیں تھی۔ اب یہاں سے سو گاڑیاں ماہانہ سیل ہو رہی ہیں۔“

نیل کارمن پہلی بار مسکرایا۔ ”تم نے ٹھیک کہا اسی لیے کل میں نے آفس میں ایک میٹنگ رکھی ہے۔ تم کل صبح دس بجے آنا۔“

رین نے سکون کا سانس لیا۔ وہ سمجھا کہ نیل کارمن اب تک مذاق کر رہا تھا۔ دو سال پہلے جب اس نے یہ شوروم اور ورکشاپ اس کے حوالے کی تھی، تب یہاں خاک اڑتی تھی اور بزنس نہ ہونے کے برابر تھا۔ نیل نے اس میں ساڑھے سات لاکھ ڈالرز انویسٹ بھی کیے تھے۔ لیکن یہ رقم اس نے رین کو دی تھی۔ رین کے نزدیک یہ قرض تھا اور اس نے دو سال میں جو کمایا تھا، اس میں اس کا شیئر بنتا تھا۔ اب تک تمام بزنس مالی لحاظ سے نیل کارمن کے قبضے میں تھا حالانکہ وہ شاذ ہی وہاں آتا تھا اور اس کا بھائی ولیم کارمن نام نہاد طور پر وہاں بیٹھتا تھا۔ وہ سارا دن ٹی وی دیکھتا اور کھاتا پیتا تھا۔ شوروم اور ورکشاپ کے معاملات سے اسے کوئی غرض نہیں تھی۔ یہ ساری رین کی محنت تھی جو بزنس یہاں تک پہنچا تھا۔ بزنس بہت اچھا تھا اور کاغذات میں بہت اچھا چل رہا تھا۔ منافع براہِ راست نیل کے اکاؤنٹ میں جاتا تھا اور رین کو صرف گزارے لائق رقم ملتی تھی۔ دو سالوں میں نیل کو منافع میں سے کم سے کم تین لاکھ ڈالرز مل چکے تھے۔

ان کے شوروم میں پرانی گاڑیاں ری کنڈیشن کر کے فروخت کی جاتی تھیں۔ ستر کی دہائی میں تیل کے بحران نے امریکن آٹو انڈسٹری کو شدید متاثر کیا تھا۔ اس لیے نئی گاڑیوں کی تیاری کے متعدد پروجیکٹ منسوخ کر دیے گئے تھے۔ اس کے نتیجے میں پرانی ری کنڈیشن گاڑیوں کی مانگ بڑھ گئی تھی۔ لائف آٹوز پرانی گاڑیاں خرید کر ان کو ری کنڈیشن کر کے فروخت کرتا تھا۔ گاڑیاں انفرادی طور پر بھی فروخت کی جاتی تھیں اور لاٹ کی صورت میں بھی۔ رین نے ورکشاپ میں اچھی ٹیم جمع کی تھی۔ سیلز کا سارا کام وہ خود دیکھتا تھا۔ ملازموں کی تنخواہ بچانے کے لیے وہ بہت سارے کام خود کرتا تھا۔ حد یہ کہ کوئی گاہک آتا اور سیلز مین فارغ نہ ہوتے تو وہ خود سیلز مین بن جاتا تھا۔

☆☆☆

رین شوروم میں تھا اور اس کے سامنے ایک جوڑا تھا، مسئلہ انشورنس کا تھا۔ وہ محدود انشورنس کے ساتھ کار فروخت کرتے تھے اور اس جوڑے کو جو کار فروخت کی گئی تھی، اس کا انجن دوسرے دن سیز ہو گیا تھا۔ رین انہیں سمجھا رہا تھا کہ یہ انشورنس میں شامل نہیں مگر وہ سننے کو تیار نہیں تھے۔ مجبوراً وہ ولیم کے پاس آیا جو حسبِ معمول ٹی وی دیکھ رہا تھا اور ایک برگر کھا رہا تھا۔ رین نے اسے مسئلہ بتایا تو اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”حل کر دو۔“

رین جانتا تھا کہ اس میں کئی سو ڈالرز کا خرچ تھا مگر مجبوری تھی۔ اب ولیم نے بھی کہہ دیا تھا۔ اس نے واپس آ کر جوڑے کو خوش خبری سنائی کہ ان کی کار ٹھیک کر دی جائے گی۔ وہ خوش خوش رخصت ہوئے مگر رین نے سر تھام لیا۔ خرچ بچانے کے چکر میں اس نے بہت سے دردِسر مول لے لیے تھے۔ اور ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ زبانی کلامی انشورنس طے کرتا تھا۔ کمپنی کا معاہدہ وہ ہر ایک کو نہیں دکھا سکتا تھا کیونکہ وہ محدود انشورنس ہوتی تھی۔ اس سے گاہک بدک جاتا۔ سیلز بڑھانے کے لیے اس نے بہت پاپڑ بیلے تھے۔ وہ صبح سے رات گئے تک گدھوں کی طرح کام کرتا تھا۔ ولیم دس بجے آتا اور چار بجے اپنے بھائی کے دفتر چلا جاتا۔ آج نیل نے اسے حساب کتاب کے لیے بلایا تھا۔ اسے امید تھی کہ دو سال کے نفع میں اسے کم سے کم چار لاکھ ڈالرز ملیں گے اور وہ بیٹی کیش کی کمی پوری کر لے گا۔ اسے پرانی گاڑیوں کی دو لاٹس مل رہی تھیں اگر وہ انہیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا تو آنے والے موسمِ بہار میں اس کا بزنس چمک اٹھتا لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ اس کے پاس رقم ہو۔ اس نے سوچا کہ اگر نیل نے اسے منافع کی رقم دے دی تو وہ کال کر کے گیپ کو منع کر دے گا۔ دوسری صورت میں اس کے پاس اس منصوبے پر انحصار کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہو گا۔

جوڑے سے نمٹ کر وہ ورکشاپ میں آیا۔ جارڈن نامی دوغلا انڈین اس کے ورکشاپ کا سپروائزر تھا۔ جارڈن کی ماں سفید فام اور باپ انڈین تھا۔ وہ محنتی لیکن سخت مزاج شخص تھا۔ گاڑیوں کے بارے میں اس کا علم حیرت انگیز تھا۔

اسی لیے رین اس کی بدتمیزی اور اکھڑپن بھی برداشت کر لیتا تھا۔ اس وقت ورکشاپ میں ایک درجن گاڑیاں مرمت اور ری کنڈیشننگ کے مراحل سے گزر رہی تھیں۔ یہاں کاموں کے لیے جدید ترین مشینری اور اوزار موجود تھے۔ اس وجہ سے کام بہت تیزی سے اور صفائی کے ساتھ ہوتا تھا۔ یہاں سے نکلنے والی گاڑی تقریباً نئی ہو جاتی تھی۔ ٹھیک ہونے والی گاڑیوں میں ایک وائٹ کریسلر بھی تھی۔ یہاں جو گاڑی ری کنڈیشننگ سے گزرتی تھی، اسے نئی رجسٹریشن اور نمبر پلیٹ الاٹ ہوتی تھی۔ لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ گاڑی کے تمام کاغذات اور پرانی نمبر پلیٹ رجسٹریشن آفس کو مہیا کی جائے۔ اس کریسلر کی ڈکی سے گاڑی کی اضافی نمبر پلیٹ کا جوڑا نکلا تھا اور رین نے وہی جوڑا گیپ کو مہیا کیا تھا۔

''چار... کریسلر سے نمبر پلیٹ کا ایک ہی جوڑا نکلا تھا۔''

''اس سے دو جوڑے نکلے تھے۔'' رین نے دانت پیسے۔

''کیا مجھے کسی کے سامنے جھوٹ بولنا پڑے گا؟''

''اگر بولنا پڑا تو تمہیں اس کے دو سو ڈالرز اضافی ملیں گے لیکن میری بات یاد رکھنا۔''

''او کے باس۔''

شوروم کا کام آسان نہیں تھا، اس میں سر بہت کھپانا پڑتا تھا۔ نیل کارمن نے اپنے کیریئر کا آغاز آٹو شوروم سے کیا تھا مگر پھر اس کی توجہ زیادہ نفع بخش اور کم جھنجٹ والے بزنس کی طرف چلی گئی اور شوروم برائے نام رہ گیا۔ جب رین نے یہاں کا چارج سنبھالا تو ورکشاپ بند پڑی تھی اور ایک سیلز مین خرید و فروخت کا کام کرتا تھا۔ اب یہاں سات افراد کام کر رہے تھے، ان میں سے پانچ ورکشاپ میں تھے اور دو شوروم میں۔ وہ دونوں سیلز مین تھے۔ تین دن پہلے رین نے پچھلے دو سال کی مکمل اسٹیٹ منٹ نیل کو بھیج دی تھی اور آج اسے بلایا گیا تھا۔ وہ شام کے وقت شوروم سے روانہ ہوا۔ نیل کا دفتر ڈیٹرائٹ کے دریا کے کنارے ایک پرانی عمارت میں تھا۔ نزدیک ہی وہ دریائی گودی تھی جہاں کینیڈا سے لکڑی لائی جاتی تھی اور پھر آگے روانہ کی جاتی تھی۔ بے پناہ سردی اور برف باری کی وجہ سے بندرگاہ بند پڑی تھی اور یہ جگہ ویران تھی۔ اس وقت بھی برف باری جاری تھی۔ رین، نیل کے دفتر میں داخل ہوا تو وہاں ولیم موجود تھا اور وہ اس کی بھیجی ہوئی اسٹیٹ منٹ چیک کر رہے تھے۔ اس کے مطابق لائف آٹوز نے پچھلے دو سالوں میں سات لاکھ ڈالرز کا خالص نفع کمایا تھا۔ نیل مہاگنی کی میز کی دوسری طرف بیٹھا تھا۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ ولیم نے بات شروع کی۔ اس نے رین کی تعریف کی جس نے محنت کر کے شوروم کو یہاں تک پہنچایا تھا۔ پھر اس نے اچانک کہا۔

''رین! تمہارا کمیشن کتنا بنتا ہے؟''

وہ چونکا۔ ''کمیشن... میں نے انویسٹ کیا ہے۔''

دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ولیم نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''انویسٹ... تمہارے پاس رقم کہاں سے آئی؟''

''پاپا نے مجھے ساڑھے سات لاکھ ڈالرز کی رقم ادا کی تھی۔''

''بکواس۔'' نیل نے منہ بنایا۔ ''ہم بینک نہیں ہیں جو قرض دیتے پھریں۔''

''سنا تم نے رین... ہم بینک نہیں ہیں۔'' ولیم نے اس کی طرف دیکھا۔ ''بینک ضمانت لیتے ہیں۔ تم نے کیا ضمانت دی تھی؟''

''وہ... پاپا نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔''

''گویا تم نے ایسے ہی رقم لی۔ یہ تمہاری انویسٹ کہاں سے ہوگئی؟''

''میں ضمانت دیتا ہوں پاپا کی رقم واپس ملے گی۔ دو سالوں میں اصل رقم کے برابر ہی نفع پاپا کے اکاؤنٹ میں جا چکا ہے۔''

''بکواس۔'' نیل نے پھر کہا۔ ''یہ میرا بزنس ہے، میری رقم ہے اس لیے نفع بھی میرا ہے۔''

رین کے اندر غصہ ابلنے لگا مگر اوپر سے اس کا چہرہ مسکین ہو گیا۔ اس نے بے بسی سے ان دونوں کو دیکھا۔ ''دو کمیشن صرف دس فیصد ہوتا ہے لیکن میں نے پاپا سے لے کر...''

''اسے بھول جاؤ۔'' نیل غرایا۔ ''تمہارا کمیشن دو سالوں میں ستر ہزار ڈالرز بنتا ہے۔ تم اسے ایک لاکھ سمجھ لو اور اتنی رقم تم ماہانہ اخراجات کی صورت میں لے چکے ہو۔''

''اس لیے حساب برابر۔'' ولیم نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ رین کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا پھر وہاں سے نکل آیا۔ پارکنگ تک آتے آتے اس کا غصہ بے قابو ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا بریف کیس برف پر پٹخ دیا اور کار کی کئی ٹھوکریں رسید کیں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر وہ کچھ دیر دانت پیستا رہا پھر اس نے کہا۔

''اب تم پچھتاؤ گے خبیث بڈھے۔''

کچھ دیر بعد وہ ایک فون بوتھ میں تھا۔ اس نے ایک موٹیل کا نمبر ملایا اور گیپ سے بات کرانے کو کہا۔ کچھ دیر بعد گیپ لائن پر تھا۔ رین نے صرف اتنا کہا۔ ''پلان ڈن ہے... کل عمل کرو۔''

☆☆☆

ناشتے کی میز پر میک ٹی وی دیکھتے ہوئے ناشتا کر رہا تھا۔ اس کا اسکول سردی کی وجہ سے بند تھا اس لیے وہ اکارڈین سیکھنے کی کلاس لے رہا تھا اور ساتھ ہی اس کا ارادہ آئس ہاکی میچ دیکھنے کا تھا۔ اس کے سارے دوست جا رہے تھے۔ اس نے ماں کو راضی کر لیا تھا۔ رین اوپر سے تیار ہو کر آیا اور اس سے پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہو برخوردار؟''

''ہاکی میچ دیکھنے پاپا... اس کے بعد میں اکارڈین کی کلاس لوں گا۔''

''گڈ، تم اچھا بجانے لگے ہو۔''

''تھینک یو پاپا۔'' میک نے خوش ہو کر کہا۔ چند منٹ بعد وہ اپنا بیگ لے کر رخصت ہو رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد رین نے بیٹ سے پوچھا۔

''تم کیا کرو گی؟''

''میں ٹی وی دیکھوں گی۔ آج میرا پسندیدہ شو آتا ہے۔''

رین نے سر ہلایا۔ ''ہو سکتا ہے مجھے کچھ دیر ہو جائے۔''

''کل پاپا سے کیا بات ہوئی؟''

رین کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آ گئی۔ ''مجھے پورے ایک لاکھ کا کمیشن ملا ہے۔''

''یہ تو اچھی خبر ہے۔'' بیٹ خوش ہو گئی۔

''اس سے بھی زیادہ اچھی خبر یہ ہے کہ ایک لاکھ ڈالرز میں تنخواہ کی صورت میں لے چکا ہوں اور وہ خرچ ہو گئے تھے۔'' رین نے تلخی سے کہا اور کچھ دیر بعد وہ دفتر جا رہا تھا تو بیٹ ساکت بیٹھی تھی۔ وہ ذرا سی موجی قسم کی عورت تھی جو اپنے گھر، شوہر اور بچے میں مگن رہتی تھی۔ وہ دولت مند باپ کی بیٹی ہونے کے باوجود سارے کام خود کرتی تھی۔ اسے شاپنگ اور گھومنے پھرنے کا شوق نہیں تھا۔ اس کا واحد شوق ٹی وی دیکھنا تھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ باپ سے بات کرے۔ وہ باپ اور شوہر کے معاملے میں دخل نہیں دیتی تھی لیکن اس بار اسے محسوس ہوا کہ اس کے باپ نے اس کے شوہر کو استعمال کیا تھا۔ ٹی وی شو شروع ہونے والا تھا اس

لیے اس نے شو ختم ہونے تک کال کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ ٹی وی کے آگے بیٹھ گئی۔ لاؤنج میں سامنے کی دیوار شیشے کی تھی اور یہیں سے گھر کے اندر آنے والا راستہ تھا جیسے ہی کوئی سیڑھیوں سے آتا، اسے پتا چل جاتا۔ البتہ باہر سے دیکھنے پر اندر دکھائی نہیں دیتا کیونکہ یہ تاریک شیشے تھے۔

ابھی شو شروع ہوا تھا کہ سیڑھیوں سے ایک نقاب پوش برآمد ہوا جس نے جیک کی راڈ اٹھا رکھی تھی۔ شیشے کے پاس آ کر اس نے جھانک کر اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ پھر گویا مطمئن ہو کر اس نے راڈ سے مار کر شیشہ توڑ دیا۔ بیٹ جو اب تک دم بخود بیٹھی تھی چیخ مار کر بھاگی۔ اس کا رخ داخلی دروازے کی طرف تھا لیکن وہ ابھی لاؤنج میں تھی کہ دروازہ کھلا اور دوسرا نقاب پوش اندر آیا۔ پہلا اندر آ چکا تھا۔ بیٹ اب اندر کی طرف بھاگی اور سیڑھیوں سے اوپر آتے ہوئے واش روم میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ اس کی گھگھی بندھی ہوئی تھی اور اس کے منہ سے ڈری ڈری آوازیں نکل رہی تھیں۔ جب دروازے پر پہلی ضرب پڑی تو اس نے چیخ ماری۔ اس نے باہر کی طرف کھلنے والی چھوٹی سی کھڑکی کا پٹ کھولنے کی کوشش کی ... مگر ایسا لگ رہا تھا کہ سردی سے اس کا ہک جام ہو گیا تھا۔

راڈ والا نقاب پوش جم تھا اور اس نے پے در پے ضربیں لگا کر دروازے کا لاک والا حصہ توڑ دیا۔ وہ دونوں اندر گھسے تو عقبی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ گیپ نے باہر جھانکا اور پھر باہر کی طرف بھاگا مگر جم وہیں رک گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اتنی چھوٹی کھڑکی سے کوئی آسانی سے باہر نکل سکتا ہے جبکہ دوسری طرف زمین بھی بارہ فٹ نیچے تھی۔ پھر اس کی نظر ٹب کے سامنے لگے پردے پر گئی۔ اسی لمحے پردے میں حرکت ہوئی اور اس کے پیچھے چھپی ہوئی بیٹ پردے سمیت بھاگی۔ پردہ اس کے منہ سے لپٹا ہوا تھا اور وہ اندھا دھند بھاگتے ہوئے چیزوں سے ٹکرا رہی تھی۔ بالآخر وہ سیڑھیوں تک آئی اور نیچے لڑھک گئی۔ جب جم نیچے آیا تو وہ فرش پر ساکت پڑی تھی۔ اسی لمحے گیپ واپس آ گیا۔ ان دونوں نے مل کر اسے پردے میں ہی لپیٹ کر کار کی پچھلی نشست پر منتقل کیا اور پھر اس کے ہاتھ عقب میں باندھ کر اس کے منہ پر ٹیپ لگا دیا۔ آخر میں اس کے سر پر غلاف چڑھا دیا۔ اب وہ ان کی صورت نہیں دیکھ سکتی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ہائی وے کی طرف جا رہے تھے۔ بیٹ عقبی نشست پر بے سدھ پڑی تھی۔ جم نے پوچھا۔

''اب کہاں جانا ہے؟''

''این آربور۔'' گیپ نے جواب دیا۔ ''لیکن سیدھے راستے سے نہیں۔''

''وہ کیوں... کس طرف سے جانا ہے؟''

''یہاں سے ہم جنوب میں ٹولیڈو کی طرف جائیں گے۔'' گیپ نے کہا۔ ''پھر وہاں سے واپس این آربور کی طرف آئیں گے۔''

''اتنا گھومنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''ضرورت ہے کیونکہ اگر پولیس تک معاملہ پہنچ گیا تو ہماری تلاش شروع کر دی جائے گی اور اگر اس کار کا سراغ لگ گیا تو نمبر پلیٹ بتائے گی، اس نمبر کی کار تو جنوب کی طرف گئی تھی۔''

ہائی وے ٹول پلازا میں کیمرے لگے ہوئے تھے جن سے پتا چل جاتا کہ فلاں نمبر کی کار وہاں سے گزری تھی۔ گیپ یہ سب پلان کے تحت کر رہا تھا۔ ٹولیڈو سے گھوم کر وہ این آربور کی طرف آتے اور یہاں سے دوبارہ ڈیٹرائٹ کی طرف جاتے مگر ان کی منزل ڈیٹرائٹ سے پہلے لیوونیا کا علاقہ تھا۔ یہاں انہیں بیٹ سمیت ایک کیبن میں اس وقت تک رکنا تھا جب تک رین کی طرف سے اشارہ نہیں مل جاتا۔ بارہ بجے وہ ٹولیڈو تک پہنچ گئے اور اب انہیں واپس این آربور کی طرف جانا تھا۔ اس سے پہلے وہ دوسری ہائی وے کی طرف جاتے۔ جم نے لنچ کا مطالبہ کر دیا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔

☆☆☆

رین شام کے وقت گھر آیا۔ میک ابھی نہیں آیا تھا۔ اس کی اکارڈین کی کلاس رات نو بجے تک ختم ہوتی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر کا حشر دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ سب پلان کے مطابق ہوا ہے۔ اس نے سامان کے شاپرز کچن میں رکھے اور فون اٹھا کر نیل کا نمبر ملایا۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''پاپا! میں گھر آیا تو بیٹ غائب تھی۔ ابھی مجھے نامعلوم شخص کی کال آئی ہے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو، تمہارا دماغ درست ہے؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' رین روہانسا ہو گیا۔ ''اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر اسے ایک ملین ڈالرز ادا نہ کیے گئے تو وہ بیٹ کو... مار دے گا۔''

اس بار نیل کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ''تم وہیں رکو، ہم آ رہے ہیں۔''

رین نے ریسیور رکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

گیپ ڈرائیو کر رہا تھا اور جم سگریٹ نوشی میں گم تھا۔ اس نے کار کو اندر سے دھواں دھواں کر دیا تھا۔ گیپ نے ناگواری سے اسے دیکھا اور بولا۔ ''کیا تم کھڑکی کھول سکتے؟''

''اس موسم میں۔'' جم نے باہر جمی برف کی طرف اشارہ کیا۔ وہ این آربور سے کچھ دور تھے اور رات ہو رہی تھی۔ لنچ کے بعد وہ بار میں چلے گئے اور وہاں پیتے پلاتے ہوئے یہ بھول گئے کہ ان کی کار میں ایک مغویہ موجود ہے۔ چار بجے وہ وہاں سے نکلے تو اندھیرا چھانے لگا تھا اور چھ بجے مکمل تاریکی چھا چکی تھی۔ بیٹ ہوش میں آ گئی تھی اور رہ رہ کر کلبلا رہی تھی۔ گیپ بے دھیانی میں حدِ رفتار کا خیال نہیں رکھ سکا اور اسے اس وقت ہوش آیا جب عقب سے پولیس کار کی روشنیاں اور سائرن سنائی دیا۔ اس نے فوراً رفتار کم کر لی۔ مگر پولیس کار پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کی روشنیاں اور سائرن آن رہا۔ گیپ نے زیرِ لب اسے کوسا۔ جم نے اسے گھورا۔ ''تمہیں خیال رکھنا چاہیے تھا۔ ہائی وے پر یہ لوگ چھپ کر بیٹھے ہوتے ہیں۔''

گیپ نے مجبوراً کار ایک طرف روک لی۔ پولیس کار کی سرچ لائٹس آن ہو گئی تھیں۔ جم نے بیٹ کو دھمکایا۔ ''تم چپ رہو گی۔''

چند لمحے بعد پولیس کار سے واحد پولیس آفیسر اتر کر آیا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں ان دونوں کا معائنہ کیا پھر گیپ سے کہا۔ ''تم مقررہ رفتار سے زیادہ پر جا رہے تھے، اپنے کاغذات دکھاؤ۔''

''سوری آفیسر... باتوں میں خیال نہیں رہا۔'' گیپ نے معذرت کی اور پرس میں لگا اپنا ڈرائیونگ لائسنس سامنے کر دیا۔ پولیس آفیسر نے تصویر سے اس کا معائنہ کیا۔

''گاڑی کے کاغذات دکھاؤ۔'' اس نے اگلا مطالبہ کیا۔ گیپ ڈیش بورڈ سے کاغذات نکالنے جا رہا تھا کہ عقب سے بیٹ نے کراہنے جیسی آواز نکالی۔ پولیس آفیسر چونکا۔ ''یہ آواز کیسی ہے؟'' اس نے جھک کر اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ گیپ کا چہرہ سفید پڑ گیا مگر جم تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پولیس آفیسر کی جیکٹ کا کالر کھینچا اور دوسرے ہاتھ سے اپنا پستول نکالتے ہوئے اس کے سر میں گولی اتار دی۔ خون کے چھینٹے اڑ کر گیپ تک آئے۔ جم نے کالر چھوڑا تو پولیس آفیسر پیچھے جا گرا۔

مر چکا تھا۔ اسی لمحے سامنے سے ایک کار نمودار ہوئی اور وہ ان کے پاس پہنچی تو اس میں موجود ایک موٹے سے آدمی اور ایک لڑکے نے واضح طور پر پولیس آفیسر کی لاش اور ان لوگوں کو دیکھا۔ موٹے آدمی نے دہشت زدہ ہو کر اپنی گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ جم نے گیپ کو باہر دھکیلا۔ ''اسے سڑک سے دور پھینک دو۔''

ایک منٹ سے بھی پہلے جم دوسری کار کے پیچھے جا رہا تھا۔ فائر کی آواز سن کر بیٹ سسکیاں لے رہی تھی۔ جم نے گرج کر کہا۔ ''اب تمہاری آواز نکلی تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔''

یہ سنتے ہی بیٹ نے دم سادھ لیا۔ اگلی کار کا انجن اتنا اچھا نہیں تھا اس لیے جم رفتہ رفتہ اس کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ یہ بات آگے کار والوں نے بھی محسوس کر لی اور ان کی کار اپنی حد سے زیادہ رفتار پر جا رہی تھی۔ اچانک وہ لہرائی اور سڑک سے اتر کر الٹ گئی۔ اس نے چند قلابازیاں کھائیں اور الٹی ہو کر رک گئی۔ جم نے کار اس کے پاس روکی اور پستول نکالتا ہوا نیچے آیا۔ موٹا آدمی کار سے نکل کر بھاگا مگر اسے چند قدم اٹھانے کا ہی موقع ملا پھر گولی اس کی پشت میں اتر گئی۔ لڑکا اندر ہی تھا اور جم نے اسے وہیں شوٹ کر دیا۔ اس نے موٹے آدمی کو چیک کیا۔ وہ بھی مر گیا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ سب اس طرح سفر کر رہے تھے کہ گیپ پولیس کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے پولیس کار درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپا دی اور این آربور میں داخل ہو گئے۔ یہاں سے انہیں مزید ایک گھنٹے کا سفر کر کے لیوونیا تک جانا تھا۔ اس کے بعد بس انہیں انتظار کرنا تھا۔ گیپ نے پولیس آفیسر کا خون صاف کر دیا تھا اور اب کچھ سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

جولی این گہری نیند میں تھی جب فون کی گھنٹی بجی اور اس نے کروٹ لے کر سرہانے رکھا ہوا فون اٹھایا۔ ''ہیلو۔'' اس نے غنودہ آواز میں کہا پھر دوسری طرف سے بات سن کر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ عقب سے اس کے شوہر جان نے نیند بھری آواز میں کہا۔

''آرام سے ڈیئر، اس حالت میں تمہیں یوں نہیں اٹھنا چاہیے۔''

''اوکے، میں آ رہی ہوں۔'' جولی نے کہا اور فون رکھ کر بولی۔ ''اٹھ جاؤ... مجھے جانا ہے تم ناشتا کر کے آ جانا۔''

آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں کچن میں تھے۔ جولی نے عجلت میں اپنا لائم جوس ختم کیا جبکہ جان سکون سے مکمل ناشتا کر رہا تھا۔ جولی نے وردی پہن لی تھی جس میں اس کا پیٹ نمایاں تھا۔ وہ اور جان دونوں ڈیٹرائٹ پولیس میں تھے۔ جولی اس جگہ پہنچی جہاں کار الٹی پڑی تھی اور ایک لاش اس کے باہر تھی جبکہ دوسری اندر تھی۔ وہاں ایک عدد پولیس کار تھی اور اس کا ساتھی بیری مین موجود تھا۔ اس نے اترتے ہی جولی کو گرم کافی کا مگ تھمایا اور بولا۔ ایک گھنٹا پہلے پولیس نے انہیں دیکھا ہے اور دوسری خبر یہ ہے کہ ایک پٹرول کار غائب ہے اور اس کے آفیسر کی لاش یہاں سے دو کلومیٹرز پیچھے سڑک سے ہٹ کر پائی گئی ہے۔ پہلے تم انہیں دیکھ لو۔''

جولی ہومی سائڈ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے دونوں لاشوں کا معائنہ کیا اور جوتوں کے نشان نوٹ کیے جو الٹی کار کے آس پاس بنے تھے۔ اس نے بیری سے کہا۔ ''قاتل بڑا اور بھاری آدمی ہے۔''

پولیس کا عملہ اور ایمبولینس آ گئی تھی۔ جولی یہاں معائنہ مکمل کر کے بیری کے ساتھ دوسری طرف روانہ ہو گئی۔ وہاں پولیس آفیسر مائیکل کین کی لاش پڑی تھی۔ سڑک کے کنارے جما خون بتا رہا تھا کہ اسے وہاں قتل کیا گیا تھا اور پھر یہاں لا کر ڈالا گیا تھا۔ جولی نے جوتوں کے الگ نشان سے نتیجہ اخذ کیا کہ یہاں دوسرا آدمی ملوث تھا اور امکان یہی تھا کہ دونوں وارداتیں ملی ہوئی تھیں۔ پولیس کار اور قاتلوں کی کار این آربور کی طرف گئی تھیں۔ جولی نے اس لاش کا معائنہ مکمل کیا اور پولیس کار تلاش کرنے کا حکم دے کر دفتر کی طرف روانہ ہو گئی۔ ایک گھنٹے بعد اسے پتا چلا کہ پولیس کار مل گئی ہے اور اس کے کیمرے میں ایک سلور مزدا کی تصویر تھی۔ اس کی نمبر پلیٹ نمایاں تھی۔ مزید ایک گھنٹے بعد پتا چلا کہ اس نمبر پلیٹ کی کار لائف آٹوز میں ری کنڈیشننگ سے گزر رہی تھی اور نمبر پلیٹ اور رجسٹریشن نمبر تبدیلی کے مرحلے کی درخواست آئی ہوئی تھی۔

☆☆☆

وہ صبح لیوونیا پہنچے۔ مطلوبہ کیبن سڑک کے کنارے لیکن کسی قدر ہٹ کر اور جنگل کے ساتھ واقع تھا۔ یہاں پیچھے لکڑی کا برادہ بنانے والی مشین لگی ہوئی تھی۔ گیپ نے عقب سے بیٹ کو نکالا تو وہ چھوٹ کر اِدھر اُدھر دوڑنے اور چلّانے لگی۔ وہ دونوں اس کی جدوجہد سے محظوظ ہو رہے تھے۔ پھر وہ اسے اندر لے گئے۔ انہوں نے اسے کچن میں ستون کے ساتھ ایک اسٹول رکھ کر اس پر باندھ دیا۔ گیپ

نے جم سے کہا۔ ”تم اس کی نگرانی کرو، میں ابھی آتا ہوں۔“

”تم کیا کرو گے؟“

”ایک تو میں کال کر کے اسے بتاؤں گا کہ ہم نے کام کر لیا ہے، دوسرے گاڑی کی نمبر پلیٹ پھر بدلنی ہے۔“ گیپ باہر نکل آیا۔ اس کا رخ ایک بار کی طرف تھا۔ وہ وہاں سے رین کو کال کر سکتا تھا۔ پولیس آفیسر اور دیگر دو افراد کے قتل نے اسے پریشان کر دیا تھا مگر اب اسے ایک چانس اور مل رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس سے پورا فائدہ اٹھائے گا۔

☆☆☆

رین منہ بنائے بیٹھا تھا۔ جن لانس کی رقم پھنسی تھی، ان کے سیریل نمبرز والا کاغذ اس سے کہیں گم ہو گیا تھا اور دوسری طرف سے مسلسل فون پر فون آ رہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو آخری فون آیا تھا، اس میں اسے واضح دھمکی دی گئی تھی کہ بات اب قانون تک جائے گی۔ سیریل نمبر پھر سے نکلوانا مسئلہ نہیں تھا مگر دوسری پارٹی نے وعدہ خلافی کی تھی اور اب تک اسے ایڈوانس کی رقم بھی نہیں ملی تھی۔ اس لیے وہ بھی اس معاملے میں تیزی دکھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سیریل نمبرز کے بغیر وہ گاڑیاں آگے فروخت نہیں کر سکتے تھے۔ نیل کے عزائم واضح تھے۔ وہ اسے صرف ایک ملازم کے طور پر استعمال کر رہا تھا جبکہ اس نے محنت مالکوں والی کی تھی اور دن رات کوشش کر کے لائف آٹوز کو اس مقام پر لایا تھا جہاں یہ نفع بخش ادارہ بن گیا تھا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ نیل اسے سرے سے الگ نہ کر دے۔

اس لیے رین نے یہ منصوبہ تیار کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بیٹ سے محبت کرتا ہے اور اس کی خاطر تاوان کی رقم ادا کرنے پر راضی ہو جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ جب رین نے اسے بتایا کہ اغوا کرنے والوں نے ایک ملین ڈالرز کا مطالبہ کیا ہے اور نہ دینے کی صورت میں بیٹ کو قتل کرنے کی دھمکی دی ہے تو نیل ایک ملین ڈالرز دینے پر راضی ہو گیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ آج شام تک رقم کا بندوبست کر لے گا۔ ولیم پولیس کے پاس جانے کا مشورہ دے رہا تھا مگر نیل نے مشورہ مسترد کر دیا۔ رین خوش تھا۔ اس نے زیرِ لب کہا۔ ”سب جائیں جہنم میں... کل تک مجھے کسی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ میں اپنا آٹوز خود کھول لوں گا۔ یہاں کے گاہک میرے پاس آئیں گے۔“

اسی لمحے اس کے دفتر کا دروازہ کھلا اور ایک خاتون پولیس آفیسر نے اندر جھانکا۔ ”مسٹر اولس۔“

”ہاں، میں ہی ہوں۔“ رین کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ یہاں کیوں آئی ہے۔ کیا ان [illegible] سے کوئی گڑبڑ ہوئی تھی؟ وہ اندر آ گئی اور اس کی طرف بڑھایا۔ اس کا بڑھا ہوا پیٹ بتا رہا تھا کہ وہ امید سے [illegible]

”سر! میں جولی این ہوں... ہومی سائڈ ڈیپارٹمنٹ [illegible]“

”بیٹھو، میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

”تمہارے شوروم سے کوئی کار چوری ہوئی ہے؟“

”بالکل نہیں۔“

”یہ تمہاری ایک کار کا نمبر ہے۔“ جولی نے [illegible] آگے کیا، اس پر کرسیلر کا نمبر لکھا ہوا تھا۔

رین نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا مگر اس [illegible] اداکاری کی اور اپنے رجسٹر میں چیک کیا پھر بولا۔ ”ہاں [illegible] ایک کار کا نمبر ہے جو ری کنڈیشن ہو رہی ہے اور اس [illegible] ورکشاپ میں موجود ہے۔“

”اس نمبر کی کار ایک معاملے میں ملوث پائی [illegible] ہے۔“

رین کا دل دہل گیا مگر اس نے اپنے تاثرات پر [illegible] رکھا۔ ”کیسی واردات؟“

”تمہیں یقین ہے کہ اس نمبر کی کار تمہاری [illegible] ورکشاپ میں ہے؟“ جولی نے اس کا سوال نظر انداز کر کے پوچھا۔

”بالکل... میں ابھی تمہیں دکھاتا ہوں۔“ اس [illegible] کہا اور جولی کو لے کر ورکشاپ میں آیا جہاں کرسیلر کار [illegible] مرحلے سے گزر رہی تھی۔ کار اور اس کے کاغذات د[illegible]

جولی نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ رین نے پوچھا۔ ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم یہاں کس سلسلے میں [illegible] ہو؟“

جولی نے سوچا اور مسکرائی۔ ”میں ایک بار پھر تمہاری شکرگزار ہوں۔“

جولی کے جانے کے بعد رین اپنے کمرے میں [illegible] وہ سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں سے کیسے رابطہ کرے۔ وہ [illegible] تک یقیناً لیوونیا میں کیبن تک پہنچ گئے ہوں گے لیکن [illegible] فون نہیں تھا۔ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہوئی تھی۔ فون کی گھنٹی [illegible] اس نے ریسیور اٹھایا۔ ”ہیلو۔“

”مسٹر اولس۔“ دوسری طرف سے گیپ کی [illegible] آئی۔

”میرے خدا! تم لوگوں نے کیا کیا ہے؟! ابھی [illegible]

پولیس آفیسر یہاں سے ہو کر گئی ہے۔ اس کے پاس تمہاری گاڑی کا نمبر ہے... وہ نمبر جس کی پلیٹ میں نے تمہیں دی تھی۔"

"مسٹر اوئس! صورتِ حال بدل گئی ہے۔ اس معاملے میں تین لاشیں بھی ملوث ہو گئی ہیں اور اب اسی ادائیگی پر کام نہیں ہوگا۔"

"تین لاشیں۔" وہ دہل گیا۔ "تم نے کیا کیا ہے؟"

"تم نے کیا سمجھا ہے، یہ سب اتنا آسان ہوتا ہے۔ اس میں ایک کوپ بھی شامل ہے۔ اب صرف چالیس ہزار ڈالرز سے کام نہیں چلے گا۔"

"دیکھو، ہمارے درمیان ایک ڈیل ہوئی تھی۔"

"اسے بھول جاؤ... اب ہمیں پانچ لاکھ ڈالرز چاہئیں۔"

"پانچ لاکھ ڈالرز۔" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"ہاں اور کل رات تک چاہئیں دوسری صورت میں تمہاری بیوی کی لاش ملے گی، ان نمبر پلیٹوں کے ساتھ جن پر تمہاری انگلیوں کے نشانات ہیں۔ تم سوچ سکتے ہو کہ تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔ پانچ لاکھ ڈالرز کل رات دس بجے تک تیار رکھنا، میں کال کروں گا۔"

"میری بات سنو۔" رین چلّایا مگر گیپ فون بند کر چکا تھا۔ رین کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی دلدل میں پھنس گیا ہے اور رفتہ رفتہ اس میں اترتا جا رہا ہے۔

☆☆☆

جولی ہائی وے کے ساتھ مختلف موٹیل اور بارز میں سلور رنگ کی مزدا کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہی تھی۔ شام ہو چکی تھی اور وہ تھک رہی تھی مگر وہ یہ کام کر کے جانا چاہتی تھی۔ ایک رات میں تین افراد کا قتل جن میں ایک پولیس آفیسر بھی شامل تھا، معمولی بات نہیں تھی۔ وہ دوپہر میں کچھ دیر کے لیے آفس گئی تھی اور وہاں جان کے ساتھ لنچ کیا تھا۔ وہ جان سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ صرف اس کے پاس رہنے کی خاطر وہ پولیس کی جاب کر رہی تھی اور اس حالت میں بھی اس نے چھٹی نہیں لی تھی لیکن ایک مہینے بعد اسے لازمی چھٹی لینا پڑتی۔ یہ ساتواں موٹیل اور بار تھا جہاں وہ لوگوں سے سلور مزدا کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہی تھی۔ بالآخر اسے کامیابی مل گئی۔ یہ دو کال گرلز تھیں۔ عورت ہونے کے ناتے وہ فوراً اس سے بے تکلف ہو گئیں۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ پرسوں رات انہیں دو آدمیوں نے ہائر کیا تھا۔ ان میں سے جو ذرا موٹی تھی، وہ گیپ کے ساتھ تھی اور اس نے اسے ناٹی مین کا لقب دیا تھا۔ دوسری جو دبلی اور قدر لمبی تھی، اس نے ناٹی مین کے ساتھی کو آکس مین قرار دیا تھا۔ کام کی بات یہ تھی کہ ان کے پاس سلور مزدا تھی۔ رات بھر ان کے ساتھ رہی تھیں اور انہوں نے انہیں چھ سو ڈالرز دیے تھے۔

"ان کے نقوش کیسے تھے؟" جولی نے پوچھا تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

"ناٹی مین چالاک نقوش والا تھا۔" موٹی نے کہا۔

"جیسے بہت ہوشیار آدمی ہوتے ہیں۔"

"ہوشیار... بالکل وہ ہوشیار ہی ہوگا۔" جولی نے تعریفی انداز میں کہا۔

"دوسرا بالکل خاموش اور اپنے کام سے کام رکھنے والا تھا۔" لمبی لڑکی نے کہا۔ "مجھے اس سے خوف محسوس ہوا تھا جیسے وہ اندر سے خوفناک آدمی ہو۔"

"وہ یقیناً خوفناک ہوگا۔" جولی نے پھر تعریفی انداز میں کہا۔ آدھے گھنٹے میں اس نے ملک شیک کے دو گلاس پیے اور ان سے خاصی معلومات حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ وہ ان کا شکریہ ادا کر کے اٹھی تو خاصی مطمئن تھی۔ گھر جانے سے پہلے اس نے ریڈیو پر آفس میں بیری سے بات کی اور اس نے انکشاف کیا کہ سلور مزدا کار جس کا نمبر وہ لے کر آئی تھی وہ پہلے ٹولیڈو گئی تھی اور پھر پلٹ کر واپس این آر پورٹ ہوتی ہوئی ڈیٹرائٹ کے علاقے لیوونیا سے اندر داخل ہوئی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اگلے روز سے لیوونیا کے علاقے میں سلور مزدا کی تلاش شروع کرے گی۔ وہ گھر آئی تو بہت تھکی ہوئی تھی۔ جان نے اس کے لیے ڈنر تیار کیا تھا۔ وہ ڈنر کر کے سونے کے لیے لیٹے تو جان نے اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔

"دو مہینے باقی ہیں۔"

جولی مسکرانے لگی۔ اس وقت وہ عورت بن گئی تھی۔

"ہاں، دو مہینے باقی رہ گئے ہیں۔"

☆☆☆

"پاپا! یہ بہت خطرناک ہوگا بیٹ کے لیے۔" رین نے کہا۔ وہ اس وقت نیل کے گھر میں تھا۔ پتھروں اور لکڑی سے بنا یہ عالی شان مینشن ڈیٹرائٹ کے ایک پوش علاقے میں تھا۔ ولیم کی رہائش ایک ہائی رائز اپارٹمنٹ بلڈنگ میں تھی لیکن وہ اکثر بھائی کے ساتھ ہی پایا جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ وہاں موجود تھا۔ صبح نیل راضی تھا کہ وہ ایک ملین ڈالرز اس کے حوالے کرے گا اور وہ جا کر اغوا کاروں سے بیٹ کو واپس لے آئے گا۔ رین نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ سب خوش اسلوبی سے کر لے گا۔ مگر اب نیل نے اچانک پلٹا کھایا تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ تاوان کی رقم خود لے کر جائے گا۔ رین کی بات پر اس نے غرا کر کہا۔

"یہ میری رقم ہے اور بیٹ میری بیٹی ہے۔ میں دونوں کی سلامتی کسی اور کے حوالے نہیں کر سکتا۔"

"پاپا! ان سے میری بات ہوئی ہے اور اگر میرے علاوہ کوئی گیا تو بات بگڑ بھی سکتی ہے۔"

"کیسے بگڑ سکتی ہے؟" ولیم نے کہا۔ وہ سکون سے ایک طرف بیٹھا تھا مگر رین کو دو سو فیصد یقین تھا کہ نیل کو یہ پٹی اسی نے پڑھائی ہوگی۔ اب وہ خود رقم لے کر جانا چاہتا تھا۔ "انہیں رقم چاہیے... چاہے وہ کوئی بھی لے جا کر دے۔"

"نہیں، انہوں نے واضح کہا ہے کہ میرے سوا کوئی نہ آئے ورنہ ڈیل نہیں ہوگی اور ڈیل نہیں ہوئی تو بیٹ نہیں آئے گی۔"

"بکواس۔" نیل نے منہ بنایا۔ "انہیں رقم سے مطلب ہونا چاہیے اور میں اس معاملے میں تم جیسے ناکارہ آدمی پر کیسے اعتماد کر سکتا ہوں؟ دوسری صورت یہ ہے کہ میں پولیس کو رپورٹ کر دوں، وہ خود ان سے نمٹ لے گی۔"

رین کا دل چاہ رہا تھا کہ سر دیوار پر دے مارے۔ اس نے سارا پلان بہت سوچ سمجھ کر بنایا تھا۔ اس نے گیپ اور جم کو تلاش کیا، ان سے رابطہ کیا اور ان سے کام لیا۔ وہ بیٹ کو اغوا کر کے لے گئے۔ پلان کے مطابق اسے تاوان کی رقم لے کر جانی تھی۔ مگر وہ راستے میں ہی اصل رقم سے صرف چالیس ہزار ڈالرز نکال کر لے جاتا اور ان کو دے کر بیٹ کو لے آتا۔ اسے بیٹ سے محبت تھی اور وہ اس کے بیٹے کی ماں بھی تھی اس لیے وہ اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ کام بھی اس نے دل پر پتھر رکھ کر کیا تھا۔ اس کے پاس ساڑھے نو لاکھ ڈالرز سے زیادہ کی رقم بچتی اور وہ اس سے اپنا کام کر سکتا تھا۔ مگر اب سب اس کی پلاننگ کے برخلاف ہو رہا تھا۔ پہلے ہی تین افراد بلاوجہ مارے گئے اور پھر گیپ نے بدبختی سے پانچ لاکھ ڈالرز کا مطالبہ کر دیا تھا۔ مگر یہ بھی غنیمت تھا کہ اسے نصف رقم بچ رہی تھی۔

اب نیل مصر تھا کہ وہ خود تاوان کی رقم لے جا کر دے گا۔ اس صورت میں رین کے ہاتھ سے باقی کے پانچ لاکھ ڈالرز بھی جاتے اور اسے کچھ نہ ملتا۔ یہ سوچنا بھی بے وقوفی تھی کہ ایک بار ایک ملین ڈالرز کی رقم ہاتھ آ جانے کے بعد گیپ اور جم اسے ایک ڈالر... بھی واپس کریں۔ دوسری طرف نیل کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ فیصلہ کر چکا ہے اور کسی صورت اس سے نہیں ہٹے گا۔ رین کے چہرے پر بے بسی کے تاثرات دیکھ کر ولیم مخصوص انداز میں مسکرانے لگا۔ وہ روزِ اوّل سے رین سے نفرت کرتا تھا۔ نیل کو اس کے خلاف وہی بھڑکاتا تھا کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ کہیں بیٹی کی محبت میں آ کر نیل دولت میں سے کچھ حصہ اس کے نام نہ کر دے۔ اس صورت میں ولیم کو کم ملتا اور وہ کسی صورت اپنے حصے میں کمی کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسی وجہ سے اس نے... خود دم کی نگرانی اپنے ذمے لی تھی تاکہ ہمہ وقت رین پر نظر رکھے اور اس کی خبریں نیل تک پہنچاتا رہے۔ نیل نے اس کی طرف دیکھ کر تحکمانہ انداز میں کہا۔

"جیسے ہی ان کی کال آئے، تم مجھے بتاؤ گے کہ رقم لے کر کہاں جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے پاپا۔" رین نے کہا اور اپنا کوٹ اور ہیٹ پہن کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی ولیم نے کہا۔

"مجھے لگ رہا ہے یہ درمیان میں اپنا حصہ بھی رکھ رہا ہے۔"

"اسی لیے میں خود رقم لے کر جا رہا ہوں۔" نیل نے سر ہلایا۔ "پھر مجھے بیٹ کی فکر بھی ہے۔ میں اس کی سلامتی اس شخص پر نہیں چھوڑ سکتا۔"

ولیم سوچ رہا تھا کہ اگر اغوا کرنے والے بیٹ کو قتل کر دیں تو اس کے راستے کا واحد کانٹا بھی ہٹ جائے گا۔ پھر نیل کی ساری دولت اسے ہی ملے گی۔

☆☆☆

گیپ شام سے ذرا پہلے ڈیٹرائٹ ائر پورٹ کی پارکنگ میں داخل ہوا اور اس حصے میں آیا جہاں باہر جانے والے مسافروں نے اپنی گاڑیاں کھڑی کی تھیں۔ ان پر جمی برف کی موٹی تہ بتا رہی تھی کہ وہ ہفتوں سے وہاں کھڑی تھیں۔ گیپ پارکنگ میں گھوم پھر کر دیکھنے لگا۔ اسے ایک بیوک مناسب لگی کیونکہ اس پر برف کی اتنی موٹی تہ تھی کہ اس کی نمبر پلیٹ بھی چھپ گئی تھی۔ وہ اتر کر نیچے آیا۔ اس نے عقبی نمبر پلیٹ سے برف صاف کی اور پھر اسکروڈرائیور سے اسے کھولنے لگا۔ اسے کھول کر اس نے آگے والی نمبر پلیٹ کھولی۔ یہ کام اس نے چند منٹ میں کر لیا۔ خالی جگہ اس نے

برف اٹھا کر مل دی‘ اب برف ہٹائے بغیر یہ کہنا مشکل تھا کہ کار کی نمبر پلیٹیں موجود ہیں یا نہیں۔ یہاں دور تک کوئی نہیں تھا اس لیے اس نے سکون سے یہ نمبر پلیٹیں سلور مزدا میں لگائیں اور اس کی نمبر پلیٹیں بیوک کے نیچے پھینک دیں۔ اب بیوک ہٹتی تو یہ نمبر پلیٹیں نظر آتیں۔

وہ پارکنگ سے باہر جانے لگا تو گیٹ کیپر نے جھانک کر کار کا نمبر دیکھا اور بولا۔ ’’چار ڈالرز پلیز۔‘‘

’’وہ کس چیز کے؟‘‘

گیٹ کیپر بڑے دانتوں والا نوجوان تھا۔ اس نے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ ’’یہ بہت عرصے سے پارکنگ میں کھڑی تھی اس لیے فیس لگتی ہے۔‘‘

گیپ جانتا تھا کہ ایسی کوئی فیس نہیں ہے مگر اس کے بغیر وہ یہاں سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ زیر لب اسے کوستے ہوئے گیپ نے اسے چار ڈالرز تھمائے اور کار آگے بڑھا دی تھی۔ اسے جھنجلاہٹ ہو رہی تھی اور وہ واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس ویران کیبن میں سوائے ایک ٹی وی کے اور ایک ادھیڑ عمر عورت کے کچھ نہیں تھا اور اسے دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے ایک بار کا رخ کیا۔ اسے امید تھی کہ وہاں اسے کوئی اچھی صورت مل جائے گی اور اس کی رات خوشگوار گزرے گی۔ اس کی توقع پوری ہوئی۔ یہ ذرا مہنگا بار تھا اور اسے ملنے والی کال گرل بھی مہنگی تھی۔ وہ اتنے میں مانی جتنے میں انہیں دو دن پہلے والی دونوں کال گرلز پڑی تھیں مگر وہ خوش تھا۔ بس ایک دن کی بات اور تھی پھر اس کے پاس پانچ لاکھ ڈالرز کی خطیر رقم ہوتی۔ اسے یقین تھا کہ رین انکار کی جرأت نہیں کرے گا۔ خاص طور سے اس کی نمبر پلیٹ والی دھمکی کے بعد۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ جم کو طے شدہ بیس ہزار ڈالرز تھمائے گا اور پھر جنوب کا رخ کرے گا جہاں موسم اور لڑکیاں دونوں زبردست تھے۔ لڑکی اسے بار کے ساتھ واقع موٹیل میں لے گئی۔ یہ موٹیل بھی مہنگا تھا مگر آج گیپ خرچ کرنے کے موڈ میں تھا اس لیے اس نے بہ خوشی یہ خرچ بھی برداشت کر لیا۔ مگر عین اس وقت جب وہ ہواؤں میں اڑ رہا تھا، اچانک ہی لڑکی کو کسی نے بستر سے کھینچ لیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تھا کہ کھینچنے والے نے اسے بھی کھینچ کر دیوار پر دے مارا۔ وہ بہت تنومند تھا۔ لڑکی چلا رہی تھی اور بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی مگر تنومند شخص نے اسے دبوچ کر زمین پر گرایا اور اس کی کمر پر لاتیں مارنے لگا۔ بہ مشکل وہ بھاگنے میں کامیاب ہوئی تو وہ پلٹ کر گیپ کی طرف آیا اور اسے گردن سے دبوچ کر اٹھایا۔ وہ چلایا۔ ’’یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے کال گرل کی ادائیگی کی تھی۔‘‘

’’کال گرل؟‘‘ تنومند شخص غرایا۔ ’’ذلیل آدمی، وہ میری بیوی ہے۔‘‘

اس نے دوبارہ گیپ کو دھکا دے کر زمین پر گرایا اور اس کی پتلون سے بیلٹ نکال لی۔ آدھے گھنٹے بعد گیپ اپنی قسمت کو کوستے ہوئے ایک بار میں وہسکی کی مدد سے پشت میں لگی آگ کو بھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ موٹیل کے کلرک نے اسے دوبارہ نظر آنے کی صورت میں پولیس کو کال کرنے کی دھمکی دی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ کسی موٹیل میں نہیں جائے گا اور نہ ہی کسی لڑکی کے چکر میں پڑے گا۔ رقم لے گا اور یہاں سے سیدھا نکل جائے گا۔ وہ صبح چار بجے تک بار میں بیٹھا رہا اور جب بار بند ہوا تو آ کر کار میں سو گیا۔ کار اس نے ایک عقبی گلی میں کھڑی کی تھی‘ اسے معلوم تھا کہ پولیس کو سلور مزدا کا پتا چل گیا تھا۔ اس نے بروقت نمبر پلیٹ بدل لی تھی ورنہ اس نمبر پلیٹ کے ساتھ وہ آسانی سے گرفت میں آ جاتا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ جانے سے پہلے اس کار سے بھی چھٹکارا حاصل کر لے گا۔ وہ بائی روڈ یا بائی ٹرین بھی جا سکتا تھا۔

☆☆☆

رین کی آنکھ کھلی اور اس نے بستر پر خالی جگہ دیکھی تو اس کے اندر کانٹا سا چبھا۔ یہاں بیٹ ہوتی تھی اور اب وہ نہ جانے کس حال میں تھی۔ ان مجرموں نے اس کے ساتھ کوئی غلط سلوک تو نہیں کیا تھا؟ وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ حد یہ کہ اس کے زندہ ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر آیا تو میک کے کمرے سے سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے اندر جھانکا۔ وہ بیٹھا... رو رہا تھا۔ رین اندر آیا اور اسے سینے سے لگا لیا۔

’’میک! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آج پاپا رقم دے کر بیٹ کو لے آئیں گے۔ وہ ٹھیک ہوگی۔‘‘

’’مجھے ڈر ہے کہ ان لوگوں نے ماما کے ساتھ برا سلوک نہ کیا ہو۔‘‘

’’نہیں، سب ٹھیک رہے گا۔‘‘ رین نے اسے تسلی دی مگر اندر سے اسے لگ رہا تھا کہ سب ٹھیک نہیں۔ گڑبڑ ہو جا رہی تھی۔ وہ نیچے آیا۔ اس نے اپنے اور میک کے لیے ناشتا بنایا اور پھر شوروم کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ گیپ سے بیٹ کے ساتھ نمبر پلیٹس بھی لے گا اور انہیں خود ضائع کرے گا تاکہ وہ کبھی پولیس کے ہاتھ

آ سکیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کاش گیپ اسے ایک بار کال کر لے۔ اب اسے رقم سے زیادہ بیٹ اور اپنے تحفظ کی فکر تھی۔ گیپ کو آگاہ کرنا ضروری تھا کہ رقم وہ نہیں بلکہ اس کا سسر نیل لائے گا اور اسے اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ مگر گیپ نے کال نہیں کی۔ وہ سارا دن ہر بیل پر اس توقع کے ساتھ ریسیور اٹھاتا... کہ شاید گیپ کی کال ہو۔ وہ پریشان بیٹھا ہوا۔ بے خیالی میں سامنے رکھے کاغذ کے پیڈ پر پنسل سے لکیریں بنا رہا تھا۔ شام کے وقت اسے نیل کی کال آئی۔

’’اپنے گھر آ جاؤ، میں رقم سمیت یہاں موجود ہوں۔‘‘

وہ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ گھر پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ نیل سخت لیدر کے ایک بریف کیس سمیت موجود تھا۔ اس نے رین سے کہا۔ ’’اس میں ایک ملین ڈالرز کی رقم موجود ہے۔‘‘

’’پلیز پاپا! میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔‘‘ رین نے ولیم کی غیر موجودگی سے حوصلہ پا کر کہنا شروع کیا۔ ’’اغوا کرنے والے نے واضح کہا ہے کہ وہ صرف مجھ سے ڈیل کرے گا اور کسی سے بات نہیں کرے گا۔‘‘

’’میں اس سے بات کرنے نہیں، اسے رقم دینے اور اپنی بیٹی کو لینے جا رہا ہوں۔‘‘

’’وہ بھڑک جائے گا، اسے کوئی چال سمجھے گا اور اس سے بیٹ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔‘‘ رین نے التجا کی۔ ’’پلیز پاپا! رقم مجھے لے کر جانے دیں۔‘‘

’’رقم صرف میں لے کر جاؤں گا۔‘‘ نیل نے کہا۔ ’’جب وہ کال کرے گا تو میں دوسرے فون پر سنوں گا۔ تم اسے بالکل نہیں بتاؤ گے کہ رقم لے کر کوئی اور آ رہا ہے۔‘‘

’’پاپا...‘‘

’’دوسری صورت میں، میں پولیس کو کال کر دوں گا۔‘‘

☆☆☆

گیپ کی آنکھ کھلی تو سردی سے اس کا جسم اکڑا ہوا تھا اور اس کی پشت پر موجود زخم تکلیف دے رہے تھے۔ جس وقت تنومند شخص اس پر اسی کی بیلٹ برسا رہا تھا تو اس کا پستول کار میں پڑا ہوا تھا۔ ورنہ وہ تنومند شخص کے سر میں سوراخ کر دیتا۔ وہ کار سے بہ مشکل اترا اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کبھی نہ کبھی یہ کام ضرور کرے گا اور ساتھ ہی اس کتیا کو بھی قتل کر دے گا جس نے اسے کال گرل کا دھوکا دیا تھا۔ وہ بار تک آیا اور وہسکی کے دو گلاس پی کر اس کی حالت کسی قدر بہتر ہوئی۔ سات بجے اس نے رین کے آفس کال کی مگر وہاں بیل جا رہی تھی اور کال ریسیو نہیں ہوئی تب اس نے رین کے گھر کا نمبر ملایا اور اس بار اس نے کال ریسیو کر لی۔ گیپ نے غرا کر کہا۔

’’رین! مجھے رقم آج ہی چاہیے۔‘‘

’’رقم آج ہی مل جائے گی۔‘‘ رین نے کانپتی آواز میں کہا۔ اسے ڈر تھا کہ ابھی گیپ کوئی ایسی بات کہہ دے گا جس سے ان دونوں کا گٹھ جوڑ ثابت ہو جائے گا۔ نیل سامنے ہی لاؤنج میں ایکسٹینشن کان سے لگائے گفتگو سن رہا تھا۔

’’اسی میں تمہاری عافیت ہے ورنہ میں تمہاری اس بوڑھی بطخ کا سر اڑا دوں گا۔‘‘

’’رقم کہاں پہنچانی ہے؟‘‘

چٹکلا

ایک نیا شادی شدہ جوڑا کسی تفریحی مقام پر ہنی مون منانے گیا۔ منیجر نے جب پوچھے بغیر ان کا نام رجسٹر میں لکھ لیا تو بیوی بہت حیران ہوئی، اس نے منیجر سے پوچھا۔ ’’آپ کو میرے شوہر کا نام کیسے معلوم؟‘‘

منیجر نے جواب دیا۔ ’’یہ ہمارے پرانے کرم فرما ہیں۔ ہر سال ہنی مون منانے کے لیے ہمارے ہوٹل میں ہی تشریف لاتے ہیں۔‘‘

☆☆

ایک لڑکا رشتے کے سلسلے میں لڑکی دیکھنے گیا۔ لڑکے کو لڑکی پسند آ گئی تو اس نے لڑکی سے پوچھا۔ ’’کیا آپ کے والد کی حیثیت اتنی ہے کہ وہ مجھے سلامی میں کار دے سکیں؟‘‘

لڑکی نے جواب دیا۔ ’’میرے ابا کی حیثیت تو ہوائی جہاز دینے کی ہے لیکن کیا آپ کے ابا کی حیثیت ائر پورٹ بنانے کی ہے؟‘‘

ذاکم علی گورچانی، داجل

''اب سے ایک گھنٹے بعد دریا پر نارتھ سائڈ پر بنے پل کے نیچے پارکنگ میں۔ یاد رکھنا، کوئی دھوکا ہوا تو بہت بُرا ہوگا۔''

''کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔'' رین نے اسے یقین دلایا اور اس نے کال منقطع کردی۔ رین نے سکون کا سانس لیا کہ گیپ نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ کال بند ہوتے ہی نیل نے اپنا کوٹ اور ہیٹ پہنا اور بریف کیس اٹھا کر باہر نکل گیا۔ رین کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ وہ کچھ دیر ٹہلتا رہا پھر وہ بھی باہر نکل گیا۔ دوسری طرف گیپ نے ایک گلاس وسکی کا اور لیا... پھر روانہ ہوگیا۔ اس کا رخ پل کی طرف تھا۔ پونے آٹھ بجے وہ پل کے نیچے پارکنگ میں تھا اور رین کا انتظار کررہا تھا۔ آٹھ بجنے میں پانچ منٹ پر ایک کار نمودار ہوئی اور اس کی کار کے سامنے رکی لیکن اس سے رین کے بجائے ایک بوڑھا آدمی نکلا۔ اس نے بریف کیس اٹھا رکھا تھا۔ گیپ نیچے اتر آیا۔

''تم کون ہو؟''

''نیل کارسن... میری بیٹی کہاں ہے؟''

''نیل کارسن! تمہیں کس نے آنے کو کہا تھا؟''

''میں رقم لایا ہوں، میری بیٹی میرے حوالے کرو اور رقم لو۔''

''تم رقم لائے ہو، یہ میرے حوالے کردو۔''

''نہیں، پہلے میری بیٹی... اگر وہ نہیں ہے تو رقم بھی نہیں ملے گی۔''

''رقم نہیں ملے گی۔'' گیپ نے دانت پیسے اور اچانک پستول نکال کر گولی نیل کے سینے میں اتار دی۔ وہ کراہا اور اس نے حیرت سے اپنے سینے کے سوراخ کو دیکھا اور پھر نیچے لڑھک گیا۔ گیپ نے آگے بڑھ کر بریف کیس اٹھا لیا۔ اس نے دیکھا نہیں کہ نیل کا ہاتھ کوٹ کی جیب میں گیا تھا اور پھر ایک ریوالور سمیت باہر آیا تھا۔ اس نے گیپ پر گولی چلائی جو اس کے دائیں رخسار کو چھیلتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے چیخ ماری اور منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ پھر اس نے نیل پر گولی چلائی۔ دوسری تیسری اور اس وقت تک چلاتا رہا جب تک میگزین ختم نہیں ہوگیا۔ پھر وہ اسے جنون کے عالم میں ٹھوکریں مارنے لگا حالانکہ وہ مر چکا تھا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ ایک لاش اور تاوان کی رقم کے ساتھ ہے اور اتنی فائرنگ کے بعد کسی وقت بھی پولیس وہاں آسکتی تھی۔ وہ جلدی سے کار میں بیٹھا اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اس کے جانے کے پانچ منٹ بعد ہی رین وہاں پہنچا اور اس نے نیل کی لاش دیکھی۔ وہ کچھ دیر بت بنا لاش دیکھتا رہا پھر اس نے کار واپس موڑی اور شہر سے باہر جانے والی سڑک کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

گیپ کا تکلیف اور اس سے زیادہ جھنجلاہٹ سے برا حال تھا۔ وہ خونم خون ایک میڈیکل اسٹور میں داخل ہوا اور اس نے وہاں سے خون روکنے والی پٹیوں کا پورا پیک لیا۔ ایک پارکنگ میں کار روک کر وہ پٹیاں بدلتا رہا۔ کئی گھنٹے بعد اس کا خون رک گیا تھا مگر اس کا پورا کوٹ، شرٹ اور ہاتھ خون سے بھر گئے تھے۔ جب خون رکا تو اسے رقم کا خیال آیا۔ اس نے بریف کیس کھول کر دیکھا۔ اس میں موجود رقم اسے پانچ لاکھ ڈالرز سے زیادہ لگی۔ اس نے گڈیاں گنیں تو سو ڈالرز کے نوٹوں والی سو گڈیاں تھیں۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ ایک ملین ڈالرز... لیکن اس نے تو پانچ لاکھ ڈالرز کا مطالبہ کیا تھا پھر اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ یہ سارا چکر رین کا چلایا ہوا تھا اور اس نے اپنے سسر سے ایک ملین ڈالرز کے حصول کا منصوبہ بنایا تھا۔ ان کے حصے میں صرف چالیس ہزار ڈالرز آتے اور باقی وہ ہضم کر جاتا مگر اس کا سسر رقم دینے آگیا اور وہ پورے ایک ملین ڈالرز لے آیا تھا۔ مارے خوشی کے گیپ اپنی ساری تکلیفیں بھول گیا۔ اس نے فوری فیصلہ کیا اور بریف کیس سے چار گڈیاں نکال کر کوٹ کی جیب میں رکھ لیں۔

رات تین بجے اس نے ہائی وے پر ایک جگہ سڑک سے ذرا دور برف کھود کر اس میں بریف کیس چھپایا اور پھر لیوونیا کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب وہ کیبن کے سامنے رکا تو صبح ہو چکی تھی۔ وہ اندر آیا۔ جم ناشتا کرتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہا تھا اور اس پر نیل کے بارے میں خبر آرہی تھی۔ گیپ نے اندر جاتے ہی دو گڈیاں نکال کر اس کے سامنے رکھیں۔

''یہ تمہارا حصہ ہے... میں جارہا ہوں۔''

''کہاں؟''

''میں تم سے الگ ہورہا ہوں۔ اب تم نے جہاں جانا ہے جاؤ۔''

''اور یہ...؟'' جم نے بیث کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ جائے جہنم میں۔'' گیپ کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا کہ عقب سے پستول کا سیفٹی کیچ ہٹائے جانے کی آواز سن کر رک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ جم نے پستول اس کی طرف سیدھا کر رکھا تھا۔

''جہنم میں یہ نہیں تم جاؤ گے... تم مجھے دھوکا دے

رہے ہو۔ باقی رقم کہاں ہے؟''

گیپ نے پھرتی سے پستول نکالنے کی کوشش کی اور نکال بھی لیا مگر وہ بھول گیا تھا کہ وہ خالی تھا۔ اس نے ٹریگر دبایا اور صرف ٹرچ کی آواز آئی لیکن جم کی چلائی ہوئی گولی اس کے سینے میں اتر گئی ---۔ ستون سے بندھی بیث نے دہشت زدہ ہوکر چیخ ماری۔

☆☆☆

جولی کا گزشتہ سارا دن کار میں گھومتے گزرا تھا۔ وہ گلیوں اور مکانوں کے سامنے سلور مزدا تلاش کررہی تھی۔ ایک دن کی ناکامی سے وہ مایوس نہیں ہوئی تھی۔ اگلی صبح وہ لیوونیا کے مضافاتی علاقے میں پہنچی۔ یہاں جنگل کے ساتھ ساتھ لوگوں نے گھر بنا رکھے تھے اور ان میں سے زیادہ تر لکڑی سے متعلق کوئی کام کرتے تھے۔ وہ سڑک پر سے گزرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ساتھ ہی ریڈیو پر بیری سے بات کررہی تھی۔ رات ہونے والا قتل بھی اسے اسی سلسلے کی کڑی لگ رہا تھا۔ وہاں برف سے دو الگ طرح کے خون کے نمونے ملے تھے۔ پھر دوسری گاڑی کے ٹائروں کے نشانات تھے اور یہ بالکل سلور مزدا کے ٹائروں جیسے تھے۔ بیری نے بتایا کہ نیل کے بھائی ولیم کے مطابق اس کا بھائی رات اپنی اغوا شدہ بیٹی بیث اوٹس کو چھڑانے کے لیے ایک ملین ڈالرز تاوان کی رقم لے کر گیا تھا مگر پولیس کو اس کی لاش کے ساتھ ایسی کوئی چیز نہیں ملی تھی۔ جب پولیس رین اوٹس کے گھر پہنچی تو وہ بھی غائب تھا اور اس کے بیٹے میک نے تصدیق کی کہ اس کی ماں تین دن سے غائب تھی۔ جولی سنتے ہوئے آنکھیں بھی استعمال کررہی تھی اور اسے اچانک ہی سلور مزدا نظر آگئی۔

''مل گئی۔''

''بیث اوٹس؟'' بیری نے حیرت سے کہا۔

''شاید وہ بھی مل جائے لیکن ابھی تو سلور مزدا نظر آئی ہے۔'' اس نے کہتے ہوئے کار روکی اور نیچے اتر آئی۔ کھلی فضا میں آتے ہی اسے کسی مشین کا شور سنائی دیا اور آواز کیبن کے پیچھے سے آرہی تھی۔ وہ محتاط قدموں سے کیبن تک آئی اور اندر جھانکا مگر اسے وہاں صرف ایک عورت ستون سے بندھی نظر آئی۔ وہ اسے نظرانداز کرکے کیبن کے پیچھے آئی۔ درختوں کے پیچھے سے مشین کا شور بہت زیادہ تھا اور آواز سے یہ لکڑی کا برادہ بنانے والی مشین لگ رہی تھی مگر جب جولی وہاں پہنچی تو ایک شخص اسے مشین میں کچھ دھکیلتا ہوا نظر آیا اور یہ ایک انسانی پاؤں تھا جوتوں سمیت اور جس جگہ سے برادہ نکلتا تھا، اس سے خون اور لوتھڑے نکل کر سامنے برف پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے پستول نکال لیا اور چلا کر اس شخص کو ہینڈز اپ ہونے کو کہا۔ پہلے تو اسے مشین کے شور میں سنائی نہیں دیا مگر جب اس نے دوبارہ کہا تو جم نے سن لیا اور پھر وہ یک دم بھاگا مگر اسے زیادہ دور جانا نصیب نہیں ہوا۔ جولی کی چلائی ہوئی دوسری گولی اس کی ران میں اتر گئی۔ آدھے گھنٹے بعد جولی اسے پولیس کار میں پیچھے اور بیث کو ساتھ بٹھائے واپس جارہی تھی۔

جم نے زبان کھول دی تھی اور پولیس نے رین کو... سو میل دور ایک موٹیل سے اس وقت گرفتار کرلیا جب وہ خودکشی کے لیے اپنی کلائیاں کاٹنے جارہا تھا۔ بیث بہت دکھی تھی۔ اس کا باپ مارا گیا تھا اور شوہر جس سے وہ محبت کرتی تھی، وہ اسی کے اغوا میں ملوث نکلا تھا مگر میک بہت خوش تھا کہ اسے اس کی ماں واپس مل گئی تھی۔ جم نے ہائی وے پٹرول پولیس آفیسر اور دو افراد کے قتل کا اقرار کرلیا تھا۔ یہ اسی کے پستول سے مارے گئے تھے البتہ گیپ کو اس نے اپنے دفاع میں قتل کرنے کا دعویٰ کیا تھا۔ البتہ وہ اس کی وضاحت نہیں کرسکا تھا کہ اس نے گیپ کی لاش کو لکڑی کا برادہ بنانے والی مشین میں کیوں ڈالا تھا۔ پولیس کو صرف اس کا گھٹنے سے نیچے کا پاؤں دستیاب ہوا تھا۔

ولیم اس صورتِ حال میں اس وقت تک خوش تھا جب تک نیل کے وکیل نے اس کا وصیت نامہ نہیں سنایا تھا۔ اس وصیت نامے کی رو سے ولیم کو صرف لائف آٹوز ملی تھی اور نیل کی باقی ساری دولت اور جائداد کا مالک اس کا نواسا میک قرار پایا۔ اسے یہ دولت اس وقت ملتی جب وہ اکیس برس کا ہوجاتا اور کسی یونیورسٹی سے گریجویشن کرلیتا تب تک بیث اس کی گارجین رہتی۔ ولیم اب تک برائے نام ہی لائف آٹوز کے معاملات دیکھتا تھا۔ جب اس نے پہلی بار باقاعدہ اس کے حسابات دیکھے تو اسے چھ لاکھ ڈالرز کا شارٹ فال نظر آیا مگر وہ کیا کرسکتا تھا۔ عدالت نے پہلے ہی رین کو چار سال کے لیے جیل بھیج دیا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے صرف اغوا کا مرتکب قرار دیا گیا تھا۔ جب عدالت سے رین کو جیل لے جایا جارہا تھا تو بیث اور میک وہاں موجود تھے۔ رین ان سے نظریں نہیں ملا پارہا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے بیث سے بس اتنا کہا۔

''آئی ایم سوری بیث... آئی لو یو بیث۔''

بیث کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

جواری

احمد اقبال

گیارہویں قسط

زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان

شیکسپیئر کا کہا ہوا ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ زندگی ایک اسٹیج ہے جس پر ہم سب اداکار ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا کے چلے جاتے ہیں... یہی اداکار زندگی کے آغاز سے انجام تک ایک جوا کھیلتا ہے... جس میں خطرات اور حادثات کی بازی پہلی سانس کے ساتھ لگتی ہے اور آخری سانس تک جاری رہتی ہے... تخلیق کے نقائص ہوں یا بیماریاں... وہ زندگی کے ہر نومولود کو شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی مقابلہ کرتی ہے اور یہ کھیل انسانی تدبیر اور نوشتۂ تقدیر کے ساتھ زندگی کے تمام اہم اور غیر اہم فیصلوں میں جاری رہتا ہے... خوشی... غم... نفع... نقصان... دوستی... دشمنی... محبت اور نفرت... سب ہار جیت کے وہ روپ ہیں جن سے ہر انسان ایک جواری بن کے سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے... جواری... انسانی جذبوں کے ردعمل سے جنم لینے والی وہ کہانی ہے جو نگر نگر گلی گلی اور گھر گھر نئی بھی لگتی ہے اور پرانی بھی... آپ بیتی بھی اور جگ بیتی بھی... تجسس اور حیرانی کے سارے رنگ دکھلاتی جادو اثر تحریر...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

ایم اے پاس خاور سکھر جیل میں سزائے موت کا منتظر تھا۔ اس پر قتل کا جھوٹا الزام ایک گینگ لیڈر نادر شاہ کے ایما پر عائد کیا گیا تھا۔ وہیں ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار گاما رستم بھی پھانسی کا منتظر تھا۔۔۔۔ اس کے ساتھی جیل پر حملہ کرکے اسے چھڑا لے جاتے ہیں۔ گاما، خاور کو ساتھ لے جاتا ہے۔ خاور ایک پرانی غیر آباد حویلی میں پناہ لیتا ہے۔ خاور کو اس حویلی کے کھنڈر میں نورین ملی جو لباسِ عروسی میں تھی اور اپنے شوہر کو قتل کرکے آئی تھی۔ اس کی پرورش کرنے والے چچا نے نورین کی تمام جائیداد اور دولت پر قبضہ کرلیا تھا اور زبردستی اس کو اپنے پاگل بیٹے سے بیاہ دیا تھا۔ پاگل چچازاد کی دست درازی سے بچنے کے لیے نورین نے اسے قتل کردیا اور کھڑکی کے راستے آسیب زدہ مشہور حویلی میں آگئی۔ کسی نے اسے دیکھا تو بدروح سمجھ کے بھاگ گیا۔۔۔۔ نورین سلمان خان نامی ایک شخص سے چھپ کر ملتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ وعدے کے مطابق وہ یہاں موجود ہوگا لیکن وہ نہیں آیا تھا۔ نورین پریشان تھی کہ صبح پولیس اسے قتل کے الزام میں گرفتار کرلے گی۔ وہیں اس کی ملاقات خاور سے ہوئی۔ اس کھنڈر کی دوسری منزل پر خاور کو سلمان کی لاش نظر آئی۔ وہ اپنا وعدہ نبھانے پہنچا تھا لیکن قتل ہوگیا تھا۔ تلاشی پر خاور کو اس کی جیب سے دس لاکھ نقد ملے۔ خاور نے اپنے کپڑے اسے پہنائے اور خود اس کے کپڑے پہن کے رقم جیب میں ڈال لی۔ اس نے اپنا حلیہ بدلا اور نورین کو برقع میں چھپا کرلے گیا۔ وہ اکیلا نورین کے گھر گیا تو اسے علم ہوا کہ نورین پر شوہر کے قتل کا الزام ہے جو نورین نے نکاح نہ ہونے کے باعث اسے تسلیم نہیں کیا تھا۔ خاور نے نورین سے جھوٹ بولا کہ سلمان جو پہلے سے بے روزگار تھا، نوکری مل جانے پر دبئی چلا گیا تھا۔ باہر جانے میں خطرہ تھا کیونکہ خاور کے جیل سے فرار کی اطلاع کے بعد نادر شاہ نے اپنے کارندے اسے تلاش کرنے پر لگا دیے تھے جو کتوں کی طرح ہر جگہ اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ دوسرا خطرہ پولیس سے تھا جن کو خاور کے علاوہ نورین کی بھی تلاش تھی۔ خاور، نورین کو لے کر نکلا اور ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ تاہم وہاں غیر محفوظ ہونے اور نورین کی اچانک طبیعت خراب ہونے پر وہ ایک اسپتال میں آگئے۔ خاور اور نورین وہاں سے نکلے۔ ہر بڑے ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ اور ائرپورٹ پر وہ پکڑے جا سکتے تھے چنانچہ انہوں نے پنجاب کا رخ کیا اور کئی مقامات پر ٹرین بدلتے رہے۔ اس کے باوجود نادر شاہ کے بندوں نے جو ویٹر کی وردی میں تھے، خاور کو پہچان لیا۔ ایک کو خاور نے چلتی ٹرین سے کودنے پر مجبور کردیا۔ دوسرے نے نورین اور خاور کو حفاظت اور اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ جذباتی نورین اسے اپنا بھائی تسلیم کرچکی تھی۔ خاور بھی اسے معاف کرنے پر مجبور ہوگیا، اس کا اصل دشمن نادر شاہ تھا۔ خانیوال کے ویٹنگ روم میں رات گزار کے وہ دونوں ایک پرائیویٹ کیری ڈبے سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ نازی نے انہیں رات بھر کے لیے کسی اجنبی قصبے سے باہر ایک کچے خالی گھر میں رکھا اور انہیں تسلی دی کہ صبح وہ لاہور کے مضافات میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن صبح جاگنے پر نادر شاہ کے آدمی آگئے اور نورین اور خاور کو لے گئے لیکن راستے میں نورین نے جانے کیا کیا کہ گاڑی حادثے کا شکار ہوگئی۔ خاور بچ گیا مگر نورین کا پتا نہ چل سکا۔ خاور نے رحیم بخش نامی شخص کے گھر میں پناہ لے لی۔ مقامی چودھری رحیم بخش کی بیٹی سے شادی کا خواہش مند تھا۔ رحیم بخش کو قتل کردیا گیا اور ریشم اور خاور کو چودھری کے گرگے اٹھا کرلے گئے۔ خاور کو قید کردیا گیا تاہم وہ اکبر کے بھائی انور کے ساتھ رہا ہوگیا اور انور نے حویلی پر اپنا اختیار حاصل کرلیا۔ ریشم بھی حویلی میں ہی تھی۔ چودھری انور نے اکبر کو قید کردیا۔ اکبر اور خاور کو حویلی سے نکال کے دوسری جگہ پہنچایا گیا۔ تاہم کچھ وقت گزرنے کے بعد دوبارہ حویلی میں قید کردیا گیا۔ ادھر بڑے چودھری کو دل کا دورہ پڑا لیکن اس نے اسپتال میں داخل ہونے سے انکار کردیا۔ اس کا کہنا تھا کہ تمام کام گھر پر ہی کیے جائیں۔ خاور اور انور نے اسپتال والوں کی ایک متعلقہ سپلائی کرنے والی کمپنی سے رابطہ کیا۔ وہیں ایک شخص نے خاور کو فریدالدین کی حیثیت سے شناخت کیا تاہم خاور نے انکار کردیا۔ انور اسے شناختی کارڈ آفس گیا اور ملک سلیم اختر کے نام سے نیا شناختی کارڈ بنوا دیا۔ متعلقہ کمپنی کے اہلکار سازوسامان لے کر حویلی پہنچ گئے اور بڑے چودھری کے کمرے کو اسپتال جیسا بنا دیا۔ کمپنی کے ورکر نے خاور کو فریدالدین کی حیثیت سے پہچان لیا مگر اس بات کو راز میں رکھنے کا وعدہ کیا۔ حویلی میں کوئی سازش ہو رہی تھی، ایک گارڈ کی موت کے بعد انور نے تمام گارڈ بدلنے کا فیصلہ کیا۔ قبرستان میں ایک سرنگ کھودی گئی تھی جو پوری ہونے پر انور کے کمرے میں نکلتی۔ تاحال یہ سازش بے نقاب ہوگئی تھی۔ ادھر اکبر کے سسر نے خاور عرف ملک سلیم کو زبردستی اٹھالیا اور آستانے کے تہ خانے میں قید کردیا۔ وہیں خاور کو نورین نظر آئی۔ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھی تھی۔ رات کو کچھ نامعلوم لوگوں نے آستانے پر دھاوا بول دیا۔ خاور وہاں سے بھاگ نکلا اور نورین کی تلاش میں گیا۔ لیکن وہ جب نورین کے گھر پہنچا جہاں نورین فاطمہ کے نام سے رہ رہی تھی تو اسے وہاں موجود نہ پایا۔ نورین کا فرضی باپ اسے لے کر شہر چلا گیا تھا۔ خاور نے ایک دیہاتی نور محمد کو ساون خان اور فاطمہ کا کھوج لگانے کا کام سونپ دیا۔ ادھر شاہینہ نے ریشم کو زہر دے کر مارنے کی کوشش کی تاہم بروقت امداد کے سبب اس کی جان بچ گئی۔ پیر اظہر علی کو قتل کے مقدمے کا سامنا تھا اور اپنی بیٹی کی کہیں اور موجودگی ثابت کرنے کے لیے اس نے روزینہ سے انور کا جعلی نکاح کردیا اور اس نکاح کا خاور گواہ بنا۔ اکبر کو کسی نے زہر دے کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ حویلی کے معاملات گڑبڑ ہوگئے۔ تاہم پیر صاحب نے معاملات کو سنبھالا۔ اچانک ایک اور بری خبر ملی کہ انور کا نکاح نامہ تیار کرنے والے مولوی کو قتل کردیا گیا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ چڑ گئی۔۔۔ ''یار جتنا مجھے سلونی سے معلوم ہوا تھا اتنا میں نے بتا دیا تمہیں۔۔۔ اور جو پوچھنا ہے انور سے پوچھو۔''

''خبر اچھی لائی ہو۔۔۔ خدا کرے سچ بھی ہو۔''

''کچھ خدا کا خوف کرو۔۔۔ کسی کے قتل کی خبر کو اچھی خبر کہہ رہے ہو۔۔۔ ایسا تو دشمن کے مرنے پر بھی نہیں کہنا چاہیے۔''

میں نے ہاتھ پکڑ کے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ ''وہ مسکین سا نکاح خواں تو دشمن بھی نہیں تھا میرا۔۔۔ مگر تم جانتی

ہو، اصل مسئلہ اس نکاح نامے کا ہے۔ اس سے کہا گیا تھا کہ رجسٹرڈ کاپی دے جائے۔ آج دوپہر میرے سونے تک وہ نہیں آیا تھا۔ معلوم ہوجائے گا کہ اسے کسی نے یہاں سے واپس جاتے ہوئے مارا تھا یا یہاں پہنچنے سے پہلے ہی کسی نے اسے اوپر پہنچا دیا۔''

''اب کیا فرق پڑتا ہے اس کاغذ سے جس کو نکاح نامہ کہتے ہیں۔''

''بہت فرق پڑتا ہے ریشم۔''

''پتا نہیں کتنے نکاح ہوتے ہیں یہاں۔۔۔ کوئی نکاح نامہ نہیں بنتا کسی کا۔'' ریشم بولی۔

''بالکل ٹھیک کہتی ہو تم۔۔۔ دو پہلو ہیں اس معاملے کے۔۔۔ ایک قانونی اور دوسرا شرعی۔۔۔ نکاح ہو جاتا اور نکاح نامہ نہ بنتا تو واقعی کوئی فرق نہ پڑتا لیکن نکاح ابھی باقی تھا۔ سب ایسا ہی سمجھتے تھے کہ نکاح کا کیا ہے۔۔۔ جب روزینہ کی رخصتی کا دن آئے گا تو کوئی مولوی نکاح بھی پڑھا دے گا پھر نکاح نامہ بنے نہ بنے۔ یہ نکاح نامہ عدالت میں پیش کرنے کے لیے بنوایا گیا تھا۔ تم سمجھ رہی ہو نا۔۔۔ نکاح کے بغیر نکاح نامہ اور نکاح نامے کے بغیر نکاح۔۔۔ دونوں میں جھوٹ سچ کا فرق ہے۔''

''میں نے سنا ہے لوگ جھوٹا نکاح نامہ بھی بنوا لیتے ہیں؟''

''ٹھیک سنا ہے تم نے۔۔۔ کیا یہ اس کی مثال نہیں ہے؟ لیکن دنیا میں جو ہوتا ہے اس کا یہاں بیٹھ کے تم اندازہ نہیں کرسکتی ہو۔ بیوی تو بیوی ہے مگر جو باہر رہتے ہیں۔۔۔ امریکا، برطانیہ میں۔۔۔ وہ کسی کو بھی صرف نکاح نامے کی بنیاد پر بیوی بنا کے لے جاتے ہیں۔ لاکھ دو لاکھ مل جاتے ہیں انہیں۔۔۔ وہاں لڑکی پکا کام کرنا چاہے تو وہاں کی کسی مسجد میں جاکے طلاق حاصل کر لیتی ہے۔ معاوضہ لے کر لانے والا شوہر تین دفعہ طلاق کہتا ہے، وہ کہتی ہے تھینک یو۔۔۔ دونوں ہاتھ ملا کے چلے جاتے ہیں اور پھر کبھی نہیں ملتے۔''

وہ حیران ہوئی۔ ''یہ تو کاروبار ہوگیا۔۔۔ عورت بھی کر سکتی ہے۔''

''عورت وہاں کرتی ہے۔ شہریت دلانے کے لیے کوئی ولایتی بیوی ہونی چاہیے۔ کچھ عورتیں یہی کام کرتی ہیں۔ پیسا لے کر عدالت میں نکاح کی رجسٹریشن کرا دیتی ہیں اور گواہی دینے کے لیے بھی حاضر ہو جاتی ہیں۔ ادھر شوہر کو شہریت ملی ادھر انہوں نے طلاق لی اور دوسرا شوہر کر لیا۔ وہ بھی فائدہ اٹھاتی ہیں اس سے کہ اسلام میں تو نہ نکاح کی رجسٹریشن ہے نہ طلاق کے لیے قانونی کارروائی کی ضرورت۔۔۔ دو منٹ میں ہوجاتے ہیں دونوں کام۔۔۔ لیکن کچھ عورتیں مجبوری سے فائدہ اٹھاتی ہیں تو بلیک میل بھی کرتی ہیں۔ یہ تو عام سی بات ہے لیکن تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ یہاں سے لوگ حقیقی بہنوں کو بیوی ظاہر کرکے لے گئے ہیں اور دلیل ان کی یہی ہوتی ہے کہ بہن تو بہن ہی ہے۔۔۔ کون سا نکاح ہوا ہے اس سے۔''

ریشم کانوں کو ہاتھ لگانے لگی۔ ''توبہ۔۔۔ توبہ۔''

''تم جانتی ہو میں صرف نکاح نامے کی وجہ سے پھنسا ہوا ہوں۔ مجھے کہا گیا تھا کہ نکاح ابھی ہوا ہی نہیں۔''

''وہ ہوجائے گا کسی دن۔''

''وہ تو ہوجائے گا مگر فرض کرو کسی وجہ سے نہ ہوا؟''

''کیسے نہ ہوا؟''

''کسی بھی وجہ سے۔۔۔ روزینہ نے انکار کردیا اور کہہ دیا کہ نہیں کروں گی۔۔۔ میں تو ہوگیا نا جھوٹا گواہ۔''

''وہ ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔'' ریشم بولی۔

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ''کیوں نہیں سوچ سکتی؟''

ریشم نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''وہ۔۔۔ مراد جو نہیں ہے اب۔۔۔''

''کیا مراد کی محبت بھی نہیں ہے اس کے دل میں۔۔۔ مراد کی موت کے ساتھ ہی وہ بھی ختم ہوگئی؟ ایسی تھی اس کی محبت؟''

''دکھ تو خیر ہوگا اسے مگر مجبوری ہے۔''

''کیا ہر لڑکی ایک سی مجبور ہوتی ہے؟ کیا تمہارے خیال میں ایسی محبت صرف فلموں میں ہوتی ہے جس میں لڑکا یا لڑکی ایک دوسرے کے لیے جان دے سکتے ہوں؟ ورنہ یہ صرف کھیل ہوتا ہے جوانی کا۔۔۔ انور کے لیے تمہاری محبت ایسی ہی تھی؟''

''میری بات مت کرو۔''

''کیوں نہ کروں۔۔۔ روزینہ بھی ایک لڑکی ہے تم جیسی۔۔۔ کیا وہ انور سے نفرت نہیں کرسکتی؟ وہ جانتی ہے کہ مراد کیوں مارا گیا۔ انور درمیان میں نہ ہوتا تو اس میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ اس کا رشتہ بھی قبول کرلیا جاتا۔ انور سے نفرت کے لیے یہ وجہ کافی ہے۔''

ریشم نے اداسی سے سر ہلایا۔ ''یہ تو ہے۔''

''اگر وہ جان کی پروا نہ کرتے ہوئے نکاح سے انکار کردے۔۔۔ پولیس آئی تھی اس کا بیان لینے۔۔۔ اگر وہ

صاف بتادے کہ نہ اس کا نکاح ہوا ہے اور نہ وہ انور کی بیوی ہے... پھر کیا ہوگا؟ ہم سب جھوٹے جنہوں نے نکاح نامے پر دستخط کیے۔ مجھے معلوم ہے یہ لوگ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ معاملہ پولیس کی سطح پر ہی دبا دیا جائے گا۔ بیان بدل دیا جائے گا۔ نکاح نامے کی طرح اس پر دستخط بھی کر دے گا کوئی... لیکن سیشن کورٹ میں اسے خود حاضر ہو کے بیان دینا ہوگا۔"

"کون جانے دے گا اسے عدالت میں؟"

"بیان تو ضروری ہوگا۔ وہ وہاں اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا حساب برابر کرسکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"جو یہ سب کرسکتے ہیں، وہ روزینہ کی جگہ کسی اور کو بھی پیش کرسکتے ہیں۔ خود شاہینہ عدالت میں روزینہ بن کے حاضر ہوجائے گی اور ان کی مرضی کا بیان دے کرآجائے گی۔"

"ایسے نہیں ہوتا ریشم... عدالت میں شناخت کا مسئلہ بھی آتا ہے۔"

"شناخت کرنے والے بھی چلے جائیں گے جو کہہ دیں گے کہ ہاں یہی روزینہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیس کرنے والے شور مچادیں گے کہ یہ روزینہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"شناخت کس کی تسلیم کی جائے گی؟ گھر والوں کی یا باہر والوں کی؟"

میں نے کہا۔ "تم بے حد ذہین ہوگئی ہو لیکن گواہی کو مسترد کرنے والے بھی گھر کے ہی لوگ ہوں گے... کیس کیا ہے لڑکی کے ماموں نے۔"

"دنیا میں ناممکن کچھ نہیں سلیم... آخر میرا باپ بھی تو قتل ہوا تھا مگر ہم بہت دور کی بات کررہے ہیں۔ پتا نہیں کل کیا ہوگا۔ ایک بات اچھی طرح جانتی ہوں میں... جس طرح انہوں نے انور کو چھوٹے بھائی اکبر کے قتل کے الزام سے صاف بچالیا... تو یہ پیر صاحب کو قتل کے جرم میں پھانسی چڑھنے دیں گے؟ وہ شاہینہ، روزینہ کا باپ ہے۔ بڑا بھائی ہے ہمارے چودھری صاحب کا... ہزاروں مرید ہیں اس کے... نہ جانے اور کتنے لوگ اس دشمنی کی بھینٹ چڑھ جائیں گے... خون کی ندیاں بہہ جائیں گی یہاں سلیم۔"

میں سمجھ داری اور دوراندیشی کے اس حیرت انگیز مظاہرے پر خاموشی سے ریشم کی صورت دیکھتا رہا۔ اس نے جو کہا ایک ایک لفظ بالکل درست تھا۔ جو نہیں ہوسکتا، وہ نہیں ہوسکتا۔ واقعی یہاں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی اس خاندانی دشمنی کے چکر میں... میرے جیسے نہ جانے کتنے مارے جائیں گے جن کا یوم جزا سے پہلے نہ کوئی [illegible] مانگنے والا ہوگا نہ دعوے دار۔

وہ جانے کے لیے اٹھی تو میں نے کہا۔ "ریشم [illegible] واقعی یہ سمجھتی ہو کہ اکبر کو قتل کرنے والا انور تھا؟"

"ہاں، اور کون کرسکتا تھا یہ کام؟" وہ رکی۔

"پھر بھی تم محبت کرتی ہو اس سے؟"

"پہلے تم نے سوال کیا تھا دماغ سے... اب دل [illegible] پوچھ رہے ہو۔"

"کیا دل کی رائے مختلف ہے اب؟"

"پتا نہیں... مجھے لگتا ہے یہ انور وہ نہیں جس [illegible] محبت کرتی تھی۔ مگر انور تو وہی ہے۔" اس نے جیسے خود [illegible] کہا اور چلی گئی۔

انور جیسے اسی انتظار میں تھا۔ اس سے پہلے کہ [illegible] جاتا، وہ خود میرے پاس آگیا۔ "یار! ایک افسوسناک [illegible] اور ہوگیا۔"

"اب کیا ہوگیا؟ خدا خیر کرے۔"

"وہ نکاح خواں قتل ہوگیا جس نے میرا نکاح پڑ[illegible] تھا۔ میرا مطلب ہے پڑھانا تھا۔"

"کیا وہ اسی کام کے لیے آرہا تھا... [illegible] پڑھانے؟"

"نہیں یار! نکاح تو اب چہلم کے بعد رکھا گیا [illegible] حالانکہ یہ شرعاً ممنوع ہرگز نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "شرع اور قانون کی بات تیرے [illegible] سے اچھی نہیں لگتی۔ اس کا جو کام تھا، وہ اس نے کردیا [illegible] اب نکاح کا کیا ہے... کوئی اور مولوی پڑھادے گا... [illegible] دکھ کیوں ہورہا ہے؟"

"وہ حویلی کے قریب تھا جب کسی نے اس پر [illegible] چلائی۔ دیکھا کسی نے نہیں۔ میں ابھی تھانے گیا تھا۔ [illegible] لاش وہیں پڑی ہے، دکھ تو ہوا مجھے... نیک آدمی تھا۔ [illegible] بھی افسوس ہوا کہ ہم نے اس کی حفاظت میں غفلت بر[illegible] ہمیں خیال ہی نہیں آیا کہ ایسا ہوسکتا ہے اس کے ساتھ [illegible] وہ بھی ہماری طرف سے ایک اہم گواہ تھا۔"

میں نے تلخی سے کہا۔ "بس افسوس کی یہی بات [illegible] تیرے لیے؟ ورنہ وہ قتل ہوجاتا تجھے کیا فرق پڑتا۔"

انور نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "یار تو نہیں دیکھ [illegible] میری نظر دیکھ رہی ہے۔ مراد کا باپ سکندر اب ایک [illegible] بلڈر ہے۔ اس کے تعلقات حکومتی سطح پر وزیروں [illegible] اسمبلی تک سب سے ہیں۔ یہ پولیس والے انہی [illegible]

ہوتے ہیں۔ کسی ممبراسمبلی کے علاقے میں نیچے سے اوپر تک تمام پولیس حکام اسی کی مرضی سے لگائے جاتے ہیں اور انہیں اپنے مستقبل کو محفوظ رکھنے اور علاقے میں من مانی کرنے کے لیے رکن اسمبلی کی خوشنودی کو اپنے فرض سے زیادہ اہم سمجھنا پڑتا ہے۔"

"یعنی علاقے کا اتنا بڑا پیر ایک بلڈر کے مقابلے میں کمزور فریق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پیر صاحب کا اثر رسوخ بھی بہت ہے۔ رائے عامہ پر اس کا اثر زیادہ ہے اور جو پیر صاحب کے مرید ہیں وہی رکن اسمبلی کے ووٹر بھی... ان کو وہ ناراض تو نہیں کر سکتا۔ ابھی سکندر کو بیٹے کے غم نے پاگل کر رکھا ہے۔ وہ انتقام کی آگ میں جل رہا ہے۔"

"کیا تو اس کے جذباتی ردعمل کو غلط سمجھتا ہے؟"

"نہیں... اس کی جگہ میں ہوتا تو کم نہ کرتا۔ سکندر نے بات کی ہوگی علاقے کے رکن اسمبلی سے... اس نے پولیس کے کسی آئی جی یا ایس پی کو بلا کے حکم دیا ہوگا کہ وہ قتل کے کیس میں سکندر کی ہر ممکن مدد کریں۔ لیکن آگے آجاتی ہے سیاست... ممکن ہے اس نے سکندر کو مطمئن کردیا ہو اور بعد میں پولیس افسر کو بلا کے مصلحت اور مصالحت کے فارمولے پر عمل جاری رکھنے کا کہا ہو۔ نہ بلڈنگ ٹھیکے دار ناراض ہو اور نہ وہ روحانی ٹھیکے دار جس کے قبضے میں ہزاروں ووٹ ہیں... یہ ہے سیاست۔"

"یعنی... باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی۔"

"بالکل... حساس معاملات میں جہاں جذبات کے آتش فشاں دونوں طرف ابل رہے ہوں، وقت سب سے مؤثر فائر فائٹر ثابت ہوتا ہے۔ خطرناک اور دھماکا کرنے والا وقت گزار دو... وہ ایک لمحہ گزر جائے تو صورت حال قابو میں آجاتی ہے۔ اس کے بعد کا ہر لمحہ آگ کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ عقل خود بخود کمان حاصل کرنے لگتی ہے۔ اس فیصلہ کن لمحے کو ٹالنے کے لیے جھوٹ مکروفریب... اور ضمیر فروشی... سب جائز ہے۔ یہاں پولیس یہی کررہی ہے۔ وقت کو گزار رہی ہے۔ ایک ہفتہ پھر ایک مہینا... پھر ایک سال گزر جائے گا پھر سب کچھ بدل جائے گا۔ سکندر جو آج سوچ رہا ہے ایک سال بعد اس کے برعکس سوچنے لگے گا کہ بیٹا تو واپس آنے سے رہا اور یہ پیر بھی کمزور حریف نہیں ہے۔ اس کی گردن میں پھانسی کا پھندا کون ڈال سکتا ہے۔ پھانسی تو دور کی بات ہے اسے ہتھکڑی لگا کے قتل کے الزام میں عدالت میں لانا بھی مشکل ہوگا۔ علاقے میں فساد پھیل جائے گا۔ پولیس کا دوغلا پن اپنی جگہ... وہ قانون کا نہیں طاقت اور دولت کا ساتھ دیتے ہیں... تو قصہ مختصر... بالآخر یہ کیس ہوا میں اسی طرح تحلیل ہو کے ختم ہوجائے گا جیسے کسی طاقتور بم دھماکے سے اٹھنے والا دھواں اور گردوغبار کا طوفانی مرغولہ فضا کی وسعت میں گم ہوجاتا ہے۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ "تو اس کھیل میں شریک ہے؟"

"میں انکار کیسے کرسکتا ہوں۔ میچ چاہے فکس ہو... لوگوں کو بھی پتا ہو کہ نتیجہ کیا نکلے گا لیکن پلیئرز کو کھیلنا تو پڑتا ہے۔"

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔ "تیرے خیال میں اس نکاح خواں کو کس نے قتل کرایا؟"

"ظاہر ہے پیر صاحب اینڈ کمپنی نے... نکاح یا نکاح نامے کے بارے میں ہم جانتے ہیں... سکندر کو کیا معلوم؟"

"پھر بے چارے نکاح خواں کی جان کس حساب میں گئی؟"

"یہاں پھر وہی محاورہ کام آئے گا کہ ہاتھیوں کی لڑائی میں مینڈک پس جاتے ہیں تو کیا ان کا شمار شہدا میں ہوتا ہے؟ مولوی ادھر آرہا تھا تو اسے مروا دیا گیا۔ اب الزام دونوں فریق ایک دوسرے پر عائد کریں گے۔ پیر صاحب کہیں گے کہ اسے نکاح پڑھانے کی سزا دی گئی۔ نکاح نامہ چھیننے کے لیے اسے ماردیا گیا تاکہ ثبوت کوئی نہ رہے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ نکاح نامہ ہم پہلے ہی لے چکے تھے۔ سکندر کہے گا کہ یہ جھوٹ ہے۔ نکاح خواں کو خود مار کے قتل ہمارے کھاتے میں ڈالا جارہا ہے۔ یہ کھیل تو چلے گا ابھی... اور یہ پیادے بھی ہلاک ہوتے رہیں گے۔"

"یعنی یہ سب ٹوپی ڈراما ہے؟" میں نے کہا۔ "آؤ لڑائی لڑائی کھیلیں... یہی ہورہا ہے نا... نقصان کی کسی کو پروا نہیں... کسی کو لڑائی کے کھیل میں جان گنوانے والوں کے نقصان کی بھی فکر نہیں۔"

"یار شطرنج کے کھیل میں پیادے بھی مارے جاتے ہیں ہاتھی گھوڑے بھی... بعض اوقات وزیر بھی... شاہ کو بچاتے ہوئے۔"

"اس کھیل میں روزینہ کی کیا حیثیت ہے... اور میری... اور ریشم کی؟"

"روزینہ بیوی ہے میری... تو دوست ہے... ریشم سے محبت ہے مجھے۔"

"مجھ سے نظر ملا کے بات کر... تُو نے تو دنیا دیکھی ہے۔ کیا واقعی ایسی ہوتی ہیں بیویاں... یہی حیثیت ہوتی

ہے ان کی؟"

"بیوی کی حیثیت ہر جگہ مختلف ہوتی ہے۔" وہ لاجواب ہوکے اب غصے میں آنے لگا تھا۔

"سچ کہا تو نے... حیثیت وہ جو شوہر اسے دے... چاہے پاؤں کی جوتی بنا کے رکھے یا سر پر چڑھا کے جورو کا غلام بن جائے... مگر دوستی کا تو ایک ہی معیار ہے سارے جہان میں... دوستی کی بنیاد ہوتی ہے بے غرض خلوص کے رشتے پر..."

وہ نظر چرا کے بولا۔ "تجھے شک کیوں ہے میری دوستی پر؟"

"پہلے تھی یہ خوش فہمی مجھے... وقت کے ساتھ دور ہوگئی۔"

"اسی دوستی کی وجہ سے اب تُو ایک فیملی ممبر ہے۔"

"بکواس... میں اس لیے یہاں ہوں کہ میں ایک چشم دید گواہ ہوں۔ دشمنی کے کھیل کا ایک مہرہ... شطرنج کے وزیر کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے اور اسے آخر تک بچا کے رکھا جاتا ہے۔ ایک قیدی ہوں میں بھی تیرا اور تیری اس فیملی کا... سازشی... مکار... بے ضمیر اور خود غرض لوگوں کا ایک ٹولہ جو خون کے رشتوں کی آڑ لیتا ہے... ورنہ اس رشتے کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔"

"تُو اس وقت ہوش میں نہیں ہے۔ تجھے اندازہ نہیں کہ تُو کیا کہہ رہا ہے۔" انور بگڑ گیا۔

"ہوش اب آیا ہے مجھے انور جب میں اپنی آزادی اور زندگی سب کچھ گروی رکھ چکا ہوں۔ تو کیا خون کے رشتوں کی اور محبت کی بات کرتا ہے۔ پہلے اکبر نے کیا کیا تھا تیرے ساتھ... اور اب اکبر کا قتل..."

وہ مشتعل ہو کے کھڑا ہوگیا۔ "تُو سمجھتا ہے میں نے مارا اسے؟"

میں گھوم کے دروازے کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ "نہیں... میں نے یہ نہیں کہا۔ لیکن اسے انہی میں سے کسی نے مارا جو اس کے ساتھ خون کے رشتے کے دعوے دار تھے... یہ کھلی حقیقت ہے۔ کسی کے نہ ماننے سے سچ کبھی جھوٹ نہیں بن سکتا۔ اگر اس کی موت کو طبعی قرار دے دیا گیا ہے تو میں بھی خاموش ہوں۔ لیکن ہر چشم دید گواہ کی زندگی داؤ پر لگ جاتی ہے۔ میری بھی لگ چکی ہے۔ کیا ایک دوست مجھے بچا لے گا؟"

"آج تک میں ہی تجھے بچاتا رہا ہوں... فریدالدین سے تجھے ملک سلیم اختر بنانے والا میرے سوا کون تھا۔ میں یقین دلاتا ہوں تجھے کہ میرے ہوتے کوئی تیرا بال بیکا نہیں کرسکے گا... تُو بہت ٹینشن میں ہے اس وقت۔"

"مجھے معلوم ہے... میں تیرا راستہ نہیں روک سکتا۔ ابھی تُو کسی ملازم کو آواز دے گا تو ایک کی جگہ دو بھاگتے ہوئے آئیں گے... لیکن انور! تُو بس ایک احسان کر مجھ پر... مجھے جانے دے۔ میں کس کا واسطہ دوں تجھے... شرافت اور دوستی کا؟ خدا رسولؐ کا... دیکھ میں نے کبھی تیرا برا نہیں سوچا۔"

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے نرمی سے کہا۔ "تیری خیر خواہی پر اعتبار نہ ہوتا تو کیا یہ تعلق رہتا؟ مجھے معلوم تھا کہ تجھ سے بہتر دوست، مشیر اور مددگار مجھے نہیں ملے گا۔ آج بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں میں... وہم نہ کر... بھروسا کر مجھ پر... اس مولوی کے قتل کا افسوس صرف اس لیے ہے کہ وہ ہماری طرف سے ایک گواہ تھا۔ میرا اس سے کوئی رشتہ جذباتی تعلق نہیں تھا۔"

"میں بھی ایک گواہ ہوں اور بس۔" میں نے ناراضی سے کہا۔

"نہیں... اس سے پہلے بھی تُو دوست تھا اور آئندہ بھی رہے گا۔ اس مولوی کا تجھ سے کیا مقابلہ... تو میری ذمے داری ہے۔ تیرے معاملے میں مجھ سے کوتاہی ہوئی تو میں تمام عمر خود کو معاف نہیں کرسکوں گا۔"

"چنانچہ میں حکومت کی حفاظتی تحویل میں ہوں۔" میں نے طنزیہ کہا۔

"چل ایسا ہی سمجھ لے تو۔"

"انور قتل کا مقدمہ تجھ پر تو نہیں ہے۔ پیر صاحب خود نمٹ لیں گے اپنے دشمنوں سے... تو خود بھی جانتا ہے یہ بات... جیسے وہ مولوی نہیں رہا، اکبر بھی ایک گواہ تھا۔ میں مارا جاؤں یا چلا جاؤں کہیں... ان کو فرق نہیں پڑ سکتا۔ کیس بھی بالآخر ختم ہو جائے گا۔ جیسا کہ تو نے بتایا... پھر میرے ساتھ زبردستی کیوں؟"

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا۔ "تُو واقعی جانا چاہتا ہے؟"

"ہاں، اس لیے نہیں کہ میں گواہی دینا نہیں چاہتا۔ ڈرتا ہوں کہ میں بھی مارا جاؤں گا۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"انور! یہ معاملہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا، ورنہ میں نے نورین کا سراغ لگا لیا تھا۔ وہ مجھے مل گئی تھی اور پھر کھو گئی۔ لیکن میں اسے تلاش کرلیتا۔ مجھے جانا ہی تھا۔ تو میرا راستہ مت روک۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تجھ سے رابطہ رکھوں گا۔ جس دن گواہی ہوگی میری... میں عدالت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ اس لیے کہ تو ایسا چاہتا ہے اور میں تیرا دوست

ہوں۔ ورنہ پیر صاحب کے معاملات سے مجھے کیا؟"

انور نے گہری سانس لی۔ "اوکے... تو جا... میں تیرے راستے کی دیوار نہیں بنوں گا۔ تیرے وعدے پر مجھے پورا اعتبار ہے۔ بس ایک دو دن میری خاطر رک جا۔ کچھ معاملات ایسے ہیں کہ مجھے تیرا مشورہ اور تیری مدد کی ضرورت ہوگی۔ یہاں اور کون ہے جس پر میں بھروسا کروں... کون تھا تیرے سوا دوست میرا... تیرے بغیر میں بہت اکیلا اور بے سہارا محسوس کروں گا۔"

میرے لیے انور کی جذباتی اپیل کو مسترد کرنا مشکل ہوگیا۔ "چل ٹھیک ہے، میں اس وقت تک جانے کی بات نہیں کروں گا جب تک تو خود مجھے اس کی اجازت نہیں دے گا۔ ابھی تجھے ضرورت ہے میری تو میں ہوں یہاں... تیرے ساتھ۔"

وہ میرے گلے لگ گیا۔ "مجھے معلوم تھا تُو اتنا خود غرض اور کمینہ نہیں ہوسکتا کہ مجھے مشکل وقت میں تنہا چھوڑ جائے۔"

اس رات میں بہت دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ میں کوئی جذباتی غلطی تو نہیں کر رہا ہوں۔ یہ زمین جائداد، نام و نسب، انا پرستی اور خاندانی عداوتوں کا کبھی ختم نہ ہونے والا سلسلہ تھا جس سے میرا کوئی تعلق نہیں بنتا تھا، خواہ اس میں انور کی دوستی کا حوالہ ہو۔ یہ سراسر مجرمانہ، غیر انسانی اور غیر اخلاقی جنگ تھی۔ مجھے اس میں ایک فریق بننے کی کیا ضرورت ہے۔ کہیں انور دوستی کے نام پر میرا جذباتی استحصال تو نہیں کر رہا؟ ایسا نہ ہو کہ میں کیچڑ میں قدم رکھوں اور دلدل میں اتر جاؤں؟ ابھی امید زندہ ہے، دل میں نورین کے آتشِ عشق کا شعلہ فروزاں ہے۔ وہ میری آرزو کا حاصل ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو میں اس دلدل کا اسیر ہو جاؤں۔ میرے لیے ممکن نہ رہے کہ میں اپنی جستجو کا سفر جاری رکھ سکوں اور فاصلہ بڑھتا جائے۔ وقت گزرتا جائے اور اس کی صورت کا نقش بھی دھندلا جائے۔ جیسے بہت پرانی ہو جانے والی تصویریں شناخت سے محروم ہو جاتی ہیں۔

معلوم نہیں وہ رات کا کون سا پہر تھا جب میں جاگا۔ یا میں نے محسوس کیا کہ میں جاگا ہوں اور میں نے پھر اسے دیکھا۔ وہ تاریکی کا ایک حصہ تھی لیکن میری نظر اسے یوں دیکھ سکتی تھی جیسے اس کا وجود روشن ہے۔ کسی اسپاٹ لائٹ میں بس وہی نظر آرہی ہے اور مجھے جگانے والی اس کی آواز نہیں تھی۔ اس کی خوشبو نے مجھے جگایا تھا۔ یوں جیسے سرگوشی میں میرا نام لیا ہو اور میں جاگا تو ذہنی طور پر پوری طرح مستعد تھا... مجھ پر نیند کا کوئی اثر نہ تھا۔

وہ کھلے دروازے سے اندر آکے چند قدم کے فاصلے پر رک گئی تھی۔ اس کے پیچھے دروازے کا خلا ایک نیم روشن مستطیل کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ "نورین! یہ تم ہو؟" آواز میرے حلق سے پھنس کر نکلی۔

"ہاں... پھر آنا پڑا مجھے۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔

میں ایک دم اٹھنے لگا۔ "وہاں کیوں کھڑی ہو... میرے قریب آؤ۔"

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ "نہیں خاور! میرے قریب مت آؤ۔"

"تم میرے پاس آئی ہو... تو پھر یہ دوری کیوں؟" میں اور آگے بڑھا۔

وہ مزید پیچھے ہوئی۔ "تم جتنا آگے آؤ گے، میں اتنا پیچھے ہٹوں گی۔ اس دروازے سے نکل گئی تو پھر تمہیں نظر نہیں آؤں گی۔"

میں رک گیا۔ "یہ سب کیا ہے نورین؟ کیا تم صرف میرا خیال ہو؟"

"عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔ یہ شعر تم پڑھتے تھے۔ تم نے بتایا تھا کہ غالب کا ہے ورنہ مجھے کہاں معلوم تھا۔ نہ مجھے شاعری کبھی سمجھ آئی نہ میں نے پڑھی۔ لیکن تمہاری ہر بات مجھے یاد ہے۔ جو تم کہتے تھے میں سمجھ لیتی تھی۔ تمہاری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ مجھے یاد ہے۔ جیسے میرے دماغ میں ٹیپ ریکارڈر کی طرح محفوظ ہوگیا۔ میں یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ کس دن تم نے مجھ سے کیا کہا تھا اور کیوں... خود مجھے حیرانی ہوتی ہے کیونکہ کسی اور کی کوئی بات مجھے ایسے یاد نہیں رہتی۔"

"میں نے تمہیں دیکھا تھا... پیر صاحب کی درگاہ پر... اس وقت تم نے خود کو نورین تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔"

"ہاں، میں نے کہا تھا کہ میں فاطمہ ہوں۔"

"ایسا کیوں کہا تھا تم نے نورین... کیوں جھوٹ بولا تھا مجھ سے؟"

"وہ جھوٹ نہیں تھا... اس وقت میں فاطمہ تھی۔"

"مگر میں نے معلوم کرلیا تھا۔ تمہارا سراغ لگا لیا تھا۔ تم مجھے چھوڑ کے کیوں چلی گئی تھیں؟"

"تمہیں چھوڑ کے فاطمہ گئی تھی، وہ مجبور تھی۔ اگر میں نورین ہوتی تو کیا تمہیں چھوڑ کے جاتی؟"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے... اب تم کیا ہو... فاطمہ یا نورین؟"

"میں نورین ہوں... مجھے نہیں معلوم کتنا عرصہ میں فاطمہ رہی... لیکن پھر ایک صبح میں اٹھی تو نورین تھی۔ ایک شخص مجھے کہہ رہا تھا کہ تم فاطمہ ہو مگر میں نے انکار کر دیا۔ میں اس شخص کو نہیں جانتی تھی۔ اس نے پہلے مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ معلوم نہیں کتنے دن قید میں رکھا اور وہ جگہ کیا تھی۔ پھر وہ مجھے کسی دوسرے پیر کے پاس لے گیا۔ وہاں اس نے کہا کہ مجھ پر جن آتے ہیں۔ میرا نام فاطمہ ہے مگر میں خود کو نورین کہتی ہوں... اور اب میں اس جعلی پیر کی درگاہ پر ہوں... اسی طرح جیسے یہاں تھی۔"

"مجھے بتاؤ اس پیر کا نام؟"

"مجھے نہیں معلوم... کوئی اس کا نام نہیں لیتا۔"

میں نے کہا۔ "کہاں ہے اس کی درگاہ؟"

"یہ بھی میں نہیں جانتی۔ مجھے یقین تھا کہ تم مجھے تلاش کرو گے اور اس قید سے چھڑا لو گے۔ معلوم نہیں وہ کون سی جگہ تھی جہاں میں نے تمہیں سلاخوں کے پیچھے دیکھا تھا۔ کوئی درگاہ تھی وہ بھی... مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ وہ تم تھے... وہ خواب نہیں تھا اور میں نے اپنا نام فاطمہ ہی بتایا تھا۔ معلوم نہیں کیوں... میرے دماغ میں کنفیوژن ہے۔ نورین سے فاطمہ اور پھر نورین بننے تک جو وقت گزرا، اس میں جو بھی ہوا کبھی مجھے خواب لگتا ہے کبھی حقیقت۔ کچھ یاد ہے... کچھ بالکل یاد نہیں۔"

"تم فکر مت کرو، میں تمہیں تلاش کرلوں گا۔"

"مجھے بھی پورا بھروسا ہے تم پر... تم آؤ گے... میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں خاور... آخر تم یہاں کیوں رک گئے ہو؟ ایسا نہ ہو وقت گزرے تو تم مجھے بھول جاؤ۔"

"یہ ناممکن ہے نورین۔"

"دنیا میں ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا۔ آخر کب تک انتظار کروں گی میں تمہارا؟ تم جانتے ہو کہ تمہاری طرح میں آزاد اور خودمختار نہیں ہوں۔ میں تمہاری امانت ہوں خاور... جب تک یہ زندگی ہے لیکن زندگی بہت ناقابلِ اعتبار ہوتی ہے۔" وہ رونے لگی۔

میں اس کی سسکیاں سن کے دیوانہ وار اٹھا۔ "خدا کے لیے ان آنسوؤں کو روکو۔"

میں نے اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر اس کی آنکھوں کو چومنے اور اس کے آنسو پینے کی کوشش کی... ایک دھماکا ہوا اور میں بند دروازے سے ٹکرا کے وہیں گر گیا۔

پھر ہوش آیا تو میں اپنے بستر پر تھا۔ انور مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے ریشم تھی۔ پھر ڈاکٹر جلالی دروازے میں نمودار ہوا تو میں نے باہر دن کے اجالے کو اور دھوپ کو دیکھا۔

ڈاکٹر جلالی میرے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا بیگ کھول کے دل کی دھڑکن سننے والا آلہ نکالا۔ "کیا پرابلم ہے ینگ مین؟"

میں نے کہا۔ "میں ٹھیک ہوں ڈاکٹر۔"

انور نے کہا۔ "یہ شاید سوتے میں اٹھ کے بھاگا تھا اور بند دروازے سے ٹکرا کے گر گیا تھا۔ دھماکا سن کے ایک گارڈ آیا تھا تو یہ یہاں پڑا تھا۔ اسی نے مجھے بتایا۔ ہم نے اسے اٹھا کے بیڈ پر شفٹ کیا۔"

ڈاکٹر نے ابتدائی معائنے کے بعد سر ہلا دیا۔ "مجھے خرابی تو کوئی نظر نہیں آتی... سب نارمل ہے۔ یہ اسی سے پوچھو کہ کیا ہوا تھا؟"

"میرا خیال ہے آپ اسے انڈر آبزرویشن رکھ لیں... اس کے تمام ٹیسٹ کروالیں۔" انور سخت اپ سیٹ تھا۔ ریشم نے تائید میں سر ہلایا۔

ڈاکٹر جلالی نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "یہاں صرف چودھری کو آبزرویشن پر رکھا جاسکتا ہے اور وہ ہارٹ پیشنٹ ہے۔ یہ کیس بنتا ہے نیورولوجسٹ کے لیے اور وہی بتا سکتا ہے کہ کس قسم کے ٹیسٹ ضروری ہیں۔ وہ کسی اچھے اسپتال یا لیبارٹری سے شہر میں کرائے جاسکتے ہیں۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "یو آر رائٹ ڈاکٹر... مجھے زبردستی ایک کیس بنانے کی کوشش کی جارہی ہے جبکہ مجھے کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔"

"پھر یہ سب کیا تھا؟ تُو نے بند دروازے سے گزرنے کی کوشش کی تھی۔ سر کی ٹکر سے دروازہ توڑنے کی... یہ دماغی خرابی کا پہلا دورہ پڑا تھا تو آئندہ کے لیے معائنہ کرانا چاہیے۔" انور نے کہا۔

میں نے اپنے دفاع کے لیے وضاحت اور صفائی پیش کرنے کی ناکام سی کوشش کی۔ "شاید نیند میں تھا میں۔"

"نیند میں چلنے کی بیماری پہلے تو نہیں تھی۔" انور نے میری دلیل مسترد کر دی۔ "میرا خیال ہے کہ کوئی نیورولوجسٹ دیکھ لے تو اچھا ہے۔"

"اچھا یار! چلے جائیں گے لاہور کسی دن... ابھی کون سی ایمرجنسی ہے۔ میرا خیال ہے نہا کے میں فریش ہو جاؤں... بھوک سے بُرا حال ہے۔"

"ناشتا ابھی تک میں نے بھی نہیں کیا ہے۔" ریشم بولی۔ "تم بھی میرے ساتھ کرلینا... میں لاتی ہوں یہاں۔"

جب میں غسل کے بعد کپڑے بدل کے نکلا تو وہ سب موجود نہیں تھے جو ایک غیر معمولی حادثے یا واقعے سے پریشان ہو کے میری مدد کے لیے آئے تھے۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا جہاں گزشتہ شب نورین کے خیال یا خواب کو میں نے اسی طرح دیکھا تھا جیسے صحرا میں سراب پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ عقل یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی کہ نورین ایک زندہ حقیقی وجود رکھتی تھی مگر عقل کے پاس ان تمام باتوں کا بھی کوئی جواب نہ تھا جو نورین کر گئی تھی۔ یقیناً یہ ایک معما ہے سمجھنے کا کہ سمجھانے کا... اگر معاملہ نیورولوجسٹ کا نہیں تو پھر کسی مافوق الفطرت واقعات کو سمجھنے والے عامل یا ماہرِ روحانیات کا ہوگا۔ اس میں عقل کے گھوڑے دوڑا کے کیا ملے گا۔

اب میں پُرسکون تھا لیکن میرے ذہن میں نورین سے ملاقات کی آڈیو، ویڈیو فلم مسلسل چل رہی تھی۔ پہلے سین سے ڈراپ سین تک... اور میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ جو بات میں کسی کو سمجھا نہیں سکتا، وہ کسی سے کرنی بھی نہیں چاہیے۔ نورین میرے خیالوں اور خوابوں میں حقیقت کا رنگ بھر کے یوں ملنے آتی ہے تو یونہی سہی... میں تو اس شدتِ احساس کے ساتھ نورین تک رسائی نہیں رکھتا۔ اگر میں بھی سوچتا رہا تو یقیناً دماغی امراض کے ماہر کا کیس بن جاؤں گا۔ ابھی جو سمجھ میں نہیں آتا اسے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی جائے۔ اسی میں عافیت ہے۔ وہ کبھی پھر ملے گی تو اسی سے پوچھ لوں گا کہ ان باتوں کا مطلب کیا ہے۔ تم کیسے مجھ تک پہنچ جاتی ہو اور وہ باتیں بتا جاتی ہو جو ایک طرح سے "عالم غیب" کی باتیں ہیں۔ ان کے جھوٹ سچ کا پتا بھی چل ہی جائے گا۔

ریشم ناشتے کی ٹرے کے ساتھ نمودار ہوئی اور ٹرے درمیان کی میز پر رکھ کے میرے سامنے بیٹھ گئی۔ "کیا سوچ رہے ہو؟"

"اپنے بارے میں... لیکن میں اس پر کوئی بات کرنا نہیں چاہتا... جو ہوا اور سب نے دیکھا۔"

"تم نے آئینہ دیکھا؟ ناشتا شروع کرو۔"

"ہاں، میرے ماتھے پر دروازے سے ٹکرانے کا نیل ہے... بلکہ زخم سا ہے۔"

"چلو تم نہ بتاؤ... ڈاکٹر جلالی کا خیال ہے کہ یہ اعصابی دباؤ کا نتیجہ ہے۔ دماغ نیند میں بھی جاگتا رہتا ہے... خواب کو حقیقت سمجھ لیتا ہے اور لوگ نیند میں چلنے لگتے ہیں۔"

میں نے چڑ کے کہا۔ "مجھے معلوم ہے۔ نیند میں چلنے کا مرض کیا ہوتا ہے۔ لوگ ہپناٹائز کیے جانے والے شخص کی طرح گھر سے باہر نکل جاتے ہیں اور جب جاگتے ہیں تو حیران ہوتے ہیں کہ وہ کہاں آ گئے۔"

"کیا ایسا پہلے بھی ہوا تھا کبھی؟"

"نہیں، اب کوئی اور بات کرو۔" میں نے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ... وہ پرفیوم کون سی ہے جو تم نے ایک بار پہلے بھی استعمال کی تھی؟"

میرا ہاتھ رک گیا۔ "پرفیوم؟"

"ہاں، پرفیوم تو انور کے پاس بھی بہت ہیں اور شاہینہ کے پاس بھی... یہ سب سے الگ تھی... جب گارڈ دروازہ بجا رہا تھا تو سب سے پہلے میں آئی تھی۔ جب انور نے آکے کہا کہ دروازہ توڑ دو... گارڈ نے کندھا مار کے دروازہ کھول دیا۔ اوپر سے چٹخنی نکل گئی تھی۔ اس وقت کسی نے بات نہیں کی... بعد میں انور نے ذکر کیا تو میں نے ہی کہا۔ ہم نے ڈاکٹر جمالی سے پوچھا۔"

"ایسی کیا ضرورت پڑ گئی تھی، اتنی تحقیق اور تفتیش کی؟"

"تم بتانا نہیں چاہتے تو نہ بتاؤ۔" وہ بُرا مان گئی۔

"ہاں، میں نہیں بتا سکتا یا نہیں بتانا چاہتا۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

وہ چپ ہوگئی اور ناشتا ختم ہوا تو ٹرے اٹھا کے نکل گئی۔ مجھے کچھ افسوس ضرور ہوا لیکن یہ ضروری ہو گیا تھا کہ میں سخت رویّہ اختیار کروں ورنہ ہر ایک کو بتانے اور سمجھانے میں میرا پاگل ہو جانا یقینی تھا۔ میں انور سے بھی وعدہ کر چکا تھا کہ جب بھی ضرورت ہوگی میں گواہی دینے آجاؤں گا اور اس نے میرے وعدے پر اعتبار کرتے ہوئے مجھے اجازت بھی دے دی تھی کہ حالات چند دن میں کچھ نارمل ہو جائیں گے تو مجھے نورین کی تلاش میں نکلنے کی آزادی ہوگی۔ آج مجھے یہ چند دن گزارنا بھی مشکل لگ رہا تھا۔ میرا دل اس حویلی سے اور یہاں کے معاملات سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اپنے سفر کی کسی سمت کا یقین نہ ہونے کے باوجود میں پُرامید تھا کہ جستجو کا یہ سفر رائگاں نہیں جاسکتا کیونکہ میرے دل کی لگن جو میری راہنمائی کرے گی، سچی ہے۔

مزاج پرسی کے بہانے میں چودھری صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ ان کی بیماری کا ایک صدمے سے متاثر ہونا فطری بات تھی۔ وہ ایک دم جیسے ڈھے گئے تھے۔ عمر کا بڑھاپا ان کے عزم اور حوصلے کو بھی شکست دے رہا تھا۔ ڈاکٹر جلالی ہر اچھے ڈاکٹر کی طرح ماہرِ نفسیات بھی تھا... نہ اس نے کسی سے کہا تھا اور نہ ظاہر ہونے دیا تھا کہ وہ چودھری

صاحب کی طرف سے ناامید ہے۔ وہ خود ہی ان کا حوصلہ بڑھاتا تھا اور دوسروں سے بھی توقع رکھتا تھا کہ وہ حوصلہ شکن باتیں نہ کریں لیکن ظاہر ہے اس ماحول میں وہ اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب نہیں تھا۔

چودھری آنکھیں بند کیے تکیے کے سہارے نیم دراز تھا۔ وہیں صوفے پر اس کی بیوی ساکت بیٹھی خلا میں گھور رہی تھی اور اسے علم ہی نہ تھا کہ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ میں کچھ فاصلے پر دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''کیسی طبیعت ہے چودھری صاحب؟'' میں نے اخلاقاً پوچھ لیا۔

''کیسی ہونی چاہیے تیرے خیال میں؟'' اس نے آنکھیں کھول کے مجھے ناگواری سے دیکھا۔ ''سب پاگل بار بار یہی پوچھتے رہتے ہیں... نظر نہیں آتا کیا؟''

میں نے جان بچانے کے لیے کہا۔ ''حوصلہ رکھنا چاہیے آپ کو...''

''حوصلہ کس لیے... کیا کرنا ہے حوصلہ رکھ کے... کشمیر فتح کرنے جانا ہے؟ کوئی مرنے بھی تو نہیں دیتا مجھے... سارے دشمن ہیں میرے سکون کے... خدا کے لیے مجھے معاف کرو۔'' وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔

میں اٹھنے والا تھا کہ چودھری نے کہا۔ ''اوئے ملک! تُو بڑا سیانا بنتا ہے... بتا اکبر کو کس نے قتل کیا؟''

میں بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ ''میرا خیال ہے اس ملازمہ نے جو کھانا پکاتی تھی۔''

''اس کی کیا دشمنی تھی اکبر سے... جوانی میں تو یہ کام کیا نہیں، ساری زندگی گزار دی یہاں سب کی خدمت کرتے۔''

''پھر میں کیا کہوں چودھری صاحب؟'' میں نے کہا۔

''اپنا دماغ استعمال کر دماغ... جو صرف تیرے پاس ہے... ہمارے سر میں تو بھوسا ہے... سوچ اس کو زہر دینے پر کس نے مجبور کیا... وہ دھمکی یا لالچ میں آنے والی نہیں تھی، مجھے پتا ہے... اور زہر کیا تھا۔''

''چودھری صاحب! ایسی بات بالکل نہیں کہنی چاہیے آپ کو... ہم سب ایک بات پر قائم ہیں کہ اکبر کی موت طبعی تھی۔ ہم نے اس معاملے کو دبا دیا ہے تاکہ حویلی کے اندر سب محفوظ رہیں۔ سب کی عزت محفوظ رہے۔ خدانخواستہ تفتیش شروع ہو گئی تو کوئی محفوظ نہیں رہے گا... نہ آپ نہ میں... نہ انور نہ بڑی بھابی۔''

''ملک ٹھیک کہتا ہے... سب آپ کو سمجھا چکے ہیں۔ آپ پھر وہی باتیں شروع کر دیتے ہو۔'' چودھرائن نے پُرملال لہجے میں شکوہ کیا۔ چودھری خاموش رہا اور اپنی آنکھیں بند کیے ستا رہا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں سے کھسک جاؤں۔

باہر آ کے میں نے سکون کا سانس لیا۔ چودھری کی ذہنی حالت ایسی تھی کہ مجھے اس سے دور ہی رہنا چاہیے تھا۔ مزاج پرسی کی رسم نبھانا موجودہ حالات میں خطرناک ہو گیا تھا۔ چودھری بیمار تو پہلے ہی تھا لیکن جینے کی خواہش ضرور رکھتا تھا۔ اب یہ خواہش مر گئی تھی تو اس کو بھی مرنا ہی تھا اور شاید بہت جلد۔

مجھے اس ماحول میں وحشت ہونے لگی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ جب یہ وقت گزر جائے گا تو انور کے لیے زندگی آسان ہو کے ایک معمول پر آ جائے گی۔ جب چودھری بھی نہ ہوگا تو حویلی اور اس سے منسلک تمام معاملات میں انور کو مکمل اختیار حاصل ہوگا۔ سب کچھ وہی طے کرے گا اور اسی کا فیصلہ آخری اور حتمی ہوگا۔ چودھرائن کسی گوشۂ تنہائی میں خود کو بند کر لے گی اور اپنا سارا وقت یادِ الٰہی میں صرف کرے گی۔ روزینہ حویلی کی مالکن کی حیثیت سے اپنے محدود اختیارات کے دائرے میں زندگی اسی طرح گزارے گی جیسے اس سے پہلے کی ہر چودھرائن نے گزاری تھی۔ شاہینہ کا معاملہ غیر یقینی تھا۔ وہ کہاں رہتی ہے... میکے میں یا سسرال میں... اس کا ذاتی فیصلہ ہوگا لیکن اسے ایک دائمی بیوہ کی تنہا زندگی قبول کرنی ہوگی۔ نئی ازدواجی زندگی کا خواب بھی اس کے لیے ممنوع ہوگا۔ اپنے باپ کی جائداد میں پیر صاحب کی گدی پر اس کا شرعی یا اخلاقی حق ضرور برقرار رہے گا مگر ملے گا نہیں... ہاں خود پیر صاحب کی دنیادار نظر نے کسی کو جانشینی کے منصب پر فائز کرنے کے لیے منتخب کر لیا تو ان کا فیصلہ شاہینہ کو قبول کرنا پڑے گا۔ وہ خود فیصلے کا کوئی اختیار نہیں رکھتی۔

وہ سخت بے عملی کے بیزار کرنے والے دن تھے۔ ریاکاری اور منافقت والے ظاہری سوگ کی فضا نے حویلی کے معمولات کو کرفیو سا لگا رکھا تھا۔ اکبر سے میرا کسی قسم کا جذباتی رشتہ یا تعلق تھا تو اس کی یاد خوش گوار نہ تھی کہ میں اس کے لیے سوگوار ہوتا اور میں ایسا اجنبی بھی نہ تھا کہ غم واندوہ میں ڈوبے نظر آنے والوں کے حقیقی جذبات کو سمجھ نہ پاتا۔ وہاں صرف اکبر کے ماں باپ کا دکھ جینوئن تھا۔

میں نے ریشم کو صحن کے وسط میں اکیلا کرسی پر بیٹھا دیکھا۔ اب سردیاں رخصت ہو رہی تھیں لیکن ابھی دھوپ تاپنے کا موسم نہیں آیا تھا۔ وہ دھوپ سے بچ کر اپنی کرسی

ایک درخت کی چھاؤں میں کیے چپ بیٹھی تھی۔ دوسری کرسی کھینچ کے میں اس کے سامنے جا بیٹھا۔

''آئی ایم سوری ریشم... صبح میں نے زیادتی کی تمہارے ساتھ۔''

اس نے سوالیہ نظر اٹھائی۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟''

''میرا مطلب تھا بہت نامناسب رویّہ تھا میرا... میں بہت اپ سیٹ تھا۔''

''میں نے بُرا نہیں مانا تھا... ہم سب ہی اپ سیٹ ہیں۔''

''جو بات تم نے پوچھی تھی... سب نے پوچھی تھی اور وہ ایسی بات تھی کہ کوئی نہ مانتا... شاید تم بھی...''

''ایسی کیا بات ہو سکتی تھی؟''

''ریشم! میں نے نورین کو دیکھا تھا۔'' میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

ریشم کا چہرہ حیرت کی تصویر بن گیا۔ ''نورین کو دیکھا تھا... کہاں؟''

''اپنے سامنے... اپنے کمرے میں... بالکل اسی طرح جیسے اس وقت میں تم کو دیکھ رہا ہوں۔ شاید اس سے بھی زیادہ احساس کی شدت کے ساتھ کیونکہ اس وقت بہت رات گزر چکی تھی آس پاس سب سوئے ہوئے تھے... اندھیرا تھا... اور سناٹا... اور تنہائی... میرے کمرے میں۔''

''وہ یہاں ہے... نورین...''

''دیکھو... میری بات سمجھنے کی کوشش کرو... میرے لیے بتانا مشکل ہوگا اور تمہارے لیے یقین کرنا... لیکن میں کیوں جھوٹ بولوں گا تم سے... کیوں کوئی بے سروپا بات کروں گا۔ تم جانتی ہو کہ میں کوئی نشہ نہیں کرتا... مجھ پر کوئی جن نہیں آتا... کسی آسیب کا سایہ نہیں اور نہ کسی نے مجھ پر کوئی جادو یا سفلی عمل کرایا ہے۔ میں ایسی فضول اور بے بنیاد باتوں کو ایمان کی کمزوری سمجھتا ہوں۔ کیا تم نے کبھی محسوس کیا کہ مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑتا ہے تو میں الٹی سیدھی اور بے سروپا باتیں کرتا ہوں؟''

''خدا نہ کرے...''

''تو یقین کرو مجھ پر... نورین کا مجھے کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ سب کہتے تھے کہ اس حادثے میں وہ مر گئی... ڈوب گئی اور اس کی لاش نہ جانے بہہ کر کہاں گئی۔ مجھے تو بچا لیا تھا تم نے... قسمت اچھی تھی میری... لیکن میرا دل نہیں مانتا تھا یہ بات... مجھے یقین تھا کہ وہ زندہ ہے... اور وہ زندہ تھی... میرا یقین غلط نہیں تھا۔ وہ فاطمہ بن کے میرے سامنے آئی۔''

''مگر وہ فاطمہ تھی... تم اسے نورین سمجھتے رہے۔''

''وہ نورین ہی تھی لیکن خود کو فاطمہ سمجھ رہی تھی۔ جس حادثے میں خدا نے میری جان بچالی تھی اور تمہیں وسیلہ بنا دیا تھا، اس نے نورین کو بھی محفوظ رکھا۔ بس کسی وجہ سے اس کی یادداشت متاثر ہوئی۔ یہ تو ڈاکٹر ہی بتا سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا تھا۔ پہلے کی کوئی بات اسے یاد نہیں رہی... لیکن اس کا دماغی توازن خراب نہیں ہوا۔ اسے ساون خان نے پانی سے نکالا تھا۔ وہ یقیناً ہوش میں نہیں ہوگی۔ آگے اس نے کیا علاج کرایا، کس سے کرایا... نورین زندہ رہی اور ٹھیک ہو گئی مگر وہ اپنے بارے میں کچھ نہ بتا سکی کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ ساون نے جو نام مناسب لگا رکھ دیا... اور نورین نے بھی مان لیا کہ وہ فاطمہ ہے... لیکن وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ چھوٹی موٹی چوریاں کرتا تھا اور کچھ عرصہ جیل میں بھی رہا۔ وہ فاطمہ کو اپنی بیٹی بتاتا رہا... حالانکہ اس کی بیٹی کوئی نہیں تھی۔ اس کی بیوی شادی کے بعد اس کے ساتھ نہیں رہی۔ وہ یہاں حویلی میں رہی اور پھر کسی کے ساتھ نکل گئی۔ یہ بات سب بتاتے ہیں... شاید اسی لیے وہ نورین کو فاطمہ بنا کے نکل گیا۔ کچھ پتا نہیں اس کی نیت کیا تھی۔ مجھے اس کو تلاش کرنا ہوگا۔ میں نے پہلے ہی دیر کر دی ہے۔''

وہ خاموشی سے میری صورت دیکھتی رہی۔ ''تم کہاں تلاش کرو گے اسے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ تو میں خود نہیں جانتا۔ یہ جاسوسی اور سراغ رسانی کا کام ہے۔ اس میں عقل سے زیادہ خدا کی مدد چاہیے۔''

''تمہیں اِدھر اُدھر بھٹکنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ خود آجاتی ہے تم سے ملنے... اگلی مرتبہ آئے تو اس سے کہنا کہ اپنا پتا لکھ کر دے جائے۔''

''تم بھی مذاق اڑا رہی ہو نا میرا... مجھے معلوم ہے میری بات کا یقین کوئی نہیں کرتا۔ سب اسے میرا وہم سمجھتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ خواب کو میں سچ سمجھ لیتا ہوں لیکن ایک بات بتاؤ... پہلے بھی تم نے پوچھا تھا... آج صبح بھی کہ یہ خوشبو کیسی ہے... انور کو بھی اس کا احساس ہوا تھا۔''

''ہاں مگر یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے... کیا نورین تمہارے خواب میں وہ پرفیوم لگا کے آتی ہے؟''

''یہ خوشبو اس کے ساتھ آتی ہے۔''

''ایسا میں نے روحوں کے بارے میں سنا ہے۔ نیک ارواح کے ساتھ خوشبو آتی ہے لیکن وہ زندہ لوگ نہیں ہوتے۔ تم کہتے ہو نورین زندہ ہے... پھر وہ روح بن کے کیسے آتی ہے؟''

''یہ سب مجھے نہیں معلوم... لیکن خوشبو اس کی ہوتی ہے۔ کسی دن تمہیں بھی یقین آجائے گا جب تم اس سے ملو گی۔ میں جب پہلی بار اس سے ملا تھا تو وہاں اندھیرا تھا۔ ایسا اندھیرا تھا کہ میں صرف اس کی آواز سن سکتا تھا۔ لیکن آواز سننے سے پہلے میں نے اس خوشبو کو محسوس کیا تھا۔ اور میں ڈر گیا تھا۔ کیونکہ وہ ایک پرانی آسیب زدہ حویلی تھی۔ مشہور تھا کہ اس جگہ پر آسیب ہے۔ نورین وہاں چھپی ہوئی تھی۔ میں جیل سے فرار ہو کے وہاں چھپا تھا۔ نورین کی خوشبو نے میرے حواس کو مختل کر دیا تھا۔ لیکن بعد میں ہمیشہ مجھے وہی خوشبو اس کے وجود سے پھوٹتی محسوس ہوئی۔ کئی ہفتے اور اب کئی ماہ بعد جب اس کا وہ عروسی جوڑا بھی نہیں ہے اور وہ بازار سے خریدے ہوئے عام کپڑے پہنتی ہے، میں جانتا ہوں کہ اس کے پاس نہ کوئی عطر تھا نہ پرفیوم... اور ایسی کوئی چیز میرے ساتھ اس نے کبھی نہیں لی تھی... اب دو ہی باتیں ہیں یا تو میرے دماغ میں وہ خوشبو بس گئی تھی۔''

''کیا ایسا ہوتا ہے؟''

''دیکھو، میں اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق یہ بات کہہ رہا ہوں۔ تمام حواس کا تعلق دماغ سے ہے۔ دیکھنا... سننا... گرم ٹھنڈا... سختی نرمی... ذائقہ... بھوک پیاس... سب دماغ محسوس کرتا ہے۔ خوشبو کو دماغ پہچانتا ہے۔ بتاتا ہے کہ خوشبو یا بدبو کس چیز کی ہے تو نورین کی خوشبو میرے دماغ میں ہے۔''

''اور دماغ اس لیے محسوس کرتا ہے کہ وہ نورین میں سے یوں پھوٹتی ہے جیسے گلاب یا چنبیلی میں سے۔''

''ہاں... مگر وہ سب سے الگ ہے۔ وہ نورین کی خوشبو ہے۔''

''انسانوں کے جسم سے بو آتی ہے یہ تو سنا ہے... بو پسینے کی ہوتی ہے مگر کسی خوشبودار انسان کے بارے میں نہیں سنا۔''

''مجھے پتا تھا تم نہیں مانو گی۔ مگر جو میرے لیے حقیقت ہے اسے میں کیسے جھٹلا دوں؟''

''کیا کبھی کسی اور نے بھی یہ کہا؟''

''آج صبح تم نے کہا تھا اور انور نے کہا تھا۔ کل رات جب وہ آئی تھی تو اپنی خوشبو ساتھ لائی تھی اور میرے کمرے میں وہی خوشبو تھی۔''

''وہ تمہارے خواب میں آئے تب بھی اس کی خوشبو کمرے میں بھر جاتی ہے... جو دوسرے محسوس کر سکتے ہیں؟''

''اگر ایسا ہے تو میں کیسے کہوں کہ نہیں ہے۔ اور گزشتہ رات میں وہ آئی تو میں سوتے سے اٹھا تھا۔ میں جاگ رہا تھا اور وہ میرے سامنے کھڑی تھی اور جب میں نے اس کو چھونا چاہا تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے مجھے منع بھی کیا تھا مگر میں دیوانگی میں اور آگے لپکا تو دروازے سے ٹکرا گیا۔ میرا سر ٹکرایا تھا دروازے پر... اور آواز پر گارڈ آیا تھا۔ ظاہر ہے چوٹ اتنی سخت تھی کہ میں کچھ دیر کے لیے بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے تمہارے سوا کسی کو بھی سمجھانے یا قائل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی اور تم بھی مانو نہ مانو... لیکن یہ میرے احساس کا تجربہ تھا۔ میں اسے فراموش نہیں کر سکتا۔ میں نے انور کو بتا دیا ہے کہ مجھے جانا ہے۔''

''تم کیسے جا سکتے ہو... تم چشم دید گواہ ہو؟''

''انور نے اجازت دے دی ہے مجھے... میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں گواہی کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔ میں رابطہ رکھوں گا۔''

''انور کہاں یقین کرنے والا ہے۔ اس نے ٹال دیا تمہیں۔ ورنہ تم ہی بتاؤ... تم کدھر جاؤ گے؟ مشرق میں مغرب میں... شمال کی طرف یا جنوب کی طرف... کہاں سے رابطہ رکھو گے اور کیسے... پیشی والے دن کہاں سے آؤ گے اور کیسے؟''

''ریشم! مجھے جانا ہے اور میں جاؤں گا۔ انور اجازت دے نہ دے... میں نکل جاؤں گا کسی بھی دن۔''

''کسی بھی دن؟'' اس نے میرے الفاظ کو زیر لب دہرایا۔

''ہاں، کسی بھی دن... کسی بھی وقت... اگر کسی نے میرا راستہ روکا تو پھر مجھے ایسا ہی کرنا پڑے گا۔''

''سنو... کیا ایسا ہو سکتا ہے؟'' اس نے سوالیہ نظر اٹھائی اور کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

میں نے پلٹ کے دیکھا تو انور قریب آچکا تھا۔ اس نے کچھ فاصلے پر رکھی کرسی اٹھائی اور ہمارے پاس آکے بیٹھ گیا۔ تین دن میں انور اتنا بدل گیا تھا کہ اس کی صورت دیکھ کے خوف آتا تھا۔ بیک وقت اسے بہت سے مسائل کا سامنا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی عام آدمی کی زندگی کے روزمرہ مسائل جیسا نہ تھا۔ حویلی کے حاکم اور اب اس جدی

جائداد کے اور خاندانی روایات کے علمبردار کی حیثیت سے تمام مسائل کا بوجھ اس پر آپڑا تھا۔ یہ تمام سماجی، اخلاقی یا قانونی مسائل اس پر ہر طرف سے اپنا نفسیاتی اثر ڈال رہے تھے۔ اس نے اکبر کی موت (یا قتل) سے جڑے ہوئے تمام معاملات سنبھالنے تھے۔

تین دن میں وہ برسوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے تھے جو تھکن، بے سکونی اور بے آرامی کی علامت تھے۔ وہ بہت کم سو رہا تھا اور اس کا کھانا پینا بھی برائے نام رہ گیا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ پاگل ہونے سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے۔

انور یوں کرسی پر گر گیا جیسے میلوں چل کے آیا ہو مگر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''مزے میں ہو تم... گپ شپ چل رہی ہے... میں تو بہت تھک گیا ہوں... میری ہمت جواب دے رہی ہے۔''

میں نے ہمدردی سے کہا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا انور... کچھ وقت تو لگے گا معاملات ٹھیک ہونے میں۔''

''میں چائے کے لیے کہتی ہوں۔'' ریشم اٹھنے لگی۔

انور نے اسے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ ''میں کہہ کے آیا ہوں... بیٹھو، مجھے تم سے بھی بات کرنی تھی۔''

ریشم بیٹھ گئی مگر ناگواری سے۔ ''ایسی کیا بات تھی؟''

انور کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ''جب روزینہ یہاں تھی تو اس سے تمہاری کوئی بات ہوئی تھی؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بس ایک دو بار دیکھا ضرور تھا میں نے... ایک بار شاہینہ بھابی کے کمرے میں... تو بھی تھا وہاں۔''

''اس نے تم سے کچھ کہا تھا؟'' انور نے ریشم کی طرف دیکھا۔

''ہاں، بہت کچھ کہا تھا آتے جاتے... جب سامنا ہوتا، وہ کچھ نہ کچھ کہہ جاتی تھی لیکن میں بتاؤں گی نہیں کہ وہ کیا کہتی تھی۔'' ریشم نے کہا۔

انور نے سر ہلایا۔ ''مجھے اندازہ ہے کہ وہ کیا کہتی ہو گی۔ دراصل ابھی فون پر میری پیر صاحب سے بڑی لمبی بات ہوئی ہے۔ کچھ ناراض تھے وہ ہم سب سے... ضرورت سے زیادہ اپنا حق جتا رہے تھے مجھ پر... کافی برداشت کیا میں نے اور بہت ٹالا... لیکن وہ بہت سی توقعات کے ساتھ مجھے حکم دینے لگے تو میں کہاں تک برداشت کرتا۔ میں نے کہہ دیا کہ پیر صاحب! میں نے آپ کی خواہش اور اپنے والد کی مرضی سے مجبور ہو کے روزینہ کو شریک حیات بنا لیا اور اسے وہ درجہ مل گیا جس کی آپ سب کو خواہش تھی۔ میں نے یہ رشتہ بیک ڈیٹ سے قبول کرنے پر آمادگی بھی آپ کے لیے قبول کی۔ اسے میں احسان نہیں کہتا۔ خاندانی ذمے داری کی مجبوری کہتا ہوں اور مجھے اس کا احساس نہ ہوتا تو میں اس معاملے میں پڑنے سے صاف انکار کر دیتا۔ لیکن اس کا مطلب آپ یہ ہرگز نہ لیں کہ اب آپ میری زندگی کو کنٹرول کریں گے۔ نہیں... زندگی میری اپنی ہے تو فیصلے بھی میرے اپنے ہوں گے۔''

میں نے کہا۔ ''آخر وہ کیا چاہتے تھے... روزینہ نے ایسا کیا کہہ دیا ان سے؟''

ملازم چائے کی ٹرے اٹھا کے لایا اور درمیان میں رکھ کے چلا گیا تو انور نے کہا۔ ''چھوڑ ان کی بات... انہوں نے تو بہت کچھ کہا تھا اور پھر مجھ سے سنا بھی۔ اس کو دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے بتا دیا ہے کہ پولیس آئی تھی روزینہ کا بیان لینے۔ دوبارہ آئے گی تو میں آپ کی طرف بھیج دوں گا۔ اپنا بیان میں نے ریکارڈ کرا دیا ہے۔''

ریشم نے چائے بنا کے اسے دی۔ ''روزینہ کا بیان کیا ہو گا؟''

''وہ اپنا بُرا بھلا خود سمجھتی ہے۔ یہاں ہوتی تو میں اپنی مرضی سے اس کا بیان ریکارڈ نہیں کرا سکتا تھا۔ وہاں پیر صاحب ایسا کر سکتے ہیں تو کریں۔ یہ کیس ان کی طرف سے ان کا وکیل لڑے گا۔ میری حیثیت ایک گواہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ پوچھا جائے گا کہ روزینہ اس دن تمہارے گھر میں تھی تو میں کہہ دوں گا کہ ہاں تھی اور ثبوت کے طور پر نکاح نامہ سامنے رکھ دوں گا۔ گواہ کے طور پر تجھے پیش کر دوں گا... ہمارا کام ختم... عدالت جانے اور وہ جانیں۔''

ریشم نے ایک وقفے کے بعد سوال کیا۔ ''روزینہ رخصت ہو کے یہاں کب آئے گی؟''

''جب اس کی اور ماں باپ کی مرضی ہو گی۔''

''نکاح تو ابھی ہوا نہیں؟'' ریشم نے کہا۔

''پھر وہ بھی ہو جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''اگر وہ یہاں ہو گی، میرا مطلب ہے جب وہ یہاں ہو گی تو کیا تو اس کیس سے اپنی لاتعلقی ایسے برقرار رکھ سکے گا؟''

''تیرا کیا مطلب ہے، روزینہ کے حکم کا غلام بن جاؤں گا میں... مجھے نہیں معلوم کہ مستقبل میں اس رشتے اور ہمارے تعلق کی کیا نوعیت ہو گی۔ ابھی میں طے نہیں کر سکتا کہ جو میں نے کیا... اچھا کیا یا بُرا... میرے سامنے زیادہ

اہم اپنے معاملات ہیں۔ ایک ماں باپ کی ذمے داری ہے۔ اب جائداد ساری میرے نام منتقل ہو گی تو اس کے معاملات بھی ہوں گے۔''

اب مغرب کا وقت ہونے والا تھا۔ ریشم نماز کے بہانے اٹھی اور اندر چلی گئی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ باتوں کا رخ بہت سے دوسرے ایسے ہی سوالوں کی طرف ہو سکتا ہے جس میں اس کا حوالہ بھی آئے گا۔ شاید انور نے ابھی تک اس موضوع سے گریز کیا تھا۔ لیکن وہ مجھ سے بات بھی کرنا چاہتا تھا۔

موقع اسے میں نے فراہم کیا۔ ''ایک بات بتا... تُو نے روزینہ کو قبول کر لیا... کیا اس نے بھی قبول کیا ہے؟''

''ابھی تو کیا ہے... ورنہ دستخط کیوں کرتی۔''

''وہ تو باپ کو قتل کے الزام سے بچانے کے لیے کر دیے... مگر کیا وہ شادی کر کے یہاں آ جائے گی اور تیرے ساتھ خوش رہے گی؟''

''خوش رہنا نہ رہنا اس کے اختیار میں ہے... یہاں نہ آنا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ کوئی تیسرا راستہ بھی تو اختیار کر سکتی ہے۔''

''ہاں، وہ خودکشی کر سکتی ہے۔'' انور بولا۔

میں نے کھل کے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ''دنیا چھوڑ کر جانے کے بجائے اس کے پاس بغاوت کا تیسرا راستہ بھی ہے جو وہ اختیار کرنا چاہتی تھی... لیکن کر نہ سکی۔''

''کسی اور مراد کا اب اس کے خیال میں بھی گزر ممکن نہیں۔ وہ جو بے وقوفی میں مارا گیا، اس کے ماموں کا بیٹا تھا۔ باہر کے کسی عاشق جانباز کا سایہ بھی حویلی پر نہیں پڑ سکتا۔''

میں نے کہا۔ ''انور! میرا اس خاندان کے رسم و رواج اور ان کی سوچ سے کوئی تعلق نہیں... تیرے میرے درمیان کوئی رشتہ ہے تو صرف دوستی کا... دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا... خلوص نہ ہوتا تو میری یہاں کیا ضرورت اور اہمیت ہوتی۔ میں تجھ سے صاف بات کروں گا۔ شاید تجھے بری لگے گی مگر میں مصلحت اور منافقت کا فرق جانتا ہوں۔''

وہ میری صورت دیکھتا رہا۔ ''میں جانتا ہوں تو کیا کہے گا... تو کہے گا کہ روزینہ کے انکار سے پہلے تو انکار کر دے۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ انکار کر چکی ہے اور یہ بات تیرے علاوہ دوسرے بھی جانتے ہیں لیکن سب نے مل کر اسے اقرار پر مجبور کر دیا ہے۔ ابھی اس کے لیے کوئی چوائس نہیں۔ سب دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔ وہ یقیناً جانتی ہو گی کہ مراد کے ساتھ وہ جس راستے پر جا رہی تھی، اس کا انجام کیا تھا۔ یہ خاندان رسوائی افورڈ نہیں کر سکتا۔''

''یہ سب میں نے بھی سوچا تھا۔ بہت غور کیا تھا اس مسئلے پر۔ پھر یہ سوچا کہ نوجوانی میں ایک جذباتی غلطی سب ہی کرتے ہیں۔ خود میں باہر رہ کے کیا کرتا رہا، میں جانتا ہوں۔ مجھے اس کو ایک موقع ضرور دینا چاہیے۔ اگر وہ راضی ہے۔''

''وہ راضی نہیں... مجبور تھی۔''

''ہو گی... مگر زندگی کے حادثات کو بھلانے میں وقت لگتا ہے۔ اگر پہلی غلطی معاف کر دی جائے تو آدمی سنبھل سکتا ہے۔''

''بات غلط نہیں مگر ہم مرد اتنے فراخ دل کہاں ہوتے ہیں انور کہ عورت کی غلطی کو معاف کر دیں۔ تجھے خود پر بھروسا ہے تو اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو... اور تم دونوں کی زندگی پر ماضی کے آسیب کا سایہ تک نہ پڑے۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اندھیرا ہوتے ہی مچھر آ گئے ہیں۔''

میں اس بحث کو آگے لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ انور کے اعصاب کتنے کشیدہ ہیں۔ ایسے میں اگر میں روزینہ کے اور اس کے مستقبل کے بارے میں اندیشوں کا اور خدشات کا اظہار کرتا اور دلائل سے ثابت کرتا کہ یہ شادی ایک بہت بڑا جوا ہے، جواری خود سب کچھ داؤ پر لگا دے تو اسے کون روکے۔

میں رات تک سوچتا رہا کہ کیا انور سے کھل کے بات کروں اور اسے کہوں کہ وہ روزینہ سے شادی نہ کرے۔ یہ کاغذ کا پرزہ جو نکاح نامہ ہے، کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ شاید اس کے عدالت میں پیش ہونے سے قبل ہی مصالحت کر لی جائے یا کرا دی جائے پھر وہ اسے پھاڑ کر پھینک دے اور بہتر ہو گا کہ ابھی وہ روزینہ کو لانے کا معاملہ ٹالے... وہ لڑکی ذات ہے... کمزور اور بے بس ہے... اگر اسے آنا پڑا تو اس سے دونوں کی زندگی تباہ ہو گی۔ نفرت کی ایک خلیج دونوں کے درمیان حائل رہے گی جسے پاٹنا کسی کے بھی اختیار میں نہ ہو گا۔

اگلے دن وہی پولیس افسر پھر نمودار ہو گیا جو روزینہ کا بیان لینا چاہتا تھا۔ انور کی اس سے جھڑپ ہوئی۔ ''میں نے کہا تھا کہ آپ بتا کے آئیں۔''

''معاف کیجیے انور صاحب! اپنی پروفیشنل ڈیوٹی کے لیے میں کسی کی اجازت کا پابند نہیں۔ کیا میں بیان لینے کے لیے زیرِ تفتیش افراد سے اپائنٹ منٹ لوں؟ کوئی مجرم دے

گا مجھے اپائنٹ منٹ...؟"

"آپ اسے ملزم بھی نہیں کہہ سکتے... ملزم اگر ہے تو اس کا باپ... وہ بھی مجرم نہیں ہے... صرف گواہ ہے۔"

"میں اسے وجۂ قتل سمجھتا ہوں۔ فردِ جرم کے لیے ہمیں لاش کے بعد آلۂ قتل اور وجۂ قتل کی ضرورت ہوتی ہے۔ آلۂ قتل ہم بعد میں برآمد کرلیں گے... ایف آئی آر میں۔"

انور نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ سب مجھے نہ بتائیں... وہ یہاں نہیں ہے... باپ کے گھر چلی گئی ہے۔"

ڈی ایس پی نے جو سوال کیا وہ احمقانہ تھا۔ "کیوں؟"

انور بھڑک اٹھا۔ "کیوں؟ کیا بیٹیاں باپ کے گھر نہیں جاتیں؟ تمہاری بیوی کبھی نہیں گئی۔ کیا فرق پڑے گا اگر میں کہوں کہ وہ لڑ کے چلی گئی ہے یا میں نے اسے نکال دیا ہے۔ آپ جائیں وہاں اگر بیان لینا ہے۔"

ڈی ایس پی بڑی عجلت میں "سوری" کہہ کر رفو چکر ہوگیا۔ اس کے جاتے ہی وہ وکیل آگیا جس سے میری ایک ملاقات پہلے بھی ہو چکی تھی۔ جائداد کی تقسیم کے ایک فارمولے پر عمل درآمد کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ حالات بدل گئے۔ اس نے وہ تمام اسٹامپ پیپرز اور بیانِ حلفی وغیرہ انور کو واپس کر دیے جو عدالت میں پیش کرنے کے لیے تیار کیے گئے تھے لیکن ابھی عدالت میں پیش نہیں ہوئے تھے۔ اب کسی قانونی کارروائی کی ضرورت نہ رہی تھی۔ چودھری صاحب کا انور ایک ہی وارث تھا۔ ان کے بعد وہ رسمی کارروائی کے بعد ازخود تمام جائداد کا مالک بن جاتا۔ پولیس، وکیل کے سامنے میری موجودگی قطعی غیر ضروری تھی لیکن انور سے زیادہ بڑے چودھری نے اصرار کیا کہ میں موجود رہوں۔ ان کی ذہنی عدم توازن کی کیفیت میں کچھ بہتری آئی تھی۔ اس میں کچھ ڈاکٹر جلالی کی چارہ گری شامل تھی لیکن زیادہ کرشمہ سازی وقت کی تھی جو گزرتا ہے تو ہر صدمے کا اثر کم کرتا جاتا ہے۔ جیسے جیسے صبر آتا ہے، سب نارمل ہونے لگتا ہے۔

وکیل کے جانے کے بعد چودھری صاحب پر ڈپریشن کا ایک اور شدید حملہ ہوا۔ یہ فطری بات تھی۔ دوپہر کا کھانا سب نے الگ الگ کھایا۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا مگر سلونی کے ساتھ ریشم آکے بیٹھ گئی۔

"آج تو بہت مصروف نظر آرہے تھے تم۔" ریشم بولی۔

"ہاں، صرف نظر آرہا تھا۔ ورنہ میری کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ اس وقت تشریف آوری کا مقصد؟"

"میں نے سلونی کو بتایا کہ تم یہاں نہیں رہو گے۔"

"بہت اچھا کیا۔ باقی سب کو بھی یہ اطلاع کر دو۔" میں نے خفگی سے کہا۔

اب سلونی نے لب کشائی کی۔ "دراصل... آپ سے پہلے میں نے یہ طے کرلیا تھا کہ موقع ملے تو مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"اس اطلاع پر مجھے کیا کرنا چاہیے... حیرانی کا اظہار... خوشی کا یا افسوس کا؟"

"میرا مقصد مشورہ کرنا تھا۔ اس فیملی کے ساتھ میں بارہ سال سے ہوں اور میری حیثیت دوسرے ملازموں سے بہتر رہی ہے۔ عزت کی بات میں نہیں کرتی۔ وہ شاید کسی کی نظر میں کسی کی نہیں۔ میری جیسی عورت کی کیا ہوگی۔ جیسے آپ نے سب کا اعتماد حاصل کیا، ایسے ہی بڑے چودھری نے مجھ پر اعتماد کیا اور مجھے کچھ ذمے داریاں دیں۔ اکبر کے دور میں میرے لیے یہاں رہنا مشکل ہوگیا تھا۔ میں چلی گئی۔ انور پھر مجھے لے آیا۔ لیکن آج آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ پھنس گئے ہیں۔ آپ بہت سے معاملات جان گئے ہیں جو دوسرے لوگ نہیں جانتے۔ آپ بہت سے واقعات کے چشم دید گواہ ہیں۔ وہ سب غیر اخلاقی ہی نہیں، غیر قانونی اور مجرمانہ فعل ہیں... اسی لیے جانا چاہتے ہیں آپ..."

"میرے جانے کی وجہ کچھ اور ہے۔ میں یہاں حادثاتی طور پر رک گیا تھا۔ پھر مجھے روک لیا گیا۔ سوچا میں نے کچھ اور تھا کہ نورین کے ساتھ باقی زندگی سکھ چین سے گزاروں گا۔ میں نے یہ مقصد فراموش کر دیا۔ یہ میری غلطی تھی۔ میں واقعی یہاں پھنس گیا تھا۔"

"جتنا آپ نے دیکھا اور جانا ہے، اس سے کہیں زیادہ میں جانتی ہوں اور دیکھ چکی ہوں۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ میری اہمیت ختم ہو رہی ہے۔ حویلی کے اندر حالات بدل چکے ہیں۔ لوگوں کی نظریں بدل گئی ہیں۔ کل کا کچھ پتا نہیں کیا ہو جائے۔ مجھے غیر ضروری سمجھ کے حویلی سے رخصت کر دیا جائے یا خطرناک سمجھ کے دنیا سے... بہت تھک چکی ہوں میں ملک صاحب... میں بھی اب کہیں سیٹل ہونا چاہتی ہوں۔ ایک عام عزت دار عورت کی طرح گھر یلو کے محفوظ ہونا چاہتی ہوں۔ آپ مرد ہیں۔ دنیا میں اکیلے بھی رہ سکتے ہیں۔ عورت اکیلی ہو تو دنیا اس کے لیے جہنم بن جاتی ہے۔ اسے پہلے شوہر کا اور پھر بیٹوں کا تحفظ ملنا چاہیے۔"

"بالکل ٹھیک سوچا ہے تم نے... مگر تم جاؤ گی کہاں؟"

"آپ کو بتایا تھا میں نے... کتنے برسوں سے رنگیلا مجھ سے یک طرفہ اور بے غرض محبت کرتا آیا ہے۔ دیوانہ ہے وہ... ورنہ میرے جیسی عورت سے کون محبت کرسکتا ہے جو محبت کا مطلب ہی نہ جانتی ہو۔ لیکن کچھ عرصہ پہلے میں نے خود ہی اسے کہہ دیا کہ میں شادی کے لیے تیار ہوں۔ مت پوچھیں خوشی سے وہ کتنا پاگل ہو رہا ہے۔ اس نے بھی کافی پیسا جوڑ رکھا تھا۔ خرچ کہاں کرتا اور کس پر کرتا۔ اسی آس میں جی رہا تھا کہ ایک دن اس کا گھر بھی ہوگا۔ وہ میرے ساتھ ہوگا اور ہم اپنے بچوں کے ساتھ... خواب تو ہر عورت کے ہی یہی ہوتے ہیں اور یہ سب مل جائے تو ختم ہو جاتے ہیں۔ اس نے کہا کہ اب وہ اپنا پرانا دو کمرے کا گھر بیچ دے گا اور کسی صاف ستھری آبادی میں کم سے کم پانچ مرلے کا مکان خریدے گا۔ میں نے اسے کہا کہ پیسے کم ہوں تو مجھ سے لے لینا... لیکن اس نے کہا کہ یہ ذمے داری میری ہے۔ وہ پہلے رکشا چلاتا تھا پھر ٹیکسی لے لی... اب وین خرید چکا ہے۔ اچھی آمدنی ہو رہی ہے اس کی تو میں نے ریشم کو بتا دیا کہ میں کسی بھی دن چلی جاؤں گی... انور کو بتا کے۔"

"اور وہ روکے گا نہیں تمہیں؟"

"روکے گا ضرور لیکن ملک صاحب! آپ دیکھیں حویلی میں کیا ہو چکا ہے۔ مجھے سب سے ڈر لگتا ہے۔ شاہینہ سے بھی اور اس کی بہن سے بھی۔ اور اب تو انور سے بھی... میں بڑے چودھری سے بھی اجازت ضرور لوں گی لیکن کسی کے روکنے سے رکوں گی نہیں۔" اس نے خاموش ہو کے ریشم کی طرف دیکھا۔

"مجھے خوشی ہوئی تمہارے فیصلے سے اور میں ہمیشہ تمہاری اچھی زندگی کے لیے دعا کرتا رہوں گا۔ خدا نے ہر کام کے لیے ایک وقت اور ہر وقت کے لیے ایک کام رکھا ہے۔ رنگیلا ہوتا تو میں اسے مبارک باد دیتا۔ بالآخر اس کی محبت جیت گئی۔ میں وعدہ نہیں کرسکتا لیکن کوشش ضرور کروں گا کہ تمہاری شادی میں شرکت کروں۔ مجھ سے رابطہ رکھنا۔"

"بات دراصل یہ ہے۔" ریشم نے کچھ تذبذب کے ساتھ کہا۔ "کل شام کو جب تم نے مجھے بتایا کہ تم نے نکل جانے کا فیصلہ کرلیا ہے اور انور نے تمہیں روکا تو تم بھاگ جاؤ گے کسی کو بتائے بغیر... اس وقت میں بھی تم سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن انور آگیا تھا۔ میں کہنا چاہتی تھی کہ اپنے ساتھ مجھے بھی لے چلو۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "تمہیں لے چلوں؟ آخر

کیوں؟"

وہ کچھ دیر خلا میں دیکھتی رہی۔ "میں انور سے شادی نہیں کرسکتی۔"

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد میں نے کہا۔ "تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں پوری طرح ہوش وحواس میں ہوں سلیم۔ یہ فیصلہ میں نے اچانک جذبات کی رو میں بہہ کے نہیں کیا۔ بہت سوچا میں نے اور اس نتیجے پر پہنچی کہ اب حالات وہ نہیں رہے۔"

"لیکن تم نے انور کی پریشانی دور کرنے کے لیے خود سے ایک سمجھوتا کرلیا تھا۔ تم نے اس کی دوسری بیوی کی حیثیت بھی قبول کرلی تھی۔ یہ محبت کی مجبوری تھی۔ اب ایسی کیا بات ہوگئی؟"

"تم جانتے ہو کہ انور نے مجھ سے کیا وعدے کیے تھے۔ اس کی ہر بات مجھے یاد ہے۔ انور کے لیے میں نے یہ ذلت بھی قبول کرلی تھی۔ شاید آج تک کسی لڑکی نے خود پر جبر کرکے اپنے محبوب کے لیے اتنی بڑی قربانی نہیں دی ہوگی۔ بعد میں بہت کچھ ہوجاتا ہے۔ محبت کی نظر بدل جاتی ہے۔ چاہت کے جذبات کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ کچھ لوگ اپنے جذباتی فیصلے کی غلطی پر پچھتانے لگتے ہیں۔ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں یا تین لفظ بول کے نکال باہر کرتے ہیں۔ یہ سب اس دنیا میں ہوتا آیا ہے۔ میرے ساتھ ہوتا تو میں بھی کیا کرتی؟ اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کے قبول کرتی۔ محبت میں ایسا جوا سب کھیلتے ہیں لیکن ہر جواری ہار کے ڈر سے کھیل نہیں چھوڑتا۔"

"زندگی اسی کا نام ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن انور کا جو روپ اب میرے سامنے آیا ہے، اس نے مجھے ڈرا دیا ہے۔ میں انور کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔" اس کی آواز بھرا گئی پھر وہ رونے لگی۔ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے۔ میں نے اسے رونے دیا۔ سلونی بھی چپ بیٹھی رہی۔ چند منٹ بعد ریشم نے دوپٹے کے پلو سے آنکھوں کو خشک کیا اور میں نے اسے ٹیبل پر سے پانی کا گلاس بھر کے دیا۔

"میں تمہاری پرابلم کو سمجھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کوئی اتنا بے حس، بے رحم اور سنگ دل بھی ہوسکتا ہے۔ انور تو بہت مختلف تھا۔ پڑھا لکھا، ذہین... میں اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتی تھی۔ اس پر اعتبار کرتے ہوئے میں نے اتنی بڑی قربانی دی جو سب کے نزدیک میرا پاگل پن تھی۔"

"ہاں... میں بھی سب کی طرح سوچتا تھا۔"

"میں بھی اسے سمجھا کے ہار گئی تھی۔" سلونی نے کہا۔

وہ پھر رونے لگی۔ "تم جانتے ہو... روزینہ کی بہن نے مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے زہر دیا تھا۔ قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"ہاں، میں نے اسپتال سے رپورٹ لے لی تھی اور ڈاکٹر جلالی کو دکھائی تھی۔ اس نے بتایا کہ تمہیں وہ گولیاں دی گئیں جو گندم کے ذخیرے میں کیڑے مارنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔"

"اور کیسا شرمناک الزام لگایا اس نے مجھ پر... کہ میں اپنا گناہ چھپانا چاہتی تھی۔ انور سب جانتا تھا مگر خاموش رہا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے بھائی کی بیوی پر کیسے الزام لگائے کسی ثبوت کے بغیر... اور میں بھی چپ ہوگئی۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا۔ گزشتہ ایک ہفتے میں... تم نے میں نے اور یہاں سب نے دیکھا... اس نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا۔"

"ریشم! تم اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتی ہو؟ کیا اس نے تمہارے سامنے اعتراف کیا؟"

"اس کے اعتراف کا مشاہدہ تم نے بھی کیا۔ سلونی نے بھی... اور میں نے بھی... ہم سب نے دیکھا کہ کس طرح اس نے اکبر کی لاش قبر سے نکال پھینکی، اس خوف سے کہ وہ قانون کی گرفت سے محفوظ رہے۔ اس کے بعد میں سو نہیں سکی۔ رات کو ڈر کے اٹھ بیٹھتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے انور میرے سرہانے خنجر لیے مجھ پر جھک رہا ہے۔ تم نے، سلونی نے اور میں نے سب نے اپنی زبان بند رکھی، اپنی آنکھوں سے سب دیکھ لینے کے باوجود... جب وہ میرے سامنے آتا ہے تو مجھے اس کے ہاتھ خون میں بھرے نظر آتے ہیں، وہ مجھے انسان نہیں... آدم خور بھیڑیا لگتا ہے انسان کے روپ میں... اللہ نے بچایا مجھے۔ یہ سب جان لینے کے بعد کیا میں اس سے شادی کرسکتی ہوں؟"

اب وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی اور بولتی جارہی تھی۔ احساسِ ذلت اور شکست اس کے دکھ میں اضافہ کررہا تھا۔ اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے کا غم اس کے لیے ایک جان لیوا روگ بن گیا تھا۔ میں ڈر رہا تھا کہ انور ادھر نہ آنکلے یا کوئی اور یہ باتیں نہ سن لے۔ لیکن سب خیریت رہی۔ آہستہ آہستہ میں نے ریشم کے ہسٹریا کو بھی کنٹرول کرلیا۔

اس کے خاموش اور پُرسکون ہوجانے کے بعد میں نے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں سلونی کے ساتھ ہی نکل جانا چاہیے جتنی جلدی ہو... تمہاری ذہنی حالت ایسی ہے کہ تم

یہاں رہوگی تو پاگل ہوجاؤ گی۔"

"مگر سلونی کے ساتھ؟" اس نے نظر اٹھا کے مجھے دیکھا۔

"ہاں، سلونی تمہاری مدد کرے گی۔ رنگیلا بھی اچھا آدمی ہے۔ یہاں تمہارا کیا ہے، ایک کچا مکان اور تھوڑی سی زمین۔"

"سلیم! میں تمہارے آسرے پر نکلی تھی۔ ہم اکبر کے ہاتھوں گرفتار نہ ہوتے تو نہ جانے کہاں ہوتے۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ تم جہاں بھی جاؤ گے، میں تمہارا ساتھ دوں گی۔ اگر نورین مل جائے گی تو تم بھی اپنا گھر بساؤ گے۔ مجھے اعتماد ہے تم پر... تم میرے لیے بھی سوچو گے... مجھے بھی اپنی ذمے داری سمجھو گے... میرا گھر بھی بسا دو گے۔"

"ریشم... ریشم... مجھے سوچنے کی مہلت دو۔ میری تو کوئی منزل ہی نہیں ہے ابھی۔" میں نے کہا۔

"تم انکار کررہے ہو؟"

"نہیں، تم یوں کرو ابھی تم سلونی کے ساتھ نکل جاؤ۔ میرا ابھی کچھ پتا نہیں کتنے دن لگ جائیں۔ لیکن میں آؤں گا تمہارے پاس... میں رنگیلا اور سلونی کا پتا سمجھ لوں گا۔ یہ کسی اور کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے نہیں معلوم سلونی کا پروگرام کیا ہے... وہ کب جائے گی۔"

"بس آج کل میں... ایک دو دن۔" وہ بولی۔

"اچھا اب تم جاؤ۔ غنیمت ہے کہ کوئی ادھر نہیں آیا۔ ورنہ نہ جانے کیا سمجھتا۔" میں نے کہا۔ "جاؤ، خود کو ٹھیک کرو... شک نہ ہو کسی کو۔"

سلونی اٹھی۔ "شک کون کرے گا۔ یہاں تو سب ہی بڑے دکھی اور غم زدہ نظر آتے ہیں۔"

انور آدھے گھنٹے بعد نمودار ہوا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ سلونی اور ریشم مجھ سے باتیں کررہی ہیں مگر باتوں کی نوعیت کا اسے کیا اندازہ ہوسکتا تھا۔ وہ مجھے بتانے لگا کہ روزینہ کا بیان لینے والا پولیس افسر پیر صاحب کے ڈیرے پر گیا تھا تو وہاں زیادہ ذلیل ہوا۔ پیر صاحب نے کسی افسرِ اعلیٰ سے اس کی شکایت کی اور فون آگیا کہ وہ فرض شناسی میں حد سے نہ بڑھے ورنہ اس کی معطلی نہ سہی تبدیلی ضرور کر دی جائے گی۔ انور یہ قصہ سنا کے بہت محظوظ ہوا۔

حیرت انگیز طور پر اس رات کھانے کی میز پر سب نے نارمل نظر آنے کی کوشش کی۔ حویلی میں ہونے والے حادثے کا اثر اب صرف بڑے چودھری صاحب پر تھا یا مرنے والے کی ماں پر... باقی سب اس کوشش میں شریک تھے کہ خدا کی مرضی کے آگے فوراً سر جھکا دیں اور بلا تاخیر صبرِ جمیل کا مظاہرہ کریں۔ سوئم کے بعد دسواں اور پھر چہلم ہوگا تو مرنے والے کی مغفرت کی دعاؤں میں وہ پیش پیش رہیں گے لیکن زندگی رکتی تو نہیں۔

ایک احتجاج کا باغیانہ انداز مجھے شاہینہ بھابی کے رویّے میں نظر آیا تھا۔ عدت کے زمانے میں نامحرم کے سامنے نہ آنے پر اس کی انور سے جھڑپ ہوچکی تھی اور اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ ملک سلیم اختر اگر غیر ہے تو اسے باہر نکالو۔ مجھے کیوں بند کرتے ہو۔ اس لیے روایتی انداز میں بیواؤں جیسے سوگ والے سفید کپڑے نہیں پہنے تھے اور اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں بھی نہیں توڑی تھیں۔

اسے میں نے کھانے کی میز پر دیکھا تو وہ بہت پُراعتماد لگ رہی تھی اور سنجیدہ تھی لیکن گفتگو میں شریک رہی۔ کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ سب کی نظر بچا کے وہ مجھے دیکھتی ہے تو اس کی آنکھوں میں میرے لیے کوئی پیغام ہوتا ہے جو میں سمجھنے سے قاصر رہا۔ وہ ایک سازشی اور خطرناک عورت تھی۔ اس کے مجرمانہ عزائم کا نشانہ صرف ریشم ہی نہیں بنی تھی، نادانستگی میں ایک بار میں بھی اس کے پھیلائے ہوئے نظر نہ آنے والے جال میں گرفتار ہوگیا تھا۔ قصوروار میں خود ہی تھا۔ میں نے مان لیا تھا کہ حویلی میں اس کے مرتبے اور مقام کی حامل عورت ایسا کرہی نہیں سکتی۔ تجربے نے مجھے سمجھا دیا کہ عورت ہو یا مرد... اس کی فطرت نہ ماحول بدل سکتا ہے اور نہ تعلیم وتربیت... نہ خاندانی حسب نسب اور نہ اچھی صحبت۔

میرے دل میں ایک ڈر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ عورت بظاہر بے ضرر باحیا اور فرشتہ سیرت نظر آتی تھی لیکن باطن میں وہ اس کے برعکس تھی۔ اس کی شخصیت کے اس تضاد کو وہی جان سکتے تھے جو اس کی محبت یا نفرت کا شکار ہوں۔ اس کی زندہ مثال ریشم تھی اور میں تھا۔ میں نے بہت بڑی قیمت ادا کرکے یہ معلوم کرلیا تھا کہ اس نے ریشم کو زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس فائل میں جو اب بھی میرے پاس تھی، یہ نہیں لکھا ہوا تھا کہ زہر دینے والی شاہینہ تھی۔ میں سچ جان لینے کے باوجود اس کا نام لینے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔

میں کھانا ختم کرنے کے بعد اپنے اندیشوں کی وجہ سے کچھ خاموش تھا۔ اچانک انور نے کہا۔ "تو کس سوچ میں گم ہے؟"

میں چونکا۔ "نہیں، کوئی خاص بات نہیں۔"

''بہت دیر سے میں دیکھ رہا ہوں کھانے کے دوران بھی تو خاموش تھا... چل اٹھ میرے ساتھ چل۔''

''کہاں؟'' میں نے کہا۔

''ابھی میں نے کہا تھا کہ اباجی بلا رہے ہیں مجھے اور تجھے بھی... تو نے سنا نہیں تھا؟'' انور حیرانی سے بولا۔

تب میں نے دیکھا کہ واقعی کچھ دیر کے لیے میں کتنا بے خبر ہو گیا تھا۔ کھانا ختم ہو چکا تھا اور سب لوگ جا چکے تھے۔ ملازم منتظر تھا کہ ہم اٹھیں تو وہ میز صاف کریں۔ میں وضاحت کیے بغیر انور کے ساتھ چل پڑا۔ رات کے دس بجے کے بعد بڑے چودھری صاحب کے آرام کا وقت ہوتا تھا۔ انہیں نیند آئے نہ آئے... ان کے کمرے میں سوائے ڈاکٹر جلالی کے اور کسی کو باریاب ہونے کی اجازت نہ تھی۔

وہ اپنے بیڈ پر نیم دراز تھے اور ان کی حالت میں کچھ افاقہ محسوس ہوتا تھا۔ اخلاقاً میں نے طبیعت کا حال پوچھا اور انہوں نے رسماً کہا کہ شکر ہے اللہ کا گزر رہی ہے۔ ہم ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے۔ یہاں آتے ہوئے انور نے کسی خادمہ سے کہہ دیا تھا کہ کافی لے آئے۔ شاید وہ جانتا تھا کہ اس وقت کی طلبی بے سبب نہیں ہو سکتی اور بات اہم ہوگی تو لمبی ہوگی۔

بہت جلد ایسا ہی ہوا۔ چودھری نے کہا۔ ''ملک! تجھے تو سب معلوم ہو گیا ہے ہمارے بارے میں... کچھ اپنے بارے میں بتا؟''

میں اس غیر متوقع سوال سے حیران ہوا۔ ''آپ تو جانتے ہیں چودھری صاحب... لاوارث ہوں میں... ادھر سے گزر رہا تھا اپنی بیوی کے ساتھ کہ حادثہ ہو گیا۔ خدا نے مجھے بچا لیا... بیوی کا کچھ پتا نہیں۔''

''پھر بھی... تیرا کوئی گاؤں شہر ہوگا... گھر ہوگا اور ماں باپ ہوں گے؟''

میں حیران تھا کہ آج اچانک چودھری کو میرے بارے میں ان معلومات کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ میں نے انور کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ''اباجی نے مجھ سے پوچھا تھا۔ میں نے کہا کہ وہ خود بتا سکتا ہے آپ کو۔''

مجھے ایک دم فیصلہ کرنا پڑا کہ میں اپنی داستانِ حیات کو کیسے ایڈٹ کر کے سناؤں۔ اس میں کتنا سچ رکھوں اور کتنا جھوٹ شامل کروں۔ آج میں وہ نہیں تھا جو اصل میں تھا۔ فریدالدین سے میں خاور بنا تھا اور اب ملک سلیم اختر ہو گیا تھا۔ یہ کہانی بہت لمبی تھی جو میں پوری سناتا تو صبح ہو جاتی۔ اسے دہرانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ''میں آپ کو مختصراً بتاتا ہوں۔ اپنے والدین کے بارے میں مجھے کچھ یاد نہیں... میں بہت چھوٹا تھا جب وہ مر گئے تھے۔''

''کرتا کیا تھا تیرا باپ... رہتے کہاں تھے وہ؟''

''میری پرورش بڑے بھائی نے کی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ میرے والد کسی اسکول میں ٹیچر تھے۔ راولپنڈی سے آگے فتح جنگ کی طرف کوئی گاؤں تھا۔ والد پنڈی آ گئے تھے۔ باقی خاندان والوں سے تعلق نہیں رہا تھا۔ وجہ مجھے معلوم نہیں۔ تقسیم کے وقت وہ پنڈی کے کسی محلے میں تھے اور کسی مڈل اسکول میں پڑھاتے تھے۔ وہاں سکھ بھی کافی تھے۔ انہی کے ہاتھوں میرے والدین قتل ہوئے تھے۔ بڑے بھائی نے میٹرک کر لیا تھا۔ وہ کام کرتا رہا اور پڑھتا رہا۔ میں اس سے بیس سال چھوٹا تھا۔ میری پرورش اسی نے کی۔ اسے بینک میں نوکری مل گئی تھی ہم لاہور آ گئے تھے۔ وہاں اس نے شادی کر لی لیکن بچے نہیں ہوئے۔ وہ بینک میں کیشیئر ہو گیا تھا۔ ایک دن بینک سے کیش لے کر آ رہا تھا کہ ڈاکوؤں نے اسے لوٹ لیا۔ وہ پیسا ایک بڑے بدنام اسمگلر نادر شاہ کا تھا۔ اس نے میرے بھائی پر یقین نہیں کیا اور مار دیا۔ میں اکیلا رہ گیا۔ میں نے کسی نہ کسی طرح ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ایک بے وقوفی کی۔ مجھ پر اپنے بھائی کے قاتل سے انتقام لینے کا بھوت سوار ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ مجھے جان بچا کے بیوی کے ساتھ بھاگنا پڑا۔ یہاں نہر کے پل پر ویگن حادثے کا شکار ہو گئی۔ اس کے بعد سے میں یہاں ہوں... بیوی کا کچھ پتا نہیں۔''

اس کہانی میں جھوٹ وہی تھا جو ''دروغ مصلحت آمیز'' کہلاتا ہے اور جس کا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا یا ناجائز فائدہ حاصل کرنا نہیں بلکہ دفاعی ہوتا ہے یا اجتماعی فلاح... اس کے سوا کہ نورین میری بیوی تھی اس میں اور کچھ جھوٹ نہیں تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ شاید میں نے نادر شاہ کا نام لے کر غلطی کی تھی لیکن اس سے بڑی غلطی میں پہلے بھی اعتبار میں کر چکا تھا۔ میں نے انور کو سب بتا دیا تھا۔ اس وقت جب میں اور وہ ایک ہی قید خانے کے اسیر تھے۔ پھر میں نے ریشم پر اعتماد کیا تھا۔ آج بھی مجھے یہ خطرہ نہیں تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے یا بلیک میل کر سکتا ہے۔

چودھری صاحب نے حقے کے چند کش لیے پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''چل یہ بھی اچھا ہوا جو ادھر آ گیا تو... سب قسمت کے کھیل ہیں ورنہ کہیں اور ڈوب کے مر جاتا اور پتا بھی نہ چلتا تیرا... بیوی کی طرح۔''

''مجھے یقین ہے چودھری صاحب کہ وہ زندہ ہوگی۔''

چودھری نے مجھے پُرتمسخر نظروں سے دیکھا۔ ''زندہ ہوتی تو تجھے تلاش کرتی یہاں نہ آ جاتی؟''

''یہ کام میں بھی کر سکتا تھا مگر ابھی تک نہیں کیا۔ کیا پتا اس کے حالات کیا ہوں گے جو اس کے پیروں کی زنجیر بنے ہوئے ہیں۔''

چودھری نے سر ہلایا۔ ''مجھے پتا چلا تھا کہ تو اس کو تلاش کرنے کے لیے جانے کا سوچ رہا ہے۔''

''بالکل ٹھیک سنا تھا آپ نے... پہلے ہی بہت دیر کی میں نے۔''

''مگر تو جائے گا کہاں؟''

میں نے تفصیل میں جانے سے گریز کیا۔ ''اسی نہر میں گری تھی وہ تو دیکھوں گا نہر کے آس پاس... لوگوں سے پوچھوں گا۔''

''اس کے لیے تجھے خوار ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کام تو انور خود بھی کر سکتا ہے۔ ورنہ اس کے بندے ہر گھر میں تلاشی لے سکتے ہیں اور دو دن میں پتا لگا سکتے ہیں۔''

چودھری کی دلیل کا ویسے تو میرے پاس جواب نہ تھا۔ جب تک کہ میں اسے فاطمہ اور ساون کے بارے میں تفصیل سے نہ بتاتا۔ ''میں یہ کام خود کرنا چاہتا ہوں چودھری صاحب۔''

وہ کچھ دیر سوچتے رہے۔ ''دیکھ ملک! جب تُو آیا تو کسی کو تیرے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ جو یہاں رہتے ہیں ایک دوسرے کے دادا پردادا تک سب کو جانتے ہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اپنے گھر میں کوئی بھی کسی اجنبی کو جگہ نہیں دیتا اور نہ عزت دیتا ہے۔ پہلے سب شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ زمانہ ہی ایسا ہے کہ بندے کی شناخت کوئی نہیں رہی۔ شناختی کارڈ سے نہ حسب نسب کا پتا چلتا ہے نہ کسب کا اور کوئی بھی شکل دیکھ کے کسی پر اعتبار نہیں کرتا۔ تیرے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں ہوا پہلے... بلکہ برا سلوک ہوا۔''

''لیکن مجھے اس کا کوئی گلہ نہیں۔''

وہ اپنی دھن میں بولتے رہے۔ ''لیکن ساتھ رہ کے آہستہ آہستہ تو نے بھی خود کو منوا لیا۔ ساری عمر جھک مار کے اب سمجھ آئی ہے کہ یہ جو شرافت ہوتی ہے اور عقل اس کا ذات سے کوئی تعلق نہیں۔''

میں نے ہمت سے کام لیا۔ ''لیکن ذات برادری اور حسب نسب کے فرق کو ہم مانتے ہیں۔''

چودھری کا چہرہ غصے سے مکدر ہوا لیکن پھر مجھے اندازہ ہو گیا کہ انور کے اشارے پر انہوں نے برہمی کا اظہار نہیں کیا۔ ''دیکھ ملک! فرق تو اللہ نے رکھا ہے۔ بندے کی شکل صورت رنگ اور فطرت الگ بنائی ہے۔ یہ فرق دنیا میں ہے۔ گورے کیسی نفرت رکھتے ہیں کالوں سے... میں اپنی زندگی کے تجربے کی بات کر رہا تھا۔ ادھر ایک میراثی تھا جو ڈھول بجاتا پھرتا تھا۔ اس کا بیٹا پڑھ لکھ کر وکیل بنا اور میں تو خدا کی قدرت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ شہر کی بڑی عدالت میں ہمارا کیس لگا ہوا تھا۔ اس میں مدعی ہم نہیں تھے۔ وہ میراثی کا لڑکا مدعی کا وکیل بن کے اتنی بڑی گاڑی سے اترا۔ میں کیسے پہچانتا اسے... وہ خود آیا میرے پاس اور مجھ سے ملا۔ بعد میں ایک دن اپنے باپ کو بھی لایا تھا۔ ادھر ایک کمہار کا پتر تھا... آواز اچھی تھی... مسجد میں بانگ دیتا تھا... ابھی امریکا میں بیٹھا ہے اور اس کے ماں پیو بھی۔''

میں نے کہا۔ ''ایسی ہزاروں نہیں لاکھوں مثالیں ملیں گی آپ کو۔''

گفتگو کو پھر ٹریک پر لانے کے لیے انور نے پھر کوئی اشارہ کیا ہوگا کہ چودھری نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ''تو خیر سے ملک ہے... اور باپ بھی تیرا تھا عزت دار... تیری شرافت بھی ہم نے دیکھ لی اور انور کے ساتھ مل کے تو نے جس طرح معاملات کو سنبھالا... ڈاکٹر جلالی کو بھی تو لایا اور تو نے ہی یہ سارا بندوبست کیا۔'' انہوں نے اپنے کمرے پر ایک نظر ڈالی۔

انور نے کہا۔ ''یہ واقعی میرے بس کی بات نہیں تھی۔''

اب ہم کافی بھی پی چکے تھے اور کسی حد تک مجھے اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ گفتگو کس رخ پر جا رہی ہے۔ ''آپ کی بڑائی ہے کہ ایسا سمجھتے ہیں آپ۔''

''سیانا بندہ سیانا (پہچانا) جاتا ہے... آہستہ آہستہ تُو نے خود عزت حاصل کر لی سب کی نظر میں... انور تو خیر مرید ہے تیرا... لیکن ادھر سب کو تیری شرافت نے متاثر کیا۔ تیری گھر کے ایک بندے جیسی حیثیت نہ ہوتی تو کیا ہم تجھے انور کے نکاح میں شریک کرتے؟''

میں کہتے کہتے رہ گیا کہ وہ نکاح کہاں تھا۔ انور نے میری طرف ممنونیت کے ساتھ دیکھا لیکن میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔ ''آپ کے بڑے بھائی صاحب نے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا میرے ساتھ۔''

''اوئے غلط فہمی میں غلطی بھی ہو جاتی ہے بندے

ہے۔ وہ تجھے ٹھیک سے جانتا نہیں تھا۔ پھر اس نے دیکھا اور ہم نے بھی کہا تو اس کو اندازہ ہو گیا کہ منڈا چنگا ہے۔'' وہ کچھ مسکرائے۔ ''اکبر کے ساتھ تیری بنی نہیں۔ اس کو موقع نہیں ملا تجھے سمجھنے کا لیکن انور تو مرید ہو گیا ہے تیرا... اور اکبر کی بیوی... شودی اس عمر میں بیوہ ہو گئی۔ اس نے بھی کہا مجھ سے کہ بندہ پڑھا لکھا اور سمجھ دار ہے ورنہ پڑھے لکھے بے وقوف بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ تمام معاملات کو سمجھتا ہے... اس کو جانے نہ دیں۔''

میں چونکا۔ ''جانے نہ دیں... یہ شا... بڑی بھابی نے کہا؟''

چودھری نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''اسی لیے میں نے سوچا کہ تجھے سمجھاؤں کہ تو نے اپنی حیثیت بنالی ہے۔''

میں نے تلخی سے کہا۔ ''ایک چشم دید گواہ سے زیادہ کیا حیثیت ہے میری؟''

چودھری اس ردِعمل کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ ''یہ بات نہیں ہے پتر! میں بتارہا ہوں تجھے کہ اب تو اس فیملی کا ایک ممبر ہے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''خالص خاندانی خون میں باہر کا خون کیسے شامل ہو سکتا ہے چودھری صاحب... ضرورت پڑنے پر تو لوگ گدھے کو بھی باپ بنالیتے ہیں۔''

یہ بہت سخت بات تھی جس کا ردِعمل پہلے انور کی طرف سے آیا۔ ''سلیم! کچھ اباجی کا خیال کر... انہوں نے پتر کہا ابھی تجھے... ہم کیا صرف اپنے مفاد کی بات کر رہے ہیں یہاں؟ خود تجھے ایک شناخت اور ایک معتبر حوالہ اس خاندان سے تعلق کی بنا پر حاصل ہو گا۔ تجھے زمانے بھر میں بھٹکنا اچھا لگتا ہے تو جا... تو چشم دید گواہ نہیں ہو گا تو ہم پھانسی نہیں چڑھ جائیں گے۔''

اب چودھری صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے انور کو روکا۔ ''اوئے پتر... گرمی کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ انکار تو نہیں کر رہا ہے۔ اتنی عقل ہے اس میں بھی کہ اپنا بُرا بھلا سوچ سکے۔ ہم نے ایسا نہیں کہا کہ ملک کو ہماری ضرورت ہے... ضرورت مند ہم ہیں... ساتھ رہنے میں دونوں کا فائدہ ہے۔''

میں نے اسی وقت وہ سب کہہ دینا بہتر جانا جو میرے دل میں تھا۔ ''میں اپنا احسان نہیں جتا رہا... لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے انور کا ساتھ بُرے وقت میں بھی دیا۔ خطرناک حالات میں بھی جب میری جان جا سکتی تھی... لیکن اس کا صلہ مجھے کیا ملا؟ آج میں ایک قیدی ہوں۔ گارڈ مجھے روک دیتا ہے کہ آپ باہر نہیں جا سکتے۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ مجھے عدالت میں پیش ہونے تک تہ خانے میں قید رکھا جائے گا۔''

''کس سے سنا ہے؟ یہ کون بکواس کرتا ہے؟'' چودھری کی آواز میں برہمی آگئی۔ ''اور تو نے ایسا سمجھا ہے تو غلط ہے۔ ہم تیری حفاظت کے خیال سے یہ نہیں چاہتے کہ تو اکیلا کہیں آئے جائے۔ دشمن پہلے ہی ہیں... یہ نئے دشمن بہت ڈاڈے ہیں... خود انور جاتا ہے کہیں گارڈ کے بغیر... تو بھی جدھر دل کرتا ہے جا... لیکن تیری حفاظت بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی انور کی... میری یا گھر کے کسی اور بندے کی۔''

''آئی ایم سوری چودھری صاحب... آپ میری منزل کھوٹی نہ کریں۔ میں اور نورین اپنا گھر اور اپنا مستقبل خود بنانا چاہتے تھے۔ اپنی ایک دنیا خود آباد کرنا چاہتے تھے۔ عزت، دولت، شہرت... یہ سب حاصل کرنا میرا بھی مقصدِ حیات تھا لیکن کسی کا سہارا لے کر نہیں... کسی کی سفارش سے... کسی کا حق مار کے یا فراڈ کر کے نہیں۔''

''دیکھ... تو کتابی باتیں کر رہا ہے۔ جذباتی ہو رہا ہے۔ یہ دنیا ایسے ہی چل رہی ہے۔ جوانی میں آدمی سوچتا بھی ہے کہ وہ تیر چلا کے آسمان میں سوراخ کر دے گا... لیکن اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن یہاں میرا کسی چیز پر کوئی حق نہیں... قانونی اور نہ اخلاقی... میں تو لاٹری یا جوئے پر بھی یقین نہیں رکھتا... میں دولت بھی کماؤں گا تو محنت سے۔''

''چل جیسی تیری مرضی... دنیا میں جائے گا تو پتا چل جائے گا کہ محنت بھی جوا ہے۔ جو محنت کرتے ہیں سب کو ایک جیسی کامیابی نہیں ملتی۔ اکثر ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں۔ کاروبار ایک جوا ہے۔ شادی ایک جوا ہے۔ کامیابی کی کوئی گارنٹی نہیں... اور بچہ جب پیدا ہوتا ہے تب سے زندگی کا جوا کھیلتا ہے۔ وہ کہیں بھی ہار سکتا ہے، کبھی بیماری کے ہاتھوں... کبھی کسی حادثے میں، خواہ اسکول جاتے ہوئے سڑک پار کرتے ہوئے پیش آجائے۔ تجھے بہت عجیب لگ رہی ہوں گی میرے منہ سے ایسی باتیں ملک... میں نے کسی کالج یونیورسٹی سے ڈگری نہیں لی لیکن یہ جو عمر ہے نا یہ سب بتا دیتی ہے، سکھا دیتی ہے اور پڑھا دیتی ہے۔ یہ سب سے بڑی یونیورسٹی ہے۔ اس کا پتا چل جائے گا تجھے ہماری عمر کو پہنچ کے... پھر تو مانے گا کہ کتابوں میں صرف

ہیں۔''

میں واقعی دم بخود بیٹھا تھا۔ روایتی وڈیرے کا شعور اور مزاج رکھنے والا چودھری ایک بالکل مختلف زبان بول رہا تھا اور میں اس کی شخصیت کا بالکل نیا روپ دیکھ رہا تھا۔ ''آپ کی باتوں سے مجھے سو فیصد اتفاق ہے۔''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''لیکن... پرنالہ وہیں گرے گا... ٹھیک ہے... تو کچھ دن ٹھہر جا... ابھی انور کو بھی تیری ضرورت ہے اور... ہم سب کو بھی۔ انور بھروسا کرنے لگا ہے تجھ پر... سارے معاملات کو سنبھال رکھا ہے تو نے... یہ حالات بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے... قابو میں آجائیں گے ہمارے...''

''ایک عینی گواہ تو آج مارا گیا۔'' میں نے طنز سے کہا۔

''کچھ دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا... تب تک خیال رکھ اپنا... اور کوئی مسئلہ ہو خرچے ورچے کا تو انور سے کہہ دیا ہے میں نے۔''

میں نے کہا۔ ''خرچ کہاں کروں گا میں... آپ نے بڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے مجھے۔''

''آزمائشیں تو آتی رہتی ہیں زندگی میں... اتنا خودغرض نہیں ہونا چاہیے بندے کو کہ بس اپنی فکر کرے اور کسی کی نہیں۔''

میں سمجھ گیا تھا کہ مجھے روکنے کے لیے زبردستی کے بجائے اب اپنائیت کا جال پھیلایا جا رہا ہے۔ بہتر یہی ہو گا کہ عیاری کا مقابلہ عیاری سے کیا جائے۔ صاف انکار کی صورت میں شاید میری مشکلات میں اضافہ ہو جائے۔ مجھے سچ مچ قید خانے میں ڈال دیا جائے پھر میرے لیے نورین کی تلاش میں نکلنا ممکن نہ رہے... مجھے یہاں روکے رکھنے کا یہ طریقہ آزمانے کا مشورہ صرف انور نے نہیں دیا تھا۔ میری پُرزور وکالت کرنے والوں میں شاہینہ بھی شامل تھی اور یہ انکشاف ہی میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجانے کے لیے کافی تھا۔ میں اس خطرناک عورت کے سائے سے بھی بچنا چاہتا تھا۔ اس کے تیور آج بھی جارحانہ تھے۔ معلوم نہیں عدت کا زمانہ گزارنے تک وہ کیا گل کھلائے اور مجھے کسی نئی مصیبت میں ڈال دے۔

''کس سوچ میں پڑ گیا ملک؟'' چودھری کی آواز آئی۔

میں چونکا۔ ''کچھ نہیں چودھری صاحب! سوچنے کے لیے اب کیا رہ گیا ہے... میں آپ کا حکم کیسے ٹالوں۔''

چودھری کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''مجھے یہی امید تھی تجھ سے... اور ہاں، وہ جو تو پریشان ہے نا اپنی گھر والی کی طرف سے... اس کا بھی کچھ کرتے ہیں... اتنا وقت گزر گیا ہے امید تو نہیں ہے کہ وہ زندہ ہے۔''

''جب تک اس کا ثبوت نہ ملے، میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

''ہاں ہاں... ثبوت بھی مل جائے گا... گواہ بھی... میرے بندے اس علاقے کا چپا چپا چھان ماریں گے... ہر بندے سے پوچھ لیں گے... تو فکر نہ کر۔''

میں نے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں۔''

''ہاں ضرورت تو نہیں... سب سے اچھا تھا کہ تو ادھر حویلی میں ہمارے ساتھ رہتا... وہ لڑکی بھی تو ہے جو تیرے ساتھ جانا چاہتی تھی۔''

''آپ کس کی بات کر رہے ہیں... کون لڑکی؟''

''وہی جو اب حویلی میں ہے... ریشم... اس سے شادی کر لینا۔''

مجھے جیسے چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ لگا۔ میں ایک دم کھڑا ہو گیا۔ ''آپ شاید ہوش میں نہیں ہیں کہ ایسی بات کر رہے ہیں۔''

''اوئے گرمی نہ کھا... بابے رحیم داد کی لڑکی کے اور تیرے بارے میں تو سب ہی جانتے ہیں ادھر... لڑکی اچھی ہے۔''

''چودھری صاحب! وہ بہن کی طرح ہے میرے لیے...'' میں نے چلّا کے کہا۔

''بہن بنا لینے سے کوئی بہن ہو نہیں جاتی۔''

انور نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ ''چھوڑ سلیم! اباجی کی بات کا بُرا مت مان... وہ ہوش میں نہیں ہیں اب... انہیں آرام کی ضرورت ہے۔''

میں نے درشتی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ''مجھے معلوم ہے چودھری صاحب کتنے ہوش میں ہیں۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ ریشم سے تو شادی کرنا چاہتا تھا؟''

چودھری مسکرانے لگا۔ ''چاہتا تھا نا... کی تو نہیں نا... شادی تو اسی سے کی جس سے ہونا تھی... روزینہ سے...''

''کب؟ کس کے سامنے... میرے سامنے تو صرف نکاح نامہ ہی بھرا گیا تھا چودھری صاحب...'' انور نے مجھے زبردستی باہر کھینچ لیا ورنہ میں نہ جانے اور کیا کہتا۔

''پاگل ہو گیا ہے تُو۔'' وہ مجھے میرے کمرے کی طرف کھینچ کر لے گیا۔

''رہنے دے انور... کون پاگل ہے... کس کو پاگل بنایا جارہا ہے، میں سب جانتا ہوں۔ مجھے بتا کہ تیری اس بات کا میں کیا مطلب لوں؟ تو اب ریشم سے شادی نہیں کرے گا؟ تو اب تک اسے بے وقوف بنا رہا تھا اور چودھری صاحب کو بھی... مجھے بھی۔''

''یار ہم صبح بات کریں گے۔''

''اس وقت بات کرنے میں کیا ہے۔ یہ ڈبل گیم میرے ساتھ ہی نہیں، یہاں سب ایک دوسرے کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ تو بھی... شاہینہ بھی... چودھری صاحب بھی... اپنایت کا یہ ڈراما بھی ڈبل گیم ہے۔ اس کا مقصد مجھے کہیں جانے نہ دینا ہے... لیکن انور... اب تو مجھے زنجیریں پہنا کے ڈال دے تہ خانے میں تو مجھے تعجب نہیں ہو گا۔ مجھے صرف اسی طرح روکا جاسکتا ہے اور کسی طریقے سے نہیں۔''

انور مجھے دروازے پر چھوڑ کے چلا گیا۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ بہت ضبط سے کام لے رہا تھا۔ میرا کھرا سچ اتنا کڑوا تھا کہ اس کی تلخی نہ چودھری سے برداشت ہوئی تھی اور نہ انور اسے قبول کر رہا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کے میں نے ایک گلاس پانی حلق میں انڈیلا اور بیڈ پر گر گیا۔ آہستہ آہستہ میرا بلڈ پریشر کم ہونے لگا۔

مجھے احساس ہونے لگا کہ خود پر کنٹرول گنوا کے میں نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا تھا۔ معاملات بڑے سیاسی مصلحت کے ساتھ آگے بڑھے تھے اور دونوں فریق اپنے اپنے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک سمجھوتے کو عملی شکل دے رہے تھے کہ اچانک ہونے والے ایک سوال نے میری عقل کا فیوز اڑا دیا اور میں جذبات کی تاریکی میں ڈوب گیا۔ چودھری کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ ریشم سے شادی کی بات اتنا بڑا دھماکا کرے گی... لیکن دھماکا ہو گیا تھا۔ اس کا نقصان میرے سوا کسی کا نہیں ہوا تھا۔ چودھری کی اور انور کی پوزیشن محفوظ تھی۔ ریشم ایک فیصلہ کر چکی تھی۔ شاید مجھے بھی یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا کہ انور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو کسی اور کی بات بھی کیسے کی جاسکتی ہے۔

انور کیا کرنا چاہتا تھا، کیا کر چکا تھا اور کیا کرے گا، ریشم کو اس بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں رہی تھی اور وہ خاموشی سے نکل جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ خدا کا ہزار شکر ہے کہ میں نے جذبات کی رو میں بہہ کر یہ راز فاش نہیں کیا۔

اندھیرا کر کے بھی میں بہت دیر تک جاگتا رہا اور کروٹیں بدلتا رہا۔ یہ سوچتا رہا کہ کیا جو کچھ چودھری صاحب نے کہا اور میں نے کہا... اس کا پتا ریشم کو چلے گا؟ کان تو دیواروں کے بھی ہوتے ہیں اور یہاں سب کی آنکھیں خفیہ کیمرے تھیں اور سب کے کان خفیہ مائکس... کیا اب ایسی کوئی صورت ہے کہ میں ایسے جذباتی ابال سے ہونے والے نقصان کی تلافی کر سکوں؟

انور نے کہا تھا کہ صبح بات کریں گے مگر کیا اب وہ بات کرے گا؟ اور بات کرے گا تو کیا بات کرے گا... یہ ایسے اندیشے تھے جو صبح ہی دور ہو سکتے تھے۔ رات کے آخری پہر بڑی کوشش کے بعد میں سونے کے قابل ہو گیا اور اس کا نتیجہ حسبِ توقع یہ نکلا کہ صبح بہت دیر تک سوتا رہا۔

مجھے چودھری صاحب کے کمرے میں کچھ ہلچل نظر آئی۔ انور دو بار باہر آیا اور پھر اندر چلا گیا۔ دو تین ملازم آتے جاتے دکھائی دیے۔ میں خود جا کے خیریت معلوم کرنا چاہتا تھا کہ انور نکلا اور صحن کراس کر کے سیدھا میری طرف آ گیا۔ کچھ کہے بغیر وہ صوفے پر گر گیا۔ اس کا چہرہ پریشانی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

''ناشتا کیا تو نے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ابھی اٹھا ہوں... غسل کر لوں پہلے۔''

''چل نہا کے آ... میں نے بھی ناشتا نہیں کیا ہے ابھی تک۔''

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''کیا ہوا... تُو بہت اپ سیٹ ہے؟''

''یہ پوچھ کہ کیا نہیں ہوا... ابا جی کی طبیعت بگڑ گئی ہے... ڈاکٹر جلالی کچھ بتاتا نہیں... کہتا ہے دعا کرو۔''

''تو مایوس مت ہو... وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔''

''یار تسلی کے ان الفاظ کا کیا فائدہ؟ کیا میں جانتا نہیں کہ اب وہ ٹھیک نہیں ہو سکتے... مجھے تو یہ احساس ہوتا ہے کبھی کبھی کہ میں اور ڈاکٹر جلالی اور ہم سب کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ صرف ان کی اذیت کے عذاب کو طویل اور طویل تر کر رہے ہیں لیکن میں کوشش ترک بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے یورپ میں دیکھا ہے۔ لواحقین اور ڈاکٹر متفق ہوں تو قانون اجازت دیتا ہے کہ مریض کو سکون سے مرنے دیا جائے۔ ہم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔ بس اللہ ان کی مشکل آسان کرے۔''

ایک خادمہ ٹرے اٹھا کے لائی اور ناشتا جار...

درمیان رکھ کے چلی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ باپ کی بیماری کے علاوہ بھی انور کسی پریشانی کا شکار ہے۔ ”یار! اس کے علاوہ بھی ایک مسئلہ ہے۔“ میرا شک فوراً اس کی زبان پر آگیا۔ ”سارے مسئلے ایک ساتھ کھڑے ہو گئے ہیں۔“

”اور کیا ہے؟ کوئی تفتیش کا مسئلہ ہے؟“

”اس سے نمٹ لیں گے پیر صاحب... اور پولیس انہیں پکڑ کے ٹانگ دیتی ہے تو میری بلا سے... ریشم حویلی میں نہیں ہے۔“

میرا ہاتھ رک گیا۔ ”کیا مطلب؟“

”میں نے کون سی فارسی بولی ہے... ریشم کہیں چلی گئی ہے۔“

”کہاں چلی گئی ہے... کہاں جاسکتی ہے وہ... ناشتا جاری رکھ۔“

اس نے کافی کا مگ اٹھالیا۔ ”میرا دل نہیں چاہتا کچھ بھی کھانے کو... دماغ میرا ابھی اسی سوال میں الجھا ہوا ہے کہ وہ کہاں گئی اور کیوں... مجھے شک ہے کہ وہ... اسے اپنے ساتھ لے گئی۔“

”یہ اتنی بڑی گالی کس کے لیے ہے؟“ میں نے کہا۔

”وہی... سلونی اور کون... مجھ سے تو آج صبح ہی بات ہوئی تھی۔ اس نے ماں سے اور شاہینہ بھابی سے کل کہا تھا کہ وہ شادی کر رہی ہے۔“

”شادی... اچانک؟“

”اچانک کیا... اس کا وہی پرانا یار... رنگیلا... بے غیرتی کی بھی حد ہوتی ہے کوئی... پہلے جب سلونی گئی تھی تو اسی کے ساتھ رہی تھی اور لاہور میں کیا کرتی تھی؟ جسم فروشی... یہی ٹیکسی والا رنگیلا... پہلے رکشا تھا اس کے پاس... یہ لے جاتا تھا سلونی کو ہوٹلوں میں ہر رات... اور یہ بعد میں خود سپلائر ہو گئی تھی تو وہ لڑکیاں لاتا تھا اور یہ دوسرے گاہکوں کو سپلائی کرتی تھی اور اس پر دعوے کہ سلونی سے سچی محبت کرتا ہے... حرام زادہ۔“

”یہ سب چھوڑ... ریشم کی بات کر۔“

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”مجھے شک ہے کہ وہ ورغلا کے لے گئی ریشم کو اپنے ساتھ... اس کا تو پھر یہی دھندا ہوگا... بھولی بھالی لڑکیوں سے پیشہ کرانا... پتا نہیں اس نے کیا سنہرے خواب دکھائے ریشم کو...“

”یار انور... وہ اتنی بے وقوف بھی نہیں تھی کہ سلونی کے ورغلانے سے تجھے چھوڑ کے چلی جائے۔“

”اس فاحشہ نے ریشم کو ایکسپلائٹ کیا۔ اسے میرے خلاف بھڑکایا... تو دیکھ کہ میں اسے پھر حویلی میں لایا اور غیرت سے زندگی گزارنے کا موقع دیا۔ کس چیز کی کمی تھی اسے یہاں... اس کی ہر ضرورت پوری ہوتی تھی اور پیسا بھی بہت مل جاتا تھا۔ یہاں تنخواہ تو کسی بھی ملازمہ کی مقرر نہیں... ضرورت سب کی پوری ہو جاتی ہے۔ سلونی کو پہلے کی طرح ہاؤس کیپر کا درجہ حاصل تھا۔ وہ ملازموں پر کنٹرول رکھتی تھی۔ آج کل تو مہمان خانہ بھی ویران پڑا رہتا ہے۔ اباجی کے زمانے میں اور اکبر کے دور میں بہت لوگ آتے تھے۔ سب عیاش اور شوقین مزاج... کچھ شکار کے بہانے کچھ تفریح کے لیے... ان سب کی ہر طرح خاطر مدارات سلونی کے ذمے تھی۔ ہر طرح کا مطلب ہے کوئی اسے پسند کرے تو مہمان کو انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اب تو وہ کچھ نہیں تھا۔ کیا اس نے تجھ سے بات کی تھی کہ وہ شادی کر رہی ہے؟“

میں چونکا۔ ”نہیں۔“

”مجھ سے بھی کبھی ذکر نہیں کیا۔ ماں جی کو بتایا... اور بھابی کو... اب ان دونوں نے سلونی کو حویلی میں مجبوراً قبول کر رکھا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ کس قماش کی عورت ہے اور سب کی محبوبہ بنی ہوئی ہے۔ اپنی ہوشیاری اور چالاکی سے... باتیں اچھی کرتی تھی اور مردوں کا دل بہلانا جانتی تھی۔ صورت اتنی اچھی نہیں تھی مگر بری بھی نہیں تھی اور خوب بہت نخرے کے ساتھ رہتی تھی۔ میری ماں اور بھابی تو ہیں خاندانی شریف زادیاں مگر اپنے گھر کے مردوں کی ساری عیاشی کو برداشت کرنا ان کی عادت ہے۔ ان کا بس چلتا تو سلونی کو ایک دن حویلی میں رہنے نہ دیتیں۔ اب اس نے اجازت مانگی کہ میں شادی کر کے اپنا گھر بسانا چاہتی ہوں۔ مجھے اجازت دی جائے تو انہوں نے کہا کہ خس کم جہاں پاک... کل کی جاتی آج ہی جاؤ... ماں نے اجازت دے دی تو اباجی اب کیا روک لیتے۔ اس نے صبح مجھ سے ذکر کیا اور یہ بھی بتا دیا کہ چودھری صاحب نے بھی اسے اجازت دے دی ہے۔ ماں جی اور بھابی کو بھی بتا دیا ہے۔ میں نے کہا کہ اچانک شادی کا فیصلہ کر لیا تم نے تمہاری مرضی... میں روکنے والا کون... اس نے بتایا کہ ابھی رنگیلا آئے گا ٹیکسی لے کر تو میں چلی جاؤں گی... وہ کب گئی... میں نے نہیں دیکھا... میں اباجی کو دیکھ رہا تھا۔“

”کسی اور نے تو دیکھا ہوگا؟“

”ہاں گارڈ نے دیکھا تھا۔ ایک وین آئی تھی جس میں سلونی کا سامان رکھا گیا۔ جاتے وقت وہ کسی سے ملی بھی

نہیں۔ وین ڈرائیور وہی تھا رنگیلا... ہاں مجھے صبح اس نے بتایا تھا کہ وہ ملتان جائے گی اور وہاں سے کراچی۔ میرا خیال ہے کہ یہ بھی جھوٹ تھا۔“

”تو کیسے شک کر رہا ہے کہ وہ ریشم کو لے گئی؟ کسی نے دیکھا ریشم کو ساتھ جاتے؟“

”یہی تو عجیب بات ہے۔ ریشم کو کسی نے باہر جاتے نہیں دیکھا۔“

”پھر تجھے یہ خیال کیوں آیا کہ وہ سلونی کے ساتھ چلی گئی؟“

انور نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ریشم بدگمان اور ناراض تھی مجھ سے... اس کا رویّہ بدل گیا تھا میرے ساتھ... خصوصاً جب سے اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی اور وہ اسپتال گئی تھی۔ اسے شک تھا کہ شاہینہ نے اسے زہر دیا۔“

”یہ شک کی بات نہیں... حقیقت ہے... شاہینہ نے پہلے کہا کہ اس نے ابارشن کی گولیاں کھائی تھیں... جو انور مجھ سے لے گیا تھا کیونکہ ریشم کو ان کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ یہ کتنا شرمناک جھوٹ تھا... تھا یا نہیں؟“

”ہاں، جھوٹ تھا۔“ انور نے تذبذب کے ساتھ بادل ناخواستہ اقرار کیا۔ ”لیکن اس میں میری کوئی خطا نہیں تھی۔“

”شاہینہ نے سلونی کا نام لے کر کہا تھا کہ ریشم ہر رات تیرے ساتھ ہوتی ہے۔ تیرے کمرے میں... اور اس کا نتیجہ تو سامنے آنا ہی تھا لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے اسپتال میں ریشم کو سمجھانے کی اور... شرمندہ کرنے کی کوشش کی تو وہ مجھ پر برہم ہو گئی کہ ایسا بے سروپا اور شرمناک جھوٹ کس نے بولا؟ کیا اس نے تجھ سے یہ نہیں کہا ہوگا... ضرور کہا ہوگا... مگر تو نے کچھ نہیں کیا۔“

”میں... کیا کرتا؟“

”تو نے بھابی سے پوچھا تھا؟“

”ہاں، پوچھا تھا۔ وہ کہنے لگی کہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ کون بدنام کر رہا ہے مجھے... پھر کیا میں تجھے اس کے سامنے لے جاتا یا عدالت لگا کے ریشم کو وہاں پیش کرتا؟ ایسا فساد کھڑا کرتی وہ... اور انجام اس کا وہی ہوتا جو میں جانتا تھا... بھابی کی بات سچ تسلیم کی جاتی۔ تیری یا ریشم کی نہیں... چنانچہ میں اسے گول کر گیا۔“

”اور وہ گولیاں کیا تھیں جو تو لایا تھا اس سے؟“

”میں نے کہا تھا کہ... ریشم اپ سیٹ ہے... اسے نیند نہیں آرہی ہے۔ وہ خود بھی نیند کی گولیاں کھانے لگی ہے... اس نے وہی دی تھیں مجھے۔“

”بے وقوف آدمی... اس نے ریشم کو گندم کے کیڑے مارنے والی زہر کی گولیاں دے دی تھیں... جو گندم کے ذخیروں کو محفوظ رکھنے میں کام آتی ہیں۔“

وہ میرا منہ تکنے لگا۔ ”یہ کیا کہہ رہا ہے تو...؟“

”وہی جو سچ ہے... اور مجھے شک ہے کہ تو بھی یہ سب جانتا تھا مگر تو نے بڑی بھابی کو بچایا تھا... ورنہ پولیس کیس بن جاتا... اس کی عزت خاندان کی عزت تھی۔ اس پر ریشم کو قربان بھی کیا جاسکتا تھا۔“

وہ چلّایا۔ ”خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم۔“

میں نے بیڈ کے نیچے سے فائل نکالی اور اسے تھما دی۔ ”یہ رپورٹ میں نے اسپتال سے لی تھی۔ اسے دبا دیا گیا تھا۔ میں نے اسے نکلوانے کے لیے دس ہزار دیے اور ایک فاحشہ کے ساتھ رات بسر کی۔ پھر اس نے ان ردی دستاویزات میں سے رپورٹ نکالی جن کو اگلے دن ضائع کر دیا جاتا۔“

بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے اس نے فائل کھولی اور اس میں لکھی ہوئی ڈاکٹری رپورٹ پڑھنے کی ناکام کوشش کی۔ ”اس سے تو کچھ بھی پتا نہیں چلتا... تو نے کیسے سمجھ لیا؟“

میں نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”اسے لے جا ڈاکٹر جلالی کے پاس... اسی نے مجھے بتایا تھا... مگر اسے اور کچھ پتا نہیں... نہ یہ کہ رپورٹ کس کی تھی اور یہ واردات کہاں ہوئی تھی... وہ تجھے بھی سمجھا دے گا۔“

انور کسی فالج زدہ شخص کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا خلا میں گھورتا رہا۔ ”کاش یہ مجھے پہلے معلوم ہو جاتا۔“

میں اس کا مذاق اڑانے کے انداز میں تلخی سے ہنسا۔ ”پہلے معلوم ہو جاتا تب بھی کچھ نہ ہوتا۔ بڑی بھابی کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ تو ڈرتا تھا اس سے... اور مصلحت کے تقاضے تیرے پاؤں کی زنجیر آج بھی ہیں۔“

”لیکن... ریشم آج مجھے کیوں چھوڑ گئی؟ یہ بات پرانی ہے۔“

”تو نے مان لیا کہ وہ چلی گئی ہے؟“

”ہاں وہ حویلی میں نہیں ہے تو پھر جا چکی ہے اور سلونی کے ساتھ... اب میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ ریشم نے ایسا کیوں کیا؟“

”ہاں، اس نے روزینہ کی وجہ سے ایسا کیا۔“

”یہ پہلی درست بات کی ہے تُو نے... اس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے اپنی محبت کی رسوائی قبول کرلی تھی۔ تیری دوسری بیوی بن کے رہنا قبول کرلیا تھا۔ سچ یہ بھی ہے کہ وہ مجبور تھی۔ وہ کہیں بھی نہیں جاسکتی تھی جہاں وہ محفوظ ہوتی اور اسے حویلی کے عیش و آرام کی عادت بھی پڑ گئی تھی۔ کیونکہ وہ ایک غریب کسان کی بیٹی تھی۔ لیکن برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس نے اور بھی بہت کچھ دیکھا جس میں تیرے کردار کا منفی... بلکہ قابلِ نفرت روپ اس کے سامنے آگیا۔ رہتی وہ بھی حویلی میں تھی... سب دیکھ سکتی تھی... سن لیتی تھی۔“

انور کی نظر مجھ پر جم گئی۔ ”صاف بات کر... کیا وہ سمجھتی تھی کہ اکبر کو میں نے قتل کیا؟“

”میرے سامنے اس نے ایسا کچھ نہیں کہا... لیکن یہ تو سب کو شک ہے... خواہ کوئی اس کا اظہار کرے... ڈر سے یا مصلحت سے... اکبر طبعی موت نہیں مرا... اس کو آخر کون مار سکتا تھا؟ کس کی رسائی تھی اس تہ خانے تک جہاں وہ قید تھا؟ تیری... شاہینہ کی... اور ماں جی کی... زہر کھانے میں دیا گیا تھا۔ کھانا کون پکاتا تھا اور کون لے کر جاتا تھا؟ جو لے کر جاتا تھا اسی نے زہر فراہم کیا اور کھانا پکانے والی کو بھی اپنا پکایا ہوا کھلا کے خاموش کردیا... ماں جی اور شاہینہ میں سے کون یہ کام کرسکتا تھا... کوئی ماں اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے زہر دے سکتی ہے؟ جوان بیٹے کو...؟ لیکن بیوی دے سکتی ہے... بیویوں نے پہلے بھی شوہروں کو قتل کیا ہے... کبھی آشنا سے مل کر... کبھی سوکن کے معاملے میں... کبھی بدزبانی، بدسلوکی اور مار پیٹ سے تنگ آکے... اب رہ گیا تو... تیرے پاس لالچ کے علاوہ نفرت کی وجہ تھی... انتقام کی وجہ تھی۔“

انور بہت دیر خاموش رہا۔ ”ریشم بہت سادہ تھی۔“

میں نے کہا۔ ”تو سادہ اور بے وقوف کا ایک ہی مطلب سمجھتا ہے؟“

”اب میرا شک پکا ہوگیا ہے، یہ ساری باتیں سلونی نے اسے اکسانے کے لیے کہی ہوں گی۔“

”تیری مت ماری گئی ہے انور... تو عورت کی فطرت کی اس بنیادی کمزوری سے آنکھیں بند کر کے بیٹھا ہے؟ وہ پاکستان کی دیہاتی لڑکی ہو یا ہالی ووڈ کی سپر اسٹار... اپنے محبوب میں شراکت برداشت نہیں کرتی۔ تو کیوں سمجھتا ہے کہ ریشم کے لیے روزینہ کا وجود اور اس کی برتر حیثیت قابلِ قبول تھی۔ وہ محبت میں اتنی مجبور اور ذلیل ہونا قبول کرسکتی تھی۔“

”کیا سلونی نے یہ سب اسے سمجھایا ہوگا؟“

”صرف سلونی کو الزام مت دے... ریشم نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ دوسری بیوی بننے کے رسوا کن معاہدے کو قبول کرنا اس کی غلطی تھی۔ خصوصاً اس وقت جب تیرا نکاح روزینہ سے ہوا... میرا مطلب ہے قانونی طور پر اس نے یہ حیثیت حاصل کرلی... شرعی طور پر بھی ہوجائے گی بہت جلد اور جب وہ حویلی کا چارج سنبھالے گی تو سب کچھ وہی ہو گی... بیوی... مالکن... خاندانی بہو۔“

انور پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتا رہا اور سب سنتا رہا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میں ضرورت سے زیادہ بول گیا ہوں۔ مجھے تو کچھ بولنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میرا وعظ انور کی فطرت یا اس معاشرے کی سوچ نہیں بدل دے گا۔ مجھے تو ریشم کے فرار کی خبر سن کے صرف ”اچھا“ کہنا چاہیے تھا اور انور کے سوالوں کا بھی ہاں یا نہیں میں جواب دینا چاہیے تھا... یا پتا نہیں کہہ کے خاموش ہوجانا چاہیے تھا۔

انور نے بالآخر ایک سوال کیا۔ ”یہ سب اس نے کہا تھا تجھ سے... یا تو نے اسے سمجھایا تھا؟“

”تو اسے میری سازش بنانا چاہتا ہے؟ میں نے سلونی کو اکسایا اور ریشم کو تیرے خلاف کیا؟“ میں نے سپاٹ مگر مضبوط لہجے کہا۔

”نہیں ملک... تو نے ہمیشہ مجھے سپورٹ کیا ہے۔ کیا ریشم کے دماغ میں یہ اندیشے تھے جن کا اس نے اظہار تیرے سامنے کیا ہو؟“

”وہ اپ سیٹ ضرور تھی۔ محبت پر اس کا اعتماد پارہ پارہ ہوگیا تھا۔ لیکن تجھے چھوڑ کر جانے کا خیال اس کے دماغ میں نہیں آیا تھا۔ اس تبدیلی کا مجھے بھی علم نہیں۔“

”یعنی میرا شک صحیح ہے۔ یہ سب سلونی کی کارستانی ہے... وہ سب جانتی تھی۔ اس نے ریشم کو ورغلایا... مجھ سے برگشتہ کیا۔ اسے مستقبل کے سنہرے خواب دکھائے۔“

”اچھا چھوڑ یہ قیاس کے گھوڑے دوڑانے کا کھیل... اگر وہ گئی تو بس گئی... سلونی کے ورغلانے سے گئی یا اپنی مرضی سے... کیا فرق پڑتا ہے۔ دیکھا تو کسی نے بھی نہیں۔“

”میں سب سمجھ گیا ہوں ملک... وہ پچھلی طرف سے نکلی... باغ میں اس وقت کوئی نہیں ہوتا مالی کے سوا اور وہ ریشم کو کیسے روکتا۔ ویسے بھی وہ لگا ہوا ہوگا اپنے کام میں... اس سے پوچھیں گے تو کہے گا کہ سرکار میں نے تو کچھ نہیں

دیکھا۔ اسے وقت کا علم تھا... یا تو وین نے اسے پیچھے سے بٹھایا یا وہ حویلی سے کچھ فاصلے پر اس میں سوار ہوگئی۔ اس کا سامان سلونی لے گئی ہوگی... سامان تھا ہی کیا۔“

”فرض کر ایسا ہی ہوا۔ اگر وہ تجھے بتا کے جاتی تو کیا تُو اسے جانے دیتا؟“ میں نے بیزاری سے کہا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تُو زبردستی کرتا... پہرے بٹھا دیتا اس پر بھی؟“

”میں اسے سمجھاتا... قائل کرتا۔“

”اور وہ قائل ہوجاتی کہ روزینہ سے شادی کے بعد بھی تو اسی طرح محبت کرتا رہے گا... جیسا کہ تو نے کہا تھا۔“

”میں مانتا ہوں کہ اس کی سوشل حیثیت وہ نہ ہوتی... جو روزینہ کی ہوگی... لیکن...“

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”چھوڑ انور! ایسی بات کیوں کرتا ہے جس پر یقین مشکل ہے۔ جو ہمارے معاشرتی حقائق کے خلاف ہے۔ میرے تیرے جیسے مردوں کی فطرت کے خلاف ہے... عقل کے خلاف ہے... بہتر ہے کہ تو بھی تلخ حقائق سے سمجھوتا کرلے... حقائق ہوتے ہی تلخ ہیں۔“

”یہ نہیں ہوسکتا۔“

”یہ ہوچکا ہے۔ جیسے اکبر مر چکا ہے ایسے ہی ریشم جا چکی ہے۔ یہ بھی ایک حادثہ ہے تیری زندگی... اور کسی حد تک ریشم کی زندگی... کسی اور کی زندگی اس سے متاثر نہیں ہوتی... اگر وہ ایک کمزور، لاوارث لڑکی ہونے کے باوجود یہ کڑوا گھونٹ پینے کا فیصلہ کرسکتی ہے تو تجھے بھی اس کے فیصلے کو قبول کرلینا چاہیے۔ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ محبت غلط نہیں تھی... نہ تیری نیت غلط تھی اور نہ ریشم کی... لیکن حالات نے اسے غلط کردیا اور حالات پر تیرا کوئی اختیار نہ تھا۔“

”کون کہتا ہے کہ حالات پر میرا اختیار نہیں؟“

”میں... جو ہو رہا ہے اور ہوچکا ہے یا ہونے والا ہے... اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ تو بے اختیار اور کمزور ہے۔ جوڑے بنتے ہیں آسمانوں پر... ہمارا یہی ماننا ہے۔ تو بھی دل کو سمجھا سکتا ہے کہ ریشم تیرے نصیب میں نہیں تھی۔ وہ تیری زندگی میں آئی اور چلی گئی، اللہ کی مرضی... تو صبر کر... اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے... کچھ دن بعد تو اسے بھول جائے گا۔“

وہ چلایا۔ ”بکواس مت کر اتو کے پٹھے... میں یہ نہیں کرسکتا۔“

”پھر؟ کیا کرے گا تو... اس کے خلاف رپورٹ لکھوائے گا؟ اسے تلاش کر کے واپس لانے کے لیے اپنا اثر رسوخ اور طاقت کو استعمال کرے گا یا خود نکل جائے گا... سر میں خاک ڈال کے؟“

وہ غصے میں آگ بگولا ہو کے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ ”تُو میرا مذاق اڑا رہا ہے... میری تذلیل کر رہا ہے... سور کے بچے...“ اس کے بعد کی ساری گالیاں ہمیشہ سے شرمناک اور ناقابلِ اشاعت سمجھی گئی ہیں۔

میں نے اسے آسانی سے پیچھے دھکیل دیا۔ ”انور... ہوش میں آ۔“

اس نے میز پر سے پانی کا جگ اٹھا کے میری طرف پھینکا۔ یہ میرے سر میں لگا۔ ”میں جانتا ہوں تو بھی شریک ہے اس سازش میں... تو نے بھگایا ہے اسے۔“ اس نے مجھے مزید گالیاں دیں اور مجھے ٹکر مارنے کی کوشش کی۔

میں نے اسے ایک فرنٹ پنچ مارا تو وہ الٹ کے پیچھے جا گرا۔ اس کی ناک سے خون بہنے لگا۔ باہر سے نوکر چاکر اور گارڈ دوڑے اور میرے سامنے دیوار بن گئے۔

”چودھری صاحب کو لے جاؤ۔“ میں نے کہا۔

شاہینہ دروازے میں نمودار ہوئی۔ ”کیا ہو رہا ہے یہاں؟“

میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”انور سمجھتا ہے کہ ریشم کو میں نے فرار کرایا ہے۔ وہ سلونی کے ساتھ گئی ہے تو یہ میری سازش ہے۔“

وہ مجھے دیکھتی رہی۔ ”وہ مجھ سے بھی پوچھ کے گئی ہے۔“

”سلونی نے بڑے چودھری صاحب کو بھی بتا دیا تھا۔“

”میں ریشم کی بات کر رہی تھی۔ آج اس نے مجھ سے کہا کہ کیا میں بھی چلی جاؤں سلونی کے ساتھ... میں نے کہا کہ تمہاری مرضی... تمہیں یہاں کسی نے زبردستی نہیں روک رکھا ہے۔“

ایک ملازم نے قریب آکے کہا۔ ”ملک صاحب! آپ کو بڑے چودھری صاحب یاد کر رہے ہیں۔“

شاہینہ دروازے کے بیچ میں میرا راستہ روکے کھڑی تھی۔ ”کیا کہو گے تم ان سے؟“

میں نے جھلا کے کہا۔ ”وہی جو ہوا۔“

”میں تمہارے حق میں گواہی دوں گی۔ میں نے سب سنا انور تمہیں کیسی گالیاں دے رہا تھا۔“

”مجھے نہیں چاہیے تمہاری گواہی... میرے راستے

سے ہٹو۔"

وہ ایک طرف ہوگئی۔ وہ سیاہ قمیص اور شلوار میں تھی جو دیکھنے والوں کو ماتمی لباس ہی لگتا ہوگا لیکن اس کی تراش خراش ایسی تھی کہ اس کا سراپا دمک رہا تھا۔ اس کے لمبے گھنے سیاہ بال اس کے چہرے کے گرد ہالا سا بنا رہے تھے کیونکہ وہ شورنس کے دوپٹے کے بغیر کمرے سے نکل آئی تھی۔ اس کا گورا رنگ اس سیاہ ملبوس میں نظر کو خیرہ کرتا تھا اور اس کے پُرشباب بدن کی سرکشی نظر کو گمراہ کرتی تھی۔ اس ذہنی انتشار کی کیفیت میں بھی میں خیال کو بھٹکنے سے نہ روک سکا۔

اس نے مجھے دروازے میں سے گزرنے کی راہ بھی چیلنج کی طرح دی تھی کہ گزر سکتے ہو تو گزر کے دکھاؤ... اور میں سمٹ کر گزرنے لگا تو اس نے نامعلوم طریقے سے راستے کو دو تین انچ ایسے کم کیا کہ نہ نظر آئے اور نہ محسوس ہو... لیکن میں اس کے جسم کی نرمی اور حرارت کو محسوس کیے بغیر گزر ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے پسینا آگیا... لیکن میں نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں... دیکھنے والے اور بھی تھے۔ ملازم، گارڈ اور خود انور جس نے خود کو ملازموں سے چھڑا لیا تھا اور ڈاکٹر جلالی سے فرسٹ ایڈ لے رہا تھا۔

میں اس کی طرف توجہ دیے بغیر چودھری صاحب کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ وہ سیدھے بیٹھے تھے اور غصے میں تھے۔ "اوئے یہ کیا تھا... کیا لگا رکھا ہے تم نے؟"

میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ "آپ انور سے پوچھ لیں۔"

"پہلے تو بکواس کر... اس کو بھی بلاتا ہوں میں۔"

میں نے کہا۔ "انور کو مجھ سے شکایت ہے کہ میں نے ریشم کو اس کے خلاف کیا اور وہ سلونی کے ساتھ چلی گئی۔ وہ میری بات سننے پر راضی ہی نہیں تھا۔"

"اس نے دیکھا ریشم کو جاتے ہوئے؟"

"دیکھا تو شاید کسی نے بھی نہیں... سلونی تو آپ سے اجازت لے کر گئی ہے۔"

"ریشم اس کے ساتھ نہیں گئی۔"

میں نے حیران سوالیہ نظروں سے چودھری صاحب کو دیکھا۔ "وہ حویلی میں نہیں ہے... انور نے اس کا یہی مطلب نکالا۔ غصے میں مار پیٹ پر اتر آیا۔"

"دماغ خراب ہے اس کا تو... مگر تجھے عقل سے کام لینا چاہیے۔"

"چودھری صاحب! وہ بہت غصے میں تھا اور میری بات سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے تو بہت برداشت کیا۔"

"اوئے بلا ذرا انور کو۔" چودھری صاحب نے دروازے کے سامنے سے گزرنے والے ایک نوکر سے کہا۔ "میں بتاتا ہوں اسے ریشم کہاں گئی ہے۔"

مجھے حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ "آپ کو معلوم ہے چودھری صاحب! کہاں گئی ہے ریشم؟"

چند سیکنڈ وہ مجھے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ "اسے پیر صاحب نے بلا لیا ہے اپنی خدمت کے لیے... درگاہ پر..."

میرے سامنے جیسے بم پھٹ گیا۔ میں شاک سے ایک دم کھڑا ہوگیا۔ "درگاہ پر... کب... اور کیوں...؟"

انور کمرے میں داخل ہوا تو اس کا موڈ پشیمانی کا تھا۔ "آئی ایم سوری ملک۔"

میں نے چلا کے کہا۔ "انور! ریشم کو درگاہ پر بھیج دیا گیا ہے پیر صاحب کی خدمت کے لیے... مجھے اباجی نے ابھی بتایا۔"

انور کا رنگ اڑ گیا۔ "یہ... یہ سچ ہے اباجی؟"

چودھری نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اس پر دورے پڑتے تھے... جن آنے لگے تھے۔"

"یہ جھوٹ ہے... کس نے بکواس کی ہے؟" انور چلایا۔

چودھری صاحب نے اسے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ "اوئے اتنی گرمی نہ کھا... تجھے کیا معلوم... کل ہی رات کو جب ہم یہاں دوسرے معاملات پر بات کر رہے تھے، اس پر دورہ پڑا ہوا تھا۔"

میں نے اپنے غصے کو قابو میں رکھا۔ "جس نے بھی آپ سے ایسا کہا ہے... غلط کہا ہے۔"

"تو بھی انور کی طرح جانتا کچھ نہیں... مجھے غلط کہہ رہا ہے۔ اوئے مردوں کو کہاں معلوم ہوتی ہیں یہ باتیں... کئی بار دورے پڑے اس پر... میں تو دورہ پڑنا ہی کہوں گا۔ عورتوں نے کہا کہ جن کا اثر ہے۔"

"کون عورتیں؟"

"وہی جو حویلی میں ہیں... سلونی بھی شامل تھی ان میں... سب سے پہلے اسی نے کہا تھا۔ تیری ماں کو اور بھائی کو بھی معلوم تھا۔" چودھری بولا۔

"مجھے کیوں نہیں بتایا کسی نے؟"

"تو کیا بڑا افلاطون ڈاکٹر ہے یا عامل ہے۔ ایسی باتیں مردوں کو نہیں بتائی جاتیں۔ مجھے بھی کل پتا چلا۔ آج صبح طے ہوا کہ اسے درگاہ پر رکھا جائے۔ وہاں جنات کا علاج ہوجاتا ہے تو ٹھیک... ورنہ وہ بھی اپنا ہی گھر ہے...

بھائی جی خیال رکھیں گے اس کا۔"

میں نے برہمی سے کہا۔ "میں آپ کا لحاظ ایک حد تک کرسکتا ہوں چودھری صاحب! وہ آپ کے بھائی ہیں اور انور کے سسر بھی بن جائیں گے... لیکن ان کی حقیقت سے آپ واقف ہیں۔ اور میں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے وہاں دیکھا تھا اس لیے مجھے معلوم ہوگیا کہ ان کی پیری مریدی سب فراڈ ہے... اور عورتوں کے ساتھ وہاں کیا ہوتا ہے۔"

"ریشم درگاہ پر نہیں... ان کے گھر میں رہے گی۔ اس کا وہاں خاص خیال رکھا جائے گا۔" چودھری نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہم نے جو کیا سوچ سمجھ کے کیا۔"

انور غصے میں پیچ و تاب کھا رہا تھا مگر بے بس تھا۔ میں بھی سمجھ گیا تھا کہ ریشم کو یہاں سے کیوں نکالا گیا ہے۔ اس سازش کی کامیابی کا سہرا شاہینہ کے سر باندھا جاسکتا تھا۔ اسی کو ریشم سے عناد تھا۔ وہی یہ چاہتی تھی کہ روزینہ کے گھر میں آنے سے پہلے ریشم کا قصہ پاک ہوجائے۔ اس کو ایک قاتلانہ کوشش میں ناکامی ہوئی تھی۔ جن والی کہانی بھی اسی نے مشہور کی ہوگی اور اس مسئلے کا آسان حل بھی اسی نے بتایا ہوگا کہ جن اتارنے کے لیے تو گھر میں ہی انتظام موجود ہے۔

بدبخت لڑکی... اچھا تھا پہلی دفعہ میں ہی مرجاتی عزت آبرو سے... اب درگاہ پر ہر روز جیے گی اور ہر روز نئے عذاب کے ساتھ مرے گی۔ اسے سب سے بڑا جن اظہر شاہ چمٹ جائے گا۔ اس کا توڑ کس عامل کے پاس ہے۔ شاہینہ نے یہ سارا ڈراما اتنی خاموشی سے کیا کہ گھر میں رہنے والوں کو بھی اس کی خبر نہ ہوسکی۔ چودھری صاحب اگر انجانے میں اس منصوبے کا حصہ بنے تھے تب بھی قصوروار تھے۔ وہ خود کب چاہتے ہوں گے کہ ریشم ان کے گلے میں اٹکی ہڈی بن کے موجود رہے۔ ایک تیر سے دو شکار ہوئے۔ وہ انور کی دسترس سے دور ہوکے ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں اسے سب سے الگ کسی کوٹھری میں بند کرکے یا زنجیروں سے جکڑ کے بھی رکھا جاسکتا تھا اور انور اپنے سسرال جاکے اس کے لیے ہنگامہ کرتا تو ریشم کے لیے برا کرتا۔ وہ حویلی سے خارج ہوگئی تھی چنانچہ آنے والے دنوں میں دونوں بہنوں کی مکمل عمل داری کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ رہی تھی۔

یہ اچھا ہوا کہ میں جذبات کی آتش فشانی دکھائے بغیر وہاں سے احتجاجاً واک آؤٹ کرگیا اور پھر بہت دیر تک اپنے کمرے میں کسی پاگل کتے کی طرح چکر لگاتا رہا۔ ریشم ایک مکروہ خاندانی سازش کی بھینٹ چڑھ گئی تھی اور میں خود کو مجرم سمجھنے پر مجبور تھا کیونکہ میں ہی اسے یہاں لایا تھا۔ گزشتہ رات چودھری صاحب نے مجھے روک کے رکھنے کے لیے ایک جذباتی ناٹک کیا تھا۔ اس کا جو تھوڑا بہت اثر تھا، وہ اب الٹا ہوگیا تھا۔ اب میرے یہاں رک کر انور کا دستِ راست بننے کا کوئی اخلاقی جواز نہیں رہا تھا۔ اب اور زیادہ ضروری ہوگیا تھا کہ میں بالکل پاگل ہوکے کسی کو قتل کرنے یا خود قتل ہونے سے پہلے اس منحوس جگہ کو چھوڑ دوں۔ انور جائے بھاڑ میں... یہاں مجھے ہمدردی تھی تو صرف ریشم سے... وہ نہ رہی تو میں یہاں کیوں رہوں۔

میں نے محسوس کیا کہ ریشم کو اپنے احساس سے خارج کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ وہ ایک مظلوم اور فریب خوردہ لڑکی تھی جس کا اب کوئی نہ تھا۔ وہی تھی جس نے میری زندگی بچائی تھی۔ بدنام کرنے والوں کی پروا کیے بغیر مجھے اپنے گھر میں پناہ دی اور دن رات میری خبرگیری کی تھی۔ اس کی نیت صاف تھی اور ضمیر صاف تھا چنانچہ اس نے زبانِ خلق کی پروا نہیں کی تھی اور اس جرم کی سزا پائی تھی۔ جب اس کا باپ بھی قتل کردیا گیا تو اسے اکبر جیسے بھیڑیے سے بچانا مجھ پر لازم ہوگیا تھا۔ مگر اس کو اکبر سے محفوظ رکھنے کی کوشش نے مجھے زنداں میں پہنچا دیا تھا۔ اکبر کی یہ غلطی اس کے حق میں قدرت کی سزا بن گئی تھی۔ آج وہ منوں مٹی تلے ایک ملازمہ کی قبر میں پڑا ہوا تھا اور اس کے نام کے کتبے والی ایک معمولی ملازمہ کی قبر پر اپنے پرائے فاتحہ خوانی کررہے تھے۔

میرے جانے کے لیے وہی وقت سب سے مناسب تھا جب ریشم کو انور نے اپنی محبت کی پناہ میں لے لیا تھا۔ میں چلا جاتا تو لوٹ کے کبھی نہ آتا مگر مجھے یہ اطمینان حاصل رہتا کہ ریشم خوش اور محفوظ ہے۔ اب یہ ناممکن لگتا تھا۔ گزشتہ رات چودھری صاحب نے اپنایت کا جذباتی جال پھیلا کے مجھے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ پہلے میں نے ہامی بھرلی تھی کیونکہ مجھے اس وقت تک انتظار کرنا تھا جب تک ریشم کے لیے اور میرے لیے راستہ ہموار نہ ہوجائے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ انکار کروں اور مجھے قیدی بنا کے زبردستی روک لیا جائے۔ میں مصلحت اور سیاسی مفاہمت کے ساتھ آنے جانے کی مکمل آزادی حاصل کرتا... اور یہ اعتماد کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ پھر ہم میدان صاف دیکھتے تو نکل جاتے... بعد میں اس نے سلونی کے ساتھ جانے کا پروگرام بنا لیا تھا اور جب انور نے مجھے بتایا کہ وہ حویلی میں نہیں ہے اور سلونی جاچکی ہے تو مجھے

حیرانی بھی ہوئی تھی اور خوشی بھی... حیرانی اس لیے کہ سلونی نے صرف جانے کی بات کی تھی۔ مجھے بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ صبح نکل جائے گی۔ شاید اس وقت وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ رنگیلا اچانک آجائے گا یا وہ مکمل رازداری کے لیے ضروری سمجھتی تھی کہ مجھ پر بھی اعتماد نہ کرے۔

اب صورتِ حال یکسر بدل گئی تھی۔ سلونی نے انور سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ ملتان کے راستے کراچی جارہی ہے... یا شاید یہی سچ تھا۔ اس نے مجھے غلط بتایا تھا... ریشم کا معاملہ اب رہی اوپر دوسرے طریقے سے نمٹا دیا گیا تھا۔ وہ ایسی جگہ پہنچ گئی تھی جہاں سے نہ وہ خود نکل سکتی تھی اور نہ اسے میں نکال سکتا تھا۔ خود انور کے لیے ریشم تک رسائی ممکن نہ رہی تھی۔ نہ روزینہ اس کی اجازت دے گی اور نہ روزینہ کا باپ یہ ہونے دے گا۔ وہاں زور زبردستی یا بدمعاشی بھی نہیں چل سکتی تھی۔ پیر صاحب کا حفاظتی حصار بہت مضبوط تھا اور کوئی جگہ ہوتی تو انور اپنے بندوں کے ساتھ چڑھائی کرتا اور ریشم کو چھڑا لاتا۔

ریشم کا مستقبل غیر یقینی ہوگیا تھا۔ اس کا والی وارث کوئی بھی نہیں تھا اور اس کا خیرخواہ یعنی میں اور چاہنے والا یعنی انور بے بس تھے۔ لوگ مرنے والوں کو بھول جاتے ہیں۔ انور بھی بالآخر تھک ہار کے بیٹھ جائے گا اور ایک دن سوچے گا کہ اچھا ہی ہوا... جنات نے اسے بڑی آزمائش سے بچا لیا ورنہ دو بیویوں کا عذاب بھی کم نہ ہوتا... آگے جو ریشم کا مقدر... وہ کسی مریدِ خاص کو ہی عطا کی جاسکتی تھی اور خود پیر صاحب قبلہ اسے زوجۂ ثانی ہونے کا شرف عطا کر سکتے تھے۔

ریشم کے خیال نے اس رات مجھے بڑی پریشانی میں مبتلا رکھا۔ اگر وہ سلونی کے ساتھ چلی جاتی تو میں مطمئن رہتا کہ بہت جلد کسی نہ کسی طرح مجھے اس کے ٹھکانے کا علم ہو جائے گا۔ سلونی کے بارے میں انور نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا، وہ اس کے اشتعال اور بے بسی کے جذبات کی ترجمانی کرتے تھے۔ بلاشبہ سلونی کا ماضی ویسا ہی تھا جیسا انور نے کہا لیکن ماضی کو حال سے یا حال کو مستقبل سے جوڑ کے کسی پر ہمیشہ کے لیے معتوب اور قابلِ نفرت ہونے کا ٹھپا لگا دینا ایک غلط رویّہ تھا۔

ریشم اگر سلونی کے ساتھ ہوتی تو محفوظ رہتی اور مجھے اس کی کوئی فکر نہ ہوتی۔ شاید کسی دن میں بھی اس کو سہارا فراہم کرسکتا کہ وہ عزت کے ساتھ اپنے پیروں پر کھڑی ہو اور کسی دن اس کا گھر بھی آباد ہو۔ اسے وہ شخص ملے جو اسے عزت کے ساتھ شریکِ حیات کا مقام دے سکے اور تمام عمر اسے خوش رکھے... لیکن اب یہ مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آتا تھا۔ معلوم نہیں ریشم نے کیا سوچا تھا۔ اس نے بڑی ہمت سے خود کو انور کی محبت میں غرق ہونے سے بچایا تھا کیونکہ یہ محبت شفاف پاکیزہ اور پُرسکون پانی کی جھیل نہیں رہی تھی۔ یہ گٹر کے پانی سے بھری دلدل ثابت ہورہی تھی۔ اس جذباتی کمزوری کے بحران سے خود کو نکالنے کے لیے بڑی قربانی اور ہمت کی ضرورت تھی... ریشم اس میں کامیاب رہی تھی۔

بس اسے اندازہ نہ تھا کہ بدبختی کیسے گھات میں ہے اور وہ عذاب کے ایک جہنم سے نکلے گی تو زیادہ سخت عذاب کے دوسرے جہنم میں پہنچا دی جائے گی۔ جہاں سے موت کے سوا نجات کا راستہ بھی نہ ہوگا۔ میرا دل اس بدنصیب لڑکی کے لیے روتا تھا۔ اس نے مختصری زندگی میں بڑے نشیب و فراز دیکھ لیے تھے۔ جوانی کے رنگین خوابوں کا سفر کہاں سے شروع ہو کے کہاں ختم ہورہا تھا۔ وہ کہاں سے کہاں پہنچا دی گئی تھی۔ وہ اکبر کی ہوس کا شکار ہونے سے بچی تھی تو انور کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی اور اب ایک بے ضمیر... عیار اور سفاک پیر کے چنگل میں تھی۔ اس نے شاید اب بھی امید باندھ رکھی ہو کہ انور اسے چھڑانے آئے گا اور پھر اپنے ساتھ لے جائے گا... یا میں اس کا سراغ لگا کے کسی دن اچانک پھر اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے پہنچ جاؤں گا۔

لیکن یہ سب خام خیالی ریشم کے کام نہ آئے گی۔ میں الف لیلیٰ کی کہانی کا شہزادہ نہیں تھا جو اکیلا جا کے کالے دیو کی قید سے شہزادی کو چھڑا لاتا تھا۔

ایک دن اور رات میں امکانات کے صحرا میں خیالات کے گھوڑے دوڑاتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا ہوسکتا ہے اور کیا نہیں۔ اگلی رات انور خود میرے پاس آگیا۔ اس کا چہرہ ایک شکست خوردہ آدمی کی ذہنی کیفیت کا ترجمان تھا۔ وہ بھی شاید سویا نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور وہ بیمار نظر آتا تھا۔

"تو سارا دن باہر نہیں نکلا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں... میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"ہمیں ایک دوسرے سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے پتا ہے کہ تو ناراض اور پریشان تھا میری طرح۔"

"میں انور نہیں ہوں... ملک سلیم اختر ہوں۔"

"جھوٹ... تو ملک سلیم اختر بھی نہیں ہے۔ اور میں بھی وہ نہیں کہ جو تھا... میں نے ریشم کو دھوکا دیا۔ میں بڑا پھنے خان بنتا ہوں مگر میں محبت میں ثابت قدمی سے اس کے ساتھ کھڑا نہ رہ سکا۔ میں روزینہ کو قبول کرنے سے انکار نہ کرسکا حالانکہ دل سے میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری شریکِ حیات ہو۔"

میں نے کہا۔ "میں تیری بات سمجھ گیا۔"

اس نے ایک گہری سانس لی۔ "میں خاندانی زنجیروں کو توڑ نہیں سکا... بغاوت نہیں کرسکا... کچھ میری کمزوری... کچھ مجبوری... آج مجھے افسوس ہوتا ہے کہ میں واپس ہی کیوں آیا اس دلدل میں گرنے کے لیے۔"

"چل چھوڑ انور... جو ہونا تھا ہوگیا۔ تو اپنی شکست کا اعتراف کرے نہ کرے... کیا فرق پڑتا ہے... آگے کا سوچ۔"

"ابھی میرا دماغ ماؤف ہے... میں کیا سوچوں؟"

"دیکھ انور! رونے اور پچھتانے سے بھی کیا ہوگا۔ تقدیر سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔ اب تو اپنے گھر کی فکر کر... اتنی بڑی جائداد کا اکیلا مالک ہے، اس کو سنبھال... تجھ پر ماں باپ کی ذمے داریاں ہیں اور ایک بیوہ بھابی کی... تیرے سوا کون ہے ان کا... مجھے نہیں لگتا کہ شاہینہ ماں باپ کے گھر جا کے بیٹھے گی۔ ان کی بیٹی ہے... وہ سپورٹ کرسکتے ہیں۔ ان کے پاس بھی کسی چیز کی کمی نہیں۔ شاید خود بھابی یہ پسند نہ کرے... اور اگر وہ چلی بھی جاتی ہے تو روزینہ آجائے گی۔"

انور نے آہ بھری۔ "بڑے مسائل ہیں میرے سامنے۔"

میں پہلے ہی طے کرچکا تھا کہ اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے میں کیا کہوں گا اور کیا نہیں۔ "یہ تجھے بھی اندازہ ہوگا کہ تو جب روزینہ کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرے گا تو حالات مختلف ہوں گے۔ ہزاروں، لاکھوں لوگ جب مل کے زندگی کا سفر شروع کرتے ہیں تو ان کے درمیان امید اور اعتماد کا رشتہ ہوتا ہے۔ کوئی بدگمانی نہیں ہوتی... جو تمہارے درمیان ہوگی۔ مانا تو بہت فراخ دل ہو گیا ہے اور مراد سے روزینہ کے تعلق کو اہمیت نہیں دیتا... لیکن روزینہ آئے گی تو اس کو دہرے جذباتی دباؤ کا سامنا ہوگا۔ ایک یہ کہ وہ اتنی جلدی مراد کی موت کو نہیں بھلا سکتی... اسے تیری طرف سے بھی ڈر ہوگا کہ تو عام شوہروں کی طرح اس کی نوجوانی کی ایک جذباتی غلطی کو تمام عمر

معاف نہیں کرے گا اور اسے طعنے دیتا رہے گا۔"

"میں اتنا کمینہ اور کم ظرف نہیں ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے... لیکن روزینہ کو معلوم نہیں... تو اپنے رویّے سے اس کا یہ خوف دور کرے گا۔ اسے اعتماد کی بنیاد فراہم کرے گا۔ اس کا دوسرا مسئلہ ہوگا یہ احساس کہ تو اسے نہیں ریشم کو چاہتا تھا اور اس سے تو نے دباؤ کے تحت شادی کی ہے۔"

"یہ غلط بھی نہیں۔"

"مگر اس سچ کو کب تک زندگی میں زہر گھولنے کی اجازت دے گا تو... اس کو نہ جانے کتنا عرصہ تیرے ساتھ گزارنا ہے۔ ہوسکتا ہے اباجی کی طرح رفاقت کی نصف صدی پوری ہو... اپنے رویّے سے اس کو یقین دلانا تیرا کام ہے کہ مراد کی طرح ریشم بھی ماضی کا حصہ بن چکی ہے۔ ایک اس کی غلطی تھا... دوسری تیری... دونوں اسے بھلا چکے ہیں۔"

مجھے انور کی آنکھوں میں احسان مندی اور شکر گزاری کے جذبات محسوس ہوئے اور وہ کچھ پُرسکون ہوگیا۔ "تیری باتوں نے مجھے بڑا حوصلہ دیا ہے۔ مگر ریشم کا کیا بنے گا... یہ جن وغیرہ کے ڈھکوسلے کا تو میں قائل نہیں... مجھے معلوم ہے کہ اسے یہاں سے ہٹایا گیا ہے۔"

"تو روزینہ اور شاہینہ کی مرضی کے خلاف جائے گا تو بے سکونی یہاں رہے گی اور وہاں ریشم زیادہ غیر محفوظ ہو جائے گی۔ تو وہاں دخل بھی کیسے دے سکتا ہے... یہ کام تو مجھ پر چھوڑ دے۔"

"تو کیا کرے گا... وہ پیر تجھے کب گھاس ڈالے گا۔"

"میں بھی براہِ راست مداخلت کی بے وقوفی نہیں کروں گا۔ میں بات کروں گا چودھری صاحب سے؟"

"وہ کب ریشم کی واپسی پر تیار ہوں گے۔"

"میں بھی واپسی کی بات نہیں کروں گا۔ میں تیری طرف سے یہ یقین دہانی کراؤں گا کہ تیرا ریشم سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ اس کی گارنٹی میں دیتا ہوں۔ وہ بے شک وہاں رہے مگر اسے عزت آرام سے رکھا جائے۔ جن اتارنے کے لیے مریضوں کی طرح نہیں... یہ تو مشکل ہے کہ پیر صاحب اسے اپنی بیٹی جیسا سمجھ لیں۔ بڑے چودھری صاحب ان کی دو بیٹیوں کے سسر ہیں۔ ان کا ایک اخلاقی اور معاشرتی دباؤ ہے۔ ان کے مطالبے کو مسترد کرنا پیر صاحب کے لیے مشکل ہوگا۔ چودھری صاحب کو کسی دھمکی کی ضرورت نہیں کہ ان کی

نہ مانی گئی تو یہاں اس کی بیٹی کو بھی پریشانی ہوسکتی ہے۔ پیر صاحب نے دنیا دیکھی ہے... ہر بیٹی کے باپ کی طرح وہ منفی امکانات کو خود سمجھ لیں گے۔ یہ میں چودھری صاحب کو سمجھا دوں گا کہ وہ ریشم کے لیے درخواست نہ کریں... حکم دیں۔"

انور نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ "اباجی ہرگز نہیں کریں گے۔"

میں ہنسا۔ "وہ کریں گے انور... وہ میرا حکم ٹال نہیں سکتے۔"

"تیرا حکم؟ تو ان کو حکم دے سکتا ہے۔"

"ہاں، میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے آپ کی ہر بات مانی ہے آج تک... آپ کے کہنے سے میں یہاں رک گیا ہوں۔ میں گواہی بھی دوں گا۔ انور کا ساتھ بھی نبھاؤں گا اور اب تک اچھا کیا ہے تو آئندہ بھی جب تک یہاں ہوں، آپ کی ہر خدمت کروں گا۔ ہر بات مانوں گا۔ لیکن آپ کو میری یہ بات ماننا ہوگی۔ ریشم کو وہاں مکمل تحفظ ملنا چاہیے۔ کوئی تکلیف نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے مستقبل کی فکر کرنا میرا کام ہے۔ جب کوئی اچھا رشتہ ملے گا، میں اسے بھائی کی حیثیت سے رخصت کر دوں گا۔ یہ میری ذمے داری ہے۔ آپ میری خواہش پیر صاحب تک پہنچا دیں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ ریشم کو جن اتارنے کے بہانے اذیت نہ دی جائے اور اسے ایک امانت کے طور پر رکھا جائے۔ میری یہ بات بھی نہ مانی گئی تو پھر کیا فائدہ اس خاندان میں میری حیثیت کا... میں وہی بے عزت اجنبی ہوں... جس کی کوئی اوقات نہیں۔ میں یہاں کیوں رہوں... اور تو دیکھنا... چودھری صاحب میری بات مانیں گے... اور پیر صاحب سے بھی منوائیں گے۔"

انور نے آبدیدہ ہو کے میرے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور بولا۔ "تو کرسکتا ہے یہ کام ملک... مت پوچھ اس وقت مجھے کتنا سکون ملا ہے اور کتنا حوصلہ۔"

"بعد میں یہ ہوسکتا ہے کہ میں ریشم سے ملوں... اور ملتا رہوں۔ پیر صاحب کو بھی اندازہ ہونا چاہیے کہ میں اہم ہوں۔ وہاں وہ میری امانت کے طور پر رہے گی۔ میں خون کے رشتے سے کچھ نہیں مگر جذبات کے رشتے سے ریشم کا بھائی ہوں۔ پوری سنجیدگی اور ذمے داری کے ساتھ... اسے کوئی تکلیف ہوگی تو میں معاف نہیں کروں گا۔"

وہ نظر جھکا کے بولا۔ "ملک! میری طرف سے ریشم سے کہنا کہ مجھے معاف کر دے۔ میں بہت کمینہ اور کمزور

ثابت ہوا۔ میرا ہرگز ایسا ارادہ نہ تھا کہ اسے محبت کے نام پر دھوکا دوں اور رسوا کروں۔ بس حالات سے شکست کھا گیا میں۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ میں اس کے قابل نہیں تھا۔"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "پریشان نہ ہو۔ وقت سب سے بڑا چارہ گر ہے۔ بالآخر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم سب کی کوشش سے۔"

"تھینک یو ملک... تھینک یو ویری مچ... تیرے بہت احسانات ہیں مجھ پر... ایک احسان اور کر... مجھے معاف کر دے۔"

"کس بات پر؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"کل جو میں نے کیا... اور کہا۔"

"یار وہ غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ بھول جا اسے... اچھا اب میں ذرا بڑے چودھری صاحب کی مزاج پرسی کرلوں۔" میں نے ہنس کے کہا۔

بڑے چودھری صاحب کا دل پھر سنبھل گیا تھا اور ان کی زندگی کی مشین کے سارے کل پرزوں کو ایندھن فراہم کر رہا تھا۔ خون کی روانی برقرار تھی تو سانس چل رہی تھی۔ نبض چل رہی تھی۔ آنکھوں میں روشنی اور جسم میں حرارت برقرار تھی۔

سلام کے جواب میں انہوں نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ "کہاں تھا تو... کل سے شکل نہیں دکھائی... غصہ دکھا رہا تھا مجھے؟"

"کیسی بات کرتے ہیں آپ چودھری صاحب! انور کو معلوم ہے کہ مجھے کچھ بخار تھا۔ دوا کھا کے لیٹا رہا۔ آپ کی حالت تو مجھے بہت اچھی لگ رہی ہے۔ آپ کیوں بیمار بنے لیٹے ہوئے ہیں؟"

"بس پتر ملک! بندہ بڑا ناشکرا ہے۔ جب اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے، وقت بھی... تو اس کو قدر نہیں ہوتی... اس وقت وہ کسی اور کے بارے میں نہیں سوچتا... نہ اپنے انجام کے بارے میں... پھر ایک دن اچانک پتا چلتا ہے کہ وقت اتنا کم رہ گیا ہے اور کرنے والے کام بہت ہیں۔ یہ بھی اس کے اپنے دماغ کی بات ہے۔ بندے نے کیا کام کرنے ہیں۔ دنیا تو اوپر والا چلا رہا ہے۔ کوئی چار دن جی کے مرجاتا ہے کوئی چار سال... میں مرجاتا عین جوانی میں تو کیا وہ سارے کام نہ ہوتے جو میں نے کیے۔"

"آپ ایسی مایوسی کی باتیں مت کریں۔ ڈاکٹر جلالی کو بلا کے شطرنج کی بازی لگائیں۔ باہر جائیں گھومنے۔"

وہ اپنی بات کہتے رہے۔ "اب مجھے فکر ہو رہی ہے خوامخواہ کہ میرے بعد کیا ہوگا؟ حالانکہ پتا ہے سوئم ہوگا چہلم ہوگا جیسا سب کا ہوتا ہے مگر یہ آدمی کی فطرت ہے۔ دو پتر تھے میرے... جب وقت تھا تو میں نے نہیں سوچا کہ میرے بعد یہ کیا کریں گے۔ میرے باپ نے ہم دونوں کے لیے سوچا ہوگا جبھی تو مرنے سے پہلے دونوں کا فیصلہ کر گیا۔ ایک کو ادھر کا مالک بنا دیا دوسرے کو ادھر کا... ہم کس بات پر لڑتے۔ اب ایک رہ گیا ہے تو مجھے دن رات خیال رہتا ہے کہ ایسا ہی میں کرتا تو شاید یہ نہ ہوتا... کسی کے ساتھ زیادتی کا الزام مجھ پر نہ آتا۔ اب اس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ انور کی طرف سے میں ناخوش ہوں۔ میں نے اس کے ساتھ بھی اچھا نہیں کیا۔ معلوم ہے کیا غلطی کی میں نے... میں نے اسے پڑھنے کے لیے باہر بھیج دیا۔"

"یہ تو آپ نے بہت فراخ دلی کا اور روشن خیالی کا ثبوت دیا تھا۔"

وہ طنز سے ہنسا۔ "سب کہنے کی بات ہے۔ کیا فائدہ ہوا اسے یا مجھے... الٹا اس کا دماغ بھٹک گیا۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ ساری ذمے داری اس نے مجبوری میں قبول کی ہے... وہ خوش نہیں ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں چودھری صاحب۔"

"ایسی بات ہے... میں جانتا ہوں۔ وہ باہر رہتا تو بہت خوش ہوتا۔ کل سے مجھے لگتا ہے کہ اس کی شادی کے معاملے میں زبردستی کرکے بھی میں نے اچھا نہیں کیا۔ وہ اس شادی سے بالکل بھی خوش نہیں ہے اور وہ ناخوش رہے گا ساری عمر... جیسے اکبر رہا۔ اور اس کی بیوی کو یہ ناخوشی بھی قبول کرنا پڑی۔"

"آپ سمجھتے ہیں کہ اکبر بھی شاہینہ کے ساتھ خوش نہیں تھا؟"

"یار! کیوں نہیں سمجھوں گا میں... آخر باپ ہوں۔ چوبیس گھنٹے دیکھتا ہوں، سنتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں۔ کیا ضرورت تھی مجھے اس زبردستی کی... اپنے فیصلے کو انا کا مسئلہ بنانے کی؟"

میں نے کہا۔ "یہ احساس آپ کو کل کیوں ہوا؟"

"کل سے دیکھ رہا ہوں انور کا حال۔"

"آپ اجازت دیں تو میں کچھ عرض کروں؟"

چودھری نے حقے کی ربر والی نلکی اٹھالی جو خادم ابھی رکھ کے گیا تھا۔ "یہ عرض کرنا کیا ہے... بول... تو کیا اکبر بادشاہ کے سامنے کوئی غلام ہے جس کو ڈر ہے کہ تلوار سے اس کا سر اڑا دیا جائے گا اگر ایک لفظ غلط بولا..."

www.paksociety.com

میں نے کہا۔ ”ریشم کو گھر سے نکال کے آپ نے اچھا نہیں کیا۔“

چودھری اپنی ٹینشن کو دھوئیں میں اڑاتا رہا۔ ”اس پر جن آتے تھے۔“

”آپ جانتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔“

”صحیح کیا ہے؟“ اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

”روزینہ... اس کی بہن... انور کی ماں... ان سب کو حویلی میں ریشم کا وجود برداشت نہیں تھا۔ وہ جن کی طرح انور پر سوار تھی۔ آپ سب نے انور کو بچایا... جن کو نکال دیا۔ مگر حویلی پر اس کا آسیب سوار ہے۔ آپ چاہتے تھے کہ میں ریشم سے شادی کرلوں۔ یہ ناممکن تھا... چنانچہ آپ نے اسے جلاوطن کر کے پیر صاحب کے حوالے کردیا۔ یہ آسان تھا۔ آپ نے بہت ظلم کیا چودھری صاحب! انور پر... ریشم پر... اور مجھ پر بھی۔“

خاموشی کے ایک اور اعترافِ جرم جیسے وقفے میں چودھری اپنے غصے سے لڑتا رہا۔ ”ہر آدمی پہلے اپنے گھر کو دیکھتا ہے۔“

”کیا یہ صرف آپ کا گھر ہے؟ اور آپ تو خود محسوس کرتے ہیں کہ یہ دوسرا غلط فیصلہ تھا۔“

”میں کیا کرتا... ان تینوں کی نہ مانتا... جن کو ڈر تھا کہ انور اس سے دوسری شادی کرلے گا۔“

”یہ خطرہ تو دور نہیں ہوا۔ اب بھی قریب ہے... آپ کو معلوم ہے کہ پیر صاحب جن اتارنے کے بہانے اسے قبر میں اتار دیں گے؟ یہ قتل تو نہیں کہلائے گا نا۔ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ ایسے ضدی جن ہوتے ہیں جو بہو، بیٹیوں کی جان لے کر ہی نکلتے ہیں۔ اس سے پیر صاحب کی روحانی عظمت پر حرف نہیں آتا۔ آپ جانتے ہیں کہ بالآخر یہی ہوگا۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔“ چودھری نے کمزور لہجے میں کہا۔

”پھر کیا ہوگا؟ ایک نئی شرح کے مطابق یہ ہو سکتی ہے کہ پیر صاحب اس کو اپنے نکاح میں لے لیں۔ کون ہے ان کو روکنے والا... ایک پرانی بیوی تو چوں نہیں کرسکتی... ان کا ضمیر بھی بڑا ڈھیٹ ہے۔ وہ داماد کی ہونے والی بیوی کو بزورِ بازو اپنی بیوی بنا سکتے ہیں اور انور سے شرمندہ ہوئے بغیر نظر ملا کے بات بھی کر سکتے ہیں۔“

”یہ سب تُو سوچ رہا ہے۔“ چودھری برہم ہوگیا۔

”چودھری صاحب! ریشم کے سامنے مرنے کے دو راستے ہیں۔ وہ جن اتروانے کے روحانی عمل سے گزر کے اسی طرح جان دے جیسے تھانے میں زیرِ تفتیش مجرم مرجاتے ہیں۔ الزام پولیس پر نہیں آتا۔ اس موت سے پہلے پیر اور مرید سب اس کے جوان جسم سے مستفید ہوں۔“

”تُو حد سے بڑھ رہا ہے ملک۔“

میں بولتا رہا۔ ”یہ سب ہوتا ہے چودھری صاحب! دوسری طویل عذاب والی موت عمر قید جیسی ہے۔ جب وہ پیر صاحب کی زوجۂ ثانی کے منصب پر فائز ہو اور اسے ریشم کی خوش بختی قرار دیا جائے۔ شاید یہ انور سے برداشت نہ ہو۔ بہتر ہوتا آپ ریشم کو خود ٹھکانے لگا کے اسی طرح گاڑ دیتے جیسے اکبر کو زہر آلود کھانا دینے والی ملازمہ کو گاڑ دیا گیا۔ پہلے نہ جانے کتنے اس زندگی کے عذاب سے چھوٹے۔“

چودھری نے چلاتے ہوئے حقے کی نَلکی مجھ پر ماری۔ ”دفع ہو جا یہاں سے کتے... میرے سامنے بھونکتا جا رہا ہے۔“

چند گالیاں میں نے مسکراتے ہوئے سنیں اور ان کے کمرے سے نکل آیا۔ ان کی آواز کی گونج حویلی میں سنائی دی۔ کچھ دیر بعد انور میرے پاس آیا۔ ”اباجی کی طبیعت پھر بگڑ گئی ہے۔“

”ڈاکٹر جلالی کیا کہتا ہے؟“ میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”تُو کیا کہتا رہا ہے ان سے... اگر انہیں کچھ ہو گیا تو...“

”تو... ان کی وفات حسرتِ آیات کا ذمے دار مجھے سمجھا جائے گا؟ میرا منہ مت کھلوا انور... اکبر کی موت کا ذمے دار کون تھا؟“

”یہ مجھے نہیں معلوم...“

”یہ کسی کو نہیں معلوم۔“ میں نے انور کی بات کاٹ دی۔ ”اور سب کو معلوم ہے؟“

”میں لڑنے نہیں آیا۔ نہ میں تجھے ذمے دار سمجھوں گا۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ تیرے خلاف بلاوجہ باتیں ہوں گی۔“

میں نے انور کو اپنی اور چودھری کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو سنا دی۔ ”ان کا غصہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ میں نے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ سچ کی تلخی ان سے برداشت نہیں ہوئی مگر یہ ری ایکشن مجھے امید دیتا ہے کہ وہ پھر مجھ سے بات کریں گے۔“

انور نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ سب سن کیسے لیا انہوں نے؟“

”جھوٹ سننے سے انکار کیا جا سکتا ہے... سچ سننا پڑتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ وقت لگ جائے۔ مگر ان کا ذہن آہستہ آہستہ سچ کو قبول کرے گا۔ میں پیر صاحب کے نمائندۂ خصوصی سے ملاقات کی توقع بھی رکھتا ہوں۔“

انور نے مجھے سوالیہ الجھن سے دیکھا۔ ”کون؟“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”سوچ... کون ہے چودھری صاحب سے بڑھ کر ان کے ساتھ قریبی تعلق کا دعوے دار؟“

”شاہینہ۔“

”رائٹ... میں خود اس سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ڈپلومیسی ہے۔ وہ احتجاج کرنے آئے گی۔ اس سے میں وہ سب کچھ کہہ سکتا ہوں جو چودھری صاحب سے کہا... لیکن کسی لحاظ کے بغیر... اسے تو دھمکی بھی دی جا سکتی ہے کہ میں تمہارے فراڈیے باپ کو گولی مار دوں گا... یا وہ مجھے پہلے مار دے... ریشم ماری گئی تو کیس کسی عدالت میں نہیں جائے گا جیسے مراد کا گیا۔“

”وہ تجھ سے بات نہیں کرے گی۔“

”کیوں؟ تُو نے روک دیا ہے اسے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں، وہ حد سے بڑھ رہی ہے۔ اکبر نہ سہی... میں تو ہوں اس حویلی کی عزت و آبرو کا رکھوالا۔“

انور نے وہ منظر دیکھا تھا جب شاہینہ احتجاج کرنے آئی تھی۔ اس ایک پنچ کے وقت جو میں نے انور کی ناک پر رسید کیا تھا اور انور نے مجھے دروازے میں پھنسی شاہینہ سے رگڑ کھا کے نکلتا دیکھ لیا تھا۔ جو نتیجہ اس کے ذہن نے اخذ کیا، اتنا غلط بھی نہ تھا۔

میں نے کہا۔ ”ابھی کس کس کا نام غیرت مندی کے قتل والوں کی فہرست میں شامل کر رکھا ہے تُو نے... شاہینہ کے بعد روزینہ ہے... پھر صاحب سسر محترم کا نام بھی آ سکتا ہے اس میں... اگر انہوں نے ریشم کو شرعی تحفظ فراہم کرنے کا سوچا۔ بن گیا رقیب آخر تھا جو سر اپنا۔“

”ملک! سب کے خلاف زہر افشانی کر کے سب کی دشمنی مول مت لے... اتنا ہی سچ بول جتنا برداشت کیا جا سکے۔“

میں نے کہا۔ ”میرے دماغ میں کوئی ابہام نہیں۔ تُو پیچھے ہٹ چکا ہے کیونکہ تیری پوزیشن روزینہ کی وجہ سے خود ریشم کی نظر میں خراب ہو چکی ہے لیکن میں ریشم کے لیے وہی جذبات رکھتا ہوں جو تھے۔ مجھے اس کو تحفظ فراہم کرنا ہے، خواہ اس میں میری جان چلی جائے۔ میں اس کو ہرگز یہاں واپس نہیں لانا چاہتا۔ تجھ پر نہ کوئی اخلاقی دباؤ ہوگا نہ جذباتی۔ یا اسے میرے حوالے کر دیا جائے اور مجھے اس کے ساتھ جانے کی اجازت دی جائے یا اسے اتنی ہی غیرت اور حفاظت کی گارنٹی حاصل ہونی چاہیے جو آج روزینہ کو ہے۔ اس کے وہاں رہنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف زبردستی نہ ہو۔“

”تو پیر صاحب کی پگ نیچی نہیں کرسکتا۔“

”مجھے کوئی خواہش بھی نہیں ہے۔ جو ہوا کسی کو معلوم نہیں، جو ہوگا وہ بھی اندر کی بات ہے، کسی کو معلوم نہیں ہو گی... یہ کام چودھری صاحب کا ہے۔ وہ مجھے رکھنا چاہتے ہیں تو میرے لیے کچھ کریں۔ وہ اپنی بہو کو بھی کہہ سکتے ہیں کہ باپ کو سمجھائے ورنہ ان کے پاس ’ورنہ‘ کا ہتھیار ہے... اور تو مطمئن رہ... چودھری صاحب اتنی جلدی ہمارا ساتھ چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ وہ جیسے چل رہے ہیں، چلتے رہیں گے۔“

”یہ تو کیسے کہہ سکتا ہے اتنے یقین کے ساتھ؟“

”کیا ڈاکٹر جلالی نے انہیں ناقابلِ علاج اور ان کی حالت کو دیکھتے ہوئے دوا کی جگہ دعا کا فارمولا اپنا لیا ہے؟ نہیں... اس کی کسی بات سے ناامیدی ظاہر نہیں ہوتی۔ وہ پرامید نہ ہوتا تو علاج جاری نہ رکھتا۔ یہ کام نہ وہ دباؤ میں کر رہا ہے اور نہ لالچ میں... بے شک وہ خود بہت مایوس ہیں، پچھتاوے کے ڈپریشن میں مبتلا ہیں مگر وہ چاہتے ہیں کہ جو غلط ہوا، اس کو صحیح کر دیں... اور مرنے سے پہلے کر دیں۔“

انور اٹھا۔ ”میں ذرا دیکھ لوں انہیں۔“

میں نے کہا۔ ”انور! ایک بات تجھ سے بھی کہنی تھی۔“

اس نے مجھے سوالیہ نظر سے دیکھا۔ ”صرف ایک بات؟“

”ہاں، ابھی ایک بات... اگر میں رہتا ہوں تو پھر مجھ پر اعتماد رکھ... اگر میں سب کی طرح گھر کا فرد ہوں تو بھابی کے معاملے میں مجھے غیر مت بنا۔ ایک بار وہ تجھے جواب دے چکی ہے میرے سامنے... دوسرا موقع نہ آئے تو اچھا ہے۔“

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر جواب دیے بغیر چلا گیا۔ میں لگی لپٹی رکھنے کا قائل نہیں رہا تھا۔ ریشم کے یوں زبردستی نکالے جانے کو انور نے اتنا سیریس نہیں لیا تھا جو اس کی خودغرضی تھی اور کمینگی... مجھے اس واقعے نے جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا لیکن پاگل نہیں کیا تھا۔ ابھی عقل کی کمان میرے ہاتھ

میں تھی۔ میں نے اپنا ری ایکشن ظاہر کر دیا تھا اور میری خواہش تھی کہ ریشم کو جلد از جلد تحفظ مل جائے۔ تاہم یہ فقط آرزو کی بات نہیں تھی۔ میں جلد بازی میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا جس سے نہ مرض رہے نہ مریض۔

میری پیشن گوئی کسی عالم غیب کی طرح ثابت ہوئی۔ شام کے وقت میری چودھری صاحب کی طرف سے پھر طلبی ہوئی۔ میں گیا تو وہ پھر نارمل تھے۔ دوا، دعا اور جینے کی خواہش سب کا مشترکہ اثر تھا۔

"ادھر بیٹھ بندے دا پتر بن کے۔" انہوں نے حکم دیا۔

میں بیٹھ گیا۔ "اور آپ کھڑے ہو جائیں... باہر نکل کے واک کریں یا ڈاکٹر جلالی کی رولز رائس میں لانگ ڈرائیو پر جائیں۔"

"اچھا۔" انہوں نے کچھ دیر سوچا۔ "تُو کیوں نہیں لے جاتا مجھے؟"

میں نے کہا۔ "میری خوش قسمتی ہوگی اگر آپ مجھے خدمت کا موقع دیں گے۔"

انہوں نے ہاتھ بڑھایا۔ "اٹھا مجھے... گاڑی کدھر ہے؟"

میں ان کو برآمدے تک لایا۔ اتنی دیر میں گاڑی سامنے آگئی۔ پسنجر سیٹ پر بیٹھ کے انہوں نے حکم دیا۔ "اور کوئی نہیں ہوگا ہمارے ساتھ۔" ڈرائیور فوراً اتر گیا اور اس کی جگہ میں بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھ سے اکیلے میں بات کریں گے اور میرے ساتھ باہر جانے کا مقصد بھی یہی ہے۔ ان کی ہدایات کے مطابق میں گاڑی کو نہر کے کنارے آہستہ آہستہ چلاتا گیا۔ ایک جگہ انہوں نے رکنے کے لیے کہا۔ یہ نہر کا موڑ تھا اور یہاں گھنے درخت تھے جو پانی پر جھکے ہوئے تھے۔ درمیان میں پرانے وقتوں کی سیمنٹ کی بینچ لگی ہوئی تھی۔

"میں نے تیری بات پر غور کیا... مگر ملک... یہ مشکل ہے۔" انہوں نے بیٹھنے کے بعد کہا۔

"مشکل کچھ نہیں چودھری صاحب! اگر آپ کوشش کریں... لیکن آپ نے کوشش بھی نہ کی تو میرے لیے بھی مشکل ہوگی' میں بھی وہ نہیں کر سکوں گا جو آپ چاہتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ پھر میرا حویلی میں بھی رکنا مشکل نہیں ناممکن ہو جائے گا۔ اگر یہاں میری بات کی کوئی اہمیت نہیں... کہنے سے کوئی اپنا نہیں ہوتا... غیر ہی رہتا ہے۔"

"تُو بلیک میل کر رہا ہے مجھے؟"

"آپ یہی کہہ سکتے ہیں لیکن کوئی میری معمولی سی بات نہ مانے تو پھر مجھ سے اتنی توقعات کیوں... آپ میرے لیے زبان نہیں ہلا سکتے۔ کچھ بھی نہیں کرنا تھا آپ کو پیر صاحب سے فون پر بات کرنے کے سوا... آپ انہیں بلا کے بھی بات کر سکتے تھے... ڈر کس کا ہے آپ کو... وہ بھائی ہیں آپ کے... اگر آپ ان کی مانتے ہیں اور اپنی زبان کا پاس رکھتے ہیں... تو ان سے اپنی بات کیوں نہیں منوا سکتے؟"

"تو نہیں سمجھتا... اگر اس نے انکار کر دیا تو میری بے عزتی الگ ہوگی... تعلقات الگ خراب ہوں گے۔"

"چلیں آپ خود بات نہ کریں... اپنی بہو سے کہیں... وہ باپ سے بات کرے... بہو تو انکار نہیں کر سکتی آپ کو... کہنا صرف یہ ہے کہ اس کا جن نہ اتاریں... وہ ٹھیک ہے... اسے عزت اور حفاظت کے ساتھ اپنے گھر کے ایک کمرے میں رکھیں... اور یہ مطالبہ ہے دو لڑکیوں کے سسرال کی طرف سے... آپ روزینہ سے بھی کہہ سکتے ہیں... اتھارٹی کے ساتھ۔"

چودھری چپ بیٹھا بائیں جانب غروب ہوتے سورج کو دیکھتا رہا۔ "تو نہیں جانتا ملک... اس سے بڑے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔"

"آپ کے لیے کیسے مسائل؟"

"تو سیانا بندہ ہے۔ سمجھنے کی کوشش کر... وقت کی کمان میرے ہاتھ سے نکل گئی ہے کیونکہ... میری حکومت ختم ہو گئی ہے۔ زندگی خدا حافظ کہہ رہی ہے۔ میرے جانے کا وقت آگیا ہے اور جانے والے افسر کی مانتا ہے کوئی؟ آنے والے کا انتظار کرتے ہیں سب۔"

"بات وہی ہے چودھری صاحب! آپ حکم عدولی سے نہیں، اپنی بے عزتی کے خیال سے ڈرتے ہیں۔ آخر میں نے مانی ہے نا آپ کی بات... دوسرے سب بھی مانیں گے اور انکار کرتے ہیں تو کر دیں... آپ کہہ کر تو دیکھیں... صاف کوئی نہیں کہے گا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ ان کا انکار یوں سامنے آئے گا کہ کچھ نہیں ہوگا... دو چار دن میں پتا چل جائے گا۔"

"اور اس کے بعد؟"

میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "پھر آپ کچھ نہ کریں... میں کروں گا جو کرنا ہے... اپنی ذمے داری پر۔"

"پاگل مت بن... اس پیر سے تُو فکر نہیں لے سکتا... مارا جائے گا۔"

"تیسرا کوئی راستہ نہیں چودھری صاحب... میرے ساتھ کیا ہوگا، اس کی آپ فکر نہ کریں۔ کم سے کم مجھے یہ افسوس نہیں ہوگا کہ میں کچھ نہ کر سکا اور مارا گیا۔ میں اپنے ضمیر پر یہ بوجھ لے کر نہیں جینا چاہتا۔"

"تو یہ نہر دیکھ رہا ہے؟ انگریز نے نکالی تھی ہماری زمینوں پر سے... دونوں طرف والوں کو کتنا فائدہ پہنچا اس سے سو سال میں... کتنا پانی یہاں سے بہہ کر گیا... تین چوتھائی صدی میں نے گزار دی یہ دیکھتے ہوئے... نہر کی عمر مجھ سے زیادہ ہے... یہ زیادہ جانتی ہے کہ اس میں کتنی لاشیں بہائی گئیں... ٹکڑے ٹکڑے کر کے..." وہ نہر کے پار خلا میں دیکھتا رہا۔

میں اب نہر کے پانی میں پیر لٹکائے بیٹھا تھا۔ "کیا آپ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایسے ہی ریشم کی اور پھر میری لاش بھی یہ نہر بہا لے جائے گی اور کچھ نہیں ہوگا؟" میں نے پلٹ کے پوچھا۔

"ریشم کا کیا پتا تجھے..." چودھری نے آہستہ سے کہا اور شیروانی کی جیب میں سے ہاتھ نکالا۔ اس میں ایک ریوالور تھا۔

میں اپنی جگہ سن ہو گیا۔ "یعنی... ریشم کے ساتھ ایسا ہو چکا ہے... یہی بتانے کے لیے آپ مجھے یہاں لائے تھے؟"

"یہ تو میں گھر پر بھی بتا سکتا تھا تجھے..." اس نے ریوالور کا رخ میری طرف کر دیا۔ "یہی نہر تجھے لائی تھی یہاں... اب آگے لے جائے گی تو دس بیس کوس آگے کون ریشم ہوگی جو تجھے زندہ نکال لے... سمجھ لینا کہ تیرے سفر میں وقفہ آگیا تھا۔"

میں اپنی جگہ منجمد بیٹھا تھا۔ میرے اور چودھری کے درمیان چند فٹ کا فاصلہ تھا۔ میں زندگی اور موت کے درمیان حائل تھا۔ ابھی مجھے خیال آیا ہی تھا کہ ہار جانے والے جواری کی طرح اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا دوں کہ چودھری کے ریوالور کا رخ بدل گیا۔ اس نے ریوالور نیچے کیا اور پھر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"کیسا لگا تھا تجھے... موت کو اچانک سامنے دیکھ کر؟" چودھری مسکرایا۔ "مجھے کوئی مسئلہ نہ ہوتا... میں کہتا کہ تُو بہانے سے یہاں لایا تھا مجھے... تو مجھے قصوروار سمجھتا تھا... جو کچھ ریشم کے ساتھ ہوا اس کا... اور مجھے مار کے نکل جاتا کہیں... لیکن چودھری کے جتنے جن تھے، اس سے کہیں زیادہ دشمن..."

"چودھری صاحب! کیا واقعی ریشم کے ساتھ... یہ ہو چکا ہے؟"

چودھری ہنسا اور کھڑا ہو گیا۔ "اوئے جھلیا... میں تو حوصلہ دیکھ رہا تھا تیرا... تُو ہے مرد کا بچہ... تجھ پر بھروسا کر کے میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔"

"لیکن یہ ڈراما کیوں کیا آپ نے؟"

وہ آہستہ آہستہ گاڑی کی طرف چلنے لگا۔ "ایک احسان کا بوجھ ڈالنا تھا تجھ پر۔"

میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ "کیسا احسان؟"

"میں نے تیری زندگی تجھے بخش دی۔ ایک بار پھر بچ گیا تُو... جیسے پہلے نہر میں ڈوب کے نہیں مرا تھا۔"

"یہ کس قسم کا احسان ہے چودھری صاحب... اور آخر کیا چاہتے ہیں آپ مجھ سے یہ احسان کر کے؟"

"بندہ ہو تیرے جیسا تو احسان کا بدلہ اتارتا ہے۔ احسان فراموشی نہیں کرتا۔ تو بھی نہیں کرے گا اب اگر سوچے گا... بہت سوچ سمجھ کے میں نے ہی انور کی ذمے داری سونپی ہے تجھے... وہ ذرا جذباتی ہے اور اس نے یہ سب بوجھ نہیں اٹھایا... ذمے داریوں کا... دشمنیوں کا اور رشتوں کا... کچھ دن میں سب آجائے گا... اس وقت تک سہارا دے اسے۔"

"میں سوچ رہا ہوں کہ احسان فراموشی آسان ہے۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "فکر نہ کر... میں بات کرتا ہوں پیر صاحب سے... اور شاہینہ سے بھی کہوں گا کہ باپ کو اچھی طرح سمجھائے۔ روزینہ سے میں نہیں بات کروں گا... ساس کی زبان بہوؤں کی سمجھ میں جلدی آجاتی ہے۔ مگر اس کا دبیں رہنا اچھا ہے... سب کے حق میں۔"

"آج مجھے یہ بھی بتا دیں کہ میری ذمے داریوں کی قید کب ختم ہوگی؟"

"جہاں تک تو محسوس کرے، وہی حد ہے۔" وہ ایک فلسفیانہ جواب دے کر مطمئن اور خاموش ہو گئے۔

حویلی کے اندر کی دنیا اب بظاہر سکون اور ٹھہراؤ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے مکینوں کی زندگی میں آنے والے دو بڑے زلزلے تباہی کے جو آثار چھوڑ گئے تھے، ان کا اثر کم

ہونے لگا تھا۔ پہلا زلزلہ اکبر کی موت یا اس کے قتل سے آیا تھا جو سب سے شدید تھا۔ اس سے پہلے خاندان کی بنیادوں کو مراد کے قتل نے ہلا دیا تھا جس سے دونوں خاندانوں کی عزت آبرو کا فلک بوس مینار گر جاتا مگر دونوں بڑوں نے تمام غیر اخلاقی یا غیر قانونی ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے ایسا نہیں ہونے دیا تھا۔ گو میں یہ محسوس کرتا تھا کہ جھوٹی عزت کے اس مینار کی بنیادیں ہل جانے کے بعد خاندان کے نام و نسب پر غرور کا مستقبل مخدوش ہو چکا تھا۔ تیسرے زلزلے کے اثرات کو سب سے زیادہ میں نے محسوس کیا تھا۔ ریشم کی ذات اس کا مرکز تھی۔ افسوسناک بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انور نے خود کو محفوظ رکھا تھا۔ اس نے محبت کو مصلحت پر قربان کر دیا تھا اور ذرا بھی شرمسار نہ تھا۔ الٹا اس نے اپنی جان چھوٹ جانے پر سکھ کا سانس لیا تھا۔

مجھے اب شدت سے احساس ہونے لگا تھا کہ میں کسی معقول وجہ کے بغیر اس دلدل میں اترتا جا رہا ہوں۔ میرا اس خاندان کے معاملات اور مسائل سے کیا لینا دینا اور میں کیوں خود کو آزمائش میں ڈالوں؟ میں صرف ریشم کی طرف سے اخلاقی ذمے داری پوری کرنے کا پابند تھا کیونکہ اس نے میری زندگی بچائی تھی اور زبانِ خلق کی پروا کیے بغیر مجھے اپنے گھر میں اعتماد کے ساتھ رکھا تھا۔ ایسی ہی اخلاقی جرأت کا مظاہرہ ریشم کے مرحوم باپ نے بھی کیا تھا۔ کسی حد تک میں انور کے احسان کا مقروض بھی تھا جس نے مجھے مکمل پناہ، تحفظ اور ایک نئی شناخت دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ آج میں محسوس کرتا تھا کہ اسے اپنی زندگی کے اصل مسائل اور خطرات کی سچائی بتانا میری جذباتی غلطی تھی کیونکہ انور اب وہ پہلے والا انور نہیں تھا جس پر میں نے بھروسا کیا تھا۔

جب ریشم کو انور نے محبت کی بنیاد پر اپنی زندگی میں شریک کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو میں بہت مطمئن تھا اور وہی وقت تھا جب آسانی سے اپنی جستجو کے سفر کی اگلی منزل کے لیے روانہ ہو سکتا تھا۔ یہ احساسِ جرم ہمیشہ میرے لیے باعثِ آزار تھا کہ میں نے نورین کو بھلا دیا۔ میں اسے بھولا نہیں تھا۔ ایک حادثے کے بعد اس سے دور ہو گیا تھا۔ اگر میں اس وقت نکل جاتا تو مجھے پتا ہی نہ چلتا کہ بعد میں ریشم اور انور کی لو اسٹوری کا کیا ٹریجک انجام رہا۔ انور نے کیسے بے وفائی کی... ریشم کا دل توڑا اور اسے اپنی زندگی سے نکال کے روایتی انداز میں خاندانی بیوی بیاہ لایا۔

آج ریشم کو ایک جعلی پیر کی قید میں چھوڑ کے جانا ناممکن تھا۔ اس حادثے کے بعد میرے فرار کا ارادہ متزلزل ہو گیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی حویلی کے اندر سب نے سازش کا جال پھیلا کے مجھے اسیر بنا لیا تھا۔ انہوں نے دوستی کے نام پر تمام ذمے داریوں کا بوجھ مجھ پر ڈال دیا تھا۔ شاہینہ ایک جادوگرنی یا خوب صورت بلا تھی جس نے مجھے دامِ ہوس میں اسیر کیا تھا اور اب چودھری صاحب نے مجھے اپنا بنا کے اور پتر کا درجہ دے کر روک لیا تھا۔ میرے حق میں یہی بہتر تھا کہ میں سارے بندھن توڑ کے نکل جاؤں۔

میرے پیروں کی واحد زنجیر ریشم تھی۔ میں اسے چھوڑ کے نہیں جا سکتا تھا اور اگر اسے اغوا کر کے پیر صاحب کی قید میں نہ ڈالا جاتا تو وہ سلونی کے ساتھ نکل جاتی۔ پھر میں دیر نہ کرتا۔ اب پہلا مرحلہ اس کو تحفظ فراہم کرنے کا تھا۔ اس میں میرا پلان خاصا کامیاب جا رہا تھا۔ چودھری نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ ریشم کو باعزت طور پر واپس لانے کے حق میں تو نہیں ہے مگر پیر صاحب کے آستانے پر یا گھر میں وہ بالکل محفوظ ہوگی اور آرام سے رہے گی۔ اس نے خود بات کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ بیوی کے ذریعے روزینہ پر اور شاہینہ پر دباؤ ڈالنے کے طریقے سے بھی اتفاق کیا تھا کہ وہ اپنے باپ کو مجبور کر سکتی ہیں... اور اب یہ حکم اگر بیٹیوں کے سسرال کی طرف سے ملے تو بیٹیوں کا باپ آسانی سے ٹال نہیں سکتا۔

اس سے اگلے مرحلے میں مجھے ریشم سے رابطہ قائم کرنا تھا۔ میں انور کے ساتھ اس سے ملنے جا سکتا تھا اور انور کا راستہ سسرال میں کون روکنے والا تھا۔ میں روایتی طریقے سے یہاں کی یا پیر صاحب کے گھر کی کسی ملازمہ کو استعمال کر سکتا تھا اور بالآخر ریشم کو نکال کر فرار ہونے کے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا۔ پہلا مرحلہ میری کوشش اور خدا کی مدد سے آسان ہو چکا تھا۔ دوسرا مرحلہ مشکل تھا اور ذہانت، چالاکی، عیاری کے تمام حربوں سے آسان بنایا جا سکتا تھا۔ اصل مرحلہ تیسرا تھا جو خطرناک تھا اور جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ مجھے بہت محتاط ہو کے آگے بڑھنے کی ضرورت تھی۔ فی الحال تو میں آنے والے دو دنوں میں پہلے مرحلے کی کامیابی دیکھنا چاہتا تھا۔ اگر چودھری نے وہی کیا جو کہا تھا تو مجھے کل پرسوں میں یہ خوش خبری مل جائے گی کہ ریشم کو ان مریضوں سے نکال کے جن پر جن آتے تھے پیر صاحب کی رہائش گاہ میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس کی تصدیق انور کے ذریعے بھی ممکن تھی اور میں اصرار کر سکتا تھا کہ مجھے اس سے ملنے کا موقع دیا جائے۔ مجھے ایک اندرونی بے چینی تھی۔ یہ آرزو مجھے مغلوب کرتی تھی کہ کوئی معجزاتی اتفاق ہو اور میں اٹھوں تو

ریشم میرے سامنے ہو۔ وہ زار و قطار روتی مجھ سے لپٹ جائے اور میں اسے تسلی دوں کہ چل بس کر... اتنی بہادر لڑکی روتی ہوئی اچھی نہیں لگتی۔ اب ہم یہاں نہیں رہیں گے کیونکہ تو بھی آ گئی ہے۔ اکیلا تو میں جا نہیں سکتا تھا مگر دنیا میں ہر شخص کی ہر خواہش کسی معجزے سے پوری نہیں ہو سکتی۔ ریشم کے لیے میری کوشش ہر جواری جیسی تھی جو آخری کوڑی ہارنے تک کھیلتا ہے۔

خواب آرزو کی تعبیر شاہینہ کے روپ میں میرے سامنے آئی۔ رات کو دیر تک اپنی ذہنی الجھنوں سے لڑتا اور پریشان کن خیالات کی یلغار میں بیٹھ کے کروٹیں بدلتے رہنا ایک معمول بن گیا تھا۔ ہر رات میں دیر سے سوتا تھا۔ نیند بھی اب پُرسکون نہیں ہوتی تھی۔ اگر جسم سوتا تھا، تب بھی دماغ جاگتا رہتا تھا اور میں اندیشوں کو خواب کے روپ میں دیکھتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ میں صبح جاگتا تھا تو فریش اور تازہ دم نہیں ہوتا تھا۔ یا میں دیر تک سویا پڑا رہتا تھا۔ یہاں وقت اور ذمے داری کا کوئی مطلب نہیں تھا۔

میں دوپہر سے کچھ پہلے جاگا تو کسل مندی سے بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اس کا کچھ علاج غسل سے ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد حواس کو بیدار کرنے والی کیفین سے بھری کافی کے دو مگ چڑھاتا تھا تو پھر دوپہر کے کھانے کی خواہش نہیں رہتی تھی۔ معمول کے مطابق میں نہا دھو کے اور کپڑے بدل کے نکلا تو خیال تھا کہ اب کسی ملازمہ سے کہوں گا کہ ناشتا لائے۔ پھر میں نے شاہینہ کو دیکھا۔ وہ بڑے سکون سے صوفے پر بیٹھی ایک کتاب دیکھ رہی تھی جو میں نے انور کی ذاتی لائبریری سے لی تھی۔ اپنی اسیری کے مختصر وقت میں مجھے اس لائبریری کا تفصیلی جائزہ لینے کا موقع ملا تھا۔ اس ذخیرے میں سیکڑوں قابلِ قدر کتابیں تھیں۔ اب ان کو پڑھنے والا کوئی نہ تھا۔

”تم پڑھتے ہو یہ فضول کتابیں؟“ وہ بولی۔

میں نے کتاب چھین کر بیڈ پر رکھ دی۔ ”کوئی کتاب فضول نہیں ہوتی۔ جو ایسا سمجھتا ہے وہ فضول ہوتا ہے۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

اس کے سکون میں فرق نہیں پڑا۔ ”میں... اگر یہ کہوں کہ صرف تمہیں دیکھنے... تم سے ملنے اور تم سے باتیں کرنے آئی ہوں؟“

”تو میں کہوں گا کہ پلیز گیٹ آؤٹ۔“

”کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم پڑھے لکھے ہو کے خواتین کے ساتھ اس لہجے میں بات کرتے ہو۔“

”دیکھو، منہ مت کھلواؤ میرا... میں جانتا ہوں کہ تم خواتین کی کون سی قسم سے تعلق رکھتی ہو۔“ میں نے اس کے سراپا کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ لباس اور یہ میک اپ دیکھ کے کوئی کہہ سکتا ہے کہ تمہارا شوہر ابھی کچھ دن پہلے مارا گیا ہے؟“

”مرا ہے۔“ اس نے میری تصحیح کی۔ ”بہت دکھ ہوتا ہے تم جیسے سب تنگ نظر اور مردانگی کے زعم میں مبتلا مردوں کو... کہ ایک بیوہ نے اچھے کپڑے پہننا اور میک اپ کرنا نہیں چھوڑا۔ اسے تو بدحال، غلیظ نظر آنا چاہیے اور میلے کپڑوں میں رہنا چاہیے۔ لگتا ہے اسے تو کوئی غم ہی نہیں ہے شوہر کے مرنے کا... انہیں صدمہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے مرنے کے بعد ہم سے اتنی محبت کا اظہار کرنے والی وفادار مشرقی بیوی بھی یہی کرے گی۔“

”اچھا فضول باتیں مت کرو... مجھے پتا ہے تم کتنی دکھی ہو۔“

”واقعی میں بالکل بھی دکھی نہیں ہوں... کون سا سکھ حاصل تھا مجھے جب وہ میرا سرتاج اور مجازی خدا تھا... کتنی عزت تھی میری۔“

”یہ سب میں سن چکا ہوں... تمہارے یہ رنگ ڈھنگ انور کو بھی پسند نہیں۔ اس سے ایک شک کو تقویت ملتی ہے۔“

”... کہ اکبر کو میں نے ہی قتل کیا؟ اگر میں تمہارے سامنے کہوں کہ ہاں... میں نے بہت سوچ سمجھ کے یہ فیصلہ کیا تھا... اور بالکل آخری وقت میں... ورنہ میری ذلت، غلامی اور جسمانی استحصال کا دور لوٹ آتا؟“

میں اسے پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔ ”شاید یہ صرف میرا شک نہیں... دوسرے بھی یہی محسوس کرتے ہوں گے۔“

”مگر ان کا شک انور پر زیادہ ہے... رائٹ؟“

”میرا خیال ہے کہ اسے بلا لوں۔ وہ بھی سن لے تمہاری گہر افشانی...“

وہ ہنسی۔ ”کہاں سے بلا لو گے... وہ گیا ہے اباجی کے لیے شہر سے کچھ دوائیں اور سامان لینے... ڈاکٹر جلالی کے ساتھ... اور چودھری صاحب سو رہے ہیں... اور انہوں نے ہی مجھے یہاں بھیجا ہے... بیٹھ جاؤ۔“

میں بیٹھ گیا۔ ”چودھری صاحب نے بھیجا ہے تمہیں... کیوں؟“

”صبح میرے والد تشریف لائے تھے۔ کافی دیر بیٹھے مگر تم سو رہے تھے۔ باتیں دونوں بھائیوں کے درمیان ہوئیں۔ میں بھی سن رہی تھی۔ مسئلہ تمہارا ہی تھا... تمہاری

ریشم کا... میں نے بھی اپنی رائے دی۔"
"پھر کیا فیصلہ ہوا؟" میں نے کہا۔
"فیصلہ بھی پتا چل جائے گا تمہیں... ایک بات بتا دوں کہ چاچاجی اور اباجی نے یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیا ہے۔"
"اس لیے کہ ریشم کو یہاں سے نکلوانے والی بھی تم تھیں۔ تم نے ہی انہیں قائل کیا ہوگا کہ اسے حویلی میں نہیں ہونا چاہیے۔"
اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں یہی چاہتی تھی۔"
"اس کی موجودگی سے تمہیں کیا خطرہ لاحق تھا؟"
"وہ خطرہ تھی میری بہن کے مستقبل کے لیے... اور اس کے آنے سے پہلے یہ میری ذمے داری تھی کہ میں حالات اور معاملات کو ٹھیک کرلوں... اور یہ میری وجہ سے ہی ہوا کہ اسے درگاہ پر پہنچا دیا گیا۔ ورنہ... اور بہت کچھ ہوسکتا تھا جو بہت بُرا ہوتا۔"
"یہ اچھا ہوا اس کے ساتھ؟" میں نے برہمی سے کہا۔
وہ مجھے دیکھتی رہی۔ "تم بہت پیار کرتے ہو اس سے؟"
"ہاں، ورنہ پریشان کیوں ہوتا؟" میں نے کہا۔
"لیکن اس سے شادی پر تیار نہیں تھے تم؟"
"پیار کیا بہن سے نہیں ہوتا؟ ماں سے نہیں ہوتا... لیکن تمہارے دماغ میں تو پیار کا بس وہی مطلب ہے جو تم نے مجھ پر جتایا۔ اس حیوانی جذبے کے سوا تمہارے نزدیک پیار کا اور کوئی مفہوم نہیں۔"
اس نے اداس ہو کے ایک گہری سانس لی۔ "بہت دکھ ہے مجھے اس بات کا... کہ تم نے مجھے نہیں سمجھا۔"
"غلط فہمی ہے تمہاری... شاید کسی اور نے تمہیں نہ سمجھا ہو ایسے جیسے میں نے سمجھا... سانپ سے ڈرتے سب ہیں مگر جس کو سانپ ڈس چکا ہو..."
"سلیم! میں محبت کرتی ہوں تم سے... یہ سچ ہے۔"
"بکواس بند کرواپنی اور جاؤ... میں اب تمہارے کسی چکر میں آنے والا نہیں ہوں۔"
ایک دم اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم مجھ پر اعتبار نہیں کرو گے۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ اتنی نفرت کرتے ہو تم مجھ سے... اتنا برا سمجھتے ہو مجھے... تمہاری قسم سلیم! میں نے آج تک کسی اور کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھا لیکن تمہیں جب پہلی بار دیکھا تھا، اسی وقت سے میں وہ نہیں رہی جو کہ تھی... ایسا پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا میں نے۔"
"خدا کے لیے شاہینہ... مجھے بخش دو۔"
"میں اتنی بُری عورت نہیں ہوں سلیم... صرف ظاہر کے روپ پر مت جاؤ۔ شاید اتنی خوب صورت نہیں ہوں میں... لیکن تمہارے لیے میں کیا محسوس کرتی ہوں... کیسے جذبات رکھتی ہوں... اس کا اندازہ تم کر ہی نہیں سکتے... مجھے ایسے مت ٹھکراؤ۔"
"تم پاگل ہوگئی ہو شاہینہ۔"
"ہاں، تمہاری محبت نے پاگل کردیا ہے مجھے... اگر تم نہ آتے میری زندگی میں تو شاید میں وہ سب نہ کرتی جو میں نے کیا۔ میں اکبر کے ساتھ پہلے جیسی زندگی گزارتی رہتی۔ لیکن اب مجھے دل نے مجبور کردیا۔ میں نے کہا کہ شاہینہ... تو یہ بازی ہار جائے گی اگر جان کی بازی نہ لگائی۔" آنسو مسلسل اس کے گالوں پر بہتے رہے۔ "میرے جیسا جواری دیکھا ہے تم نے؟ میں نے تمہیں پانے کے لیے اپنے سہاگ کو داؤ پر لگا دیا۔"
"مگر میں کچھ نہیں کرسکتا تمہارے لیے..."
"کرسکتے ہو... سب کچھ کرسکتے ہو... تم مجھ سے شادی کرسکتے ہو۔"
"شادی؟" میں صدمے سے سن ہوگیا۔ "تم سے...؟"
"سب ہوسکتا ہے اگر تم چاہو... میں سب کو منا لوں گی... اور میری محبت کوئی گھاٹے کا سودا نہیں ہوگی سلیم... اتنی محبت کوئی عورت نہیں دے سکتی تمہیں... اور میرے ساتھ وہ سب بھی تمہارا ہوگا جو میرا ہے۔"
میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "شاہینہ! سب جانتے ہیں کہ میں نورین کو کتنا چاہتا ہوں، کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی گناہ ہے میرے لیے۔"
"نورین... کہاں ہے نورین... صرف تمہارے دماغ میں... اور وہ ہوتی کوئی زندہ عورت تب بھی میں اسے تمہارے ساتھ قبول کرتی... جیسے روزینہ کے ساتھ ریشم کو قبول کر رہا تھا انور..."
اچانک میری نظروں کے سامنے جیسے سورج آگیا۔ میرے حواس پر بجلی سی گری اور میرے اعصاب شل ہو گئے۔ میں نے بڑے چودھری کو دروازے میں کھڑا دیکھا... نہ جانے کب سے وہ وہاں موجود تھا... اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔

ہر محاذ پر ایک نئے داؤ کی منتظر
جواری کی تدبیریں اگلے ماہ پڑھیے

بعض کیس بہت ہی انوکھی قسم کے ہوتے ہیں... سراغ رساں سوچتے رہ جاتے ہیں مگر الجھی ہوئی گرہیں کھلنے کے بجائے مزید بگڑتی چلی جاتی ہیں... ایک ایسے ہی درپیش کیس کا ماجرا... پولیس اور سراغ رساں اس معمّے کو حل کرنے سے قاصر تھے کہ یہ قتل کا کیس ہے یا پھر...

انسانی ذہن کی قلابازیاں... احساسات اور گہرے مشاہدے کی بہترین مثال...

سکندر علیم

قتل مقتول

آفیسر فرینک مارشل نے عقب میں ڈراؤنی دھمک سنی۔ اس کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ فرینک کو ایک سیکنڈ کے لیے لگا جیسے زمین اس کے قدموں تلے ہل گئی ہے۔
وہ ہڑبڑا کر پلٹا۔ زیادہ سے زیادہ تیس فٹ کے فاصلے پر اسے ایک جسم نظر آیا۔ فرینک نے یہ خوفناک منظر دیکھ کر خود کو بمشکل سنبھالا۔ اسے اکیڈمی سے فارغ ہوئے صرف سات ماہ گزرے تھے۔ اس قسم کی اچانک اور دہشت ناک اموات دیکھنے کا وہ عادی نہیں ہوا تھا۔

اس نے سر اٹھا کر بلند و بالا عمارت کی طرف دیکھا۔ جسم کا زمین کے ساتھ تصادم خاصی شدت کا حامل تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ گرنے والا بہت بلندی سے کودا یا گرا تھا...

فرینک کے ذہن میں خودکشی کے سوا کوئی دوسرا خیال نہیں آیا۔ تصادم کی شدت نے کھوپڑی کو پکے ہوئے تربوز کی طرح کھول دیا تھا... ایسا بھیانک منظر تھا کہ فرینک کو اسے برداشت کرنے کے لیے اپنی تمام تر ہمت کو بروئے کار لانا پڑا۔

وہ عمارت اتنی اونچی تھی کہ فرینک منزلوں کی تعداد کا تعین نہیں کر سکا۔ تعمیراتی ڈھانچے میں مضبوطی کی جھلک تھی اور خوب صورتی کے لیے بیرونی جانب شیشے کا خاصا استعمال کیا گیا تھا۔

فرینک کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ وہیں کھڑے کھڑے اندازہ لگا سکے کہ اس کے قریب پڑا بے روح جسم کون سی منزل سے ٹپکا تھا۔

وہ وہاں موجود تھا اور اس نے وہ سانحہ دیکھ بھی لیا تھا... لہٰذا یہ ناخوشگوار معاملہ اس کی ڈیوٹی میں شامل ہو چکا تھا۔

چند اور افراد نے بھی یہ ہولناک منظر دیکھا اور سکتے کے عالم میں کھڑے رہ گئے بلکہ دہشت زدہ ہو کر قدرے پیچھے سرک گئے تھے...

مختصر بھیڑ سے معاً متوسط قد کا ایک سیاہ فام شخص برآمد ہوا۔ اس نے اپنا کوٹ اتار کر لاش کو ڈھکنا چاہا۔

''پاسادینا پولیس۔'' ساتھ ہی بولا۔ ''پولیس بیک اپ اور ایمبولینس منگواؤ۔''

فرینک ابتدائی شاک سے باہر آچکا تھا۔ اس نے سیاہ فام کو روکنا چاہا۔ تاہم سیاہ فام نے اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ ایک گھٹنے کے بل گرنے والے کی لاش کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ وہ پُراعتماد اور تجربہ کار لگ رہا تھا۔

فرینک نے بیلٹ کے ساتھ منسلک پولیس ریڈیو پر اطلاع پہنچائی۔ اولین فرض سے نمٹنے کے بعد اس نے اجنبی کو استفساریہ نظر سے دیکھا۔ وہ اب اپنے قدموں پر کھڑا تھا اور سر اٹھا کر ٹاور نما وسیع بلڈنگ کو دیکھ رہا تھا۔

''شکریہ۔'' فرینک نے ہاتھ بڑھایا۔

''ورجل تھمس۔'' سیاہ فام نے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ ''غالباً گرتے وقت بلندی عمارت کے نصف سے زیادہ رہی ہوگی... تم نے سر کی حالت دیکھی؟''

''تم کس شعبے سے متعلق ہو؟'' فرینک نے پوچھا۔

''ہومی سائڈ۔''

''لیکن یہ تو خودکشی کا کیس لگتا ہے۔''

''فی الحال۔'' ورجل نے جواب دیا۔

فرینک کو ورجل کی شخصیت متاثر کن لگی تھی۔ وہ بولا۔ ''دیکھو اگر تمہیں برا نہ لگے تو بیک اپ آنے تک ساتھ رہو۔''

''ٹھیک ہے۔ اگرچہ یہ علاقہ میری حدود میں نہیں ہے... بہرحال میں جو تعاون بھی کر سکا، کروں گا۔'' ورجل نے 'پاسادینا' کی آئی ڈی نکال کر شرٹ کی جیب کے ساتھ کلپ کر دی۔

بھیڑ میں اضافہ ہونے لگا۔ ایک نوجوان کیمرے کے ساتھ آگے آنے لگا۔ فرینک نے اس کی پیش قدمی کو فی الفور پسپا کر دیا۔ اردگرد کھڑے افراد ساکت ہو گئے... اسی اثنا میں ایک پٹرول کار جائے حادثہ پر پہنچ گئی۔ سب سے پہلے کار سے ایک باوردی سارجنٹ برآمد ہوا۔ اس نے نگاہوں ہی نگاہوں میں صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ پھر سر اٹھا کر بلند و بالا عمارت کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی نگاہ واپس نیچے آئی۔ سارجنٹ نے ہاتھ لہرا کر ورجل کو قریب سے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ معاً اس کی نظر ورجل کی شرٹ کے آئی ڈی کارڈ پر گئی اور وہ رک گیا۔ کچھ بولنے سے پہلے اس نے قریب ہو کر کارڈ پڑھا۔ ''یہ غالباً تمہارا کوٹ ہے؟'' اس نے فٹ پاتھ پر پڑی لاش کی جانب اشارہ کیا۔

''ہاں۔''

''ٹھیک ہے۔ ایمبولینس پہنچنے والی ہے۔''

فائر ڈپارٹمنٹ کے پیرامیڈیکل یونٹ کے دو افراد اپنے کام میں لگ گئے۔ ایک کے بازو میں کمبل نما چادر لٹک رہی تھی۔ اس نے ورجل کا کوٹ اٹھا کر لاش پر چادر ڈال دی... کوٹ ورجل کو واپس کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''ممکن ہے یہ داغ دار ہو گیا ہو۔''

ورجل نے احتیاط سے کوٹ کا جائزہ لیا اور واپس پہن لیا۔ ''چلے گا... معمولی صفائی بعد میں ہو جائے گی۔''

فرینک، سارجنٹ کو بریف کر رہا تھا۔ پھر اس نے ورجل کا تعارف کرایا۔ سارجنٹ تجربہ کار تھا۔ تاہم اس نے اپنی اہمیت کا اظہار نہیں کیا...

''باب اپر۔'' اس نے ورجل سے ہاتھ ملایا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم رضاکارانہ تعاون کے لیے آمادہ ہو۔''

''مجھے خوشی ہوگی اگر میں لاس اینجلس کی ٹیم کے کسی کام آسکا۔'' ورجل مسکرایا۔

''تمہارا تعلق ہومی سائڈ سے ہے؟''

''یس۔''

''یہ خودکشی معلوم ہو رہی ہے تاہم مجھے چیک کرنا پڑے گا... یقیناً تم ساتھ آنا پسند کرو گے؟''

''کیوں نہیں۔''

سارجنٹ نے وسیع اور بلند عمارت کے چوڑے داخلی دروازے کا رخ کیا۔ ورجل ساتھ تھا۔

''چادر ڈالنے سے قبل، کیا تم نے نظر ڈالی تھی؟'' ورجل نے استفسار کیا۔

''ہاں... کیا تم نے کوئی خاص بات نوٹ کی ہے؟''

''شاید۔'' سیاہ فام ورجل نے مبہم جواب دیا۔

لاؤنج کی وسعت بھی عمارت کے حساب سے غیر معمولی تھی۔ اس وقت تک مستعد پولیس ڈپارٹمنٹ کی نیلی وردیاں ہر جگہ نظر آرہی تھیں۔

لابی میں ایک وردی پوش گارڈ موجود تھا۔ سارجنٹ نے اسے منیجر کو بلانے کے لیے کہا۔ گارڈ فوراً ہی فون کی جانب لپکا۔

سارجنٹ، ورجل کی جانب پلٹا۔ ''تم کہہ رہے تھے کہ تم نے کوئی چیز نوٹ کی تھی؟''

''ہاں۔'' ورجل نے تفکر آمیز لہجے میں کہا۔ ''مرنے والے کے پیروں میں بالکل نئے جوتے تھے۔ جوتوں کے تلے پر مشکل سے ایک آدھ نشان ہوگا۔''

''اور تم نے اندازہ لگایا کہ خود کو ہلاک کرنے والا ایسے موقع پر نئے جوتے خریدنے کی زحمت نہیں کرتا؟''

تجربہ کار سارجنٹ فوراً ہی ورجل کی بات کی تہ تک پہنچ گیا۔

''بالکل... نئے جوتوں کی خریداری میں انتخاب اور فٹنگ کے مراحل پیش آتے ہیں... جو شخص کچھ ہی دیر میں خود کو ہلاکت میں ڈالنے کا فیصلہ کر چکا ہو، وہ اس بکھیڑے میں کیوں پڑے گا؟ قطعی غیر منطقی۔ تلوں کی حالت بتا رہی ہے کہ جوتوں نے زیادہ سے زیادہ دو یا تین بلاک کا سفر طے کیا ہوگا۔''

سارجنٹ نے سر ہلاتے ہوئے دل ہی دل میں ورجل کی ذہانت اور مشاہدے کو سراہا۔ ''میں تم سے اتفاق کرتا ہوں... لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے خودکشی کا فیصلہ اچانک کیا ہو؟''

اسی وقت ایک پٹرول مین نے مداخلت کی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بٹوا تھا۔ ''مرنے والے کی آئی ڈی مل گئی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''رابرٹ ٹی، ولیم سن... گھر کا پتا

اور نج کاؤنٹی کا ہے۔"

"ٹھیک، اس کے گھر پہنچو... شاید گھر پر کوئی مسئلہ رہا ہو۔ کمپیوٹر کا ریکارڈ بھی چیک کر لینا۔"

"یس سر۔" پٹرول مین نے اپنا ریڈیو سنبھالا۔

ورجل نے دیکھا کہ ایک آدمی تیزی کے ساتھ ان دونوں کی طرف آرہا تھا۔ وہ درمیانی عمر کا ایک خوش لباس شخص تھا۔ اس کے جوتے چمک رہے تھے اور بزنس سوٹ بیش قیمت تھا۔

"معاف کیجیے میں فون پر تھا۔" اس نے معذرت کی۔ "میرا نام فلپ ہے۔ جنرل منیجر، فلپ۔ میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"تم جانتے ہو... کیا حادثہ پیش آچکا ہے؟" سارجنٹ نے سوال کیا۔

"بدقسمتی ہے میری... یہاں پہلے کبھی ایسا سانحہ پیش نہیں آیا تھا۔"

سارجنٹ اور منیجر کو مصروفِ گفتگو چھوڑ کر ورجل نے آگے بڑھ کر بلڈنگ ڈائریکٹری تک رسائی حاصل کی اور اس میں موجود اندراجات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

واپس آکر اس نے منیجر کو مخاطب کیا۔ "مسٹر فلپ! بلڈنگ کی صرف بتیس منزلیں بک ہیں... کچھ بتائیں گے اس ضمن میں؟"

منیجر نے ورجل کی آئی ڈی دیکھ لی تھی۔ جواب قمیص سے کوٹ پر منتقل ہو چکی تھی۔

"ہاں، آپ کی بات ٹھیک ہے اور ہم نے بتیس سے اوپر کی منزلوں کو مشتہر بھی نہیں کیا... آپ جانتے ہیں کہ ایسی عمارتوں میں کرایہ دار بلند تر منزل زیادہ پسند کرتے ہیں... تاہم بتیس سے اوپر ابھی تعمیراتی کام جاری ہے..."

"تمام عمارت ائرکنڈیشنڈ ہے؟" ورجل نے پوچھا۔

"جی ہاں، ایسا ہی ہے۔ بہت زیادہ گلاس استعمال ہوا ہے۔"

"میرا مطلب تھا کہ کھڑکیاں استعمال ہو رہی ہیں یا فی الحال بند ہیں؟"

سارجنٹ باب نے ورجل کو دیکھا اور تفہیمی انداز میں سر کو حرکت دی۔

"زیادہ تر کھڑکیاں بند ہیں، تاہم چند کسٹمرز کی خواہش پر کچھ کو کھول دیا گیا ہے۔" منیجر نے جواب دیا۔

"اتنی بلند عمارت کے لیے کیا یہ خطرناک اقدام نہیں ہے جبکہ عمارت ائرکنڈیشنڈ ہے؟" سارجنٹ نے سوال کیا۔

"آپ کی بات درست ہے... ہم نے کھڑکیاں اس طرح ڈیزائن کی ہیں کہ وہ ایک محفوظ حد سے زیادہ نہیں کھل سکتیں۔"

"کیا کوئی ضدی شخص کھڑکی کے محدود خلا سے باہر نکل سکتا ہے؟" سارجنٹ نے اپنی بات جاری رکھی۔

منیجر فلپ ہچکچایا۔ "یہ آدمی کی جسامت پر منحصر ہے۔ تاہم میں کہہ سکتا ہوں کہ پھر بھی یہ بہت دشوار ہے۔"

"عمارت میں موجود لوگوں کی فہرست تو ہوگی؟"

"نہیں۔ انفرادی کرایہ داروں سے رابطہ کرنا پڑے گا۔ تاہم ہم فہرست پر کام شروع کر چکے ہیں۔"

"کیا تم رابرٹ ولیم سن کو جانتے ہو جس کی عمر پینتالیس سال اور جسامت درمیانی ہے؟"

"نہیں۔"

ورجل نے سوال جواب میں حصہ لیتے ہوئے پوچھا۔ "مسٹر فلپ! بتیس سے اوپر نامکمل منزلوں تک کوئی پہنچنا چاہے تو کیا وہ یہ کام بہ آسانی کر سکتا ہے؟"

فلپ نے قطعیت کے ساتھ جواب دیا۔ "بتیسویں فلور کے اوپر زینے بلاک ہیں۔ ایلیویٹرز موجود ہیں۔ لیکن ان میں سے صرف ایک بتیسویں فلور سے اوپر رسائی رکھتا ہے... اور اسے آپریٹ کرنے کے لیے الگ چابی ہے۔"

"غالباً چابی تمہارے پاس ہوگی؟"

"جی ہاں، کیا آپ لوگ اوپر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" منیجر نے پوچھا۔

"پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ عمارت کی شمالی سمت کے کسی فلور کی کھڑکی کو کھولا جا سکتا ہے اور یہ کہ کیا وہاں کوئی کرایہ دار ہے؟"

"یہ ممکن نہیں ہے... پھر بھی میں چیک کر لوں گا۔ چھت پر تعمیراتی عملہ واحد ایلیویٹر کے ذریعے آتا جاتا رہتا ہے... ہمارے پاس بلڈنگ انسپکٹر ہے جو اسٹرکچر کی نگرانی کے علاوہ دیگر متعلقہ نظام کی نگرانی کرتا ہے۔ کیونکہ اس حجم کی بلڈنگ کی..."

"ہم سمجھ گئے۔" ورجل نے اس کی بات کاٹی۔ "اب ہم چھت پر جانا چاہیں گے۔"

اس وقت وہی پٹرول مین دوبارہ ظاہر ہوا جسے سارجنٹ نے مردہ آدمی سے متعلق ہدایات دی تھیں۔ سارجنٹ باب نے ایک طرف ہٹ کر اس کی بات سنی... بعدازاں ورجل کو بتایا کہ مرنے والے کا ریکارڈ صاف ہے۔ کوئی جرم، کوئی وارنٹ، کچھ نہیں۔

"گڈ ورک۔"

"ولیم سن بظاہر ایک دولت مند آدمی تھا لیکن اس کی دولت کے ذرائع اندھیرے میں ہیں۔ وہ ایک سال قبل اسپتال میں داخل ہوا تھا۔ گرنے کے سبب اس کی چند پسلیاں ٹوٹ ہو گئی تھیں۔ علاج کے دوران معلوم ہوا کہ اس نے منشیات استعمال کی تھی۔"

"منشیات کے استعمال کا ڈیٹا کمپیوٹر ریکارڈ پر موجود ہونا چاہیے تھا... نہ کہ اسپتال میں۔ منشیات کے استعمال کا معاملہ کاؤنٹی کے شیرف کے تعاون سے کیوں ظاہر ہوا؟" ورجل نے اعتراض کیا۔

"اس کی میڈیکل ہسٹری میں منشیات کا استعمال شامل ہے۔ تاہم منشیات کے باعث یا کسی اور وجہ سے اس نے کوئی غیر قانونی حرکت نہیں کی تھی۔ اگرچہ فی الحال میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ بات اس کے ریکارڈ پر کیوں نہیں تھی..." پھر سارجنٹ نے کئی امکانات کی بات کی اور آخر میں کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ اس وقت بھی وہ نشے کی حالت میں چھت پر جا پہنچا ہو... اسے خیال سوجھا ہو کہ وہ اڑ سکتا ہے۔"

"واحد ایلیویٹر کی چابی کے بغیر وہ چھت پر نہیں جا سکتا تھا، خیر آؤ چھت کو بھی دیکھ لیں۔" ورجل نے کہا۔

☆☆☆

چھت پر منڈیر سے نیچے دیکھنا کمزور دل والے کے لیے ممکن نہیں تھا... چھت پر متعدد مشینیں موجود تھیں۔ منیجر ساتھ تھا۔ ہوا کی رفتار بتا رہی تھی کہ وہ خاصی بلندی پر ہیں...

ورجل نے سر اٹھا کر بادلوں کی حرکات کو دیکھا تو ذہنی التباس کے باعث یوں لگا کہ جیسے بلڈنگ ایک جانب جھک رہی ہے... ورجل نے فی الفور نگاہ نیچے کی اور خود کو سنبھالا۔ چند گہرے سانس لے کر اس نے اطراف میں نظر دوڑائی۔ پھر احتیاط سے محض دو فٹ بلند حفاظتی منڈیر کی جانب چل پڑا۔ ورجل نے شمالی سمت کی منڈیر کا تفصیلی جائزہ لیا... وہ ہوا اور بلندی کے باعث بہت محتاط تھا... حتیٰ کہ سارجنٹ باب کو اکتاہٹ ہونے لگی۔

"کچھ ملا؟"

"کچھ خاص نہیں۔" ورجل نے کنارے سے ہٹتے ہوئے کہا۔ "دو ہی امکانات ہیں، اول خودکشی دوم قتل۔"

"قتل؟" منیجر ہڑبڑایا۔

"اس لمحے تو خودکشی کی جانب ہی خیال جاتا ہے۔" ورجل نے کہا۔

"میں جمپر ایکسپرٹ تو نہیں ہوں۔" سارجنٹ بولا۔ "لیکن وہ جس رفتار سے زمین پر گرا... وہ رفتار بلڈنگ کی کسی بھی نچلی منزل سے ممکن نہیں..."

☆☆☆

دونوں چھت سے واپس آگئے تھے۔ ورجل نے اعلان کر دیا کہ ولیم سن، چھت سے نہیں کودا تھا... چنانچہ سارجنٹ الجھن کا شکار ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بولا۔ "اگر فلپ کے مطابق شیشے کی کھڑکیاں کھولی نہیں جا سکتیں تو ہمیں کوئی ٹوٹا ہوا پینل تلاش کرنا چاہیے۔"

"نہیں، اس نے کوئی کھڑکی نہیں توڑی۔" ورجل نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ "ایسا ہوتا تو فٹ پاتھ پر کوئی نہ کوئی زخمی ہوتا یا شیشے کے ٹکڑے ضرور پائے جاتے۔"

سارجنٹ نے خود کو احمق محسوس کیا۔ ورجل کی منطق واضح تر تھی۔

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ چھت سے نہیں کودا؟"

"اوپر ہوا تیز تھی۔" ورجل نے کہا۔ "اس کے باوجود چھت پر غبار موجود تھا۔ شمالی سمت میں جہاں نیچے اس کی لاش پڑی تھی... وہاں منڈیر پر موجود غبار بے نشان ہے۔ میں نے احتیاطاً پوری شمالی منڈیر کا جائزہ لیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ چھت سے نہیں کودا۔" ورجل نے سکون سے وضاحت کی۔ "دوسری بات یہ کہ وہ چابی کے بغیر چھت والا ایلیویٹر استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ جبکہ منیجر اور بلڈنگ انسپکٹر اس کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں۔"

ورجل پُرسوچ انداز میں کافی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"اب ایک ہی امکان رہ جاتا ہے۔"

"لیکن وہ آسمان سے تو نہیں ٹپکا ہوگا۔" سارجنٹ نے حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثر کے ساتھ کہا۔

"ہیلی کاپٹر۔" ورجل نے کافی ہلاتے ہوئے دھماکا کیا۔

سارجنٹ نے چونک کر ورجل کو دیکھا اور اعتراض داغا۔ "اس صورت میں کوئی نہ کوئی تو دیکھتا... کسی کی نظر پڑتی...؟"

"بیس برس قبل کی بات ہوتی تو تمہارا اعتراض ٹھیک لگتا ہے لیکن یہ آج کی بات ہے۔ پولس، میڈیا... حتیٰ کہ فائر ڈپارٹمنٹ کے ہیلی کاپٹروں کی موجودگی یہاں کی فضا میں عام سی بات ہے۔ عوام کو انہیں دیکھتے رہنے کی عادت پڑ گئی ہے... کسی کو دلچسپی نہیں ہے کہ سر اٹھا کر ہیلی کاپٹر دیکھتا پھرے... ہاں، جب تک کوئی غیر معمولی بات نہ ہو۔"

سارجنٹ نے کافی کا کپ اٹھایا اور سوچ میں پڑ گیا۔

"تو پائلٹ کو رپورٹ کرنی چاہیے تھی؟"

ورجل کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''لاس اینجلس کے وسیع علاقے کی فضا میں جو ہیلی کاپٹر موجود ہوتے ہیں، ان کا آپس میں رابطہ اسپیشل فریکوئنسی کے ذریعے ہوتا ہے... اگر کوئی حادثہ ہوتا ہے تو پائلٹ رابطہ کرتا ہے اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ہیلی کاپٹر فوراً سن لیتے ہیں۔ نتیجتاً بلا تاخیر فضا میں ہوتے ہیں لیکن پائلٹ نے ایسا نہیں کیا۔ کسی کو کوئی ایسا پیغام نہیں ملا۔ یہ نکتہ مجھے قتل کے امکانات کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔''

''اور کچھ؟''

''ہاں، ہیلی کاپٹر تقریباً ہر رفتار پر پرواز کرتے ہیں... انتہائی رفتار پر بھی۔ بہت کم رفتار پر بھی اور ایک ہی جگہ معلق رہنے کے علاوہ بھی مختلف انداز اختیار کرتے ہیں۔ اس کا انحصار ضرورت پر ہے۔''

''پھر؟''

''پھر یہ کہ ولیم سن کو اس طرح پھینکا گیا ہے کہ وہ بلڈنگ کے ساتھ گرے... کوئی بھی ماہر پائلٹ بہ آسانی اپنے وزنی اور آہنی پرندے سے اپنی مرضی کے مطابق کھیل سکتا ہے۔ چاہے ہوا تیز ہی کیوں نہ ہو۔''

''ڈیئر! یہاں ایک مضبوط اعتراض کیا جا سکتا ہے۔'' سارجنٹ نے کہا۔

''سن رہا ہوں۔''

''ولیم سن نے مزاحمت کیوں نہیں کی؟ وہ اتنا کمزور نہیں تھا اور پائلٹ کو مشین پر بھی توجہ رکھنی تھی یا پھر ہیلی کاپٹر میں پائلٹ کے علاوہ بھی ایک یا زیادہ افراد موجود رہے ہوں گے... اس صورت میں بھی اچھی خاصی جدوجہد ہونی چاہیے تھی۔''

ورجل نے سر ہلایا۔ ''میں اپنا نظریہ ذرا کھل کر بیان کرتا ہوں اور تم اس نظریے کی جانچ بھی کر سکتے ہو۔

''ولیم سن منشیات استعمال کرتا تھا لیکن وہ اس کا عادی نہیں تھا۔ ڈرگز اس کے کنٹرول میں تھیں۔ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ منشیات کے دھندے میں ملوث تھا... تاہم اتنا ہوشیار تھا کہ جھانسا دینے کے لیے خود بھی منشیات استعمال کرتا تھا لیکن اپنے مخصوص شیڈول کے مطابق... اس مفروضے یا نظریے کو سہارا دینے کے لیے اس کی دولت کافی ہے جس کے ذرائع کا پتا نہیں... تم اس رخ پر تفتیش کر سکتے ہو۔''

''اگر میں اب تک ٹھیک جا رہا ہوں تو اس کا مطلب ہم بے رحم اور چالاک مجرموں کے بارے میں بات کر رہے ہیں... جو تیزی سے دولت مند بننے کا بہترین شارٹ کٹ استعمال کرتے ہیں۔ وہ شارٹ کٹ ہے منشیات کا دھندا۔ وہ اپنے کسی بھی ناپسندیدہ آدمی کو بے رحمی سے ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔''

سارجنٹ اپنی نوٹ بک نکال چکا تھا اور ہیجان زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ ''میں ولیم سن کے منشیات کے لنک ڈھونڈ لوں گا... اور کچھ؟''

''مزید؟'' ورجل مسکرایا۔

''سب کچھ۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ وہ گر کر مرا ہے۔'' ورجل نے بات شروع کی۔ ''اور اگر ایسا ہی ہے تو گرتے وقت وہ ہوش میں نہیں تھا یا پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔ یہ بھی تم بہ آسانی فارنسک اور پوسٹ مارٹم کے ذریعے معلوم کر سکتے ہو... اس کے بعد ہی اسے ہیلی کاپٹر سے پھینکا گیا۔ کسی نے ہیلی کاپٹر نہیں دیکھا، وجہ میں بتا چکا ہوں... میں اتفاقاً وہاں موجود تھا۔ ورنہ بہت ممکن ہے کہ یہ کیس خودکشی کے طور پر جلد بند ہو جاتا... کیونکہ موت کے اسباب اتنے واضح تھے کہ کسی ٹیسٹ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ لیکن اب تم بھرپور ٹیسٹ کرا سکتے ہو... نیز سرکاری اداروں کے ہیلی کاپٹرز کو نکال دیا جائے تو کم افراد بچیں گے جن کے پاس ہیلی کاپٹر ہوگا۔''

ورجل نے رک کر آخری بات کہی۔

''یہی نکتہ سب سے اہم ہے جہاں سے تمہاری تفتیش شروع ہوگی۔'' ورجل کھڑا ہو گیا۔

''اجازت ہے؟''

''میں تمہیں جلد بلاؤں گا... وعدہ رہا۔'' سارجنٹ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

چند روز بعد ورجل کو سارجنٹ باب کے چیف کی طرف سے ایک پیغام ملا۔

''مسٹر ورجل! جب تم میرے محکمے کے سارجنٹ باب کے ساتھ تھے اور باب نے بعدازاں تمہاری لین پر کام کیا تو بہت جلد پتا چل گیا کہ موت کی اصل وجہ ہیروئن کی زیادہ خوراک تھی۔ بقیہ تفتیش کے دوران معلوم ہوا کہ حادثے کے وقت فضا سے کسی کو کوئی پیغام وصول نہیں ہوا۔ سارجنٹ کو ملوث ہیلی کاپٹر کی آئی ڈی معلوم کرنے میں کچھ وقت لگا۔ یہ کیس واقعی ہوی سائڈ کا تھا۔ تمہارے تعاون کا بہت شکریہ... مجھے یقین ہے کہ ہم بہت جلد ڈنر پر ملیں گے۔''

دندان شکن

مختار آزاد

کسی کا حال کتنا ہی بے حال کیوں نہ ہو... وہ مستقبل کے لیے سہانے خواب ضرور بُنتا ہے... نئی امیدیں... نئے آہنگ اس کے پیشِ نظر رہتے ہیں... ماضی سے بیزار ایک ایسے ہی شخص کی روداد جو گزرے ہوئے وقت کی پرچھائیوں سے بھی بچنا چاہتا تھا... مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ ماضی کیسا ہی کیوں نہ ہو... حال اور آنے والا وقت پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیتا ہے...

عنایت... مصلحت اور کرم نوازی کے جال میں الجھ کر خطرناک داؤ کھیلنے والے کھلاڑی کا پُرمہارت کھیل...

جونز نے ریٹائرمنٹ کے بعد رہنے کے لیے ایل وڈ میں ایک چھوٹا سا گھر خریدا تھا۔ دس برس پہلے اُس کے دل میں یہاں رہنے کی خواہش ایک اخبار میں شائع ہونے والے سروے کو پڑھ کر ہوئی تھی جس میں اس قصبے کو ملک کے دس بہترین مضافاتی علاقوں میں سے ایک قرار دیا گیا تھا۔ سروے پڑھنے کے فوراً بعد اس نے اپنے کارندے دوڑائے اور چند روز میں ہی اس نے یہاں ایک گھر خرید لیا۔

ایل وڈ کی جو تعریف سروے میں بیان کی گئی تھی، وہ کچھ غلط بھی نہیں تھی۔ جونز کا دومنزلہ گھر کارنر پر تھا، جہاں سے دور دور تک پھیلے دلکش قدرتی مناظر دیکھنے والے کے تھکے ماندہ جسم و جاں کو لمحوں میں تروتازہ کردیتے تھے۔ لیونگ روم کی کھڑکی کھولو تو ہوا سے جھومتے درختوں کا نغمہ سنائی دیتا تھا۔ بیڈ روم کی کھڑکی سے جھیل کا نظارہ بہت پُرکشش تھا، جہاں دن ہو یا رات، کونجیں، مرغابیاں، بگلے اور دیگر آبی پرندے اِدھر اُدھر اڑان بھرتے نظر آتے تھے۔ واقعی ایل وڈ جنت کا عکس تھا مگر ایک بات اس کے حسن کو داغ لگاتی تھی اور وہ یہ کہ پچھلے دس برسوں کے دوران میں اس کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا تھا۔ اب ایل وڈ قصبے کے بجائے تیزی سے پھیلتا ہوا ایک شہر تھا۔

جونز نے بھرپور زندگی گزاری تھی۔ وہ ہمیشہ بھیڑ بھاڑ اور لوگوں میں رہتا رہا تھا مگر پچھلے دس پندرہ سالوں سے اُس کا دل شہری زندگی کے ہنگاموں سے اُکتا گیا تھا۔ وہ قدرتی نظاروں کے درمیان سکون سے زندگی کے باقی ایام گزارنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے یہ گھر خریدا تھا مگر جب وہ یہاں منتقل ہوا تو اسے احساس ہوا کہ جیسا وہ چاہتا تھا، ایسا نہیں ہوسکا۔

ایل وڈ میں جہاں قدرتی نظاروں کی بھرمار تھی وہیں زمین پر تیزی سے مکانات اُگنے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ جگہ جگہ تعمیراتی کام نظر آتے تھے۔ لگتا تھا کہ شہروں کی زندگی سے اکتا جانے والے اتنی تیزی سے اس طرف آئے کہ اُن کی وجہ سے ایک . اور بڑا شہر جنم لینے لگا تھا۔ جونز چاہتا تو یہ مکان بیچے بغیر کہیں اور بھی اپنی پسند کے ماحول میں نیا مکان خرید سکتا تھا مگر اب وہ بیزاری اور تنہائی کی عمر کے اس حصے میں مزید بھاگ دوڑ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایل وڈ جب تک بہت بڑے شہر کا روپ دھارے گا تب تک وہ اس جہان سے ہی گزر چکا ہوگا۔ اس لیے اس نے صبر وشکر کے ساتھ اپنی خودساختہ ریٹائرمنٹ کی زندگی اس مکان میں بسر کرنا شروع کردی۔ وہ نیویارک میں پیدا ہوا اور وہیں اس نے پوری زندگی گزاری تھی۔ اسے یقین تھا کہ نیویارک سے سیکڑوں میل دور ایل وڈ میں شاید ہی اسے کوئی ایسا شخص ملے جو اس کی پچھلی زندگی سے واقف ہو۔ وہ مکمل طور پر انجان شہر میں، انجان لوگوں کے درمیان اپنی زندگی عام لوگوں کی طرح بسر کرنا چاہتا تھا مگر ایسا ہو نہ سکا۔

بہت جلد وہ جان گیا کہ ایل وڈ سے کچھ فاصلے پر واقع ایک نواحی قصبے میں اس کا بہت پرانا اور دولتمند دوست بھی رہتا ہے۔ اس خبر سے اسے یہ بھی اطمینان ہوا کہ چلو قریب میں کوئی تو ایسا ہے، جو اسے اچھی طرح جانتا ہے۔ ویسے بھی چہار سُو اجنبی چہرے ہوں تو کسی شناسا کا ہونا، دل کی ڈھارس بندھاتا ہے۔

جونز مضبوط ہاتھ پاؤں کا آدمی تھا۔ وہ ساٹھ سال سے اوپر کا تھا مگر اب بھی اس کے بازو توانا، اور آواز پاٹ دار تھی۔ بظاہر وہ شائستہ آدمی تھا مگر دوستوں کے لیے۔ وہ دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن تھا مگر اس اجنبی شہر میں نہ تو کوئی اس کا دوست تھا اور نہ ہی دشمن۔ چند ہفتوں کے دوران میں آس پڑوس کے جو لوگ اسے پہچاننے لگے تھے، اُن کے خیال میں وہ بے ضرر انسان تھا۔ لوگ اسے عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ بات اس نے اچھی طرح محسوس کرلی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ اب زندگی کے باقی دن چین سے گزاریں۔ طویل ذہنی وجسمانی مشقت بھری زندگی کے بعد اب اسے سکون کی گھڑیاں میسر آگئی تھیں۔ وہ دن بھر قصبے کے تفریحی مقامات پر گھومتا پھرتا اور رات کو کسی اچھے ریستوران میں ڈنر کرنے کے بعد گھر آکر لمبی تان کر سو جاتا۔ مزاج کے اعتبار سے جونز نفاست پسند اور خوش رہنے والا انسان تھا۔

جونز کا گھر ایک تو بہت زیادہ بڑا نہیں تھا۔ دوسرا یہ کہ وہ تنہا رہتا تھا۔ چاہتا تو خود گھر کی صفائی ستھرائی کرسکتا تھا مگر وہ عادت سے مجبور تھا۔ اس نے زندگی بھر اس طرح کے کاموں ...کو ہاتھ نہیں لگایا تھا، بڑھاپے میں کیا خاک کرلیتا۔ اسے گھر کی صفائی ستھرائی اور چھوٹے موٹے کاموں کے لیے ایک جزوقتی ملازمہ کی ضرورت تھی۔ وہ کئی روز تک تلاش میں لگا رہا، آخر ایک دن اُسے اپنے ایک پڑوسی کی معرفت ملازمہ بھی مل گئی۔

یہ جواں سال جینی اینڈرسن تھی۔ کئی سال پہلے اُس کے ماں باپ ٹریفک حادثے میں ہلاک ہوگئے تھے، جس کے بعد وہ اپنی ایک خالہ کے ساتھ رہنے لگی۔ دو سال پہلے اُن کے انتقال کے بعد وہ اپنے بوائے فرینڈ کے پاس چلی گئی جو اسی کی طرح یتیم تھا۔ کوئی سال بھر پہلے ہی میں اس کے بوائے فرینڈ رسل کو ایل وڈ کی لائبریری میں اسسٹنٹ کی ملازمت ملی تھی۔ وہ بھی اُس کے ساتھ ہی یہاں چلی آئی۔ اس وقت وہ شہر کے مضافاتی علاقے میں ایک کرائے کے گھر میں اُس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اُس کا گھر جہاں واقع تھا، وہاں تیزی سے تعمیراتی سلسلے جاری تھے۔

جینی کا دومنزلہ گھر پینزی پیلس کے برابر واقع تھا۔ البتہ یہ اور بات تھی کہ نچلی منزل اب تک خالی تھی۔ پینزی پیلس اس علاقے کا مشہور گھر تھا جس کے آگے بڑا وسیع

عریض لان بھی تھا۔ کہتے ہیں کہ مدتوں پہلے کبھی اس گھر میں خواجہ سراؤں کا ایک گروہ کرائے پر رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے مقامی لوگ اس گھر کو پینزی پیلس کہنے لگے۔ انگریزی میں ویسے بھی نفرت کے اظہار کے طور پر خواجہ سراؤں کو پینزی کہا جاتا ہے۔ اس گھر کی بدنامی کے باعث آج تک کبھی بھی وہاں کوئی خاندان مقیم نہیں ہوا۔ یہ گھر ایک بوڑھے کی ملکیت تھا جس کا پراپرٹی ایجنٹ اسے کرائے پر دینے کا مجاز تھا۔ قصبے والے یہاں پر ٹھہرنے والوں کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اسی لیے بہت جلد گھر کے مکین بدلتے رہتے تھے۔ یہ علاقہ شہر کے آخری سرے پر واقع تھا، جس کے ساتھ ہی یہاں کی مصروف ترین مرکزی سڑک بھی گزرتی تھی۔ مضافات اور کسی حد تک پسماندہ ہونے کے باعث یہاں پر زیادہ تر کم آمدنی والے لوگ رہتے تھے۔ ویسے بھی دوسری جگہوں کی نسبت یہاں کرائے بہت کم تھے۔ ایل وڈ کا یہ حصہ آہستہ آہستہ جرائم پیشہ لوگوں کی آماج گاہ بنتا جارہا تھا۔

جینی خوش باش رہنے والی مرنجانِ مرنج قسم کی لڑکی تھی۔ اسے پینزی پیلس یا اس علاقے سے بھی کوئی غرض نہیں تھی۔ رسل تو صبح سویرے لائبریری کے لیے نکلتا۔ چھٹی کے بعد ایوننگ کالج چلا جاتا اور پھر رات گئے ہی لوٹتا تھا۔ جینی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے والوں میں سے نہیں تھی۔ اس کے جاتے ہی وہ بھی نکل جاتی تھی۔ دو پیسے کمانے کے لیے وہ ہر قسم کے شریفانہ کام کرنے پر تیار ہوجاتی تھی۔ ویسے بھی صبح رسل کے چلے جانے کے بعد اس کے پاس خاصا وقت ہوتا تھا۔ وہ مقامی ہائی اسکول میں پڑھ رہی تھی لیکن ہفتے میں تین دن کلاسیں ہونے کی وجہ سے وہ اپنے فارغ وقت کو استعمال میں لاکر اچھا خاصا کمالیتی تھی۔ گھر کی صفائی ستھرائی، کپڑوں کی دھلائی یا پھر بچوں کو سنبھالنا ہو... وہ ہر کام کرنے پر تیار رہتی تھی۔

جونز نے ایک سو ڈالر فی ہفتہ پر اسے ملازمہ رکھ لیا تھا۔ وہ ہفتے میں ایک بار دو تین گھنٹوں کے لیے آتی اور کام نمٹا کر چل دیتی تھی۔ کام کرتے ہوئے اس کے کانوں پر ہیڈفون لگا رہتا اور وہ موسیقی کی دھن پر اِدھر سے اُدھر تھرکتی پھرتی تھی۔ ویسے بھی جونز کے ہاں کچھ خاص کام تو تھا نہیں۔ اس کے کپڑے دھلنے کے لیے لانڈری جاتے تھے۔ دوپہر اور رات کا کھانا وہ باہر کھاتا تھا۔ بس ہلکا پھلکا ناشتا اور چائے کافی گھر پر بناتا تھا۔ اس کی طبیعت میں نفاست تھی۔ اس لیے زیادہ تر کام وہ ہاتھ کے ہاتھ ہی نمٹا لیتا تھا۔ اس لیے جینی بھی خوش تھی کہ کم مشقت اور کمائی اچھی تھی۔

جونز کو یہ لڑکی پسند آئی تھی۔ جینی کو عجیب وغریب حلیے بنانے کا بھی بہت شوق تھا۔ ہر بار وہ اپنا نیا ہیئر اسٹائل بنالیتی تھی۔ کبھی وہ افریقی لگتی تو کبھی ریڈ انڈین نظر آنے کی کوشش کرتی۔ شروع شروع میں تو جونز کے لیے یہ لڑکی حیرت کا باعث بنی مگر رفتہ رفتہ وہ اس کا عادی ہوگیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ بچپن میں ماں باپ کی جدائی کا صدمہ اٹھانے والی یہ لڑکی اگر خوش مزاج نہ ہوتی تو اب تک خود کو تباہ کرچکی ہوتی۔

جینی کے بوائے فرینڈ رسل سے بھی جونز دو چار بار مل چکا تھا۔ اس کے بارے میں اُس کی رائے اچھی تھی۔ رسل شائستہ مزاج کا پڑھا لکھا سنجیدہ انسان تھا۔ وہ دن میں نوکری کرتا اور شام کے کالج سے گریجویشن کررہا تھا۔ اُس کے پاؤں میں چلتے ہوئے ہلکا سا لنگ آتا تھا۔ رسل نے بتایا تھا کہ وہ ہائی اسکول میں بیس بال کا کھلاڑی تھا۔ ایک روز وہ کھیلتے ہوئے گیلی پچ پر پھسلا، جس کی وجہ سے اُس کا گھٹنا ٹوٹ گیا۔ اگرچہ علاج تو ہوگیا تھا مگر چلنے میں لنگ آگیا تھا مگر سردیوں میں یہ چوٹ اُسے بہت تکلیف دیتی تھی۔ جونز کو یہ بات پسند آئی تھی کہ جینی کے مقابلے میں رسل بہت ذمّے دار اور سنجیدہ انسان تھا۔ جونز کو یقین تھا کہ رسل اُس سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ اس کے لیے بہترین جیون ساتھی ثابت ہوگا۔ خود رسل نے بھی ایک بار اس سے کہا تھا کہ وہ گریجویشن کے بعد اچھی سی ملازمت حاصل کرکے جینی سے شادی کرلے گا۔ ویسے بھی جینی میں لااُبالی پن کے سوا اور کوئی خامی نہیں تھی۔ وہ سیدھی سادی لڑکی تھی اور سادہ سی زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔

جونز اکثر دن میں اِدھر اُدھر گھوم پھر کر وقت گزارا کرتا تھا۔ اس نے جینی کو گھر کی اضافی چابی دی ہوئی تھی لیکن ساتھ ہی یہ بھی تاکید کی تھی کہ وہ آنے سے پہلے اسے فون کرلیا کرے تاکہ وہ گھر پر ہی رہے۔ کیونکہ جب وہ آتی تو اس سے دو چار باتیں کرکے اس کی تنہائی دور ہوجاتی تھی۔ اُس کے جانے کے بعد یہ ایک بار پھر اُداس اور تنہا ہوجاتا تھا۔ جونز کو جینی میں اپنائیت محسوس ہوتی تھی۔ وہ جینی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ جب بھی اُس کا ہاتھ تنگ ہوتا یہ فوراً اس کی مالی مدد کردیتا تھا۔ وہ بھی اس کے بہت قریب آگئی تھی۔ جب وہ آتی تو اتنی بے تکلفی سے اس سے باتیں کرتی جیسے وہ اس کا بہت قریبی دوست ہو۔

☆☆☆

جونز ناشتے کے بعد گھر سے نکل جاتا تھا لیکن منگل کو ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ دوسری منزل پر واقع بیڈ

روم کی کھڑکی کے سامنے آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ شیشے کی بنی کھڑکی سے اس کے گھر کے کونے والا راستہ صاف نظر آتا تھا۔ وہ سیدھی سڑک تھی۔ دور سے ہی آنے والا یہاں سے صاف نظر آجاتا تھا۔ جینی ہر منگل کو صبح دس ساڑھے دس بجے آجاتی تھی۔ اُس روز بھی صبح اس نے فون کر کے بتایا تھا کہ وہ ساڑھے دس بجے تک پہنچ جائے گی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ کھڑکی میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ کئی مہینوں سے یہ اُس کا معمول تھا۔ اب تو اسے لگتا تھا کہ ہر منگل کی صبح جینی کا انتظار کرنا اس کی عادت بن گیا ہے۔ اس وقت بھی وہ ہاتھ میں کافی کا مگ تھامے کھڑکی کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھا اُس کی راہ تک رہا تھا۔

کافی دیر بعد جینی اُسے دور سے آتی ہوئی نظر آ گئی۔ خلافِ معمول وہ تیز تیز چل رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنک گیا۔ جینی کو جلد بازی پسند نہیں تھی۔ وہ مہینوں سے دیکھ رہا تھا کہ وہ نہایت آرام سے ٹہلتی ہوئی آتی تھی مگر اُس روز ایسا نہیں تھا۔ وہ تیز تیز چل رہی تھی۔ جب وہ گھر کے احاطے میں داخل ہونے لگی تو جوزز تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ کافی کا مگ تپائی پر رکھا اور جلدی جلدی سیڑھیاں اترا اور داخلی دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ ”کیا حال ہیں۔“ جب وہ اندر داخل ہوئی تو اس نے رسماً پوچھا۔

”بالکل ٹھیک۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا مگر اس کی آنکھیں اُس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ اس کے لہجے سے پریشانی تھی۔

”سب خیریت تو ہے؟“ وہ اندر داخل ہو گئی تو جوزز دروازہ بند کر کے پلٹا اور اس کی طرف دیکھ کر ایک بار پھر پوچھنے لگا۔ ”آج تم کچھ اُداس دکھائی رہی ہو۔ کیا کوئی پریشانی ہے۔“ جوزز سمجھ رہا تھا کہیں جینی اور رسل میں جھگڑا نہ ہو گیا ہو۔

”نہیں نہیں...“ یہ سن کر اس نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لیونگ روم کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”کام شروع کر دو۔“ اس نے پیار سے کہا۔

جینی کچھ دیر تک لیونگ روم میں کام نمٹاتی رہی۔ جوزز اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ کام کر رہی تھی مگر اس کے کانوں پر ہیڈ فون نہیں تھا۔ خلافِ عادت وہ آج بالکل خاموش تھی۔ یہ بات اسے بری طرح کھٹک رہی تھی۔ وہ گھاگ آدمی تھا، سمجھ گیا کہ کچھ گڑبڑ ہوئی ہے مگر کیا۔ یہ وہ نہیں جانتا تھا اور جینی نے بھی اب تک اس بارے میں ہلکا سا اشارہ نہیں دیا تھا۔ وہ پریشان تھا کہ ایسا کیا ہوا ہے کہ جینی جیسی خوش باش اور باتونی لڑکی بالکل خاموش اور افسردہ ہے۔ اس کی آنکھیں بھی سوجی ہوئی تھیں۔ لگ رہا تھا کہ وہ رات کو ٹھیک طرح سے سوئی نہیں یا پھر بہت دیر تک روتی رہی ہے۔ یہ دیکھ کر جوزز دل ہی دل میں خاصا پریشان ہو رہا تھا مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس پر زور دے کر یہ بات پوچھے۔ اسے ڈر تھا کہ وہ برا مان سکتی ہے۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ دو تین گھنٹے تک تو یہیں رہے گی۔ وہ آہستہ آہستہ پیار سے پوچھ لے گا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔

”تم جھوٹ کب سے بولنے لگی ہو؟“ وہ کچن کی صفائی کر رہی تھی، تب وہ بیڈ روم میں جا کر کافی کا مگ اٹھا لایا اور سنک میں رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”میں...“ یہ سن کر جینی نے چہرہ اوپر اٹھایا اور اسے دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔

”نہیں...“ جوزز نے یہ سن کر پیار سے کہا۔ ”میں اپنے بارے میں بات کر رہا تھا۔“

”میں نے کیا جھوٹ بولا ہے؟“ اس نے ہلکی سی خفگی کے ساتھ جواب دیا۔

”چلو... مان لیا تم نے جھوٹ نہیں بولا۔“ جوزز نے اس کے قریب آ کر کہا۔ ”مگر بولنے کی کوشش کر رہی ہو اور کچھ کہنے سے کترا رہی ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ کچھ بات ہے۔“ جوزز کے لہجے سے خلوص جھلک رہا تھا۔ ”تم شاید کچھ چھپانا چاہتی ہو مگر چھپا نہیں سکتیں۔“ اس نے اپنائیت سے کہا۔

”ہاں... شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ اس نے سنک کا نل کھولتے ہوئے کہا۔ ”وہ دراصل بات یہ ہے کہ رسل...“ جینی کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

یہ سنتے ہی جوزز کا دل یکبارگی ذرا زور سے دھڑکا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ میں ٹھیک سمجھا تھا۔“ اس نے قریب آ کر کہا۔ ”کام چھوڑو اور بیٹھ کر اطمینان سے بتاؤ، کیا بات ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے نل بند کیا اور جینی کا ہاتھ پکڑ کر ڈائننگ ٹیبل کے سامنے کرسی پر بٹھایا اور خود میز کے دوسری جانب بیٹھ گیا۔ جینی کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی ہلکی سی نمی کو اُس نے دیکھ لیا تھا۔ یہ بات اسے خاصی پریشان کر رہی تھی۔ وہ جینی کی پریشانی جاننا چاہتا تھا مگر وہ سر جھکائے بدستور خاموش بیٹھی تھی۔ ”کیا رسل نے تم سے جھگڑا کیا ہے؟“ کافی دیر تک جب وہ کچھ نہ بولی تو جوزز نے خاموشی توڑتے ہوئے سوال کیا۔

”تم جانتے ہو اس وقت میں کہاں رہ رہی ہوں۔“ اس

نے جواب دینے کے بجائے گمبھیر لہجے میں اُلٹا سوال کر دیا۔ ”ایسٹ ڈیلوان کے عقب میں واقع پینزی پیلس کے برابر۔“ اگلی سانس میں اس نے جوزز سے کیے ہوئے سوال کا خود ہی جواب دیا۔ یہ کہتے ہوئے وہ خاصی سنجیدہ تھی۔

”ہوا کیا ہے؟“ جوزز نے پوچھا۔ وہ خود بھی جینی کی وجہ سے خاصا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

”پینزی پیلس کے برابر والا گھر کچھ لوگوں نے کرائے پر لیا ہے۔“

”تو اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے۔“ جوزز نے لقمہ دیا۔

یہ سن کر جینی نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”تم جانتے ہو کہ میرے گھر میں ائرکنڈیشنر نہیں ہے۔ اب گرمیوں کے دن ہیں۔ رات کو خاصی گرمی اور حبس ہوتا ہے۔ اسی لیے میں بیڈ روم کی کھڑکی کھول کر سوتی ہوں۔ کھڑکی سے تازہ ہوا تو مل جاتی ہے مگر گاڑیوں کے ہارن، سامنے بازار میں گھومتے پھرتے لوگوں کی آوازیں، چیخ و پکار... ان سب چیزوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اکثر سوتے سوتے آنکھ کھل جاتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی اور پھر میز پر نظریں گڑا کر کہنے لگی۔ ”مگر کیا کر سکتی ہوں، مجبوری ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”تو پھر...“ جوزز نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں ایک بات ہے۔“ یہ سن کر اس نے کہا۔ ”رات میں ایک پہر ایسا ہوتا ہے کہ ہر طرف بالکل خاموشی چھا جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سب لوگ بستروں میں دُبک گئے ہیں۔ وہ وقت بہت اچھا ہوتا ہے۔ تب بڑے سکون کی نیند آتی ہے۔“

”اچھا...“ یہ سن کر جوزز نے کہا۔ وہ اب تک یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اُس کی پریشانی کی اصل وجہ کیا ہے۔

”تو میں بتا رہی تھی نا کہ وہ نئے کرائے دار...“

”ہاں ہاں، آگے کی بات بتاؤ۔“ جوزز نے قطع کلامی کی۔

”تم تو جانتے ہو کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جنہیں دوسروں کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔“ جینی نے فلسفیانہ انداز میں بات شروع کی۔ ”مجھے بھی وہ لوگ کچھ ایسے ہی لگتے تھے۔ انہیں بھی دوسروں کی کچھ پروا نہیں...“

”مگر رسل...“ جوزز نے قطع کلامی کی۔

”اُن نئے کرائے داروں نے رسل کے ساتھ بدتمیزی کی ہے۔“ یہ سن کر اس نے جلدی سے کہا۔

جوزز کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہنا کیا چاہتی ہے، اس کی پریشانی کی وجہ آخر کیا ہے۔ ائرکنڈیشن، گرمیاں، پڑوسی یا رسل... وہ کچھ نہیں سمجھ پا رہا تھا اور جینی جس انداز میں بتا رہی تھی اس سے تو وہ ہرگز اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا کہ بات کیا ہوئی ہے۔

”کافی پیو گی۔“ اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ یہ سن کر اس نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ ”میں کافی بناتا ہوں، باقی باتیں ہم کافی پیتے ہوئے کریں گے۔“ کافی بناتے ہوئے بھی اس کا دماغ جینی کی باتوں میں اُلجھا ہوا تھا۔

”ہاں تو تم کہہ رہی تھیں کہ وہ پڑوسی، رسل...“ کافی پیتے ہوئے جوزز نے دوبارہ بات شروع کی۔

”پہلے تو میرا خیال تھا کہ وہ لوگ کالج اسٹوڈنٹ ہو سکتے ہیں۔“ جینی نے کافی کا گھونٹ بھر کر ایک بار پھر وہ قصہ شروع کیا۔ ”مگر رسل یہ ماننے پر تیار نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ان کا حلیہ دیکھو، جیسی گاڑی اُن کے پاس ہے، جس طرح وہ اِدھر اُدھر آتے جاتے ہیں، جس طرح کی حرکتیں کرتے ہیں، اس سے تو مجھے ہرگز یہ کالج اسٹوڈنٹ نہیں لگتے۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکی۔ ”اکثر راتوں کو بھی یہ لوگ گھر سے غائب رہتے ہیں۔ خود رسل کا کہنا ہے کہ اس نے کئی بار ان لڑکوں کو صبح سویرے گھر لوٹتے دیکھا ہے۔ کیا ایسے ہوتے ہیں کالج اسٹوڈنٹس۔“

یہ سُن کر جوزز نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”مگر اُن سے تمہارا کیا لینا دینا؟“

”تم سمجھ رہے ہو گے کہ وہ بدمعاشوں کا گروپ ہے؟“ جینی نے کہا۔

”میں کچھ بھی سمجھ سکتا ہوں مگر یہ سوچنا سمجھنا میرا مسئلہ نہیں۔“ جوزز نے کہا۔ ”اس وقت تو میں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ تمہیں اُن کے کرتوتوں سے کیا پریشانی لاحق ہوئی ہے؟“

”وہ چرس بیچتے ہیں۔“ جینی نے پہلی بار کوئی کام کی بات شروع کی۔

”تم نے یہ کیسے جان لیا؟“ چرس بیچنے کا سن کر جوزز کے کان بھی کھڑے ہو گئے اس نے فوراً پوچھ لیا۔

”مجھے یہ بات رسل نے بتائی ہے۔ ویسے یہ اس کا خیال ہے۔“ البتہ وہ لوگ خود چرس پیتے ضرور ہیں۔“ جینی نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

''کیا کہہ رہی ہو؟'' یہ سن کر جونز نے اسے استفساریہ نگاہوں سے دیکھا۔

''ہاں... رات کو جب کھڑکی کی طرف سے ہوا چلتی ہے تو کئی بار اُن کے گھر کی جانب سے نہایت ہی خراب بو کے بھبکے محسوس ہوتے ہیں۔ رسل کہہ رہا تھا کہ یہ چرس کی بو ہے۔''

''تو تمہارا مسئلہ یہ بُو ہے۔'' جونز نے سوچتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ وہ کون ہیں، کیا کرتے ہیں۔'' جینی نے یہ سن کر کہنا شروع کیا۔ ''مجھے تو اس کمبخت میوزک سے مسئلہ ہے۔ وہ رات کو اپنی گاڑی کے اندر بیٹھ کر چرس پیتے ہیں اور اتنی اونچی آواز میں بے ہودہ میوزک سنتے ہیں کہ اب رات کے آخری پہر کی میری پُرسکون نیند بھی غارت ہو گئی ہے۔''

''تو تمہارا مسئلہ میوزک ہے۔'' جونز نے سر کرسی کی پشت سے ٹکاتے ہوئے کہا۔

''صرف یہی ایک مسئلہ نہیں۔'' یہ سنتے ہی اس نے جلدی سے کہا۔ ''مجھے خود میوزک پسند ہے مگر رات کے آخری پہر آپ کے پڑوس میں نہایت اونچی آواز میں بے ہنگم میوزک بج رہا ہو تو پھر کوئی کیسے سو سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لحہ بھر کے لیے رکی۔ ''اب کل رات کی ہی بات دیکھ لو۔'' اس نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''گرمی کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ میں نہا کر باتھ روم سے نکلی کہ چلو ذرا سکون سے نیند آجائے گی۔ ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ اُن کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اب کہاں کی نیند، کیسی نیند... ڈیڑھ دو گھنٹے تک اُن کا یہ ہنگامہ چلتا رہا۔ اوپر سے یہ ستم کہ کھڑکی سے گندی مہک کے بھبکوں سے دماغ خراب ہو گیا۔ اٹھ کر کھڑکی بند کی اور لیٹ گئی مگر پھر گھٹن محسوس ہونے لگی۔ مجبوراً کھڑکی پھر کھولنا پڑی۔''

''میں تمہارا مسئلہ سمجھ رہا ہوں۔'' وہ خاموش ہوئی تو جونز نے سرہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''دن بھر وہ بدمعاش اِدھر سے اُدھر آتے جاتے رہتے ہیں۔ لگتا ہے کہ میوزک کے بغیر تو وہ چل ہی نہیں سکتے۔'' اس نے پھر بات شروع کی۔ ''اتنا تیز میوزک بجاتے ہیں کہ اگر وہ دو بلاک دور ہوں، تب بھی پتا چل جاتا ہے کہ منحوس آ رہے ہیں۔ جب وہ گھر کے پورچ میں داخل ہوتے ہیں تو میوزک کے شور سے ہماری کھڑکیاں بجنے لگتی ہیں، کان کے پردے بس پھٹنے والے ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔''

جونز اس کی بات غور سے سن رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ کوئی کسی کا خیال کرنے کو تیار نہیں۔ ہنگامے، شور شرابا، چیخ و پکار کے بنا بھی زندگی پُرلطف ہے مگر کون انہیں سمجھائے۔ ''یہ سب شہروں کا کیا دھرا ہے۔'' وہ زیرِلب بڑبڑایا مگر جینی نہیں سمجھی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

''کچھ کہا تم نے۔''

''نہیں... کام ختم کرلو۔'' جونز نے سر جھٹک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''اس طرح کے لوگوں کا سدھرنا بہت مشکل ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑا ہوا اور دانت کچکچاتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''یہ لاتوں کے بھوت ہیں، صرف لاتوں سے ہی ٹھیک ہو سکتے ہیں۔''

کافی ختم کر کے وہ لیونگ روم میں آ گیا اور سوچنے لگا کہ کس طرح جینی کو اس پریشانی سے نجات دلائی جائے۔ اچانک اسے کچھ یاد آ گیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کچن میں داخل ہوا۔ جینی دھلے برتن صاف کر کے ریک میں لگا رہی تھی۔ ''ارے سنو!''

''کیا ہوا؟'' جینی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس وقت بھی اس کی پلکیں ہلکی سے نم نظر آ رہی تھیں۔

''تم کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے رسل کے ساتھ بھی کچھ...''

''ہاں...'' یہ سنتے ہی وہ پلٹی۔ ''ارے ہاں یہ بتانا تو میں بھول ہی گئی۔'' اس نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا بات ہے؟''

''میں نے کئی بار اس سے کہا کہ پولیس کو شکایت کرتے ہیں لیکن وہ تیار نہیں ہوا۔'' جینی نے خفگی سے کہا۔ ''کہتا تھا کہ پولیس کیا کر لے گی۔ تنبیہ دے کر چھوڑ دے گی۔ دو تین دن وہ احتیاط کریں گے اور پھر وہی... نہیں مانی اُس نے میری بات۔ پہلے بات مان لیتا تو یہ دن نہیں دیکھنے پڑتے۔''

''مگر تم تو کہہ رہی تھیں کہ کوئی بدتمیزی کی ہے اُن لڑکوں نے رسل کے ساتھ۔'' جونز نے قطع کلامی کی۔

''ہاں...''

''یہ بات بتاؤ ذرا تفصیل سے۔'' یہ سنتے ہی جونز نے جلدی سے کہا۔ ''کیا کیا ہے انہوں نے رسل کے ساتھ۔'' جونز کے لہجے سے سخت تشویش ظاہر ہو رہی تھی۔

''کل رات رسل جاگ رہا تھا کہ اُن لڑکوں نے پھر طوفان مچانا شروع کر دیا۔'' جینی نے بتانا شروع کیا۔ وہ بڑے غور سے اس کی بات سن رہا تھا۔ ''اکثر وہ گھوڑے بیچ کر سرِشام ہی سو جاتا تھا۔ ایک بار سو گیا تو پھر اس کے سر پر چاہے ڈھول بجاؤ مگر وہ نہیں جاگتا تھا لیکن کل رات اس کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ گھٹنے میں بھی ہلکا سا درد ہو رہا تھا۔ وہ لیٹا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا کہ اسی دوران وہ لوگ آ گئے۔ وہ پہلے ہی درد سے پریشان تھا اوپر سے اُن شیطانوں کا شیطانی میوزک شروع ہو گیا۔ کافی دیر تک وہ برداشت کرتا رہا لیکن کب تک۔ آخر وہ غصے اٹھا اور یہ کہتے ہوئے باہر نکلنے لگا کہ میں انہیں سمجھاتا ہوں۔ میں نے اسے بہت روکا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اُن کے بیچ جھگڑا نہ ہو جائے۔ وہ کئی تھے اور بدمعاش بھی اور رسل اکیلا۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ پولیس کو فون کرتے ہیں مگر وہ نہیں مانا اور غصے میں باہر نکل گیا۔'' یہ کہہ کر وہ لحہ بھر کے لیے خاموش ہو گی۔ ''پہلی بار میں نے اسے اتنے شدید غصے میں دیکھا تھا۔ میں تو خود ڈر گئی تھی۔'' جینی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اُس کے بعد کیا ہوا؟'' جونز نے قطع کلامی کی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اپنی عادت سے مجبور جینی اب ایک بار پھر موضوع سے ہٹ رہی ہے۔

''وہ بڑے غصے میں باہر نکلا تھا۔'' جینی نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ ''میں کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئی یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا ہوتا ہے۔ مجھے اُس وقت بہت ڈر لگ رہا تھا اُن بدمعاشوں سے۔''

''ہاں تو وہ نیچے گیا اُن کے پاس۔'' جونز نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''وہ نیچے گیا اور اس نے گاڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور پھر کھڑکی سے سر جھکا کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے لڑکے سے کچھ بات کی۔''

''سمجھا رہا ہوگا اُسے۔'' جونز نے سرہلاتے ہوئے خود کلامی کی۔

''پھر نہ جانے اُن کے درمیان کیا بات ہوئی کہ اچانک میوزک بند ہو گیا اور وہ ایک، ایک کر کے گاڑی سے باہر نکل آئے۔'' یہ کہہ کر وہ لحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی۔ جونز اسے دیکھے جا رہا تھا۔ ''وہ تین تھے۔ تینوں رسل کے گرد گھیرا بنا کر کھڑے ہو گئے۔ اس وقت بھی رسل انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اس کی آواز تو سن نہیں پا رہی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ وہ شریفانہ انداز میں یہی کہہ رہا ہوگا کہ میوزک ذرا کم آواز میں بجایا کرو۔ اس دوران اُن میں سے ایک لڑکا بار بار رسل کے سینے پر ہاتھ مارتا ہوا اسے دھکا دیے جا رہا تھا۔ اچانک رسل کے سامنے کھڑے لڑکے نے کنگ فو کے اسٹائل میں اسے زوردار لات ماری، وہ لڑکھڑا گیا۔ بس پھر کیا تھا، اس نے یکے بعد دیگرے کئی لاتیں اُسے ماریں۔ رسل زمین پر گر پڑا تب بھی وہ تینوں اسے ٹھوکریں مارتے رہے۔ بہت دیر تک اسے بُری طرح مارنے کے بعد ایک لڑکا اُس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ یہ دیکھ کر میں سہم گئی اور کھڑکی سے ہٹ گئی۔ اس کے بعد پتا نہیں کیا ہوا۔ میں تو بیڈ پر بیٹھی رو رہی تھی۔'' اس کی پلکیں نم اور آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''رسل ٹھیک تو ہے؟'' جونز کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔

''ہاں مگر انہوں نے اسے بہت مارا ہے۔ رات بھر درد سے تڑپتا رہا ہے۔''

''اوہ میرے خدا۔''

''حد تو یہ ہے کہ مارنے پیٹنے کے بعد ایک لڑکا اُس کو ہاتھوں میں اٹھا کر اوپر لایا اور دروازے پر پھینک دیا۔'' جینی نے مار پیٹ کے بعد کا قصہ سنانا شروع کیا۔ ''دھم کی آواز آئی۔ میں نے بھاگ کر دروازہ کھولا تو وہ فرش پر عین دروازے کے سامنے گٹھڑی بنا پڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ لڑکا آگے بڑھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر نہایت بدتمیزی سے کہنے لگا۔ چلو میرے ساتھ پارٹی کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے اوباشوں کے انداز میں آنکھ ماری اور کہنے لگا ہم تین ہیں اور گھر خالی۔ کیا ارادہ ہے۔ چلتی ہو یا گود میں اٹھا کر لے چلوں۔'' یہ بات بتاتے ہوئے اس کی نظریں میز پر گڑی ہوئی تھیں اور چہرے پر شرمندگی اور شرم کے ملے جلے تاثرات تھے۔

جینی کی آخری بات سن کر تو جونز کا خون کھول اٹھا۔ اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ یکبارگی اس کے چہرے کے عضلات سخت ہو گئے۔ اس کی آنکھوں میں نفرت جھلکنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اگر اس وقت وہ لڑکے اس کے سامنے ہوتے تو یہ انہیں کچا چبا جاتا۔ ''رسل کی حالت کیسی ہے۔ اسے بہت زیادہ چوٹیں تو نہیں آئی ہیں۔'' چند لمحوں کے بعد اس نے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے جینی سے پوچھا۔

''کافی چوٹیں آئی ہیں اسے۔ ساری رات درد سے کراہتا رہا ہے۔ اس کی تکلیف دیکھ کر میں ایک لمحے کو بھی سو نہیں سکی تھی۔'' جینی نے آہستہ سے کہا۔

''اسے تو فوراً اسپتال جانا چاہیے تھا، پولیس کو اطلاع

کرنی چاہیے تھی۔'' جوزز کے چہرے پر سخت پریشانی نظر آرہی تھی۔

''میں نے کہا بھی کہ اسپتال چلو مگر وہ نہیں مانا۔'' جینی نے جواب دیا۔

''اس وقت وہ کہاں ہے، اس کی حالت کیسی ہے؟''

''صبح سویرے کچھ دیر کے لیے میری آنکھ لگی تھی۔ سو کر اٹھی تو وہ کمرے میں نہیں تھا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا تو وہ نیچے گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔'' جینی نے بتایا۔ ''میں نیچے گئی اور ایک بار پھر اسے اسپتال چلنے کو کہا۔ وہ درد سے کراہ رہا تھا۔ کہنے لگا تم کام پر جاؤ میں تھوڑی دیر میں خود ہی چلا جاؤں گا۔'' یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ وہ انگلی کی پور سے آنسو صاف کرنے لگی۔

''ایک تو تم پوری بات تفصیل سے نہیں بتاتی ہو۔'' جوزز نے جھلا کر کہا۔ ''اسے کہاں کہاں چوٹیں لگی ہیں؟''

''پورے جسم کا تو پتا نہیں البتہ چہرے پر جگہ جگہ نیل پڑے ہوئے تھے۔'' جینی نے بتایا۔ ''نچلا ہونٹ پھٹا ہوا تھا۔ اس پر خون کی پپڑیاں جمی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ آنکھوں کے نیچے بھی گھونسوں کے نشان تھے۔ نیل کا نشان کالا پڑ چکا تھا۔ چہرے پر کافی سوجن تھی۔''

اور گھٹنا؟'' جوزز نے تشویش سے کہا۔ ''اس کا گھٹنا تو پہلے ہی ٹوٹ چکا ہے۔''

''وہاں بھی چوٹ لگی ہے۔'' جینی نے جواب دیا۔ ''اس کی گردن پر بھی کٹ کا نشان تھا۔ لگتا ہے اس لڑکے نے گردن پر زور سے چاقو گڑایا ہوگا۔''

''یہ پولیس کیس ہے اور تم اتنے آرام سے...''

''آرام سے نہیں بیٹھی...'' جینی نے تلملا کر اس کی بات کاٹی۔ ''ساری رات کہتی رہوں کہ پولیس کو فون کرو مگر وہ سن ہی نہیں رہا تھا۔ جب میں خود فون کرنے لگی تو اس نے مجھے بھی نہیں کرنے دیا۔ کہنے لگا کہ ان بدمعاشوں سے خوانخواہ کی دشمنی مول لینا ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ اسی لیے اسپتال بھی نہیں جارہا کہ ڈاکٹر پولیس کو اطلاع کردیں گے۔''

''صورتِ حال بہت تشویش ناک ہے۔'' جوزز خاصا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ ''سب سے پہلے رسل کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔ اس کا ایکسرے ہونا چاہیے۔ گردن پر زخم ہے تو اب ڈاکٹر ہی بتا سکتا ہے کہ کہیں اس پر ٹانکا لگانے کی تو ضرورت نہیں۔''

''اب میں کیا کروں؟'' جینی نے بے بسی سے کہا۔

''تم فوراً گھر پہنچو۔'' جوزز نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں کسی کو بھیجتا ہوں تاکہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جایا جائے۔''

یہ سن کر جینی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ جوزز نے ڈانٹ دیا۔ ''تم اسی وقت سیدھی گھر جاؤ۔ اب کیا کرنا ہوگا، وہ میں دیکھ لوں گا۔''

یہ سن کر جینی ایک لفظ کہے بغیر اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ''ہاں کوئی بھی بات ہو، مجھے فوراً موبائل فون پر اطلاع دینا۔'' اسے جاتا دیکھ کر جوزز نے تاکید کی۔ ''اور یہ رکھ لو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے جینی کی طرف دو سو ڈالر بڑھائے۔ جینی نے چپ چاپ نوٹ لے کر جیکٹ کی جیب میں رکھ لیے۔

جینی کے باہر نکلتے ہی اس نے فون اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔ ہیلو۔ میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں تمہیں ایک پتا لکھوا رہا ہوں۔ یہاں فوراً کسی شخص کو بھیجو۔ وہاں رسل نامی ایک زخمی لڑکا ہے۔ اسے فوراً اسپتال پہنچاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ فون کے دوسری جانب موجود شخص کو جینی کے گھر کا پتا لکھوانے لگا۔ پتا لکھوانے کے بعد اس نے مزید کچھ ہدایتیں دیں اور ریسیور رکھ کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر کچھ سوچنے لگا۔

''ہیلو...'' کافی دیر بعد اس نے فون اٹھا کر ایک نمبر ملایا۔

''فوراً ملاقات کرنی ہے۔ سہ پہر کو اروما کیفے میں ملو۔ میں باہر ہی بیٹھا ہوں گا... بائے۔''

''ملتا ہوں باس!'' دوسری طرف موجود شخص نے جواب دیا۔ ریسیور کریڈل پر رکھ کر ایک بار پھر وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر کچھ سوچنے لگا۔ جوزز کا چہرہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ جینی کو پیش آنے والا قصہ سن کر اسے اپنی بیٹی سینڈرا یاد آگئی۔ بیس برس پہلے وہ اُس وقت جینی کے برابر کی ہی تھی۔

☆☆☆

دن کے پونے تین بج رہے تھے۔ جوزز کچھ دیر پہلے ہی کیفے اروما پہنچا تھا۔ گرمیاں تھیں مگر اس کے باوجود موسم خوشگوار تھا۔ گرمیوں کی وجہ سے ہی کیفے کے سامنے فٹ پاتھ پر کرسی میزیں لگی ہوئی تھیں۔ چند لوگ بیٹھے کافی اور سگار سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کیفے ایسی جگہ بنا ہوا تھا جہاں سے بڈویل کو جانے کے لیے راستہ نکلتا تھا۔ یہ ایل وڈ سے دس کلومیٹر دور واقع قصبہ تھا، جہاں خوش حال اور نہایت

مال دار لوگوں کے فارم ہاؤس تھے۔ جوزز کی نظریں اُسی سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ بڈویل کی طرف سے سیاہ رنگ کی بی ایم ڈبلیو آتی نظر آئی۔ گاڑی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کیفے کے سامنے عین اس جگہ رکی جہاں جوزز بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نظریں بھی کار پر تھی۔ اگلے ہی لمحے کار کا پچھلا دروازہ کھلا اور اعلیٰ نسل کا خونخوار کتا باہر نکلا۔ اس کے پیچھے پیچھے کتے کی زنجیر ہاتھ میں تھامے ایک شخص باہر نکلا۔ وہ بہت عمدہ سیاہ سوٹ اور سرخ رنگ کی شرٹ میں ملبوس تھا۔ باہر نکلتے ہی اس نے بڑے تکبرانہ انداز میں چاروں طرف نظر ڈالی۔ جیسے ہی اس کی نظر جوزز پر پڑی وہ مسکراتا ہوا جلدی سے آگے بڑھا۔ یہ جمی کونڈراسن تھا۔ منشیات کے دھندے کا بے تاج بادشاہ مگر مافیا کے دوسروں لوگوں کی طرح وہ بھی بظاہر کاروباری اور شریفانہ زندگی گزارنے کا ڈھونگ رچا چکا تھا۔

''دیکھو کیسا ہے یہ؟'' جمی آگے بڑھا اور کتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جوزز سے کہا۔

''بہت خوش لگ رہا ہے باؤزر۔''

''خوش کیوں نہیں ہوگا، میرے پاس جو رہتا ہے شاہانہ انداز میں۔'' جمی نے ہنس کر جواب دیا۔ کچھ عرصے پہلے جوزز نے یہ کتا اسے بطور تحفہ دیا تھا۔ جمی کو کتوں سے ویسے بھی بہت لگاؤ تھا۔ ''اب یہ باؤزر نہیں میسی ہے۔ میں نے اس کا نیا نام رکھا ہے۔'' وہ جوزز کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر، اِدھر اُدھر چوکنا نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''تمہاری اولاد ہے، جو چاہے نام رکھو۔'' جوزز نے مسکرا کر جواب دیا۔

''یہ تو ہے۔'' جمی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''کافی، چائے یا کولڈ ڈرنک؟''

''جو چاہے منگوالو۔''

ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر جوزز نے ویٹر کو اشارہ کیا۔ ''دو کافی۔''

جوزز اور جمی کی دوستی بہت پرانی تھی۔ ستر کی دہائی کی بات ہے کہ جب جمی نیو یارک پہنچا۔ اسے شہر کے مضافات میں ڈیری فارمنگ کے لیے زمین اور لائسنس درکار تھا۔ وہ منشیات کے دھندے میں لمبا مال کما چکا تھا اور اب غیر قانونی آمدنی کو قانونی شکل دینے کے لیے ڈیری فارمنگ کا کاروبار شروع کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس دھندے میں آنے سے پہلے گوالا تھا۔ کام کا تجربہ تھا اور پیسا بھی تھا مگر نئے شہر میں اس کا کوئی واقف نہیں تھا۔ اتفاقی طور پر وہ دونوں ایک ریستوران میں ملے اور باتوں باتوں میں یہ تذکرہ اس نے جوزز سے کردیا۔ جوزز کو وہ شخص پہلی نظر میں ہی اچھا لگا تھا۔ نیو یارک میں اس کی اچھی خاصی جان پہچان اور اثر و رسوخ تھا۔ اس نے جمی کی مدد کی۔ جوزز کی کوششوں سے اسے بہت جلد زمین اور اجازت نامہ مل گیا۔ بھینسوں کی خریداری، باڑے کی تعمیر اور دیگر کاموں میں بھی جوزز نے اس کی بہت مدد کی۔ جلد ہی اس کا کاروبار چل پڑا۔ اس کے بعد کئی ایسے مواقع آئے، جب جمی کو اس کی ضرورت پڑی۔ وہ بھی اچھے دوست کی طرح ہر مشکل میں اس کے کام آیا۔ جمی نے متعدد بار اسے پاٹنر بننے کی پیشکش کی مگر ہر بار اس نے جمی کی پیشکش کو مسکرا کر ٹال دیا۔ وہ دوستی کو دوستی تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ اب تو کئی دہائیاں گزر چکی تھیں۔ جمی بہت زیادہ مالدار ہو چکا تھا۔ اس کا کاروبار امریکا کے کئی حصوں میں پھیلا ہوا تھا مگر جرم کی دنیا سے اب بھی اس کا گہرا تعلق برقرار تھا۔

ان کی دوستی مدت گزر جانے کے باوجود آج بھی قائم تھی۔ عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی دوستی کا رشتہ اور بھی مضبوط ہوگیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جوزز نے اس سے رابطہ کرکے مدد کی درخواست کی تھی۔ یہ سنتے ہی جمی بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ جوزز کے کہنے پر ہی وہ اس سے ملنے کے لیے اس وقت کیفے پہنچا ورنہ تو دوپہر کو جب جوزز نے اسے گھر سے فون کیا، وہ اُسی وقت آنے کے لیے تیار تھا۔

''تمہارے فون کے کچھ دیر بعد ہی ڈاکٹر وہاں پہنچ گیا تھا۔'' جمی نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ یہ کہہ کر وہ انتظار کرنے لگا کہ جوزز منہ کھولے اور اسے بتائے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کافی کا مگ اور آنکھیں اُس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''شکریہ۔'' یہ سن کر اس نے جواب دیا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ اُن کا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے ہے۔''

''پورا قصہ بتاؤ، اصل ماجرا کیا ہے؟'' جمی نے تشویش کن لہجے میں کہا۔

''جب میں یہاں آیا تو گھر کی صفائی کے لیے ایک لڑکی کو ملازمہ رکھ لیا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے جینی اور رسل کے ساتھ اُن بدمعاش لڑکوں کی حرکت تفصیل سے اُسے سنانا شروع کیا۔

''تو یہ ہے تمہاری پریشانی۔'' جوزز نے قصہ تمام کیا تو اس نے جواب دیا۔ ''اب تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں دیکھ لیتا ہوں کہ وہ کون ہیں اور کتنے پانی میں ہیں۔''

''تمہارا دھندا تو اُس علاقے میں نہیں چل رہا ہے؟''

اسے خاموش دیکھ کر جونز نے پوچھا۔ ''ایسا ہے تو کہیں وہ تمہارے ہی کارندے نہ ہوں۔ جینی بتا رہی تھی کہ وہ چرس پیتے ہیں اور شاید بیچتے بھی ہیں۔''

''میرا دھندا...'' وہ مسکرایا۔ ''میرے خیال میں تو وہاں میرا کوئی بندہ نہیں مگر پھر بھی پوچھ لیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے موبائل فون اٹھایا۔ ''کیا نام بتایا تھا اُس علاقے کا؟''

''ایسٹ ڈیلو اِن، پینزی پیلس۔''

''ہاں سنو'' جمی نے فون اٹینڈ ہونے پر کہا۔ ''ایسٹ ڈیلو اِن میں ہمارا کوئی گروپ کام کر رہا ہے؟'' اس نے پوچھا اور جواب سننے لگا۔

''نہیں، کوئی نہیں۔'' جمی نے فون بند کر کے کہا۔ ''تم جو کرنا چاہتے ہو، وہ کام میں کروا دیتا ہوں۔'' اس نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پیشکش کی۔

''مگر میں تو تمہیں کسی کام کا نہیں کہہ رہا ہوں۔''

''جانتا ہوں۔'' وہ مسکرایا۔ ''مگر پھر بھی... اگر مناسب سمجھو تو۔''

''میرے خیال میں نہیں۔'' جونز مسکرا دیا۔ ''ابھی ان ہاتھوں میں اتنا دم ہے کہ بدمعاشوں کو مزہ چکھا سکیں۔''

کچھ دیر تک وہ دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس دوران میں جونز نے ایک بار پھر کافی منگوائی۔ جمی اس کا پرانا دوست تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے آدمی بھیج کر اُن لڑکوں کو سیدھا کروا دے مگر وہ نہ مانا۔ ''تمہارا منصوبہ کیا ہے؟'' کچھ دیر بعد اس نے جونز سے پوچھا۔

''مجھے ایک بی ایم ڈبلیو سیاہ کار چاہیے، باوردی ڈرائیور کے ساتھ۔'' پورا منصوبہ سنا کر اس نے جمی سے کہا۔

''ابھی پہنچ جاتی ہے۔''

''ابھی نہیں۔'' جونز نے لقمہ دیا۔ ''چار بجے میری روز گارڈن کے سامنے، وہ مجھے وہاں سے پک کر لے۔''

جمی سے ملاقات کے بعد جب وہ کیفے اردما سے روانہ ہوا تو اُس وقت جمی کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ اس نے فون ہولڈ پر کیا اور ہاتھ ہلا کر اسے الوداع کیا۔ ''بے فکر رہو، وہ نمٹ لے گا اُن سے مگر جیسا میں کہوں ویسا ہی کرنا۔ جونز کو ویسے بھی اپنے کام میں کسی کی مداخلت پسند نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ فون کے دوسری طرف موجود شخص کی بات سننے لگا۔

''غور سے سنو۔ میں یہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ ابھی اسی وقت۔'' یہ کہہ کر اس نے کچھ ہدایات دیں اور موبائل فون بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔

☆☆☆

جونز منصوبہ بنا چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ رسل سے زیادہ جینی کی وجہ سے طیش میں آیا تھا۔ انہوں نے جس انداز میں جینی کی بے عزتی کی تھی، وہ اسے معاف کرنے پر تیار نہیں تھا۔ جمی سے مل کر اُسے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ اس کے آدمی نہیں ہیں۔ اب وہ جس کے بھی لوگ ہوں، اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ ایسٹ ڈیلو اِن کے علاقے سے کئی بار گزرا تھا مگر پھر بھی وہ اس جگہ کو تفصیل سے نہیں جانتا تھا۔ اس لیے اس نے کارروائی سے پہلے علاقے کا اچھی طرح جائزہ لینا مناسب سمجھا۔

اسے علم تھا کہ ہر نئی جگہ کچھ ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو کسی اجنبی کو دیکھ کر فوراً اُلٹے سیدھے سوال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ وہاں ایسے ہی چلا گیا تو پینزی پیلس ڈھونڈتے ہوئے اُسے اس طرح کی غیر ضروری صورت حال پیش آ سکتی تھی۔ ایسا ہوا تو پھر اسے ماضی کا جونز بننے سے کوئی نہیں روک پائے گا۔ ضروری نہیں تھا کہ جیسا جونز سوچ رہا تھا، ویسا ہی ہو مگر اس بات کا امکان ضرور موجود تھا۔ اسی لیے اس نے سوچا کہ جان بوجھ کر ہنگامہ آرائی سے بہتر ہے کہ اس سے گریز کیا جائے۔ اسی لیے اس نے حلیہ بدل کر پینزی پیلس اور اطراف کے علاقے کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔

سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ جونز سیاہ رنگ کی بی ایم ڈبلیو کار کی پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ بظاہر یہ عام سی بی ایم ڈبلیو نظر آتی تھی مگر تھی نہیں۔ یہ بلٹ پروف تھی اور اسے خاص آرڈر پر خصوصی مہارت کے ساتھ تیار کیا گیا تھا۔ یہ جمی کے پاس موجود کئی کاروں میں سے ایک تھی۔ اُس کی ہر کار حفاظتی لحاظ سے آرڈر پر تیار کروائی گئی تھی۔

جونز نے سیاہ رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر پر چھجے دار ہیٹ تھا، جس میں اس کا چہرہ تقریباً چھپ گیا تھا۔ آنکھوں پر بھی سیاہ شیشوں کا چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ اُس وقت ہر لحاظ سے وہ ماضی کا جونز نظر آ رہا تھا، جس کے نام سے ہی نیویارک کے بڑے بڑے بدمعاش پناہ مانگتے تھے۔ گاڑی سیاہ فام ڈرائیور چلا رہا تھا۔ وہ کم عمر تھا لیکن نہایت مشاقی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ جونز اس سے باتیں کیے جا رہا تھا۔ تعلیم، گھر، خاندان... اس نے ڈرائیور سے طرح طرح کے سوالات کیے۔ آخر ایک وقت ایسا آیا کہ ڈرائیور نے مسکراتے ہوئے شائستہ انداز میں کہا۔ ''سر! کوئی سوال رہ تو نہیں گیا؟''

''ہاں...'' یہ سُن کر وہ مسکرایا۔ ''بہت سے سوالات باقی ہیں۔ یہ دنیا ہے پیارے۔ یہاں ہر جگہ سوالات ملتے ہیں اور جینا ہے تو جواب دینا پڑے گا۔'' اس نے معنی خیز انداز میں بائیں آنکھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے۔ تجربے سے ہی سیکھی ہوگی یہ بات۔'' ڈرائیور نے بیک ویو مرر میں اسے آنکھ مارتے دیکھ کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

جونز نے راستے میں ہی ڈاکٹر کو فون کر کے رسل کے بارے میں معلوم کر لیا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اسے بے دردی سے مارا گیا تھا تاہم خوش قسمتی سے کوئی ایسا زخم نہیں لگا جس کی وجہ سے اسے کسی بڑے خطرے کا سامنا ہو۔ ماسوائے گھٹنے پر لگنے والی چوٹ کے۔ یہ وہی گھٹنا تھا جو ایک بار پہلے بھی زخمی ہو چکا تھا اور دوبارہ اُسی پر چوٹ لگی تھی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا گھٹنے سمیت اس کے جسم پر کئی جگہ سوجن ہے۔ رسل کو دو تین دن اسپتال میں رہنا پڑے گا۔ سوجن اترنے کے بعد اس کے گھٹنوں کے دوبارہ ایکسرے لیے جائیں گے، تب ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب آگے کیا کرنا ہوگا۔

اُس کی منزل پینزی پیلس تھی۔ وہ اس گھر کا دن کی روشنی میں اچھی طرح جائزہ لینا چاہتا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے اس نے جینی کو فون کر کے اُن تینوں لڑکوں اور گاڑی کے بارے میں معلومات حاصل کر لی تھیں۔ جینی نے بتایا تھا کہ وہ تین دراز قامت لڑکے ہیں۔ ان کی عمریں اٹھارہ سے پچیس سال کے درمیان ہوں گی۔ جینی کا کہنا تھا کہ ان کے پاس سیاہ رنگ کی بڑی سی رینج روور جیپ ہے۔ اس لیے جونز کو یقین تھا کہ اسے اُن لڑکوں اور گاڑی کو پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔

''مگر تم یہ سب کچھ کیوں معلوم کر رہے ہو؟'' جینی نے سب کچھ بتانے کے بعد استفساریہ لہجے میں سوال کیا۔

''تاکہ ان کی ایک یادگاری تصویر کھینچ سکوں۔'' یہ کہہ کر اس نے زوردار کا قہقہہ لگا کر فون بند کر دیا۔

کافی دیر بعد ڈرائیور ویسٹ ڈیلو اِن میں ایک کھلی جگہ پر کار پارک کر رہا تھا۔

اگلے دس منٹ کے اندر اندر اس نے پینزی پیلس کا پتا چلا لیا تھا۔ اس نے ڈرائیور کو پتا بتا کر ہدایت کی کہ وہ نہایت سست روی سے گاڑی چلاتا ہوا اس گھر کے سامنے سے گزرے۔ جب وہ پینزی پیلس کے سامنے پہنچے تو گھر کے سامنے کوئی گاڑی موجود نہیں تھی۔ ویسے بھی جینی نے جس رینج روور کا ذکر کیا تھا، وہ وہاں دور دور تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ آفت کے وہ پرکالے کہیں اور منہ مار رہے ہوں گے۔ اس نے لمحہ بھر رک کر گھر کا اچھی طرح جائزہ لیا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

اگلے آدھا گھنٹے تک وہ ویسٹ ڈیلو اِن کی سڑکوں پر گھومتا رہا۔ اس نے ہر شے کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا۔ جب وہ اپنے گھر لوٹا تو شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ اس نے گاڑی کو واپس بھجوایا اور نہا کر آرام کرنے لگا۔ اسے رات کا انتظار تھا۔ اس رات اس نے دیر سے ڈنر کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ یہ ڈنر اسے ویسٹ ڈیلو اِن کے کسی ریستوران میں کرنا تھا۔

☆☆☆

رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے جب وہ ویسٹ ڈیلو اِن کے مرکزی مُون ریستوران میں کھانا کھا کر باہر نکلا۔ کچھ دیر بعد اس کی گاڑی جھیل جانے والے راستے پر بڑھ رہی تھی۔ راستہ بالکل سنسان تھا۔ ایک مخصوص جگہ پر پہنچ کر اس نے کار روکی اور درختوں کے جھنڈ میں گاڑی کھڑی کر کے پیدل واپس چل پڑا۔ تقریباً تیس پینتیس منٹ بعد وہ پینزی پیلس کے سامنے کھڑا تھا۔ ایک جگہ رک کر اس نے سگریٹ سلگائی اور کمر سے بندھے پستول کو ہاتھ لگا کر تسلی کی۔ جونز نے ڈھیلی ڈھالی پتلون، آدھی آستین کی شرٹ اور جوگرز پہنے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ریٹائرڈ بوڑھا ڈنر کے بعد ہوا خوری کے لیے نکلا ہو۔

پینزی پیلس سے میوزک کی بہت اونچی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کا شکار دستیاب ہے۔ سگریٹ زمین پر پھینک کر اس نے پاؤں تلے مسلا اور پینزی پیلس کی طرف چل دیا۔ کچھ دیر بعد وہ گھر کے احاطے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائی۔ اسے دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بڑے سکون سے چلتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھا۔ اب تک کسی نے اس کی موجودگی کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ کی جانب سے اندر جھانکا۔ ڈرائیونگ سیٹ پیچھے کیے ایک لڑکا نیم دراز تھا۔ میوزک کا شور اتنا اونچا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا۔ وہاں دو لڑکے آنکھیں موندے پڑے تھے۔ ''سنو...'' جونز نے لگ بھگ چلاتے ہوئے کہا مگر اس بے ہنگم میوزک میں اس کی کسی نے نہ سنی۔ اس نے شریفانہ انداز میں ڈرائیونگ سیٹ پر نیم دراز لڑکے کا کندھا پکڑ کر ہلایا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور سر کے اشارے سے پوچھا کیا ہے۔

''آواز ہلکی کر دو۔'' جونز نے ہاتھوں سے اشارہ

کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں۔" اس لڑکے نے غصیلی آواز میں کہا۔ وہ اتنی زور سے چلایا تھا کہ پچھلی سیٹ پر نیم دراز دونوں لڑکے بھی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کا دروازہ جھٹکے سے کھولا۔ دروازہ زوردار جوزف کو لگا۔ اس نے لڑکھڑانے کی اداکاری کی۔ یہ دیکھ کر وہ ہنسا اور چھلانگ مارتے ہوئے باہر آیا۔ اس کے نکلتے ہی اس کے دوسرے دو ساتھی بھی باہر آگئے۔ میوزک بدستور اونچی آواز میں بج رہا تھا۔ وہ تینوں اس کی طرف دیکھتے ہوئے زور زور سے ہنس رہے تھے۔

"کیوں... کیا ہوا بڑے میاں۔" ڈرائیونگ سیٹ والے لڑکے نے اس کے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔

"اتنی اونچی آواز میں میوزک مت بجایا کرو۔" جوزف اپنے لہجے سے یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس وقت تھوڑا سا ڈرا ہوا ہے۔

"کیوں... کیا تو ہمارا باس ہے!" ایک اور لڑکے نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لوگ بے آرام ہوتے ہیں۔"

"تو تجھے کیا؟"

"بہتر ہے کہ میری بات سمجھ لو۔" جوزف نے تنبیہ کے انداز میں انہیں انگلی دکھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو تو کیا کرلے گا۔" یہ سنتے ہی ایک لڑکے نے اس کے سینے پر زور کا ہاتھ مارا مگر جوزف اپنی جگہ پر استقامت سے کھڑا رہا۔ ان تینوں نے اس کے گرد دائرہ بنالیا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ والا لڑکا ان کا سرغنہ لگ رہا تھا۔

"تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میں کیا کچھ کرسکتا ہوں۔" جوزف کا لہجہ سخت تھا۔

یہ سنتے ہی ان تینوں کو غصہ آگیا۔ ایک لڑکا آگے بڑھا۔ دو اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ دو قدم آگے بڑھ کر وہ پیچھے ہٹا اور اس نے ایک ٹانگ اٹھائی۔ وہ کنگ فو کا ماہر لگ رہا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ جوزف کو کک مارتا، صورتِ حال بدل گئی۔ جوزف نے اپنے برابر کھڑے لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتے، اس کا جسم فضا میں دائرے کی شکل میں اٹھا۔ اس کی ایک کک سے دو لڑکے ڈھیر ہوچکے تھے۔ اس سے پہلے کہ تیسرا اپنے دفاع میں کچھ کرتا، وہ ایک بار پھر فضا میں اچھلا۔ اگلے لمحے تیسرا بھی اوندھے منہ زمین چاٹ رہا تھا۔ جوزف نے بس نہیں کی۔ کئی منٹ تک انہیں مارتا رہا۔ صرف تین منٹ کے اندر وہ تینوں نیم بے ہوش ہوچکے تھے۔ جوزف زمین پر بیٹھا اور یکے بعد دیگرے ان تینوں کی گردنوں پر ہاتھ پھیر کر ہلکے سے دبایا۔ تینوں نیم بے ہوش ہوچکے تھے۔ رینج روور سے بدستور کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی آواز گونج رہی تھی۔ اس نے ایک ایک کرکے تینوں لڑکوں کو اُن کی گاڑی کی پچھلی نشست پر اوپر تلے ٹھونسا۔ اسے علم تھا کہ گردن کی مخصوص رگ دبا دینے کے باعث اب وہ کئی گھنٹے تک ہلنے جلنے اور بولنے کے قابل نہیں ہوں گے۔ البتہ وہ سن سکتے تھے۔ پانچ منٹ کے اندر جوزف نے کارروائی مکمل کرلی تھی۔

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے میوزک بند کیا۔ "میرا خیال ہے کہ تم بہت میوزک سن چکے۔" اس نے پچھلی سیٹ کی طرف مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے یقین تھا کہ وہ تینوں اس کی بات سن رہے ہوں گے۔ یہ کہہ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور زور سے کہا۔ "کہا تھا نا کہ سمجھ جاؤ مگر تم مانے ہی نہیں۔ اب یہ گاڑی اور اس کا میوزک سسٹم تمہاری قبر بننے جارہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے نہایت تیزی سے گاڑی ریورس کی۔ کچھ دیر بعد وہ جھیل والے راستے پر جارہا تھا۔ سڑک بدستور سنسان تھی۔ جس جگہ اس نے اپنی گاڑی کھڑی کی تھی، وہاں جاکر رکا۔ اس نے رینج روور کی کھڑکیوں کے شیشے چڑھائے۔ دروازے لاک کیے اور گاڑی کا رخ جھیل کی طرف کرکے گیئر نیوٹرل کیا اور باہر آکر پیچھے سے گاڑی کو دھکا دینے والا ہی تھا کہ اسی دوران جھاڑیوں میں حرکت ہوئی۔ "ایک منٹ۔" غیر متوقع آواز سن کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ جھاڑیوں سے وہی ڈرائیور نکل رہا تھا، جسے سہ پہر جمی نے بی ایم ڈبلیو کے ساتھ بھجوایا تھا۔

"تم..." اسے دیکھتے ہی جوزف نے حیرت سے کہا۔

"ہاں میں۔" وہ مسکرایا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"تمہاری مدد کا منتظر، باس کا حکم ہے یہ۔"

"تو پھر آؤ، ذرا دھکا لگاؤ۔" جوزف نے مسکرا کر کہا۔ چند منٹ بعد رینج روور جھیل کی تہ میں جاچکی تھی۔

ڈرائیور نے اسے بتایا کہ جب وہ ان لڑکوں پر ہاتھ صاف کر رہا تھا، اس وقت بھی اس کی مدد کے لیے دو آدمی وہاں موجود تھے۔ ڈرائیور کا کہنا تھا کہ باس کا حکم تھا کہ ہم سب تمہاری نظر سے خود کو روپوش رکھنے کی کوشش کریں۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ تم بوڑھے ہو، شاید ان جوانوں کا مقابلہ نہ کرسکو۔ مگر تم نے تو... بڑے میاں تو کمال کے جوان

نکلے۔" یہ کہہ کر وہ ہنس دیا۔

"ٹھیک ہے اب تم چلو۔" جوزف نے کہا۔ اب تک وہ جھیل کے کنارے کھڑا تھا۔ کچھ دیر تک وہ چپ چاپ وہیں کھڑا رہا۔ پھر اس نے اپنے آنسو پونچھے۔ "آئی ایم سوری سینڈرا..." یہ کہہ کر وہ مرے مرے قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

اب تو یہ بات بہت پرانی ہوچکی تھی مگر جوزف کے دل پر لگے زخم اب تک تازہ تھے۔ بہت پہلے کچھ بدمعاش لڑکوں نے ساحل پر پک نک مناتے ہوئے اس کی بیٹی کو زبردستی زیادتی کا نشانہ بناڈالا تھا۔ انہوں نے یہیں بس نہیں کی۔ زیادتی کے بعد وہ اسے اپنی گاڑی میں ڈال کر فرار ہورہے تھے کہ کسی نے پولیس کو اطلاع کردی کہ کچھ بدمعاش لڑکے نیم بے ہوش لڑکی کو جیپ میں ڈال کر بھاگ رہے ہیں۔ فون کرنے والے نے پولیس کو مقام اور گاڑی کا نمبر بھی بتادیا تھا۔ پولیس نے تھوڑی ہی دیر میں پہاڑی راستے پر جانے والی جیپ کا پتا چلالیا۔ لڑکوں نے پولیس کو پیچھے آتا دیکھ کر بچنے کے لیے رفتار تیز کردی اور پھر ایک موڑ کو تیز رفتاری سے کاٹتے ہوئے گاڑی اُن کے قابو سے باہر ہوکر پلٹ کر کھائی میں جاگری۔ سینڈرا اور اُن تین میں سے دو لڑکے موقع پر ہی ہلاک ہوگئے۔ ایک شدید زخمی ہوا جو کئی روز بعد اسپتال میں چل بسا۔ زخمی لڑکے نے سینڈرا سے اجتماعی زیادتی کا اعتراف کرلیا تھا۔ سینڈرا اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بیوی کئی سال پہلے کینسر کے باعث چل بسی تھی۔ اس کے بعد بیٹی ہی اس کے جینے کا سہارا تھی۔ سینڈرا کی موت کے بعد اس کا شہری زندگی سے دل ہی اُچاٹ ہوگیا۔ وہ نکلنا چاہتا تھا لیکن وہ جس دھندے میں تھا، اُس سے نکلنا آسان نہیں ہوتا۔ آخر بڑی کوششوں کے بعد اس نے اپنے دھندے سے جان چھڑائی اور سب کچھ بھلا کر سکون کی زندگی بسر کرنا شروع کی مگر جب جینی نے اسے اپنی بپتا سنائی تو اس کا خون کھول گیا۔ اس کے پرانے زخم تازہ ہوگئے تھے۔ نہ جانے کیوں وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ سب کچھ جینی نے نہیں بلکہ سینڈرا نے بتایا ہے۔ وہ ان تینوں اوباشوں کا مزہ چکھانے کا تہیہ کرچکا تھا۔ آج برسوں بعد ایک بار پھر پہلے والا جوزف اس کے اندر انگڑائیاں لے کر بیدار ہورہا تھا۔

☆☆☆

صبح کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے، جب جوزف ناشتا کرکے تیار ہوا۔ وہ شہر کے مرکزی بازار کی طرف جارہا تھا۔ گھنٹا بھر تک وہ شاپنگ میں مصروف رہا۔ اس کے بعد وہ پینزی پیلس کی طرف چل دیا۔ وہ جینی سے ملنا چاہتا تھا۔ اس نے ڈور بیل بجائی تو جینی نے دروازہ کھولا۔

"تم... یہاں۔" جوزف کو دیکھتے ہی وہ حیرت سے بولی۔ "اندر آجاؤ۔" وہ دروازے سے ایک طرف ہٹتے ہوئے بولی۔

"کیا حال ہیں؟"

"بالکل ٹھیک۔" جینی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ جوزف کو دیکھ کر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔

"رسل کا کیا حال ہے؟" وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ابھی بات ہوئی تھی، کہہ رہا ہے کہ ڈاکٹر بہت اچھی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ بتا رہا تھا کہ اب کافی بہتر حالت ہے۔" جینی نے تفصیل سے بتایا۔

"پولیس پہنچی تھی اس کے پاس؟"

"نہیں۔" جینی نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے بھی یہ بات اس سے پوچھی تھی۔"

"خیر اب پولیس کی کوئی ضرورت نہیں۔" جوزف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں ڈور بیل بجی۔ جینی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ "رکو... رات نیند کیسی آئی۔" جوزف نے پوچھا۔

"بہت اچھی۔"

"اب تمہیں ہمیشہ بہت اچھی نیند آئے گی اور وہ بھی گرمیوں میں کھڑکی کھولے بغیر۔"

"کیا...؟" اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ کچھ سمجھ نہیں پائی ہے۔

"جاؤ اور جاکر دروازہ کھول دو۔"

جینی نے دروازہ کھولا تو سامنے دو آدمی کھڑے تھے۔

"یہ ائرکنڈیشنر کہاں لگانا ہے؟" جینی نے پلٹ کر جوزف کی طرف دیکھا۔

"اسے بیڈروم کا راستہ دکھاؤ۔"

جینی سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے دروازے کے سامنے سے ہٹی اور ان دونوں کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

شکست

اقبال کاظمی

المیے... اتفاقات زیست کا حصہ ہیں... لیکن کچھ المیے اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ وقت کتنے ہی فاصلے عبور کرلے... وہ ذہن و دل سے محو نہیں ہوتے... ان کی کسک... دل اور روح کو جھنجوڑے رکھتی ہے... ایک ایسی ہی گم گشتہ و دل نشیں کہانی... جو کسی نہ کسی جذبے کی ترجمانی کرتی ہے... کہیں دوستی کا جذبہ... ہے تو کہیں انسان کے اندر زہر کی طرح پھیلتے لالچ کی عکاسی... کہیں محبت میں شک کی دیواریں تو کہیں عمل اور بے عملی کے بھنور میں گھرے انسانوں کے قصے... جو لمحہ بہ لمحہ انتقام کے شعلوں میں گھرتے ہی جارہے تھے...

ماضی کا ایک انمٹ قصہ جو نقطے سے دائرے کی صورت اختیار کرتا چلا گیا...

بروک لاج کے برآمدے میں کرسی پر نیم دراز لوسی، قصبے کی طرف سے آنے والی سڑک پر اس کار کو دیکھ کر چونک سی گئی جو کسی بدمست شرابی کی طرح جھومتی ہوئی اسی طرف آرہی تھی۔ صبح سے ہونے والی موسلا دھار بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا اور اب محض بوندا باندی ہورہی تھی۔ لوسی موسم کی رنگینی سے لطف اندوز ہونے کے لیے کچھ دیر پہلے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئی تھی۔ اس بارش نے زندگی کا سارا انظام تلپٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ اسے توقع تھی کہ کم از کم دو

دن تک یہ قصبہ شہر سے کٹا رہے گا لیکن اس لڑکھڑاتی ہوئی کار کو دیکھ کر اسے حقیقتاً حیرت ہوئی تھی۔ اس وقت تو اس کی حیرت دو چند ہوگئی جب اس نے سیاہ رنگ کی اس کار کو بروک لاج والی سڑک پر مڑتے دیکھا۔

لوسی کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں تشویش کے سائے اُبھر آئے اور وہ کار پر نظریں جمائے یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ این اس موسم میں گھر سے کیسے نکل آئی۔ این اس کی بڑی بہن تھی۔ اس کا مکان قصبے سے چند میل دور تھا۔ اس کے دو بچے تھے۔ بڑا لڑکا بل کالج کی تعلیم کے سلسلے میں شہر کے ایک ہاسٹل میں رہائش پذیر تھا اور اس سے چھوٹی لڑکی مارتھا قصبے کے ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھی۔ این کا شوہر دن بھر کھیتوں میں مصروف رہتا اور وہ خود دن بھر گھر میں پڑی بوریت کا شکار ہوتی رہتی۔ کبھی کبھار وہ تنہائی سے گھبرا کر لوسی کے پاس چلی آتی لیکن ایسے موسم میں اس نے کبھی گھر سے قدم باہر نہیں نکالا تھا۔ نازک مزاج بھی بہت تھی۔ اس وقت این کو آتے دیکھ کر لوسی کا ماتھا ٹھنکا اور وہ بے چینی سے گاڑی کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگی۔ بالآخر کار پورچ میں آ کر رک گئی اور این نیچے اتر کر ناک سڑسڑاتے ہوئے برآمدے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔

"خیریت! تم ایسے موسم میں گھر سے کیسے نکل آئیں؟" لوسی نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ اس کے لہجے میں بھی تشویش نمایاں تھی۔

"خیریت ہی تو نہیں۔" این نے رومال میں ناک چھنکتے ہوئے جواب دیا۔ "جوڈی کے بارے میں معلوم کرنے آئی تھی۔ پریشان کر رکھا ہے اس لڑکی نے۔ وہ یہاں تو نہیں آئی؟"

"نہیں لیکن بات کیا ہے؟ رچرڈ سے کوئی جھگڑا تو نہیں ہوگیا؟" لوسی متوحش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ جوڈی ان کی منجھلی بہن تھی۔ چند سال قبل اس کی شادی شہر کے ایک کروڑپتی سے ہوئی تھی۔ یہ شادی جوڈی کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی اس لیے کبھی بھی رچرڈ سے اس کی بن نہیں سکی تھی حالانکہ وہاں اسے کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ دولت کے انبار، چمچاتی ہوئی نئے نئے ماڈل کی کاریں، آنکھ کے اشارے پر قدموں میں بچھ جانے والے خدمت گاروں کی فوج، گھومنے پھرنے کی آزادی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شوہر کا پیار۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو ہوا میں اڑنے لگتی لیکن جوڈی مختلف مزاج کی لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ رچرڈ کی دولت نے اسے عزت و شہرت بخشی تھی۔ خود بھی اس کے سامنے بچھا جاتا۔ بڑی سے بڑی خواہش بھی پلک جھپکنے کی دیر میں پوری کر دیتا۔ جوڈی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وہ وفادار کتے کی طرح اس کے پیر تک چاٹنے کو تیار رہتا۔ اس نے کبھی جوڈی کی سرگرمیوں پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ لیکن وہ کبھی اسے خاطر میں نہیں لائی۔ اس کے برعکس وہ رچرڈ کا مذاق اڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ کئی مرتبہ بھری محفلوں میں اسے اپنے مذاق کا نشانہ بنا چکی تھی لیکن رچرڈ نے ہمیشہ اس کی ہر بات کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا تھا۔ این اور لوسی سے بھی یہ بات چھپی نہ رہ سکی تھی کہ شادی کے چند روز بعد ہی جوڈی نے اپنی خواب گاہ الگ کر لی تھی۔ وہ رات گئے تک شہر کے نائٹ کلبوں میں گھومتی ... اور واپس آ کر اپنی خواب گاہ میں بند ہو جاتی۔ صبح اس کے بیدار ہونے سے پہلے ہی رچرڈ دفتر جا چکا ہوتا۔ جوڈی جب دن چڑھے بیدار ہوتی تو ملازموں کی کم بختی آ جاتی۔ وہ اس کی نظروں سے بچنے کی کوشش کرتے۔ معمولی معمولی باتوں پر اس کا مزاج برہم ہو جاتا۔ اس کا غصہ ملازموں پر نکلتا یا پھر کار پر۔ لوسی جانتی تھی کہ جوڈی خطرناک حد تک تیز رفتاری سے کار چلانے لگی تھی۔ کبھی وہ شہر سے میلوں دور نکل جاتی۔ تیز رفتاری کے جرم میں کئی مرتبہ اس کا چالان ہو چکا تھا لیکن اسے شاید ان معمولی باتوں کی پروا نہیں تھی۔ اس وقت این نے آتے ہی جوڈی کے بارے میں دریافت کیا تو معاً لوسی کے ذہن میں یہی خیال ابھرا کہ اسے کوئی حادثہ تو پیش نہیں آ گیا۔ وہ ایک بار پھر سوالیہ نگاہوں سے این کی طرف دیکھنے لگی۔ این شاید اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ ناک مسلتے ہوئے بولی۔

"اسے کوئی حادثہ پیش نہیں آیا لیکن یہ انکشاف بھی کسی المناک حادثے سے کم نہیں کہ وہ رچرڈ سے طلاق کا مطالبہ کر رہی ہے۔"

"کیا؟" لوسی بدحواس سی ہوگئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ دونوں میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات خوش گوار نہیں تھے لیکن طلاق کے بارے میں تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ رچرڈ کے پاس اسے عزت، دولت، شہرت اور وہ سب کچھ حاصل تھا جس کی خواہش کی جا سکتی تھی۔ اسے چھوڑ کر ظاہر ہے سب کچھ ختم ہو جاتا اور جوڈی کو بھی بروک لاج میں رہنا پڑتا جہاں اب ویرانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ والدین نے وراثت میں اس مکان کے سوا اور کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ ان کا بڑا بھائی رینڈل کہنے کو تو وکیل تھا لیکن اس کی پریکٹس ایسی کامیاب نہیں تھی کہ زندگی کی بعض اہم سہولتیں بھی میسر ہو سکتیں۔ لوسی کو حیرت تھی کہ اگر جوڈی، رچرڈ کو چھوڑ کر یہاں آ گئی تو اس کا گزارہ کس طرح ہوگا؟ وہ انہی خیالات میں گم تھی کہ این کی آواز سن کر چونک سی گئی۔ وہ رومال سے ناک مسلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"اندر چلو، مجھے سردی لگ رہی ہے۔"

این کو نشست گاہ میں چھوڑ کر لوسی کچن میں چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ کافی بنا کر لے آئی۔ "اسی لیے میں نے اس شادی کی مخالفت کی تھی۔" این نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں یاد ہے جوڈی نے شادی کو ٹالنے کے لیے کیا کیا جتن کیے تھے۔ اس نے خودکشی تک کی دھمکی دے ڈالی تھی اور عین آخری لمحے اس نے عروسی جوڑا بھی نوچ کر پھینک دیا تھا لیکن ممی پر تو بھوت سوار تھا کہ یہ شادی ضرور ہو گی۔ کاش! وہ یہ فیصلہ نہ کرتیں۔"

"ان حالات میں وہ کرتی بھی کیا؟" لوسی نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔ چند سال پہلے کے حالات فلم کی طرح اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ ایک حادثے میں معذور ہونے کے بعد باپ نے خودکشی کر کے ہمیشہ کے لیے اس اذیت سے نجات حاصل کر لی تھی۔ گھر کا سارا بوجھ ماں کے ناتواں کندھوں پر آن پڑا تھا۔ اس نے خاندان کی گرتی ہوئی ساکھ کو سہارا دینے کی بھرپور کوشش کی لیکن بال بال قرضے میں جکڑا ہوا تھا۔ شہر والا مکان بیچ کر کچھ قرضے ادا ہوئے اور وہ لوگ اس دیہی مکان میں منتقل ہو گئے جو برسوں سے خالی پڑا تھا۔ انہی دنوں کروڑپتی رچرڈ کچھ زمین کی خریداری کے سلسلے میں قصبے میں وارد ہوا۔ اس نے جوڈی کو دیکھا اور ریشہ خطمی ہو گیا۔ جوڈی اٹھارہ برس کی بھرپور دوشیزہ تھی۔ اسے بلاشبہ قصبے کی حسین ترین لڑکی قرار دیا جا سکتا تھا۔ رچرڈ ان کی ماں سے ملا اور پھر چند ہی روز بعد جوڈی کی شدید مخالفت کے باوجود اسے رچرڈ کے ساتھ ازدواجی بندھن میں باندھ دیا گیا۔ لوسی کو یقین تھا کہ رچرڈ نے جوڈی کی کوئی نہ کوئی بولی ضرور لگائی تھی کیونکہ شادی کے چند ہی روز بعد تمام باقی قرضے بھی بے باق ہو چکے تھے۔ بات صرف یہیں پر ختم نہیں ہوئی تھی۔ جوڈی کی شادی کے بعد ماں کو ہر مہینے ڈاک کے ذریعے ایک معقول رقم بھی ملنے لگی تھی جس کے بارے میں ماں نے ہمیشہ یہی بتایا کہ ہر ماہ باقاعدگی سے آنے والی وہ رقم ان کے باپ کی پنشن تھی۔ لیکن تقریباً دو سال بعد جب ماں کا انتقال ہوا تو ڈاک سے رقم کی آمد کا سلسلہ بھی بند ہو گیا۔

"سنو لوسی!" این کی آواز نے اس کے خیالات ایک بار پھر منتشر کر دیے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "گڑے مردے اکھاڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں تمہارے پاس اس لیے آئی تھی کہ اگر جوڈی یہاں آ جائے تو اسے سمجھانے کی کوشش کرو۔ رچرڈ کو چھوڑنے کے بعد وہ ایک ایک پائی کو محتاج ہو جائے گی۔ اسے یہاں سے بھی کچھ نہیں ملے گا۔"

"جوڈی انتہا سے زیادہ ضدی اور خودسر ہے۔ اگر وہ رچرڈ سے علیحدگی کا فیصلہ کر ہی چکی ہے تو سمجھانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔" لوسی نے کہا۔

"کوشش کر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ شاید وہ اپنے اس احمقانہ فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور ہو جائے۔" این نے کافی کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کپ میز پر رکھ دیا اور ہینڈ بیگ سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اب میں چلتی ہوں۔ جوڈی سے اس طرح بات کرنا کہ وہ برا نہ مانے۔"

"کوشش کروں گی۔" لوسی بھی کہتے ہوئے اٹھ گئی اور این کو رخصت کرنے کے لیے برآمدے تک آ گئی۔

بوندا باندی بند ہو چکی تھی۔ بارش کے بعد فضا پر نکھار سا آ گیا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو لوسی اس خوش رنگ فضا سے لطف اندوز ہونے کی کوشش ضرور کرتی لیکن اس وقت اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اسے رہ رہ کر جوڈی کے اس احمقانہ فیصلے کا خیال آ رہا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھی خالی خالی سی نظروں سے خلا کو گھورتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر جوڈی یہاں آ بھی گئی تو اسے کس طرح سمجھائے گی۔

این کے جانے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد لوسی اٹھ کر اندر جانے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ ایک اور کار کو آتے دیکھ کر رک گئی۔ اس نے فوراً ہی پہچان لیا۔ یہ رچرڈ کی کار تھی جو اکثر و بیشتر جوڈی کے استعمال میں رہتی تھی۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ جوڈی ہوگی لیکن جب کار پورچ میں آ کر رکی تو جوڈی کے بجائے رچرڈ کو دیکھ کر وہ بُری طرح چونک گئی۔ رچرڈ انجن بند کر کے نیچے اتر آیا اور نپے تلے انداز میں قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھنے لگا۔ لوسی گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ درمیانے قد اور فربہ جسم کا مالک تھا۔ عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ برآمدے میں پہنچ کر رسمی علیک سلیک کے بعد وہ بے تکلفی کا مظاہرہ کرتا ہوا دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں بڑی مشکل سے وقت نکال کر یہاں آیا ہوں۔" وہ لوسی کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "رسمی باتوں میں الجھنے کے بجائے براہِ راست گفتگو کرنا پسند کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں ہمارے حالات کا علم ہو گیا ہوگا اور یہاں میرے آنے کا مطلب بھی سمجھ گئی ہوگی؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے این یہاں آئی تھی۔ اس نے ذکر کیا تھا۔" لوسی نے بتایا۔

"کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ طلاق کیوں لینا چاہتی ہے جبکہ اسے کوئی تکلیف بھی نہیں۔ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ میں اسے ٹوٹ کر چاہتا ہوں۔ اسے کوئی تکلیف پہنچانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔" رچرڈ کہتے کہتے رک گیا اور لوسی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "مجھے معلوم ہے یہ شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔ ممکن ہے اس کی نظروں میں کوئی اور ہو۔ تم اس کی چھوٹی بہن ہو۔ ہوسکتا ہے تمہیں اس معاملے میں کچھ علم ہو۔ اگر ایسا ہے تو حالات کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور شاید اسے کچھ سمجھایا بھی جاسکے۔"

"میرے خیال میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔" لوسی نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے جوڈی کے بارے میں کبھی ایسی کوئی بات نہیں سنی۔"

"لیکن پھر طلاق کا مطالبہ کیوں؟" رچرڈ کی پیشانی پر سلوٹیں اُبھر آئیں۔

"آپ دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا تھا؟ میرا مطلب ہے کوئی ایسی بات جس نے اس سنگین صورتِ حال کو جنم دیا ہو؟" لوسی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بالکل نہیں۔" رچرڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے اس کے ذاتی معاملات میں کبھی دخل اندازی نہیں کی اور نہ ہی کسی معاملے میں اس سے کبھی کوئی باز پرس کی ہے۔ رات گئے تک نائٹ کلبوں میں گھومنا اس کے معمولات میں شامل ہے۔ اس رات بھی وہ دیر سے لوٹی تھی۔ میں اس وقت جاگ رہا تھا۔ وہ جب کافی دیر تک اپنی خواب گاہ کی طرف نہیں آئی تو میں نے اٹھ کر دروازے سے باہر جھانکا۔ وہ اسٹور روم میں داخل ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے زیورات والا باکس لیے باہر نکلی۔ اسے سیڑھیوں کی طرف بڑھتے دیکھ کر میں نے دروازہ بند کرلیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ جوئے میں سب کچھ ہار آئی تھی اور اب اپنے زیورات لے کر جا رہی تھی لیکن جب وہ دوبارہ خواب گاہ سے باہر نہ نکلی تو میں نے اپنے کمرے سے نکل کر اس کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن نہ تو اس نے میری پکار کا جواب دیا اور نہ ہی دروازہ کھولا۔ میں اپنے کمرے میں واپس آگیا اور رات بھر جوڈی کے بارے میں سوچتا رہا۔ ہماری ملاقات صبح ناشتے پر ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ شاید اسے رقم کی ضرورت ہو لیکن اس نے فوراً ہی طلاق کا مطالبہ کر دیا اور یہ دھمکی بھی دی کہ اگر میں نے اپنی مرضی سے طلاق نہ دی تو وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گی۔ میرے بار بار پوچھنے پر اس نے صرف اتنا کہا کہ وہ اس ملک سے جا رہی ہے کسی ایسی جگہ جہاں سے کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ یکایک اس نے مجھ سے علیحدگی اور ملک سے جانے کا فیصلہ کیوں کرلیا ہے؟"

لوسی اس کی باتیں سن کر پریشان ہوگئی۔ جوڈی کا یہ فیصلہ واقعی حیران کن تھا جبکہ رچرڈ کے پاس... اسے کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ وہ اداس سی نگاہوں سے رچرڈ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "ممکن ہے اس نے یہ سب کچھ مذاق میں کہا ہو۔ ویسے جوڈی بھی عجیب لڑکی ہے۔ بعض اوقات بڑے سنگین مذاق کر گزرتی ہے۔"

"پہلے میں بھی اسے مذاق ہی سمجھا تھا لیکن وہ اس معاملے میں بہت سنجیدہ ہے اور اپنے وکیل سے کیس تیار کرا رہی ہے۔ جوڈی یہ شہر چھوڑنا چاہتی ہے لوسی! وہ خوف زدہ ہے۔ اس کے ذہن پر کوئی انجانا سا خوف مسلط ہے۔ یہ انجانا خوف ہی اسے یہاں سے دور کسی انجان منزل کی طرف لے جا رہا ہے۔ میری اطلاع کے مطابق وہ آج شام کی ٹرین سے جا رہی ہے اور اپنا سامان بھی تیار کرچکی ہے۔ میں یہاں تمہارے پاس صرف اس لیے آیا ہوں کہ وہ تمہاری بہن ہے۔ اسے سمجھاؤ۔ اگر وہ تمہاری بات نہ مانے تو اس کے ساتھ چلی جاؤ۔ وہ زندگی کی اونچ نیچ سے واقف نہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھے یا نادانستگی میں غلط لوگوں کے ہاتھ میں نہ پڑ جائے۔ زمانہ بہت نازک ہے لوسی..... اگر وہ کسی مصیبت میں پھنس گئی تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کرسکوں گا۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ اس کی نگرانی کروں؟" لوسی نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں اور مجھے یقین ہے کہ تم انکار نہیں کرو گی۔ تمہارے زمانہ تعلیم کے دوران میں نے تمہاری مدد کی تھی اور اب مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"میں سمجھی نہیں؟" لوسی کی الجھن بڑھ گئی۔

"تمہیں یاد ہوگا کہ کالج میں تعلیم کے دوران جب تم ہاسٹل میں رہائش پذیر تھیں تو تمہیں ہر ماہ بینک کے ذریعے کچھ رقم ملا کرتی تھی۔ تمہارے نام وہ رقم میں ہی بھیجا کرتا تھا۔"

لوسی کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اس رقم کے بارے میں اس کی ماں نے بتایا تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد انشورنس سے ملنے والی رقم بینک میں جمع کرا دی گئی تھی اور بینک کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ اسے ہر ماہ ایک معقول رقم بھیجی جاتی رہے اور اب اس رقم کے بارے میں ایک نیا انکشاف ہو رہا

تھا۔ رچرڈ چند لمحے خاموشی سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"تم جوڈی کی بہن ہو اور تمہیں بھی یقیناً اس سے ہمدردی ہوگی۔ تمہارے مالی حالات بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ میں تم پر اخراجات کا بوجھ بھی نہیں ڈالنا چاہتا۔ لہٰذا تمام اخراجات کے علاوہ دو ہزار ڈالرز بھی تمہاری خدمت میں پیش کروں گا۔"

لوسی عجیب سی الجھن کا شکار تھی۔ وہ جوڈی کے مزاج سے واقف تھی۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ اسے جھٹک بھی دیتی لیکن یہاں مسئلہ دیگر نوعیت کا تھا۔ رچرڈ کے اس خدشے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اگر وہ غلط ہاتھوں میں پڑ گئی تو کسی بہت بڑی مصیبت میں مبتلا ہوجائے گی۔ وہ جوڈی کو اس طرح نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ پھر اسے رچرڈ کا بھی خیال تھا۔ اس کا یہ احسان واقعی بہت بڑا تھا کہ زمانہ تعلیم کے دوران وہ اس کے اخراجات پورے کرتا رہا تھا اور اب وہ اس احسان کا بدلہ چاہتا تھا۔

"اگر جوڈی کو پتا چل گیا کہ میں اس کی نگرانی کر رہی ہوں تو بہت برا ہوگا۔" لوسی نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ اسے معلوم ہے کہ تم اس کے ساتھ جا رہی ہو۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے تمہاری رفاقت پر آمادہ کیا ہے۔ وہ اس شرط پر تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کو تیار ہوئی ہے کہ تم اس کے معاملات میں دخل انداز نہیں ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔ کب جانا ہوگا؟" لوسی نے دریافت کیا۔

"وقت بہت کم ہے اور مجھے کچھ ضروری کام بھی نمٹانے ہیں۔" رچرڈ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "اپنا ضروری سامان لے کر میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں مارتھا کے ہاں چھوڑ دوں گا۔ وہاں سے تم شام کو آسانی سے اسٹیشن پہنچ سکو گی۔ ٹکٹ وغیرہ تمہیں وہیں پہنچا دیا جائے گا۔"

"مجھے تیار ہونے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔" لوسی کہتی ہوئی اندر چلی گئی اور تقریباً بیس منٹ بعد سوٹ کیس لے کر لوٹ آئی۔

وہ تقریباً دو گھنٹے میں شہر پہنچ گئے۔ رچرڈ اسے مارتھا کے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ مارتھا اس کی پرانی جاننے والی تھی جس وجہ سے اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ لوسی کو اچانک ہی خیال آیا کہ کیوں نہ اسٹیشن جانے سے پہلے جوڈی سے مل لیا جائے۔ وہ ابھی گھر سے نکلنے کی تیاری کر ہی رہی تھی کہ جوڈی خود پہنچ گئی۔ اسے دیکھ کر لوسی کو دھچکا سا لگا۔ کتنا بدل گئی تھی وہ۔ ہمیشہ قہقہے اڑانے والی لڑکی حزن و ملال کی تصویر بنی نظر آرہی تھی۔ لباس بھی مسلا ہوا سا تھا جیسے دو دن سے تبدیل نہ کیا گیا ہو۔

"مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ رچرڈ تمہیں یہاں چھوڑ گیا ہے۔" جوڈی اسے دیکھتے ہی بولی۔ "لیکن اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہاری باتوں میں آکر اپنا ارادہ بدل دوں گی تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ میں رچرڈ کے کہنے پر تمہیں اپنے ساتھ لے جا تو رہی ہوں لیکن اپنے معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں دوں گی۔"

"رچرڈ نے بتایا تھا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں اور تم ملک سے باہر جا رہی ہو۔ میں تو محض تمہاری دیکھ بھال کے لیے ساتھ جانے کو تیار ہوگئی ہوں۔ مجھے تمہاری سرگرمیوں سے کوئی غرض نہیں ہوگی۔ لیکن اگر تمہیں میرا ساتھ جانا پسند نہیں تو میں اپنا ارادہ بدل بھی سکتی ہوں۔" لوسی نے جواب دیا۔

"مجھے تمہارے ساتھ جانے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن ان باتوں کا خیال رکھنا۔" جوڈی کہتے ہوئے مزید رکے بغیر واپس چلی گئی۔

لوسی اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک سوچتی رہی۔ جوڈی کی حالت دیکھ کر اسے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ وہ واقعی کسی بات سے خوف زدہ ہے اور شاید اسے اپنوں پر بھی بھروسا نہیں رہا تھا۔ لوسی کو اپنی بہن کی حالت دیکھ کر دکھ ہوا۔

سہ پہر کے قریب رچرڈ کا ایک ملازم اسے کچھ رقم کے علاوہ نیویارک کا ٹکٹ بھی دے گیا۔ شام چھ بجے لوسی اسٹیشن پہنچ گئی۔ جوڈی نے چار برتھوں والا پورا کمپارٹمنٹ ریزرو کروا رکھا تھا جبکہ لوسی کی سیٹ دوسرے کمپارٹمنٹ میں تھی۔ اس وقت جوڈی ڈبے کے سامنے پلیٹ فارم پر کھڑی قلی کو سامان کے بارے میں ہدایات دے رہی تھی۔ وہ افسردہ اور تھکی تھکی سی نظر آرہی تھی۔ اس نے لوسی کو دیکھ لیا تھا مگر توجہ نہیں دی۔ قلی جیسے ہی جوڈی کا آخری سوٹ کیس اٹھا کر ٹرین میں داخل ہوا، اس نے ایک دم دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا جیسے چکر آرہا ہو۔ دوسرے ہی لمحے وہ جھکتی چلی گئی اور دھڑام سے نیچے گر گئی۔ لوسی لپک کر اس کے قریب پہنچی اور یہ دیکھ کر بدحواس سی ہوگئی کہ جوڈی بے ہوش ہوچکی تھی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے کچھ لوگ ان کے گرد جمع ہوگئے۔ لوسی اسے ہوش میں لانے کی کوئی ترکیب سوچ ہی رہی تھی کہ جوڈی نے

خود ہی آنکھیں کھول دیں۔ لوسی نے اسے سہارا دینا چاہا مگر جوڈی اس کا ہاتھ جھٹکتی ہوئی ٹرین میں سوار ہوگئی۔ اسی لمحے وسل سنائی دی۔ لوسی بھی لپک کر ٹرین میں سوار ہوگئی۔ ٹرین حرکت میں آگئی۔ جوڈی دروازے سے باہر جھانکنے لگی۔ دفعتاً اس کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا اور وہ کھڑے کھڑے لہرانے لگی۔ اگر قریب کھڑا ہوا ایک دراز قامت آدمی اسے سہارا نہ دیتا تو وہ یقیناً گر پڑتی۔

”کیا بات ہے جوڈی! اگر طبیعت زیادہ خراب ہے تو سفر ملتوی کردو۔“ لوسی نے اسے سہارا دیتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں، یونہی چکر آگیا تھا۔ سر میں معمولی سا درد ہے، ٹھیک ہو جائے گا۔“ جوڈی کہتے ہوئے اس کا ہاتھ جھٹک کر اپنے کیبن میں گھس گئی اور دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔ لوسی نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ جوڈی نے پلیٹ فارم پر یقیناً کسی ایسے شخص کو دیکھ لیا تھا جس نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا لیکن وہ شخص کون ہوسکتا تھا؟ یہی سوچتے ہوئے لوسی دروازے سے باہر جھانکنے لگی مگر اس دوران میں گاڑی پلیٹ فارم کو بہت پیچھے چھوڑ چکی تھی۔

لوسی دوسرے کمپارٹمنٹ میں اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ کھڑکی سے باہر تاریکی میں جھانکتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ کیا واقعی جوڈی کسی سے ڈر کر شہر چھوڑ رہی ہے؟ اگر وہ واقعی کسی سے خوف زدہ تھی تو شہر چھوڑنے کا فیصلہ حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہاں رہتے ہوئے رچرڈ اس کی بہتر حفاظت کرسکتا تھا لیکن پھر دفعتاً اسے خیال آگیا کہ جوڈی، رچرڈ سے بھی تو طلاق لے رہی تھی..... لیکن کیوں؟ حالات نے اس قدر اچانک یہ پلٹا کیوں کھایا تھا؟ وہ کون تھا جس سے وہ خوف زدہ تھی؟

”ہیلو!“

لوسی کے خیالات منتشر ہوگئے۔ اس نے مڑ کر آواز کی سمت دیکھا۔ وہی دراز قامت شخص تھا جس نے دروازے میں جوڈی کو سہارا دیا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”دوسرے کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے والی خاتون غالباً آپ کی بہن ہیں۔ اور میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ اس کے لیے خاصی پریشان دکھائی دیتی ہیں۔“ اس کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

”ہاں، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اور میں واقعی اس کے لیے پریشان ہوں۔“ لوسی نے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے کہ پہلے ہمیں ایک دوسرے سے متعارف ہو جانا چاہیے۔“ وہ شخص بولا۔ ”میرا نام اوبرائن ہے۔ فوج میں تھا لیکن ٹانگ میں گولی لگنے کے باعث فوجی خدمات سے سبکدوش کر دیا گیا۔ خوش قسمتی سے کچھ عرصے بعد ہی پولیس میں ملازمت مل گئی۔ اب کئی سال کی ملازمت کے بعد چھٹیاں منانے کے لیے نیویارک جا رہا ہوں۔ آپ کا کوئی مشغلہ تو ہوگا۔ میرا مطلب ہے ہابی وغیرہ؟“

”میں سمجھی نہیں؟“ لوسی نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ارے بھئی سیدھی سی بات ہے۔ ہر انسان وقت گزاری کے لیے کوئی نہ کوئی مشغلہ ضرور اختیار کرتا ہے۔“ اوبرائن بے تکلفانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ”اب میری ہی مثال لے لو۔ میں نے مرغیاں پال رکھی ہیں۔ میرے پاس دنیا کے تقریباً ہر ملک کی مرغی موجود ہے۔ میں ان مرغیوں کی نسل ملانے کے سلسلے میں کچھ نئے تجربات کرنا چاہتا ہوں جس میں کم از کم پانچ چھ مہینے ضرور لگیں گے۔ لیکن مجھے ابھی تک اپنی پسند کا کوئی مکان نہیں مل سکا جہاں اس منصوبے پر عمل شروع کرسکوں۔ لیکن تم نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کرایا۔“ وہ خاموش ہو کر سوالیہ نگاہوں سے لوسی کی طرف دیکھنے لگا۔

”میرا نام لوسی ہے اور میں پُراسرار اور سنسنی خیز قسم کی کہانیاں لکھتی ہوں۔“ لوسی نے کہا اور پھر اپنے بارے میں تفصیل سے بتانے لگی۔

اوبرائن خاصا دلچسپ آدمی ثابت ہوا۔ وہ فوج اور پولیس کی زندگی کے واقعات سناتا رہا اور لوسی اسے اپنے حالات سے آگاہ کرتی رہی۔ لوسی نے بروک لاج کے بارے میں بتاتے ہوئے پیشکش کی کہ اگر وہ چاہے تو وہ اپنی مرغیوں پر تجربات کے لیے وہاں آسکتا ہے جہاں اسے ہر قسم کی سہولت میسر ہوگی۔ رات بھر سفر کے دوران اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔

دن چڑھتے ہی لوسی آنکھیں ملتی ہوئی جوڈی کے کمپارٹمنٹ کی طرف چلی گئی۔ دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ لوسی کی آواز پہچاننے کے بعد ہی اس نے دروازہ کھولا۔ جوڈی کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس نے رات بھر میں ایک لمحے کو بھی پلک نہیں جھپکی تھی۔ لوسی اس کے لیے ڈائننگ کار سے ناشتا منگوانے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی۔ غالباً کوئی اسٹیشن آرہا تھا۔

تقریباً تین منٹ بعد ٹرین ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رک گئی۔ جوڈی نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور پھر اچانک ہی

اس نے فیصلہ سنا دیا کہ اس نے نیویارک جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے اور اس اسٹیشن پر اتر کر کسی دوسری ٹرین سے رینو واپس جا رہی ہے۔ لوسی اس کے اس فیصلے پر ششدر سی رہ گئی۔ اس نے اسٹیشن پر کھڑے ہوئے ایک قلی کی مدد سے جوڈی کا سامان اتروایا اور دوڑتی ہوئی اپنے کمپارٹمنٹ میں پہنچ گئی۔ اسی وقت انجن کی وسل کی آواز سنائی دی۔ اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور دوڑتی ہوئی ٹرین سے اتر گئی۔ ٹرین حرکت میں آچکی تھی۔ جوڈی ٹرین کی مخالف سمت رخ کیے اس طرح کھڑی تھی جیسے کسی سے اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ لوسی نے ٹرین کی طرف دیکھا۔ سرخ رنگ کے کوٹ میں ملبوس ایک شخص جوڈی کو دیکھ کر نیچے اترنے کے لیے دروازے کی طرف لپکا لیکن اسی لمحے ٹرین کا خودکار دروازہ بند ہوگیا اور رفتار تیز ہوگئی۔ وہ شخص شیشے میں سے جھانکتا رہ گیا۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد انہیں رینو جانے والی ٹرین مل گئی۔ لوسی کا خیال تھا کہ جوڈی رینو پہنچتے ہی گھر کا رخ کرے گی اور رچرڈ سے اپنے کیے کی معافی مانگے گی لیکن اسٹیشن سے باہر آنے کے بعد جب اس نے ٹیکسی والے کو اپنے قصبے کا پتا بتایا تو لوسی کو ایک بار پھر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

”کیا تم بروک لاج جا رہی ہو؟“ لوسی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، وہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں میں اپنے آپ کو کسی حد تک محفوظ سمجھ سکتی ہوں۔“ جوڈی نے جواب دیا۔

”محفوظ۔“ لوسی نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”معاملہ کیا ہے جوڈی! آخر تم کچھ بتاتی کیوں نہیں؟ تم کسی سے ڈر رہی ہو کیا؟ کون ہے وہ شخص اور تم سے کیا چاہتا ہے؟“

”نہ میں کسی سے خوف زدہ ہوں اور نہ ہی کوئی میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔“ جوڈی نے کھردرے لہجے میں جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ میں کچھ جاننے کے لیے اصرار نہیں کروں گی۔ لیکن ..... بروک لاج تو ایک ویرانہ ہے۔ وہاں تمہیں سکون نہیں ملے گا۔“

”اب اس سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوگی۔“ جوڈی نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی گفتگو کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

باقی راستہ خاموشی سے کٹا۔ بروک لاج پہنچتے ہی جوڈی نے اپنا سامان اوپر کی منزل پر اس کمرے میں پہنچا دیا جہاں وہ شادی سے پہلے رہا کرتی تھی۔ اس نے کمرے کے

بیں کواکب کچھ

ایک بزرگ ثقل سماعت کا شکار تھے۔ گرد و پیش میں چیخ و پکار ہو یا ڈھول بج رہے ہوں، انہیں کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ وہ برسوں یہ عذاب جھیلتے رہے آخر کار ایک نامور معالج سے رجوع کیا۔ اس نے ان کے ایک کان میں بہت ننھا سا لیکن بیش قیمت آلہ لگایا اور وہ سانسوں کی آواز بھی سننے لگے۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ معالج نے انہیں ایک ماہ بعد دوبارہ بلایا تاکہ آلے میں کسی قسم کی شکایت ہو تو وہ اسے سیٹ کرسکے۔

ایک ماہ بعد وہ گئے تو ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”کہیے... اب کیا حال ہے... آپ کے گھر والے تو بہت خوش ہوں گے کہ اب آپ کی سماعت بحال ہوگئی ہے۔“

”نہیں...“ انہوں نے سر ہلایا۔ ”میں نے ابھی تک کسی کو نہیں بتایا کہ میں نے آلۂ سماعت لگوالیا ہے۔ بہروں کی طرح خاموشی سے بیٹھا سب کی سنتا رہتا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اب تک پانچ بار اپنی وصیت تبدیل کرچکا ہوں۔“

یہ مغرب ہے

اطالوی میاں بیوی کے چار بیٹے تھے، تین اپنے رنگ روپ اور شکل و شباہت میں قابلِ دید تھے لیکن چوتھا بیٹا پستہ قامت اور کم رو تھا۔ اس کے بال بھی کالے تھے۔ اس پر باپ دل ہی دل میں کڑھتا رہتا تھا۔

باپ بیمار ہوا اور بسترِ مرگ پر پہنچ گیا تو اس نے اپنی بیوی کو بلا کر کہا۔ ”دیکھو ہنی! مسیح کو حاضر و ناظر جان کر بتاؤ کہ چھوٹا والا میرا ہی بیٹا ہے نا... برسوں سے یہ خیال میرے لیے سوہانِ روح بنا ہوا ہے کہ مجھ سے بے وفائی کی گئی ہے۔“

”میں دل و جان سے قسم کھا کر کہتی ہوں کہ وہ ہم دونوں کا ہی بیٹا ہے... تمہیں اندر ہی اندر جلنے کڑھنے کے بجائے پہلے ہی مجھ سے بات کرلینی چاہیے تھی۔“ بیوی نے پورے خلوص اور سچائی سے کہا۔

اور وہ واقعی سچی تھی۔ دل ہی دل میں شکر ادا کر رہی تھی کہ اس کے شوہر نے تینوں بڑے بیٹوں کے بارے میں وہ سوال نہیں کیا تھا۔

نہال خرم کا تعاون بنگلہ دیش سے

دروازے اور کھڑکیوں کو خوب اچھی طرح چیک کیا اور ہدایت کر دی کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی اس طرف آنے کی کوشش نہ کرے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دروازہ اندر سے بند کر کے اپنے آپ کو محصور کر لیا۔

لوسی کی پریشانی بڑھتی گئی۔ جوڈی کسی طرح بھی زبان کھولنے کو تیار نہیں تھی۔ اس نے ایک دو مرتبہ کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو الٹا ڈانٹ سننا پڑی۔ بالآخر اس نے جوڈی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا لیکن اس کی اپنی پریشانی میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ گھر میں رینڈل کے علاوہ ہیلگا نامی ایک ادھیڑ عمر ملازمہ تھی۔ جوڈی کے لیے کھانا کبھی ہیلگا اس کے کمرے میں پہنچا دیتی اور کبھی لوسی خود جاتی۔ جوڈی اچھی طرح تصدیق کے بعد ہی دروازہ کھولتی کرتی تھی۔ اس کی صحت..... روز بہ روز گرتی جارہی تھی۔ وہ اپنے ہی گھر کے ایک کمرے میں بند سہمی سہمی سی رہتی۔ کوئی خوف اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹ رہا تھا۔

حویلی نما اس مکان کے ساتھ ایک بہت بڑا سوئمنگ پول اور اس کے دوسری طرف تین چار کمروں پر مشتمل ایک اور چھوٹا سا مکان بھی تھا جو کسی زمانے میں حویلی کے ملازمین کی رہائش کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس مکان سے آگے لکڑی کی پٹیوں کا جنگلا تھا جس کے دوسری طرف آڈریان ہاؤس واقع تھا۔ لیکن اس کے مکین بھی کئی سال قبل کیلی فورنیا جا چکے تھے اور اس وقت سے وہ مکان بھی خالی پڑا تھا۔ لوسی کو یہاں کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا۔ گھر کا تھوڑا بہت کام ہیلگا کر لیا کرتی تھی۔ لوسی کاغذ اور قلم لے کر تالاب کے دوسری طرف ملازمین والے مکان میں چلی جاتی اور دن بھر وہاں بیٹھی کچھ نہ کچھ لکھنے کی کوشش کرتی رہتی۔ ایک روز تالاب کے قریب سے گزرتے ہوئے یونہی اسے خیال آیا کہ کیوں نہ اس کی صفائی کر لی جائے۔ ملازمین والے کاٹیج کے قریب پہنچتے ہی دفعتاً اس کی نظریں آڈریان ہاؤس کی طرف اٹھ گئیں۔ وہاں ایک ٹیکسی کو کھڑے دیکھ کر وہ بری طرح چونک گئی۔ وہ آگے بڑھی ہی تھی کہ ٹیکسی حرکت میں آ کر تیزی سے مخالف سمت کے گیٹ سے باہر نکل گئی۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے لوسی اس کا نمبر بھی نہیں دیکھ سکی۔ لیکن یکایک اسے خیال آیا کہ اس ٹیکسی کا تعلق رینو سے نہیں ہو سکتا کیونکہ یہاں چلنے والی ٹیکسیوں کا رنگ زرد تھا جبکہ یہ ٹیکسی سلیٹی رنگ کی تھی۔ اس رنگ کی ٹیکسیاں اس نے نیویارک میں دیکھی تھیں۔ اسے حیرت ہوئی کہ وہ کون ہو سکتا تھا اور اسے دیکھ کر چلا کیوں گیا؟

وہ سر جھٹکتے ہوئے کاٹیج کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ کھولتے ہی اسے ایک بار پھر چونکنا پڑا۔ ہال کمرے کے فرش پر سگریٹ کا ایک خالی پیکٹ، کچھ راکھ اور سگریٹ کے باقی چھ ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ وہ خود سگریٹ نہیں پیتی تھی اور گزشتہ روز تقریباً تین چار گھنٹے یہاں بیٹھی لکھتی رہی تھی لیکن اس وقت یہاں ایسی کوئی چیز دکھائی نہیں دی تھی۔ اس نے آڈریان ہاؤس کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف دیکھا جو اندر سے بند تھی۔ اس کی نظریں پھر ایک بار سگریٹ کے ٹکڑوں اور بکھری ہوئی راکھ کی طرف اٹھ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر خالی پیکٹ اٹھا لیا۔ اس کا دماغ بری طرح چکرا رہا تھا۔ اس نے پیکٹ پھینک دیا اور دوڑتی ہوئی کاٹیج سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

وہ دن بڑی مشکل سے گزرا۔ اس نے ہیلگا یا رینڈل سے اس کا تذکرہ نہیں کیا لیکن ذہن میں بار بار یہی خیال آتا رہا کہ آڈریان ہاؤس میں ٹیکسی پر کون آیا تھا اور وہ کون تھا جو کاٹیج میں بیٹھا اطمینان سے سگریٹ پیتا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں جوڈی کے وہ الفاظ گونج رہے تھے کہ وہ بروک لاج میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھے گی۔ لوسی کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ جوڈی جس شخص سے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی وہ بالآخر یہاں بھی پہنچ گیا تھا اور کاٹیج میں چھپا ہوا غالباً اس کی نگرانی کر رہا تھا۔

لوسی رات بھر انہی خیالات میں الجھی رہی۔ اسے ڈھنگ سے نیند بھی نہ آسکی۔ اگرچہ سونے سے پہلے اس نے تمام کھڑکیاں اور دروازے خود بند کیے تھے لیکن ہر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد اٹھ کر ہر دروازہ اور ہر کھڑکی چیک کر لیتی اور معمولی سی آہٹ پر بھی بری طرح چونک پڑتی۔

صبح ناشتا کرتے ہی وہ شاپنگ کا بہانہ کر کے شہر روانہ ہوگئی۔ ایک ڈرگ اسٹور پر رک کر اس نے رچرڈ کو فون کیا۔ وہ گھر پر ہی تھا۔ لوسی نے اس سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا اور فون بند کر کے اسٹور سے باہر نکل آئی۔ چند منٹ بعد ہی وہ رچرڈ کے عالی شان ڈرائنگ روم میں بیٹھی اس سے باتیں کر رہی تھی۔

”وہ کسی سے خوف زدہ ہے۔ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں اس طرح بند کر رکھی ہیں جیسے اسے اپنے قتل کیے جانے کا خطرہ ہو۔ اور پھر کل کے واقعے سے تو میں بھی یہ سمجھنے پر مجبور ہوگئی ہوں کہ کوئی شخص اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔“

”سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون ہو سکتا ہے اور جوڈی اتنی خوف زدہ کیوں ہے۔“ رچرڈ نے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”مجھے شبہ ہے کہ کوئی شخص اسے بلیک میل کر رہا ہے۔ اگر واقعی کوئی ایسی بات ہے تو میں اس بلیک میلر سے نجات حاصل کرنے کے لیے جوڈی کو منہ مانگی رقم دے سکتا ہوں۔ لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ اس نے اس معاملے میں بالکل ہی چپ سادھ رکھی ہے۔ غالباً وہ اس بلیک میلر ہی کے خوف سے مجھ سے طلاق بھی لینا چاہتی ہے۔ تم ایک بار اور کوشش کر کے دیکھو۔ جوڈی کی خوشی کے لیے میں اپنی ساری دولت لٹانے کو تیار ہوں۔“

”کوشش کروں گی لیکن مجھے امید نہیں کہ وہ منہ سے کچھ پھوٹے یا طلاق کے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے کو تیار ہو۔“ لوسی کہتی ہوئی اٹھ گئی۔

رچرڈ کے مکان سے نکل کر وہ یونہی بازار میں گھومنے لگی۔ ایک دکان سے نکلتے ہوئے اچانک ہی اوبرائن سے آمنا سامنا ہوگیا۔

”ہیلو لوسی!“ وہ اسے دیکھتے ہی چہکا۔ ”تم تو ٹرین سے اس طرح اتر گئی تھیں جیسے کوئی تمہارا پیچھا کر رہا ہو۔“

”مجھے جوڈی کی وجہ سے سفر ملتوی کرنا پڑا۔“ لوسی نے جواب دیا۔ ”وہ ذہنی طور پر کچھ پریشان ہے۔ اس نے اچانک ہی رینو واپس آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تم کیسے آ گئے؟“

”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اپنی مرغیوں پر کچھ تجربات کرنا چاہتا ہوں۔“ اوبرائن مسکراتے ہوئے بولا۔ ”سنا ہے یہاں شہر کے نواح میں کم کرائے پر اچھے کشادہ مکان مل جاتے ہیں۔ آؤ تمہیں اپنی مرغیاں دکھاؤں۔“ وہ لوسی کو ایک ہوٹل میں لے گیا جس کے کمپاؤنڈ میں کھڑے ہوئے ایک ٹرک پر مرغیوں کے لاتعداد پنجرے لدے ہوئے تھے۔ ”یہ مرغیاں میں اپنے ساتھ ہی لے آیا ہوں۔ مکان ملتے ہی اوہائیو سے باقی مرغیاں بھی پہنچ جائیں گی۔“

”تم نے تو چلتا پھرتا پولٹری فارم کھول رکھا ہے۔“ لوسی ٹرک میں جھانکتے ہوئے مسکرائی۔ ”اگر ابھی تک مکان کا مسئلہ حل نہ ہوا ہو تو میں اپنی پیشکش دہرانے کو تیار ہوں۔ وہاں تمہاری مرغیوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

”گڈ!“ اوبرائن چہکا۔ ”اگر تم سنجیدہ ہو تو میرا خیال ہے کہ اس نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔“

اوبرائن نے ہوٹل سے چیک آؤٹ کیا اور لوسی کو اشارہ کرتا ہوا ٹرک میں سوار ہوگیا۔ لوسی بھی اوپر سے گھوم کر پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئی اور اسے راستے کے بارے میں ہدایات دیتی رہی۔ وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں بروک لاج پہنچ گئے۔ رینڈل بھی موجود تھا۔ تعارف کرانے پر اس نے بڑی گرم جوشی سے اوبرائن سے ہاتھ ملایا اور پھر اسے کاٹیج دکھانے لے گیا۔ اوبرائن کو یہ جگہ پسند آگئی۔ اس نے چند ماہ کا کرایہ پیشگی ادا کر دیا اور رینڈل سے مل کر ٹرک سے مرغیوں کے پنجرے اتارنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ رینڈل کو بتا رہا تھا کہ مرغیوں پر کس قسم کے تجربات کرنا چاہتا ہے۔

دوسرے روز لوسی کی بڑی بہن این کا بیٹا بل بھی پہنچ گیا۔ کالج میں چھٹیاں ہوگئی تھیں اور وہ چند روز یہاں رہنے کے لیے آگیا تھا۔ عمر میں وہ لوسی سے چند ہی سال چھوٹا تھا۔ خالہ اور بھانجے والے رشتے کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ بے تکلف دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے ملتے۔ اوبرائن سے ملنے کے بعد بل نے اسے دنیا کا پرلے درجے کا احمق قرار دیا۔ اس کے خیال میں وہ شخص پاگل ہی ہو سکتا تھا جو انسانوں کی صحبت چھوڑ کر دن بھر مرغیوں میں گھرا رہے اور ان سے اس طرح باتیں کرتا رہے جیسے انسانوں سے باتیں کی جاتی ہیں۔

تین چار روز گزر گئے۔ دن میں ایک دو مرتبہ لوسی اور اوبرائن کا آمنا سامنا ضرور ہوتا۔ اس کے پاس باتوں کے لیے مرغیوں کے علاوہ اور کوئی موضوع نہیں تھا۔ لوسی کو حیرت تھی کہ وہ فوج میں کس طرح چلا گیا تھا اور پھر پولیس میں کیسے آگیا تھا۔ ظاہر ہے لوسی کی بھی کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ اسے وقت گزاری کے لیے ایک دلچسپ ساتھی مل گیا تھا جس کی موجودگی میں کم از کم بوریت اور تنہائی کا احساس تو نہیں ہوتا تھا۔

جون شروع ہوتے ہی گرمی نے اپنے تیور دکھانے شروع کر دیے۔ دن تو کسی نہ کسی طرح کٹ جاتا لیکن رات قیامت بن کر گزرتی۔ حبس اور گھٹن سے ایک لمحے کو بھی چین نہ آتا۔ وہ رات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ لوسی اپنے کمرے میں بستر پر دراز بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب حویلی کے سامنے والی سڑک پر کسی گاڑی کے گزرنے کی آواز سنائی دی۔ لوسی کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ براؤن کی ٹیکسی ہوگی جو کسی سواری کو کہیں چھوڑ کر واپس آرہا تھا۔ لوسی نے کروٹ بدلی اور سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن اسی وقت دروازہ زور زور سے دھڑدھڑایا جانے لگا۔ ساتھ ہی بل کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

”آنٹی ..... آنٹی دروازہ کھولو۔ باہر آؤ۔ غضب ہو گیا۔“

لوسی گڑبڑا کر اٹھ گئی۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی نظریں بل کے چہرے پر جم گئیں۔ وہ غسل کا لباس پہنے ہوئے تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''کیا ہوا ..... تم اس قدر بدحواس کیوں ہو؟'' لوسی نے پوچھا۔ اس کی حالت دیکھ کر وہ بھی گھبرا گئی تھی۔

''آنٹی ..... وہ لاش ..... سوئمنگ پول میں ایک عورت کی لاش پڑی ہے۔''

''لل ..... لاش!'' لوسی بھی بدحواس سی ہو گئی اور ننگے پاؤں کمرے سے نکل کر سوئمنگ پول کی طرف دوڑی۔ جب وہ دونوں وہاں پہنچے تو اوبرائن بھی موجود تھا۔ وہ بھی ننگے پیر تھا اور جسم پر بھی صرف انڈر ویئر ہی نظر آ رہا تھا۔ لوسی کی نظریں تالاب کی سیڑھیوں کی طرف اٹھ گئیں جہاں عورت کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ پھر وہ بل کی طرف دیکھنے لگی۔

''تمہیں لاش کے بارے میں کیسے پتا چلا؟''

''گرمی کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نہانے کے لیے اپنے کمرے سے نکلا تھا۔ تالاب میں تیرتے ہوئے میرا ہاتھ اس سے ٹکرا گیا۔ پہلے تو میں کچھ سمجھا نہیں کہ یہ کیا چیز ہو سکتی ہے۔ غور سے دیکھنے پر مجھ پر خوف سا طاری ہو گیا۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ ختم ہو چکی ہے، چنانچہ میں اسے کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔'' بل نے بتایا۔

''آپ لوگ اس عورت کو جانتے ہیں؟'' اوبرائن نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔ دونوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اوبرائن کی ہدایت پر بل پولیس کو فون کرنے چلا گیا اور لوسی جھک کر لاش کا جائزہ لینے لگی۔ اس کے اندازے کے مطابق عورت کی عمر چالیس کے لگ بھگ ضرور رہی ہو گی۔ سنہری بال، درمیانہ قد اور دبلا پتلا جسم۔ وہ چہرے کو شناخت کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن یاد نہیں پڑتا تھا کہ اسے کہیں دیکھا ہو۔ قدموں کی آہٹ سن کر وہ پیچھے مڑی۔ یہ رینڈل اور جوڈی تھے۔ جوڈی آج کئی روز بعد کمرے سے باہر نکلی تھی اور وہ برسوں کی بیمار نظر آ رہی تھی۔ رینڈل نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ قریب پہنچ کر جوڈی لاش پر جھک گئی۔ پھر یوں جھٹکے سے سیدھی ہو گئی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ پیلا ہو گیا اور آنکھوں سے ویرانی جھانکنے لگی۔ اگر رینڈل فوراً ہی اسے سہارا نہ دیتا تو وہ یقیناً گر پڑتی۔ اتنے میں بل بھی واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ انسپکٹر ناڈلر کچھ دیر میں یہاں پہنچنے ہی والا ہے۔ بل اور رینڈل بے ہوش جوڈی کو اٹھا کر کمرے میں لے گئے۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد انسپکٹر ناڈلر بھی پہنچ گیا۔ لاش کا معائنہ کرنے کے بعد وہ لوسی اور اوبرائن سے سوالات کرنے لگا مگر ظاہر ہے وہ دونوں اس سلسلے میں اس کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ انسپکٹر ناڈلر نے تالاب کے آس پاس کا جائزہ لیا اور پھر لاش قصبے کے اسپتال بھجوانے کے بعد صبح آنے کا کہہ کر خود بھی رخصت ہو گیا۔

''حیرت ہے یہ عورت یہاں کس طرح پہنچی؟'' بل نے انسپکٹر کے جانے کے بعد کہا۔

''اوہ!'' لوسی اس بات پر چونک سی گئی۔ ''کچھ دیر پہلے میں نے براؤن کی ٹیکسی کی آواز سنی تھی۔ ممکن ہے وہ اسی ٹیکسی پر یہاں آئی ہو۔''

''لیکن سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ہے کون؟ اگر تم میں سے کسی کی شناسا نہیں تھی تو یہاں کیوں آئی تھی؟ اگر یہ اس قصبے کی رہنے والی نہیں تو اس کے پاس کوئی سامان بھی ہونا چاہیے۔ کوئی ہینڈ بیگ وغیرہ۔'' اوبرائن کہتے ہوئے سوئمنگ پول کی طرف دیکھنے لگا۔ پانی میں کوئی چیز تیرتی دیکھ کر اس نے فوراً ہی تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ کچھ دیر بعد وہ تنکوں کا ایک ہیٹ اور سیاہ چمڑے کا ایک ہینڈ بیگ سنبھالے تالاب سے باہر آ گیا۔

''میرا خیال ہے اس کے جوتے بھی تالاب ہی میں ہونے چاہئیں۔ بل! اب ایک کوشش تم بھی کر دیکھو۔ ہم کاٹیج میں ہیں۔'' اوبرائن کہتا ہوا کاٹیج کی طرف بڑھ گیا۔ لوسی بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔

کمرے میں پہنچ کر اوبرائن نے ہینڈ بیگ کھولا۔ بیگ میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے کوئی بات معلوم ہو سکتی۔ میک اپ کا سامان، دستانے اور کچھ رقم کے علاوہ ایک مڑا تڑا سا اخبار اور براؤن رنگ کا کاغذ کا ایک بوسیدہ سا ٹکڑا۔ ظاہر ہے عورت کی شناخت کے سلسلے میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اس دوران میں بل بھی واپس آ گیا۔ اس نے ہاتھ میں ایک سینڈل اٹھا رکھا تھا۔

''ایک ہی سینڈل ملا ہے۔ دوسرا شاید تالاب کی تہ میں کیچڑ میں پھنس گیا ہو۔ اس کی تلاش کے لیے پورا تالاب خالی کرنا پڑے گا۔'' بل نے کہتے ہوئے سینٹرل میز پر رکھ دیا۔

اوبرائن نے بیگ سے برآمد ہونے والا پرانا اخبار اور کاغذ کا بوسیدہ سا ٹکڑا فرش پر پھینک دیا اور باقی چیزیں دوبارہ بیگ میں ڈالتے ہوئے بولا۔

''یہ بیگ اور ہیٹ صبح انسپکٹر کو پہنچا دینا۔ ممکن ہے وہ ان چیزوں کی مدد سے عورت کے بارے میں کچھ معلوم کرنے

میں کامیاب ہو جائیں۔''

''کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ یہ چیزیں صبح کے بجائے ابھی پولیس کو پہنچا دی جائیں؟'' بل نے وہ تینوں چیزیں سنبھالتے ہوئے کہا۔

''اس سے اچھی بات اور کیا ہو گی۔'' اوبرائن اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

وہ دونوں کاٹیج سے نکل آئے۔ بل تو کپڑے پہن کر پولیس اسٹیشن چلا گیا اور لوسی اوپر چلی گئی۔ راہداری ہی میں رینڈل سے ملاقات ہو گئی جو جوڈی کے کمرے سے آ رہا تھا۔

''جوڈی کیسی ہے ..... ہوش آیا اسے؟'' لوسی نے پوچھا۔

''ہاں! وہ ہوش میں آ چکی ہے لیکن بہت خوف زدہ ہے۔ اس نے مجھے باہر نکال کر دروازہ اندر سے مقفل کر لیا ہے۔'' رینڈل نے جواب دیا۔

اس وقت دروازہ کھلوانے کی کوشش کرنا بیکار تھا۔ یہی سوچ کر لوسی اپنے کمرے میں آ گئی۔ رات کا باقی حصہ یہی سوچتے ہوئے گزرا کہ وہ عورت کون تھی اور یہاں کیوں آئی تھی؟ اس کی موت کس طرح واقع ہوئی تھی؟ ایک خیال یہ بھی آیا کہ وہ ڈوب کر مری ہو گی لیکن اگر پھسل کر تالاب میں گرتی تو مدد کے لیے اس کے چیخنے کی آواز ضرور سنائی دیتی۔ اس کی ذہنی رو جوڈی کی طرف دوڑ گئی جو اسے دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ عورت جوڈی کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ لیکن لوسی کو یقین تھا کہ جوڈی اس سلسلے میں زبان نہیں کھولے گی۔

صبح وہ جیسے ہی کمرے سے نکلی، ہال میں سوٹ کیس رکھے دیکھ کر چونک سی گئی۔ یہ سوٹ کیس جوڈی کے تھے۔ لوسی کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ یہاں سے بھی جانے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ ہیلگا کو آتے دیکھ کر اس نے جوڈی کے بارے میں دریافت کیا تو پتا چلا کہ سامان باہر رکھ کر اس نے ایک بار پھر کمرا اندر سے مقفل کر لیا تھا۔ لوسی زینے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی اور کچھ ہی دیر بعد ایلن اندر داخل ہوئی۔

''کیا ہوا لوسی ..... اخبار والے نے بتایا تھا کہ گزشتہ رات سوئمنگ پول سے کسی عورت کی لاش برآمد ہوئی ہے۔ کس کی لاش تھی اور جوڈی کہاں ہے؟'' ایلن نے آتے ہی پوچھا۔ اس کے لہجے میں تشویش نمایاں تھی۔

''جوڈی ٹھیک ہے۔'' لوسی نے کہا اور پھر اسے گزشتہ رات کے واقعے سے آگاہ کرنے لگی۔ آخر میں وہ بولی۔

''میرا خیال ہے جوڈی اس عورت کو جانتی ہے۔ تم میرے کمرے میں چلو۔ میں ابھی آتی ہوں۔''

لوسی اوپر پہنچ گئی۔ جوڈی کے کمرے کا دروازہ کھلوانے میں اسے دو تین منٹ لگ گئے۔ جوڈی کو دیکھ کر اس کے دل پر گھونسا سا لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ قبر سے نکل کر آئی ہو۔

''کیا بات ہے ..... کیوں پریشان کر رہی ہو؟'' جوڈی نے ناگوار سے لہجے میں پوچھا۔

''ہیلگا نے بتایا تھا کہ تم کہیں جانے کی تیاری کر رہی ہو۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ تم اس طرح کیوں بھاگی بھاگی پھر رہی ہو؟''

''میرا خیال تھا کہ بروک لاج میرے لیے محفوظ ترین پناہ گاہ ثابت ہو گی لیکن اب میں اپنے آپ کو یہاں بھی محفوظ نہیں سمجھتی۔'' جوڈی نے خوف زدہ سے لہجے میں جواب دیا۔

''آخر وہ کون ہے؟ تم کس سے ڈر کر بھاگ رہی ہو؟ اگر تمہیں کسی سے کوئی خطرہ ہے تو پولیس سے مدد کیوں نہیں لیتیں؟ وہ عورت کون تھی جس کی لاش دیکھ کر تم بے ہوش ہو گئی تھیں؟'' لوسی نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''میں نہیں جانتی۔'' جوڈی نے جواب دیا۔ ''تمہیں میرے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ میں یہاں سے جا رہی ہوں۔''

''تم نہیں جا سکتیں۔'' لوسی پہلی مرتبہ چیخی۔ ''اس طرح ماری ماری پھرتی رہو گی تو نقصان اٹھاؤ گی۔ تمہیں یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ گزشتہ رات ہمارے مکان کے سوئمنگ پول سے ایک عورت کی لاش برآمد ہوئی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس نے تالاب میں ڈوب کر خودکشی کی تھی یا اسے قتل کر کے لاش یہاں ڈالی گئی۔ اگر تم یہاں سے چلی گئیں تو پولیس تم پر شبہ کرے گی اور ممکن ہے اس کے قتل کا الزام تم پر ہی دھرنے کی کوشش کی جائے۔ گزشتہ رات تمہارے بے ہوش ہو جانے کی وجہ سے انسپکٹر ناڈلر تم سے کچھ نہیں پوچھ سکا تھا لیکن اس وقت وہ یہاں آنے ہی والا ہے۔ بہتر ہو گا کہ اس کے آنے سے پہلے تم مجھے سب کچھ بتا دو کہ وہ عورت کون تھی اور تمہارا اس سے کیا تعلق تھا؟''

''کچھ نہیں ..... میں کچھ نہیں جانتی۔'' جوڈی نے بے بسی سے سر ہلایا۔ اس نے اگرچہ اس معاملے میں زبان بند ہی رکھی لیکن لوسی کی بات شاید اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس نے یہاں سے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

''وہ کون تھی جوڈی! کیا تم اسے جانتی ہو؟'' لوسی نے

[illegible] کی۔

"وہ بے چاری شاید میرے دھوکے میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے۔ وہ تالاب میں ڈوب کر نہیں مری، اسے یقیناً قتل کیا گیا ہے۔"

"کیوں؟ وہ کون ہے جو تمہیں قتل کرنا چاہتا ہے؟" لوسی نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ "دیکھو جوڈی! اگر تم سب کچھ بتا دو تو تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہوسکتا ہے اور ہم تمہاری کوئی مدد بھی کر سکتے ہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم پولیس سے بھی مدد طلب کر سکتے ہیں۔"

"بند کرو یہ بکواس۔" جوڈی دہاڑی۔ "اگر تم نے یہ باتیں پولیس تک پہنچائیں تو مجھے زندہ نہیں پاؤ گی۔" یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے لوسی کو دھکا دے کر کمرے سے باہر نکال دیا اور دروازہ بند کرلیا۔

لوسی منہ لٹکائے نیچے آگئی۔ این کمرے میں اس کی منتظر تھی۔ لوسی نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اس کی آنکھوں میں بھی تشویش ابھر آئی۔ این، جوڈی سے کئی سال بڑی تھی لیکن جوڈی اس قدر ضدی اور خودسر تھی کہ کسی کو خاطر ہی میں نہ لاتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہیلگا نے ناشتا لگنے کی اطلاع دی تو وہ دونوں اٹھ کر ڈائننگ روم میں آگئیں۔ یہاں بل اور رینڈل بھی موجود تھے۔ ناشتے کے دوران ہی ہیلگا نے انسپکٹر ناڈلر کی آمد کی اطلاع دی۔ اسے بھی ڈائننگ روم میں ہی بلا لیا گیا۔ چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اس نے بتایا کہ اس عورت کو قتل کر کے لاش ان کے سوئمنگ پول میں پھینکی گئی تھی۔ اس کے سر کے پچھلے حصے پر ایک گہرا زخم پایا گیا تھا اور اس کی موت اسی ضرب سے واقع ہوئی تھی۔ وہ جوڈی سے اس سلسلے میں کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن لوسی نے جب بتایا کہ جوڈی کی طبیعت ٹھیک نہیں تو وہ پھر آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوگیا۔

معاملہ الجھتا ہی جا رہا تھا۔ جوڈی نے بتایا تھا کہ وہ عورت اس کے دھوکے میں ماری گئی تھی۔ قد و قامت میں دونوں ایک جیسی ہی تھیں۔ ممکن ہے قاتل، جوڈی ہی کو قتل کرنے کے ارادے سے آیا ہو۔ اس نے اس اجنبی عورت کو دیکھا مگر تاریکی ہونے کی وجہ سے اسے جوڈی سمجھ بیٹھا اور قتل کر کے لاش سوئمنگ پول میں ڈال گیا۔ لیکن سوال تو یہ تھا کہ کوئی جوڈی کو قتل کیوں کرنا چاہتا تھا؟ جوڈی اگر کچھ بتا دیتی تو شاید اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کیا جاسکتا مگر وہ خودسر لڑکی تو اس معاملے میں ایک لفظ بھی منہ سے نکالنے کو تیار نہیں تھی۔

ناشتا کرتے ہی لوسی اور برائن کو انسپکٹر ناڈلر کی تحقیقات سے آگاہ کرنے کے لیے کاٹج کی طرف چل پڑی۔ کمرے کی کھڑکی کھلی دیکھ کر نہ جانے اس کے دل میں کیا خیال آیا کہ وہیں رک کر اندر جھانکنے لگی۔ اوبرائن، مقتولہ کے ہینڈ بیگ سے برآمد ہونے والے پرانے اخبار اور کاغذ کے بوسیدہ سے ٹکڑے کا معائنہ کر رہا تھا۔ لوسی کل ہی دیکھ چکی تھی کہ کاغذ کا وہ بوسیدہ ٹکڑا بھی کسی بہت پرانے اخبار کا تراشہ ہی تھا لیکن اسے حیرت ہوئی کہ اوبرائن اس سے کیا معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر جیسے ہی دروازے میں پہنچی، اوبرائن نے اخبار اور تراشہ میز کے نیچے چھپا دیے۔

"میرا خیال ہے کہ مقتولہ کے ہینڈ بیگ سے برآمد ہونے والا یہ اخبار اور تراشہ بھی تمہیں پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے تھا۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

"کیا مطلب؟" اوبرائن نے اسے گھورا۔

"مطلب یہ کہ ممکن ہے پولیس کو ان چیزوں سے تحقیقات میں کچھ مدد مل سکتی ہو۔"

"پولیس کو ان سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ لو، تم بھی دیکھ لو۔" اوبرائن نے کہتے ہوئے دونوں چیزیں اس کی طرف بڑھا دیں۔

لوسی اخبار سے تو کچھ نہ سمجھ سکی البتہ تراشہ دیکھ کر چونک گئی۔ یہ ٹکڑا بیس سال پہلے کے کسی اخبار سے کاٹا گیا تھا جس میں اسی قصبے میں مولی پرسٹن نامی کسی لڑکی کے قتل کی خبر تھی۔ وہ اخبار اور تراشہ میز پر رکھ کر سوالیہ نگاہوں سے اوبرائن کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں گزشتہ بیس سال سے اس عورت کی تلاش میں ہوں جس کے متعلق ایک مختصر سی خبر اس اخبار میں موجود ہے۔" اوبرائن اخبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اگر گزشتہ رات یہاں آنے والی عورت وہی تھی تو سمجھو اب میری منزل زیادہ دور نہیں رہی۔"

"میں سمجھی نہیں۔" لوسی کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

"گزشتہ رات سوئمنگ پول سے جس عورت کی لاش برآمد ہوئی ہے، اس کا نام کیٹ ہنری تھا یا یوں کہو کہ آج سے بیس سال پہلے وہ اسی نام سے پہچانی جاتی تھی۔ پچھلی رات وہ کسی خاص مقصد کے تحت یہاں آئی تھی۔ یہ مقصد جوڈی سے ملاقات کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا اور اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اسے جوڈی ہی نے قتل کر کے لاش تالاب میں پھینک دیا ہو۔ میں جوڈی پر کوئی الزام نہیں لگا رہا، محض ایک امکان ظاہر کیا ہے جو غلط بھی ہوسکتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں اصل قاتل کو تلاش کرنا ہوگا تاکہ جوڈی کی بے گناہی

ثابت کی جاسکے۔ اگر تم جوڈی کو موت کے منہ میں جانے سے بچانا چاہتی ہو تو تمہیں اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھنا ہو گی۔"

لوسی کے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ دل ڈوبنے لگا۔ یہ خیال ہی ہولناک تھا کہ جوڈی نے اس عورت کو قتل کیا ہوگا لیکن وہ عورت کون تھی اور جوڈی سے کیوں ملنا چاہتی تھی؟ جوڈی اس کی لاش دیکھ کر بے ہوش کیوں ہوگئی تھی اور صبح ہوتے ہی وہ یہاں سے فرار کیوں ہونا چاہتی تھی؟ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے خوف زدہ سی نظروں سے اوبرائن کی طرف دیکھنے لگی۔

"ک.... کون ہو.... تم کون ہو؟" وہ ہکلائی۔

"تم لوگوں کا ہمدرد!" اوبرائن نے معنی خیز مسکراہٹ سے جواب دیا۔

لوسی نے متوحش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے مڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

اس روز جوڈی کی طبیعت خراب تھی۔ اس نے ناشتا بھی واپس کر دیا تھا۔ لوسی نے سوچا کہ اس کی خیریت دریافت کرلے لیکن پھر یہ سوچ کر اوپر جانے کا ارادہ ترک کر دیا کہ جوڈی کسی قیمت پر بھی دروازہ نہیں کھولے گی۔ وہ حویلی سے نکل کر سڑک پر آگئی اور بلامقصد سڑک پر چلنے لگی۔ اوبرائن کے بارے میں بھی اب اس کے دل میں طرح طرح کے شبہات جنم لے رہے تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ مرغیوں پر کسی قسم کے تجربات کر رہا ہے لیکن اب اس نے یہ دلچسپ انکشاف کیا تھا کہ اسے ایک ایسی عورت کی تلاش تھی جو بیس سال پہلے قتل کے کسی کیس میں پولیس کو مطلوب تھی اور گزشتہ رات وہ بھی اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی۔

قصبے کی طرف سے براؤن کی ٹیکسی آتی دیکھ کر لوسی نے بے اختیار اسے رکنے کا اشارہ کر دیا۔ پورے قصبے میں یہ ایک ہی ٹیکسی تھی جو دن میں شہر اور قصبے کے درمیان چکر لگاتی رہتی۔ اس طرح براؤن ہی وہ واحد شخص تھا جس سے یہ معلوم ہوسکتا تھا کہ کون آیا اور کون گیا تھا۔ ٹیکسی قریب آکر رک گئی۔

"ہیلو مس لوسی!" براؤن کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے مسکرایا۔

"کل رات تم کسی عورت کو قصبے میں لائے تھے؟" لوسی نے پوچھا۔

"ہاں، وہ ٹرین سے آئی تھی اور یہاں آنے کے لیے کہا تھا۔ میرا خیال تھا وہ سرائے میں قیام کرے گی کیونکہ اس سے پہلے میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن وہ تمہارے گھر کے قریب ٹیکسی رکوا کر اتر گئی۔" براؤن نے بتایا۔

"کیا اس نے اپنے بارے میں کچھ بتایا تھا یا یہ کہ وہ قصبے میں کس سے ملنا چاہتی ہے؟"

"نہیں، میں نے پوچھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور میں نے بھی زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ کچھ دیر پہلے انسپکٹر ناڈلر بھی اس عورت کے بارے میں پوچھ چکا ہے۔ معاملہ کیا ہے؟"

"تمہیں شاید اب تک پتا نہیں چل سکا۔" لوسی نے رخ بدلتے ہوئے کہا۔ "وہ پُراسرار عورت گزشتہ رات ہمارے تالاب میں مردہ پائی گئی ہے۔ کسی نے اسے قتل کر دیا تھا۔"

براؤن سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اچھل پڑا۔ لیکن لوسی اس کی حیرت دیکھنے کے لیے وہاں رکی نہیں۔

☆☆☆

لوسی کھڑکی میں کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ ہر طرف سوگوار سا سناٹا طاری تھا۔ ابھی اگرچہ رات کے صرف گیارہ ہی بجے تھے لیکن لگ رہا تھا رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہو۔ گزشتہ رات کی طرح آج بھی لوسی کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ عجیب و غریب سے خیالات اس کے ذہن میں آرہے تھے۔ وہ بستر سے اٹھ کر یہ سوچتے ہوئے کھڑکی کے سامنے کھڑی ہوگئی تھی کہ شاید اس طرح دھیان بٹنے سے ذہنی الجھنوں سے نجات مل جائے۔ لیکن اسے وہاں کھڑے ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ گیٹ کے سامنے سڑک پر کوئی کار رکتے دیکھ کر وہ چونک گئی۔ کار کا دروازہ کھلا اور کوئی شخص دبے قدموں چلتا ہوا مکان کی طرف بڑھنے لگا۔ لوسی سانس روکے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ شخص اِدھر اُدھر دیکھے بغیر اس جگہ رک گیا جہاں اوپر کی منزل پر جوڈی کا کمرا تھا۔ اس سے لوسی کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ جو کوئی بھی تھا، اچھی طرح جانتا تھا کہ جوڈی اس عمارت کے کس کمرے میں رہائش پذیر ہے۔ اس شخص نے نیچے جھک کر کوئی پتھر اٹھایا، چند لمحے اسے ہاتھوں میں لیے رہا پھر پتھر جوڈی کے کمرے کی بالکونی پر اچھال دیا۔ پتھر گرنے کی آواز صاف سنائی دی تھی لیکن یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ بالکونی کے بجائے کمرے کے اندر گرا ہو جس کا صرف ایک ہی مطلب تھا کہ جوڈی نے بالکونی والا دروازہ کھول رکھا تھا۔ پتھر گرنے کی آواز کے ساتھ ہی فضا میں جوڈی کی چیخ بھی گونجی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے خاموشی چھا گئی۔

لوسی نے لپک کر دروازہ کھولا اور باہر نکل کر دوڑتی چلی

گئی۔ جوڈی کے کمرے کی بالکونی کے نیچے پہنچنے کے لیے اسے عمارت کا پورا چکر لگانا پڑا تھا لیکن ابھی وہ عمارت کے پچھلی طرف مڑی ہی تھی کہ کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ دوڑتے دوڑتے رک گئی اور مڑ کر گیٹ کی طرف دیکھنے لگی۔ کار تیزی سے سڑک پر دوڑتی ہوئی نظر آئی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، فرار ہو چکا تھا۔ اسی لمحے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر لوسی چونک گئی اور آواز کی سمت دیکھنے لگی۔ وہ اوبرائن تھا جو دوڑتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔

''وہ.... وہ چلا گیا لیکن اس نے کوئی چیز جوڈی کے کمرے میں پھینکی تھی۔ شاید کوئی پتھر تھا۔ میں نے اسے زمین پر جھک کر کچھ اٹھاتے ہوئے دیکھا تھا۔''

اوبرائن نے قریب پہنچ کر کہا اور پھر دونوں جوڈی والے کمرے کی بالکونی کے نیچے آ گئے۔

''جوڈی! کیا تم جاگ رہی ہو؟ میری آواز سن رہی ہو؟ میں لوسی ہوں۔ ابھی ابھی یہاں کوئی آیا تھا۔'' لوسی نے چیخ کر کہا۔

''آدھی رات کو حلق پھاڑ کر کیوں چیخ رہی ہو۔ یہاں کوئی نہیں آیا تھا۔ جاؤ اپنے کمرے میں جاؤ۔'' اوپر سے جوڈی کی غصے بھری آواز سنائی دی۔

''جوڈی! اس شخص نے شاید کوئی پتھر اندر پھینکا تھا۔ تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچا؟'' اس مرتبہ اوبرائن نے پوچھا۔

''شاید تم لوگوں نے جاگتے میں کوئی خواب دیکھا تھا۔ میں نے تازہ ہوا کے لیے دروازہ کھولا تھا۔ لیکن لگتا ہے تم لوگ مجھے ایک منٹ کو بھی آرام نہیں کرنے دو گے۔'' جوڈی نے چیخ کر کہا اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔

''جوڈی یقیناً ہم سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ میرا خیال ہے اس نے پتھر باہر پھینک دیا ہو گا۔'' اوبرائن کہتا ہوا زمین پر کچھ تلاش کرنے لگا اور پھر جلد ہی اسے جوڈی کی بالکونی کے نیچے ایک ایسا پتھر مل گیا جس پر دھاگا لپٹا ہوا تھا۔ وہ لوسی کو پتھر دکھاتے ہوئے بولا۔ ''میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس پتھر کے ذریعے کوئی خط جوڈی تک پہنچایا گیا ہے لیکن جوڈی اس کا اقرار نہیں کرے گی۔ ممکن ہے وہ اب تک اس خط کو ضائع کر چکی ہو۔''

لوسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چند لمحے وہاں کھڑے رہے پھر واپس مڑ گئے۔ اوبرائن تو اپنے کاٹیج کی طرف چل دیا مگر لوسی برآمدے ہی میں رک کر اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ اوبرائن کا کردار بھی اب ایک معما بنتا جا رہا تھا۔ کاٹیج جوڈی کے کمرے سے تقریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر واقع تھا۔ کمرے میں پتھر گرنے کی آواز اور جوڈی کی چیخ وہاں تک ہرگز نہیں پہنچ سکتی تھی۔ بالفرض اگر چیخنے کی آواز پہنچ بھی جاتی تو اوبرائن کو یہاں تک پہنچنے کے لیے کچھ وقت ضرور لگتا۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی پہنچا تھا۔ ایک لمحے کو لوسی کے ذہن میں یہ خیال بھی ابھرا تھا کہ کہیں اوبرائن ہی تو وہ شخص نہیں جس نے جوڈی کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ وہ جیسے جیسے سوچتی گئی، اس کے شبے کو تقویت ملتی گئی اور پھر وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے کاٹیج کی طرف چل پڑی۔ اوبرائن کاٹیج کے دروازے پر ہی مل گیا۔

''مجھے یقین تھا کہ تم میرے پیچھے ضرور آؤ گی۔'' اوبرائن اسے دیکھ کر مسکرایا۔ ''لیکن میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہی ہو۔''

''میں فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم کون ہو اور گزشتہ رات قتل ہونے والی عورت سے تمہارا کیا تعلق ہے اور جوڈی کو اس معاملے میں کیوں گھسیٹا جا رہا ہے؟'' لوسی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''تم تو باقاعدہ پولیس والوں کی طرح سوال جواب کرنے لگیں۔'' اوبرائن نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں مسٹر اوبرائن۔'' لوسی کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''اگر تم نے میری باتوں کا جواب نہ دیا تو میں پولیس کو تمہارے مشکوک کردار کے بارے میں اطلاع کر دوں گی۔''

''میرا خیال تھا کہ میں کسی کو شبہ کرنے کا موقع دیے بغیر اپنا کام کرتا رہوں گا لیکن اب شاید ایسا ممکن نہ ہو۔ مجھے یہ بات کرنے کے لیے کسی مناسب وقت کا انتظار تھا شاید وہ وقت آن پہنچا ہے۔'' اوبرائن نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ آج سے بیس برس پہلے کی بات ہے۔ میں ان دنوں پولیس میں نیا نیا بھرتی ہوا تھا۔ انسپکٹر فلیچر مجھے اپنی اولاد ہی کی طرح چاہتا تھا اور میں بھی اس کا بڑا احترام کرتا تھا۔ انہی دنوں اسی قصبے میں مولی پرسٹن نامی ایک لڑکی کو قتل کر دیا گیا۔ مولی ایک لانڈری میں کام کرتی تھی۔ حصولِ زر نے اسے غلط راستے پر ڈال دیا۔ وہ ہر رات قصبے کے کسی نوجوان کو اپنے فلیٹ پر لے جاتی اور پھر اسے رسوا کرنے کی دھمکی دے کر اس کی جیبوں سے آخری سینٹ تک نکال لیتی۔ اس کی اس حرکت نے بعض لوگوں کو اس کا دشمن بھی بنا دیا اور پھر ایک صبح کمرے میں اس کی لاش پائی گئی۔ اسے گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اس کی موت رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ نچلی منزل پر رہنے والی کیٹ ہنری نامی ایک لڑکی کے بیان پر پولیس نے جان شینن نامی ایک نوجوان کو گرفتار کر لیا جسے رات سوا دس بجے کے قریب مولی پرسٹن کے فلیٹ میں جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ جان شینن نے اپنی صفائی میں یہ موقف اختیار کیا کہ اس نے مولی پرسٹن کو کپڑے دھلنے کے لیے دیے ہوئے تھے اور وہ صبح یہی کپڑے پہن کر کہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ مولی پرسٹن سے اپنے کپڑے لینے کے لیے وہاں گیا تھا۔ عدالت اس کے بیان سے مطمئن نہ ہو سکی اور اسے عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔ جان شینن کو اگرچہ انسپکٹر فلیچر ہی نے گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا تھا لیکن بعد میں نہ جانے اسے بار بار یہ احساس کیوں ہوتا رہا کہ شینن بے گناہ تھا۔ وہ کیس ختم ہو جانے کے باوجود اپنے طور پر تحقیقات کرتا رہا اور پھر ایک روز کیٹ ہنری اچانک ہی غائب ہو گئی جس سے انسپکٹر فلیچر کا شبہ یقین میں بدل گیا کہ شینن واقعی بے گناہ تھا اور کیٹ نے غلط بیان دے کر اسے اس مقدمے میں پھنسایا تھا۔ وہ کیٹ کو تلاش کرتا رہا۔ بالآخر اسے پتا چل گیا کہ وہ دریائے ہڈسن کے کنارے ایک چھوٹے سے قصبے میں روپوش ہے۔ وہ وہاں جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ کسی نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ انسپکٹر فلیچر کی موت کے بعد اس کا مشن میں نے سنبھال لیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ حقیقت سے قریب تر پہنچ چکا تھا لیکن اصل مجرم نے اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے اسے ہمیشہ کے لیے راستے سے ہٹا دیا۔ انسپکٹر فلیچر کی موت نے میرے اوپر دیوانگی سی طاری کر دی تھی اور میں اس کے قاتل کو ہر صورت میں بے نقاب کرنا چاہتا تھا۔ اس واقعے کو اگرچہ بیس سال گزر چکے ہیں لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔ میں نے ہمت نہیں ہاری اور آج بھی قاتل کی تلاش میں ہوں۔''

لوسی گہری توجہ سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ چند روز پہلے ٹرین کے سفر کے دوران اوبرائن سے اس کی ملاقات محض اتفاقیہ نہیں تھی۔ وہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس کے قریب آیا تھا اور مرغیوں پر تجربات کے لیے مکان کا مسئلہ بھی اس نے کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہی اٹھایا تھا۔ غالباً وہ آگاہ تھا کہ لوسی ایک ایسے مکان کی مالک ہے جہاں مرغیوں کے بہانے اس کے لیے بھی گنجائش نکل سکتی تھی اور وہ قریب رہ کر ان کی نگرانی کرنا چاہتا تھا۔ پھر چند روز قبل رینو کے بازار میں ہونے والی ملاقات بھی اتفاق نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن وہ حیران تھی کہ اس کا یا جوڈی کا اس معاملے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟

''اب مجھے یقین ہو چکا ہے کہ تم یہاں کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہی آئے ہو لیکن ہم اس تصویر میں کہاں فٹ ہوتے ہیں؟'' وہ اوبرائن کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔

''میری تحقیقات کا مرکز اب جوڈی ہے۔'' اوبرائن نے کہا۔ ''چند روز پہلے رینو میں ایک گمنام کال کے ذریعے کسی عورت نے مجھے بتایا تھا کہ جوڈی کی جان خطرے میں ہے۔ کال کو ٹریس کرنے کے بعد انکشاف ہوا کہ وہ کال دریائے ہڈسن کے کنارے واقع پیز گارڈن نامی ایک چھوٹے سے قصبے سے کی گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ فون کرنے والی وہ عورت کیٹ ہنری کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اسے میں نے بتایا تھا کہ چند روز بعد میں یہاں آنے والا ہوں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ مجھے ملنے کے لیے یہاں آئی تھی لیکن مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی اسے ختم کر دیا گیا۔ میں بیس سال سے کیٹ ہنری کی تلاش میں تھا کیونکہ وہ انسپکٹر فلیچر کے قاتل کو جانتی تھی لیکن افسوس کہ وہ کچھ بتانے سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ یہاں کی پولیس ابھی تک اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں کر سکی ہے۔ میرا ایک خیال یہ بھی ہے کہ ممکن ہے وہ عورت کیٹ ہنری نہ ہو، کوئی اور ہو لیکن اس سلسلے میں ہم آسانی سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے ہیٹ کے اندر اس دکان کا لیبل لگا ہوا تھا جہاں سے وہ ہیٹ خریدا گیا تھا۔ میں نے وہ ہیٹ مل کے ہاتھ پولیس کو بھجوانے سے پہلے لیبل اتار لیا تھا۔'' اوبرائن نے اسے لیبل دکھایا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس کے علاوہ ہمارے پاس معلومات کا ایک اور ذریعہ بھی ہے۔ پیز گارڈن کا بیوٹی پارلر۔ مقتولہ کے سر کے بال رنگے ہوئے تھے۔ وہ یقیناً مہینے میں ایک آدھ مرتبہ بیوٹی پارلر ضرور جاتی ہو گی۔ وہاں سے بھی اس کے بارے میں معلوم کیا جا سکتا ہے۔''

''لیکن .... میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟'' لوسی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''بہت کچھ۔'' اوبرائن مسکرایا۔ ''اگر تم پیز گارڈن جا کر اس عورت کے بارے میں معلومات حاصل کر سکو تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہو گی۔ اخراجات کی پروا مت کرنا۔''

لوسی چند لمحے کچھ سوچتی رہی اور پھر اس نے اپنی

آمادگی کا اظہار کر دیا۔ اوبرائن سے رخصت ہو کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی اور پھر صبح ہوتے ہی کسی کو بتائے بغیر دریائے ہڈسن کی طرف روانہ ہو گئی۔ ہیز گارڈن زیادہ بڑا قصبہ نہیں تھا۔ وہ بازار کے واحد بیوٹی پارلر میں پہنچ گئی۔ اس وقت اتفاق سے وہاں اور کوئی گاہک موجود نہیں تھا۔ لوسی بال سیٹ کروانے کے بہانے کرسی پر بیٹھ گئی اور بیوٹی پارلر کی مالک کو باتوں میں لگا لیا۔

"تم شاید یہاں اجنبی ہو۔ پہلی مرتبہ تمہیں دیکھا ہے؟" بوڑھی عورت نے کہا۔

"ہاں، میں اپنی ایک دوست سے ملنے پہلی مرتبہ یہاں آئی ہوں لیکن بدقسمتی سے اس کے مکان کا پتا بھول گئی ہوں۔ شاید تم اس سلسلے میں میری کوئی مدد کر سکو۔" لوسی نے کہا اور اس عورت کا حلیہ دہرانے لگی جس کی لاش ان کے سوئمنگ پول سے برآمد ہوئی تھی۔

"سمجھ گئی۔ تم یقیناً مسز بجمن سے ملنے آئی ہو۔ وہ مہینے میں کم از کم دو مرتبہ میرے ہاں ضرور آتی ہے۔" عورت نے کہا اور پھر پتا سمجھانے لگی۔

تھوڑی دیر بعد بیوٹی پارلر سے نکلتے ہی لوسی اس عورت کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑی۔ پرانا سا کاٹیج نما وہ مکان قصبے کے دوسرے سرے پر واقع تھا۔ گیٹ بند تھا۔ وہ اوپر سے گھومتی ہوئی عقبی سمت میں چلی گئی۔ پچھلا دروازہ بھی بند تھا لیکن خوش قسمتی سے ایک کھڑکی کھلی ہوئی مل گئی۔ غالباً اس کاٹیج کے مکین اسے اندر سے بولٹ کرنا بھول گئے تھے۔ لوسی نے محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر نہایت آہستگی سے کھڑکی کے راستے اندر کود گئی۔ یہ کاٹیج تین کمروں پر مشتمل تھا اور تمام کمروں کے دروازے کھلے ہوئے ہی تھے۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہو کر متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ سامنے ہی دیوار پر ایک ادھیڑ عمر شخص کی پرانی سی تصویر آویزاں تھی۔ لوسی کی نظریں تصویر سے پھسل کر دیوار کے قریب پڑی ہوئی میز پر پہنچ گئیں۔ وہ آگے بڑھ کر درازوں کی تلاشی لینے لگی۔ ایک دراز میں بھرے ہوئے کاغذات سے انکشاف ہوا کہ تصویر والا وہ ادھیڑ عمر شخص بجمن تھا جو تقریباً ایک سال قبل کار کے حادثے میں ہلاک ہو چکا تھا۔ وہ قصبے کے تمباکو اسٹور کا مالک تھا۔ موت کے بعد اسٹور اور اس سے متعلق ہر چیز اس کی بیوی کو منتقل ہو گئی۔ انہی کاغذات میں شادی کا اجازت نامہ بھی موجود تھا جس سے یہ انکشاف ہوا کہ شادی سے پہلے مسز بجمن کا اصل نام کیٹ ہنری تھا۔ میز کی دوسری دراز میں چند رسید

بکوں کے علاوہ ایک چیک بک بھی مل گئی۔ لوسی کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس چیک بک کے ذریعے تقریباً بیس سال قبل رینو کے ایک بینک میں مسز بجمن کے نام تیس ہزار ڈالر جمع کروائے گئے تھے لیکن اس وقت سے اب تک اس اکاؤنٹ میں سے ایک سینٹ بھی نہیں نکلوایا گیا تھا۔ لوسی چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر تمام کاغذات اپنے ہینڈ بیگ میں ٹھونس کر کھڑکی ہی کے راستے باہر نکل آئی اور بازار میں سے ہوتی ہوئی اسٹیشن پہنچ گئی۔ ایک گھنٹے سے پہلے کوئی ٹرین رینو کے لیے نہیں مل سکتی تھی۔ وہ بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑی۔ یہاں سے فوراً ہی بس مل گئی۔

شام چھ بجے کے قریب لوسی اپنے گھر پہنچ گئی۔ گھر کے افراد نے اس کی صبح سے اب تک کی غیر حاضری پر توجہ نہیں دی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ کاٹیج پہنچ گئی مگر تالا دیکھ کر لوٹ آئی۔ اوبرائن غالباً شہر گیا ہوا تھا۔ اس کی گاڑی بھی موجود نہیں تھی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بیٹھی سوچتی رہی کہ جوڈی کا اس سارے معاملے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اوبرائن جس قتل کی تحقیقات کر رہا تھا، وہ آج سے بیس برس پہلے ہوا تھا۔ وہ خود تو ان دنوں بہت چھوٹی تھی لیکن شاید جوڈی کی شادی انہی دنوں ہوئی تھی۔ اتنا عرصہ رحمٰن کے ساتھ گزارنے کے بعد اس سے یکایک جوڈی کا علیحدگی اختیار کرنے کا فیصلہ بھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

گیارہ بجے کے قریب لوسی نے اپنے کمرے سے نکل کر کاٹیج کی طرف دیکھا۔ ایک کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ اوبرائن واپس آ چکا تھا۔ وہ مسز بجمن کے کاٹیج سے ملنے والی چیزیں سنبھال کر کاٹیج کی طرف چل پڑی۔ کاٹیج تک پہنچنے کے لیے کچھ فاصلہ سوئمنگ پول کے ساتھ ساتھ طے کرنا پڑتا تھا۔ ابھی وہ کنارے پر پہنچی ہی تھی کہ کوئی سایہ تاریکی سے نکل کر اس پر جھپٹا۔ اس سے پہلے کہ لوسی کچھ سمجھ سکتی، سائے نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس نے ایک ہاتھ لوسی کے منہ پر جما دیا اور ہولے سے غرایا۔

"اگر تم نے مزاحمت کرنے یا شور مچانے کی کوشش کی تو زندہ نہیں بچو گی۔ میں نے تمہارے کمرے میں خط پھینکا تھا۔ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ میں دوٹوک جواب سننا چاہتا ہوں۔"

لوسی بے بسی کے انداز میں سر پٹخنے لگی۔ ظاہر ہے جب تک منہ سے ہاتھ نہ ہٹایا جاتا، وہ کیا جواب دے سکتی تھی۔

"دیکھو، میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹا رہا ہوں۔ اگر تم نے

چیخنے کی کوشش کی تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں ہاں یا نہ میں مختصر جواب چاہتا ہوں۔ بولو تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"کیسا فیصلہ ..... تت ..... تم کون ہو .....؟" لوسی منہ سے ہاتھ ہٹتے ہی ہکلائی۔

آواز سن کر وہ شخص چونک گیا۔ اس نے جھک کر لوسی کے چہرے کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے لوسی کو سوئمنگ پول میں دھکا دے کر ایک طرف کو بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک غوطہ کھانے کے بعد لوسی پانی کی سطح پر ابھر آئی۔ اس صورتِ حال نے اسے بری طرح بدحواس کر دیا تھا۔ وہ تالاب سے نکل کر گرتی پڑتی کاٹیج میں پہنچ گئی۔ اوبرائن اس کی حالت دیکھ کر چونک گیا۔

"ارے تم ..... یہ کیا ہوا؟" وہ جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"وہ ..... وہ پتا نہیں کون تھا، شاید مجھے جوڈی سمجھ بیٹھا تھا لیکن اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی مجھے سوئمنگ پول میں پھینک کر تاریکی میں غائب ہو گیا۔ وہ بیگ تالاب میں ہے ..... تمام چیزیں اسی بیگ میں ہیں جو میں کیٹ ہنری کے مکان سے لائی تھی۔" لوسی نے اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اوبرائن یہ سنتے ہی باہر کی طرف دوڑا۔ اس کی واپسی تقریباً پانچ منٹ بعد ہوئی تھی۔ وہ سوئمنگ پول سے وہ بیگ نکال لایا تھا جس کا لوسی نے تذکرہ کیا تھا۔ وہ ایک ایک چیز نکال کر میز پر رکھتا چلا گیا۔ بیگ میں سے برآمد ہونے والے کاغذات میں ایک اخباری تراشہ بھی تھا جو زیادہ پرانا نہیں تھا۔ لوسی کو حیرت تھی کہ یہ تراشہ ان کاغذات میں کیسے آ گیا تھا۔ اوبرائن چند لمحے دیکھتا رہا پھر تراشہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"جوڈی کے بیان کے مطابق وہ اس عورت کو نہیں جانتی جو اس روز سوئمنگ پول میں مردہ پائی گئی تھی۔ لیکن یہ اخباری تراشہ ثابت کرتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا۔ یہ جوڈی کے طلاق کے مطالبے سے متعلق ایک خبر ہے جس کے ساتھ اس کی تصویر بھی چھپی ہے۔ آخر اس عورت کو یہ تراشہ اپنے گھر میں سنبھال کر رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟"

لوسی تراشہ دیکھنے لگی۔ اس کا دماغ بری طرح چکرا رہا تھا۔ اوبرائن کا یہ خیال درست ہی معلوم ہوتا تھا کہ کیٹ ہنری اور جوڈی میں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا۔ وہ دونوں کتنی دیر تک اس مسئلے پر بحث کرتے رہے لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔

دوسرے دن لوسی کو کسی کام سے شہر جانا پڑا۔ واپس آئی تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے کا رخ کرنے کے بجائے سیدھی کاٹیج کی طرف چلی گئی۔ بیرونی دروازہ اگرچہ کھلا ہوا تھا لیکن خاموشی بتا رہی تھی کہ اوبرائن موجود نہیں ہے۔ اسے حیرت بھی ہوئی۔ اوبرائن اس طرح دروازہ کھلا چھوڑ کر کبھی بھی کہیں نہیں گیا تھا۔ اس نے دو تین آوازیں دیں۔ کوئی جواب نہ پا کر اندر داخل ہو گئی اور پھر اس نے جیسے ہی اوبرائن والے کمرے کی بتی جلائی، اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ فرش پر خون پھیلا ہوا تھا اور اوبرائن میز کے پیچھے کرسی پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ ٹیلی فون کے ریسیور پر تھا۔ لوسی دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گئی۔ دائیں کندھے سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ زخم دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اسے گولی ماری گئی تھی۔ وہ اسے ٹٹول کر دیکھنے لگی۔ وہ زندہ تھا۔ لوسی بدحواسی کے عالم میں دوڑتی ہوئی رینڈل کو بلا لائی اور پھر بے ہوش اوبرائن کو اسپتال پہنچانے میں انہوں نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔

اسپتال سے واپس آتے ہوئے لوسی کو خیال آیا کہ بدحواسی میں وہ کاٹیج کا دروازہ کھلا ہی چھوڑ گئی تھی۔ رینڈل تو اپنے کمرے کی طرف چلا گیا لیکن لوسی کاٹیج میں پہنچ گئی اور گھوم پھر کر تمام کمروں کا جائزہ لینے لگی۔ کسی چیز کو نہیں چھوا گیا تھا۔ اوبرائن کو زخمی دیکھ کر پہلے تو لوسی یہی سمجھی تھی کہ یہ کسی چور کی حرکت ہو گی لیکن اب وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ جو کوئی بھی تھا، محض اوبرائن کی جان لینا چاہتا تھا۔ وہ چند لمحے میز پر بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھتی رہی پھر انہیں سمیٹ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ یہ وہی کاغذات تھے جو ہیز گارڈن میں کیٹ ہنری کے مکان سے لائی تھی۔ اس نے خود ابھی تک تفصیل سے ان کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ ایک ایک چیز کو غور سے دیکھنے لگی۔ ان کاغذات میں بجمن کی ایک تصویر بھی شامل تھی۔ اس کے چہرے پر داڑھی کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ تصویر دیکھتے ہوئے لوسی کو نہ جانے یہ احساس کیوں ہو رہا تھا کہ اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکی ہے لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ کب اور کہاں دیکھا تھا۔ اسی وقت ہیلگا کھانا لگنے کی اطلاع دینے کے لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ لوسی کے ہاتھ میں تصویر دیکھ کر وہ آگے کو جھک گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں تغیر دیکھ کر لوسی چونک سی گئی۔

"کیا بات ہے ہیلگا؟ کیا تم اس شخص کو جانتی ہو؟"

لوسی نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''نن..... نہیں...... بالکل نہیں۔ میں بھلا اسے کیا جانوں.....'' ہیلگا ایک دم گھبرا سی گئی۔

ہیلگا کے انکار کے باوجود لوسی کو یقین تھا کہ وہ شخص کو جانتی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیں۔ گفتگو کے دوران ہیلگا کے منہ سے ڈرسن کا نام سن کر لوسی کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ اس نے ہیلگا کی طرف دیکھا جو تیزی سے باہر نکل گئی تھی لیکن لوسی کی ساری الجھن دور ہو چکی تھی۔

ڈرسن ان کا پرانا ملازم تھا جس نے اس کے باپ کی موت کے فوراً ہی بعد ملازمت چھوڑ دی تھی۔ یہ تصویر ڈرسن ہی کی تھی۔ چہرے پر داڑھی کے اضافے کی وجہ سے وہ فوری طور پر اسے نہیں پہچان سکی تھی لیکن اسے حیرت تھی کہ ڈرسن کے بینک اکاؤنٹ میں تیس ہزار ڈالرز کہاں سے آ گئے۔ چیک بک کی تاریخ بتاتی تھی کہ یہ خطیر رقم انہی دنوں بینک میں جمع کروائی گئی تھی جب اس نے ملازمت چھوڑی تھی۔ تصویر کی شناخت کا مسئلہ حل ہونے کے باوجود اس کی الجھن ابھی دور نہیں ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر ڈائننگ روم میں آ گئی۔ جوڈی کو وہاں دیکھ کر وہ حیران سی رہ گئی۔ جوڈی جب سے یہاں آئی تھی، وہ پہلی مرتبہ کھانا کھانے کے لیے ڈائننگ روم میں آئی تھی۔ کھانے کے دوران لوسی نے اپنے باپ کے زمانے کی پرانی باتوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ ڈرسن کے تذکرے پر جوڈی کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ لوسی نے اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی لیکن وہ صاف ٹال گئی۔ اس صورتِ حال نے لوسی کے لیے کچھ اور الجھنیں پیدا کر دیں۔ اسے حیرت اس بات پر تھی کہ اگر جوڈی اس معاملے میں کچھ جانتی تھی تو اس نے ہونٹ کیوں سی رکھے تھے۔

دوسرے دن لوسی نے اوبرائن کو اس نئی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ ابھی اسپتال ہی میں تھا اور کندھے کے زخم کے باعث کم از کم ایک ہفتے سے پہلے اسے اسپتال سے چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ لوسی کی باتیں سننے کے بعد وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے کہ اب میرے اوپر تمہیں کسی قسم کا شبہ نہیں رہا ہوگا۔ تمہیں پیز گارڈن بھیجنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ تم اپنے طور پر حقیقت حال سے آگاہ ہو سکو۔ ان حالات کی روشنی میں میری تھیوری یہ ہے کہ مولی پرسٹن کو ڈرسن نے قتل کیا تھا اور کیٹ ہنری نے جان شین کے بارے میں پولیس کو غلط بیان دیا تھا۔ اور جب یہ دونوں روپوش ہو گئے تو انسپکٹر فلیچر کو شبہ ہوا اور ان کی تلاش شروع کر دی گئی۔ انسپکٹر فلیچر کو یقیناً کوئی سراغ مل گیا تھا لیکن اس کے کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے ہی اسے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ اب تک کے حالات کافی امید افزا ثابت ہوئے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ میں انسپکٹر فلیچر کے ادھورے مشن کو پورا کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

لوسی اب بھی اس معمے میں الجھی ہوئی تھی کہ مولی پرسٹن یا انسپکٹر فلیچر کے قتل سے جوڈی کا کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ پہلے قتل کی گواہ کیٹ ہنری تھی جو روپوش ہو گئی تھی اور بیس سال بعد اپنے انجام کو پہنچی تھی لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیٹ ہنری کو کس نے قتل کیا تھا۔ ایک لمحے کو اس کا دھیان جوڈی کی طرف گیا لیکن جوڈی خود سر ضرور تھی، قتل جیسا کوئی سنگین جرم نہیں کر سکتی تھی۔ پھر وہ شخص کون تھا جس نے لوسی کو اٹھا کر سوئمنگ پول میں پھینک دیا تھا۔ جس طرح کیٹ ہنری، جوڈی کے دھوکے میں ماری گئی تھی اسی طرح وہ شخص لوسی کے بارے میں بھی غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ تازہ ترین واقعہ اوبرائن پر قاتلانہ حملے کا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا یقیناً اوبرائن کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ نامعلوم حملہ آور اوبرائن کو بھی راستے سے ہٹانا چاہتا تھا تاکہ حقیقت پر ہمیشہ کے لیے پردہ پڑا رہے۔

لوسی کچھ دیر اسپتال میں اوبرائن کے پاس رکنے کے بعد واپس آ گئی۔

☆☆☆

دو دن بعد جوڈی ایک بار پھر اپنے کمرے سے نکل آئی۔ وہ کچھ دیر راہداری میں کھڑی رینڈل سے باتیں کرتی رہی پھر لوسی کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ لوسی اس طرح اچانک اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر چونک گئی۔

''آؤ جوڈی! تمہاری طبیعت کیسی ہے اب؟'' لوسی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں یہاں سے جا رہی ہوں۔'' جوڈی نے مختصر سا جواب دیا۔

''کیا مطلب؟ کہاں جا رہی ہو؟'' لوسی گڑبڑا گئی۔

''اس ملک سے باہر۔ تم میرے ساتھ چلو گی؟ میں یہاں اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتی۔'' جوڈی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ''میرا کچھ سامان رچرڈ کے ہاں پڑا ہے۔ میں جہاز راں کمپنی کے دفتر میں تمہارا انتظار کروں گی۔ تم سامان لے کر وہیں پہنچ جانا۔''

لوسی پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ جوڈی نے ایک بار پھر فرار ہونے کا پروگرام بنا لیا تھا اور دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں روک سکتی تھی۔ وہ جوڈی کے ساتھ اس کے کمرے میں آ گئی۔ وہ غالباً صبح سویرے ہی اپنا سامان پیک کر چکی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں شہر روانہ ہو گئیں اور جوڈی کو جہاز راں کمپنی کے دفتر چھوڑ کر لوسی، رچرڈ کے مکان پر پہنچ گئی اور اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ رچرڈ بڑی مروت سے پیش آیا اور سامان پیک کرنے میں اس کی مدد کرنے لگا۔ جوڈی کی ذہنی کیفیت پر اس نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اب بھی اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہے اور اس کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہے مگر جوڈی ہی اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں۔

لوسی جب سامان لے کر جہاز راں کمپنی کے دفتر پہنچی تو جوڈی ویٹنگ روم میں افسردہ سی بیٹھی تھی۔ اس نے بتایا کہ انہیں جہاز ''کوئن میری'' پر جگہ نہیں مل سکتی تاہم وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر کسی مسافر نے سیٹ کینسل کرا دی تو چانس مل سکتا ہے۔ وہ دونوں وہاں بیٹھ کر انتظار کرنے کے بجائے بروک لاج واپس آ گئیں۔ جوڈی نے بتا دیا تھا کہ اب وہ پروگرام بدل چکی ہے اور لوسی کے ساتھ نہیں جائے گی۔

لوسی جیسے ہی اپنے کمرے میں داخل ہوئی، چونک گئی۔ اس کی میز کی دراز کھلی ہوئی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی میز کے قریب پہنچ گئی۔ کھلی ہوئی دراز میں سب سے اوپر مجھن یارن کے پرانے ملازم ڈرسن کی تصویر پڑی ہوئی تھی۔ حالانکہ یہ تصویر اس نے کاغذات کے نیچے رکھی تھی۔ اس کے ذہن میں ہیلگا کا خیال آیا لیکن ہیلگا ایسی نہیں تھی کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کے کمرے کی تلاشی لیتی۔ اس کی ذہنی رو ڈرسن کی طرف بھٹک گئی۔ ڈرسن ان کی ملازمت چھوڑ کر غائب کیوں ہو گیا تھا اور کیٹ ہنری سے اس کا کیا تعلق تھا؟ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے پاس تیس ہزار ڈالرز کی وہ خطیر رقم کہاں سے آئی تھی جو اس کے نام سے بینک میں جمع تھی۔ کیٹ ہنری نے مولی پرسٹن کے قاتل کے بارے میں پولیس کو غلط اطلاع دی تھی جس سے یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ اس نے جان بوجھ کر شین کو قتل کے الزام میں پھنسانے کی کوشش کی تھی جس میں وہ کامیاب بھی رہی تھی۔ لیکن اس نے ایسا کیوں کیا اور ڈرسن کا اس سارے معاملے سے کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ لوسی جیسے جیسے سوچتی رہی، اس کا ذہن الجھتا چلا گیا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ کاٹیج میں اوبرائن کے پاس چلی گئی جو آج شام ہی اسپتال سے زبردستی چھٹی کر کے آ گیا تھا۔

''میں بڑی الجھن میں ہوں۔'' وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''جان شین کون تھا اور ڈرسن کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟''

''تمہیں یاد ہوگا کہ نیویارک روانگی کے وقت تمہاری بہن جوڈی پلیٹ فارم پر بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی اور پھر راستے ہی میں سفر ملتوی کر کے واپس آ گئی تھی۔'' اوبرائن نے کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ''اس کی کوئی وجہ سمجھ سکتی ہو؟''

''ہاں، میرا خیال ہے وہ کسی کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی تھی اور شاید سفر بھی اسی وجہ سے ملتوی کیا تھا کہ وہ شخص اسی ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ لیکن میں کوشش کے باوجود نہیں جان سکی کہ وہ کون تھا اور جوڈی اس سے خوف زدہ کیوں تھی؟'' لوسی نے جواب دیا۔

''وہ جان شین تھا جو چند ماہ قبل ہی سزا بھگت کر جیل سے رہا ہوا تھا۔'' اوبرائن نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں شاید معلوم نہیں کہ جوڈی شادی سے پہلے شین کو پسند کرتی تھی۔ وہ دونوں چوری چھپے ملا کرتے تھے اور زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کا عہد کر چکے تھے لیکن اس دوران رچرڈ بیچ میں کود پڑا۔ اس نے تمہاری ماں کو دولت کا لالچ دے کر جوڈی سے رشتے پر آمادہ کر لیا لیکن جب جوڈی کو اس کا علم ہوا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ رچرڈ ہر قیمت پر جوڈی کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس دوران ایک رات کسی نے مولی پرسٹن کو قتل کر دیا اور کیٹ ہنری کے بیان پر شین کو قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ شین نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے انسپکٹر فلیچر کو بتایا تھا کہ اس رات وہ جوڈی کے ساتھ تھا۔ یعنی جوڈی رات بھر اس کے کمرے میں موجود رہی تھی اور وہ اس کی بے گناہی کی گواہی دے سکتی تھی لیکن جوڈی نے گواہی دینے سے انکار کر دیا۔ تمہاری ماں نے ڈرا دھمکا کر اسے زبان بندی پر مجبور کر دیا تھا کیونکہ اگر وہ عدالت میں یہ بیان دے دیتی کہ وہ رات بھر شین کے کمرے میں موجود رہی تھی تو رچرڈ رشتے سے انکار کر دیتا جو تمہاری ماں کو گوارا نہیں تھا۔ اس طرح بے گناہ ہونے کے باوجود شین کو طویل عرصے کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا۔ انسپکٹر فلیچر کو اس کی بے گناہی کا یقین تھا مگر واقعاتی شہادتیں شین کے خلاف تھیں۔ فلیچر نے اس کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اپنے طور پر تحقیقات شروع کر دی جس کے نتیجے میں اسے اپنی جان سے

بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ چند ماہ قبل جیل سے رہا ہونے کے بعد شینن نے رینو میں ٹیکسی ڈرائیوری شروع کر دی۔ انہی دنوں اخبارات میں جوڈی کی طلاق کے بارے میں خبریں شائع ہونے لگیں۔ شینن اس سے ملنے کے لیے موقع کی تلاش میں تھا اور پھر اس روز ریلوے اسٹیشن پر ان کا آمنا سامنا ہو گیا۔ اسے دیکھتے ہی جوڈی پر خوف سا طاری ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ عدالت میں شینن کی بے گناہی کی گواہی نہ دینے پر اب وہ اس سے انتقام لے گا۔ جوڈی اس وقت سے خوف زدہ ہے اور اس سے بچنے کی کوشش کر رہی ہے۔"

اوبرائن خاموش ہو چکا تھا۔ لوسی کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اسے اوبرائن کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ جوڈی ہی اس کی تصدیق کر سکتی تھی۔ وہ اوبرائن سے کچھ کہے بغیر کاٹیج سے نکل کر اپنے مکان میں پہنچ گئی اور بڑی مشکل سے جوڈی کے کمرے کا دروازہ کھلوانے میں کامیاب ہو سکی۔ لیکن جوڈی نے اس معاملے میں زبان کھولنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ لوسی مایوس ہو کر لوٹ آئی۔

رات کے کھانے کے بعد لوسی اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ ایک ایک لمحہ بڑا اذیت ناک ثابت ہو رہا تھا۔ جوڈی کی خاموشی نے ان سب کو سولی پر لٹکا رکھا تھا۔ اس کے لیے یہ انکشاف بھی حیرت انگیز تھا کہ شادی سے پہلے جوڈی، شینن نامی کسی نوجوان کو چاہتی تھی۔ اس نے اگرچہ رچرڈ کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا تھا اور خودکشی کی دھمکی بھی دی تھی لیکن شینن کا نام زبان پر نہیں لائی تھی۔ اگر وہ اس وقت سب کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیتی تو ممکن ہے اس وقت انہیں ایسے نازک حالات کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ وہ ابھی یہی سب کچھ سوچ رہی تھی کہ دروازہ دھڑدھڑانے کی آواز سن کر چونک گئی۔ اس کی نظریں بے اختیار دیوار گیر گھڑی کی طرف اٹھ گئیں جس کی سوئیاں گیارہ بجنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ جوڈی تھی جو گڑبڑائی ہوئی سی نظر آ رہی تھی۔

"کیا بات ہے، خیریت؟" لوسی نے تشویش آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ابھی ابھی جہاز راں کمپنی کے منیجر کا فون آیا ہے۔ ایک مسافر نے اپنی روانگی ملتوی کر دی ہے اور اس کی سیٹ مجھے مل رہی ہے۔ انہوں نے مجھے لینے کے لیے گاڑی روانہ کر دی ہے جو کچھ دیر میں پہنچنے ہی والی ہو گی۔ ذرا میرا سامان گیٹ تک لے جانے میں میری مدد کرو۔ ہیلگا یا رینڈل وغیرہ کو جگانے کی ضرورت نہیں۔" جوڈی نے جواب دیا۔

لوسی فوراً ہی اٹھی اور جوڈی کے دو سوٹ کیس لے کر گیٹ پر پہنچ گئی۔ گیٹ پر گاڑی کے انتظار میں کھڑی ۔۔۔۔ لوسی، جوڈی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ کسی نامعلوم منزل کی طرف جا رہی تھی، نہ جانے واپس آنا نصیب بھی ہو گا یا نہیں۔ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ شاید یہ ان کی آخری ملاقات ہو۔ تقریباً دس منٹ بعد سیاہ رنگ کی ایک وین گیٹ کے سامنے آ کر رک گئی جس میں ڈرائیور کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ ڈرائیور نے سیاہ رنگ کا لمبا کوٹ پہن رکھا تھا اور ہیٹ اس طرح پیشانی پر جھکا ہوا تھا کہ چہرہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ یوں بھی اندر کی لائٹ بجھی ہوئی ہونے کی وجہ سے کار میں تاریکی بھی تھی۔ گاڑی کی چھت پر کچھ اور سامان بھی تھا۔ لوسی نے جوڈی کے دونوں سوٹ کیس بھی اس سامان میں ٹکا دیے اور جوڈی کی طرف مڑی جو اس دوران وین میں بیٹھ چکی تھی۔ اسے افسوس ہوا کہ جوڈی نے الوداعی مصافحہ کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا تھا۔ جوڈی کے بیٹھتے ہی وین حرکت میں آ گئی۔ لوسی وہیں کھڑی اس کی غائب ہوتی ہوئی سرخ بتیوں کو دیکھتی رہی اور پھر گیٹ بند کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ جوڈی کے اس طرح رخصت ہونے سے اس کی بے چینی میں کچھ اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ رات بھر کمرے میں ٹہلتی رہی اور پھر رات کے آخری پہر کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھ لگ گئی۔

لوسی کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی تھی کہ خوفناک گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مکان کی چھت اس کے اوپر گر رہی ہو۔ وہ بھاگنا چاہتی تھی مگر پورا جسم پتھر کی طرح بے حس ہو کر رہ گیا تھا۔ گڑگڑاہٹ ایک بار پھر سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی لوسی کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ دھڑدھڑایا جا رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

"لوسی!" دروازے پر کھڑے ہوئے رینڈل کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ "حویلی سے چند گز کے فاصلے پر کسی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس کی لاش ایک وین میں پڑی ہے۔ انسپکٹر ناڈلر تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

لوسی بدحواس سی ہو گئی۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی گیٹ کی طرف دوڑی جہاں سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی قریب پہنچ گئی ۔۔۔۔ اوبرائن کو دیکھ کر اس کی طرف بڑھی۔ اس کے ساتھ ہی اس

کی نظریں وین کی طرف اٹھ گئیں اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے دل سینے میں ڈوب رہا ہو۔ گزشتہ رات جوڈی اسی وین میں گھر سے رخصت ہوئی تھی۔ وہ لڑکھڑا گئی۔ اگر اوبرائن اس کا بازو نہ تھام لیتا تو یقیناً وہ گر پڑتی۔

"مس لوسی!" انسپکٹر ناڈلر اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔ "گزشتہ رات کسی آدمی کو اس وین میں قتل کر دیا گیا ہے۔ اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوائی جا چکی ہے۔ وین کی چھت پر لدے ہوئے سامان میں سے دو ایسے سوٹ کیس بھی ملے ہیں جن پر تمہاری بہن جوڈی کا نام لکھا ہوا ہے۔ کیا تم وین میں ان سوٹ کیسوں کی موجودگی کی کوئی وجہ بتا سکتی ہو؟ میں یہ بھی جاننا چاہوں گا کہ جوڈی اس وقت کہاں ہے؟"

"جوڈی، کوئن میری نامی جہاز سے کہیں جانے والی تھی۔" لوسی ہکلاتے ہوئے کہنے لگی۔ "اسے جہاز پر سیٹ نہیں مل سکی تھی لیکن کمپنی والوں نے وعدہ کیا تھا کہ عین وقت پر اگر کسی مسافر نے سیٹ کینسل کرا دی تو اسے چانس دیا جائے گا۔ رات گیارہ بجے کے قریب جوڈی کو فون پر اطلاع ملی کہ ایک سیٹ دستیاب ہے اور اسے لینے کے لیے گاڑی بھیجی جا رہی ہے۔ یہی وین تھی۔ اسے میں نے ہی وین میں سوار کرایا تھا۔"

"مس جوڈی کہاں ہے؟" انسپکٹر ناڈلر نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟" لوسی نے اسے گھورا پھر حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "وہ کسی سے خوف زدہ تھی۔ مجھے شبہ ہے کہ اسے بھی قتل کر دیا گیا ہو گا۔"

انسپکٹر چند لمحے لوسی کی طرف دیکھتا رہا پھر اسے اور اوبرائن کو ساتھ لے کر بروک لاج آ گیا۔ اس نے ڈائریکٹری میں نمبر تلاش کر کے جہاز راں کمپنی کے دفتر فون کیا۔ چند منٹ کسی سے بات کرتا رہا پھر ریسیور رکھتے ہوئے لوسی کی طرف مڑ گیا۔

"مس لوسی! جہاز راں کمپنی کے منیجر کا کہنا ہے کہ ان کی طرف سے نہ تو جوڈی کو فون پر سیٹ دستیاب ہونے کی اطلاع دی گئی تھی اور نہ ہی اسے لینے کے لیے کوئی گاڑی بھیجی گئی تھی۔"

"تو گویا جوڈی کو دھوکے سے لے جایا گیا تھا۔ اف خدایا! اب کیا ہو گا؟" لوسی سسکیاں لینے لگی۔

انسپکٹر ناڈلر نے اپنے ایک ماتحت کو جوڈی کی تلاش کا حکم دیا اور انہیں لے کر اسپتال روانہ ہو گیا تاکہ وین میں پائی جانے والی لاش شناخت کرائی جا سکے۔ لیکن لوسی لاش کو شناخت نہ کر سکی کیونکہ گزشتہ رات تاریکی کے باعث وہ وین کے ڈرائیور کا چہرہ نہیں دیکھ سکی تھی۔ البتہ اس نے یہ محسوس کیا کہ اوبرائن لاش کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔

"کس کی لاش ہے؟" واپسی پر لوسی، اوبرائن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "مجھے یقین ہے کہ تم اسے پہچان چکے ہو۔"

"ہاں، وہ جان شینن ہے۔ اسے گولی مار کر ہلاک کیا گیا ہے۔" اوبرائن نے مدھم لہجے میں بتایا۔

لوسی ایک بار پھر چونک گئی۔ وہ کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ بروک لاج واپس پہنچتے ہی پتا چلا کہ جوڈی بے ہوشی کی حالت میں سڑک سے کچھ دور جھاڑیوں میں پڑی ہوئی مل گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور بھی تھا جسے پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ لوسی سے جب اس ریوالور کو شناخت کرنے کے لیے کہا گیا تو وہ اچھل پڑی۔ یہ اس کے والد کا ریوالور تھا جس سے اس نے خودکشی کی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ یہ ریوالور جوڈی کے پاس کہاں سے آیا۔

سارا دن پریشانی میں گزرا۔ شام کو انسپکٹر ناڈلر دو ماتحتوں کے ساتھ آن دھمکا۔ اس نے بتایا کہ ریوالور پر صرف جوڈی کی انگلیوں کے نشان ملے ہیں اور یہ وہی ریوالور تھا جس سے بیس سال پہلے مولی پرسٹن اور انسپکٹر فلیچر کو قتل کیا گیا تھا اور پھر بیس سال بعد شینن کو بھی اس ریوالور سے گولی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اوبرائن کے کندھے سے برآمد ہونے والی گولی بھی اسی ریوالور سے چلائی گئی تھی۔ انسپکٹر ناڈلر کو کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے جوڈی کو حراست میں لے لیا۔

لوسی پر دیوانگی سی طاری ہو رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ تمام قتل جوڈی نے کیے تھے اور اوبرائن پر بھی قاتلانہ حملہ اسی نے کیا تھا۔ لیکن حالات کچھ ایسے پیچیدہ ہو گئے تھے کہ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ گزشتہ رات شینن کو بھی اسی نے قتل کیا تھا۔ اوبرائن اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن لوسی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اوبرائن چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر مزید کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوئی۔

"شینن کے قتل سے یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ میں حقیقت

کی تہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔'' وہ لوسی اور رینڈل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اب زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے کچھ دیر بعد اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہوجائے گا۔''

وہ دونوں خاموشی سے اوبرائن کی طرف دیکھنے لگے۔ اوبرائن کا رخ کھڑکی کی طرف تھا اور لوسی اس کے عین سامنے والی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اوبرائن نے بیٹھے بیٹھے اچانک ہی پستول نکال لیا۔ لوسی گڑبڑا گئی۔ اس کی آنکھوں میں خوف سا ابھر آیا۔ اوبرائن نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ٹریگر دبا دیا۔ لوسی چیخ کر کرسی سے گر پڑی۔ اوبرائن اٹھ کر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ رینڈل نے بھی اس کے پیچھے ہی چھلانگ لگا دی اور جب چند سیکنڈ بعد لوسی نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ کھڑکی کے عین نیچے زمین پر رچرڈ اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ زخمی تھا جس سے خون ٹپک رہا تھا۔ اس کے قریب ہی زمین پر ایک ریوالور بھی پڑا تھا اور اوبرائن اسے اپنے پستول کی زد پر لیے ہوئے تھا۔ یہ منظر دیکھ کر لوسی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اسے اپنی بصارت پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''یہ..... یہ سب کیا ہے؟'' لوسی ہکلا کر رہ گئی۔

''زندگی کی اسٹیج پر کھیلے جانے والے بیس سال پرانے ڈرامے کا ڈراپ سین۔'' اوبرائن نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور رچرڈ کو دروازے کے راستے کمرے کے اندر لے آیا۔ رینڈل نے بھی ریوالور نال کی طرف سے اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔ رچرڈ نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ اوبرائن نے رچرڈ کو زبردستی ایک کرسی پر بٹھا دیا اور فون اٹھا کر انسپکٹر ناڈلر کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔ انسپکٹر ناڈلر نے وہاں پہنچنے میں بیس منٹ سے زیادہ نہیں لگائے تھے۔

''یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ تمہیں کیسے پتا چلا کہ اس خونی ڈرامے کا مرکزی کردار رچرڈ ہی تھا؟'' انسپکٹر ناڈلر نے پوچھا۔

''یہ کہانی بیس طویل برسوں پر محیط ہے۔ اگرچہ اس میں خاصی پیچیدگیاں ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ کسی کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔'' اوبرائن نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''بات مس لوسی کے گھرانے کے پرانے خدمت گار ڈرسن سے شروع ہوتی ہے جو مولی پرسٹن کے عشق میں مبتلا تھا۔ لیکن مولی پرسٹن نے اسے کبھی لفٹ نہیں دی جس کے نتیجے میں ڈرسن نے لوسی کے باپ کا ریوالور چرا کر اسے قتل کر دیا اور ریوالور دوبارہ اسی جگہ رکھ دیا۔ اس بلڈنگ میں رہنے والی کیٹ ہنری نامی ایک لڑکی ڈرسن کو چاہتی تھی۔ اس نے ڈرسن کو قاتل کے روپ میں دیکھا تو اس سے شادی کا وعدہ لے کر قتل کا الزام شین پر عائد کر دیا جو اس واردات سے تھوڑی دیر پہلے اپنے کپڑے لینے کے لیے صرف چند منٹ کے لیے مولی پرسٹن کے فلیٹ میں داخل ہوا تھا۔ شین واقعی بے گناہ تھا۔ اس نے جوڈی کو گواہ کے طور پر پیش کرنا چاہا جو رات بھر اس کے کمرے میں رہی تھی۔ لیکن اس دوران رچرڈ کا جوڈی سے رشتہ طے ہوچکا تھا۔ وہ دولت مند تھا اور اس کا شمار شہر کے چند معززین میں ہوتا تھا۔ اسے یہ بات پسند نہیں تھی کہ جوڈی شین کے حق میں گواہی دے کیونکہ اس طرح بچہ بچہ یہ جان لیتا کہ اس کی منگیتر نے رات کسی غیر مرد کے ساتھ گزاری تھی۔ ادھر شین کو عدالت کے حوالے کرنے کے باوجود انسپکٹر فلیچر کو یہ احساس ہورہا تھا کہ وہ واقعی بے گناہ ہے۔ اسے سزا ہونے کے بعد بھی فلیچر نے اپنے طور پر یہ تحقیقات جاری رکھیں۔ لیکن رچرڈ نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا کیونکہ اسے شبہ تھا کہ اگر انسپکٹر فلیچر نے حقیقت سے پردہ اٹھا دیا تو اس کی عزت سرعام نیلام ہوجائے گی۔ ادھر ڈرسن نے رچرڈ کے سامنے باتوں ہی باتوں میں اسے جتا دیا کہ وہ انسپکٹر فلیچر کے قاتل سے واقف ہوچکا ہے۔ رچرڈ نے پچاس ہزار ڈالرز کی رشوت سے ڈرسن کا منہ بند کر دیا اور وہ اسی روز کیٹ ہنری سمیت غائب ہوگیا۔ پیز گارڈن نامی چھوٹے سے قصبے میں رہائش اختیار کرنے کے بعد اس نے بیس ہزار ڈالرز سے نہ صرف مکان خرید لیا بلکہ تمباکو فروشی کا کاروبار بھی شروع کر دیا۔ قصبے میں اس نے اپنا نام جمن بتایا تھا۔ وہ دونوں اپنا ماضی بھول جانا چاہتے تھے۔ تقریباً ایک سال پہلے جمن کا ایک حادثے میں انتقال ہوگیا اور اس کا کاروبار کیٹ ہنری نے سنبھال لیا۔ چند ماہ قبل شین بھی جیل سے رہا ہوگیا۔ وہ اب بھی اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہتا تھا۔ جوڈی تک اس کی پہنچ ممکن نہیں تھی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح کیٹ ہنری کو ڈھونڈ نکالا اور کسی نہ کسی طرح اسے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ جوڈی کو اس کے حق میں بیان دینے پر آمادہ کرلے تاکہ اس کی پیشانی پر لگا ہوا بدنامی کا داغ دھل سکے۔

کیٹ ہنری معمولی سی حیل و حجت کے بعد اس کی مدد کرنے پر آمادہ ہوگئی۔ مولی پرسٹن کا اصل قاتل ڈرسن مر چکا تھا لہٰذا اسے اس کے لیے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ رینو پہنچ گئی لیکن جوڈی سے پہلے رچرڈ سے آمنا سامنا ہو گیا۔ رچرڈ بھی شین کی رہائی سے آگاہ ہوچکا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ جوڈی سے اپنی بے گناہی کا بیان حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس نے کیٹ ہنری کو بھگا دیا لیکن اس کی نگرانی شروع کر دی۔ اس دوران جوڈی کو بھی شین کی رہائی کا پتا چل گیا۔ وہ، یہ سوچ کر ڈر رہی تھی کہ شین اس سے انتقام لینے کی کوشش کرے گا۔ وہ اس سے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی ایسی جگہ چلی جائے جہاں کسی کی پہنچ نہ ہو۔ اسی خوف میں اس نے رچرڈ سے طلاق کا مطالبہ کر ڈالا اور بروک لاج چلی آئی۔ کیٹ ہنری بھی اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچ گئی۔ لیکن جوڈی سے ملاقات سے پہلے ہی وہ رچرڈ کے ہتھے چڑھ گئی جو مسلسل اس کے تعاقب میں لگا ہوا تھا۔ اس نے کیٹ ہنری کو قتل کر کے سوئمنگ پول میں پھینک دیا اور بڑے اطمینان سے واپس چلا گیا۔

''اس دوران شین کو بھی رچرڈ پر شبہ ہوگیا۔ اس نے رچرڈ سے مطالبہ کیا کہ اگر وہ ایک لاکھ کی رقم اور جوڈی کو طلاق دے دے تو وہ اسے لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلا جائے گا۔ رچرڈ نے اس کی زبان بندی کی یہ شرط فوراً ہی مان لی لیکن اسے پتا چل گیا تھا کہ میں اس کیس کی تفتیش کر رہا ہوں۔ اس نے کاٹیج کی کھڑکی سے گولی مار کر مجھے بھی ہلاک کرنے کی کوشش کی لیکن میری قسمت اچھی تھی کہ بچ گیا۔ بہرحال، شین نے ایک پتھر سے خط باندھ کر جوڈی کے کمرے میں پھینک دیا جس میں صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے اسے بتایا گیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار رہے۔ مگر جوڈی کی طرف سے جواب نہ پا کر اسے سخت مایوسی ہوئی۔ پھر دفعتاً اسے کسی طرح پتا چل گیا کہ جوڈی، کوئین میری، نامی جہاز کے ذریعے ملک سے باہر جانے کی کوشش کر رہی ہے اور اس کا نام جہاز کے مسافروں کی ویٹنگ لسٹ پر ہے۔ اس نے کمپنی کی طرف سے فون کیا اور خود وین لے کر پہنچ گیا۔ لوسی نے خود جوڈی کو رخصت کیا۔ لیکن کچھ دور جانے کے بعد ہی شین نے گاڑی روک لی کیونکہ پروگرام کے مطابق رچرڈ کو وہاں ایک لاکھ ڈالرز کی رقم اور طلاق نامہ لے کر اس کا منتظر ہونا چاہیے تھا۔ مگر رچرڈ اتنا بے وقوف نہیں تھا۔ اس نے گاڑی رکتے ہی شین کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ جوڈی گاڑی سے اتر کر چیختی ہوئی بھاگ کھڑی ہوئی اور جھاڑیوں میں گر کر بے ہوش ہو گئی۔ رچرڈ نے چہرے پر نقاب لگا رکھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جوڈی نے اس کی شکل نہیں دیکھی ہوگی۔ اس نے پستول

صاف کر کے جوڈی کے ہاتھ میں تھما دیا اور وہاں سے فرار ہوگیا۔ اس طرح وہ، یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ شین کو جوڈی نے قتل کیا تھا جس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔'' اوبرائن خاموش ہو کر باری باری ان کے چہروں کی طرف دیکھنے لگا۔

''لیکن تمہیں کیسے پتا چلا کہ اس کے پیچھے رچرڈ کا ہاتھ ہوسکتا ہے؟'' اس کے خاموش ہونے پر انسپکٹر ناڈلر نے اعتراض کیا۔

''جائے واردات پر سڑک سے ذرا ہٹ کر کچی زمین پر کسی کار کے ٹائروں کے نشان نظر آئے تھے۔ وہ رولز رائز کے ٹائروں کے نشان تھے اور پورے شہر میں رچرڈ کے سوا کسی اور کے پاس رولز رائز گاڑی نہیں ہے۔ ٹائروں کے یہ نشان دیکھ کر مجھے صورتِ حال کو سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹا پہلے میں نے فون پر اسے بتایا کہ شین کا اصل قاتل گرفتار ہوچکا ہے۔ ہم نے ابھی اسے پولیس کے حوالے نہیں کیا۔ اگر وہ اصل قاتل کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہے تو فوراً یہاں چلا آئے۔ میرا خیال ہے رچرڈ میری بات سنتے ہی چل پڑا ہو گا۔ وہ یہ بھی سمجھ گیا ہوگا کہ میں اسے پھنسانے کے لیے کسی قسم کا جال پھیلا رہا ہوں۔ وہ مجھے راستے سے ہٹانے کی پوری تیاری کر کے آیا تھا۔ گاڑی اس نے دور ہی چھوڑ دی اور کھڑکی کے قریب پہنچ کر ایک بار پھر مجھے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن اس مرتبہ میں غافل نہیں تھا۔ نتیجہ تم لوگوں کے سامنے ہے۔'' اوبرائن خاموش ہو کر رچرڈ کی طرف دیکھنے لگا جس نے پکڑے جانے کے بعد اب تک ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا۔

''کیا یہ سب کچھ درست ہے مسٹر رچرڈ؟'' انسپکٹر ناڈلر نے سوالیہ نگاہوں سے رچرڈ کی طرف دیکھا۔

رچرڈ نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر اس کی پلکیں جھک گئیں۔ گویا وہ اپنی شکست کا اعتراف کر چکا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' انسپکٹر ناڈلر اٹھتے ہوئے بولا۔ ''چلیے مسٹر رچرڈ! میرا خیال ہے اس خاتون سے معافی مانگنے میں مجھے اب زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے جس کے خلاف میں نے سنگین جرائم کی ایک طویل فہرست تیار کر کے سلاخوں کے پیچھے بند کر رکھا ہے۔ وہ فہرست اب آپ کے کام آئے گی۔''

رچرڈ اپنے زخمی ہاتھ کو سنبھالے خاموشی سے اٹھ گیا۔ ان کے روانہ ہوتے ہی اوبرائن، لوسی اور رینڈل بھی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ وہ جوڈی کو لینے جارہے تھے۔

شدید اذیت تھی...... تکلیف، کرب کے سوا ہر احساس فنا ہو گیا تھا۔ وقت نہیں تھا لیکن روبی اتنی کمزور نہیں تھی...... ' مجھے صحت یاب ہونا تھا۔' وہ سوچ رہی تھی۔ ' ارادہ ہی زندگی ہے۔ میں ٹھیک ہو کر دکھاؤں گی...... '

روبی کی آنکھیں پھر سے بند ہوتی چلی گئیں۔

''مسٹر شاکر، میرا خیال ہے کہ وہ خود پر قابو پالے گی۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ جیسا کہ آپ جان چکے ہیں کہ ایک زندگی بچ سکتی تھی...... بیوی یا بچہ...... ہم بے بس ہیں لیکن تمہاری بیوی ٹھیک ہو جائے گی۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' شاکر نے کہا۔ ''میں اپنی بیوی کو صحیح سلامت دیکھنا چاہتا ہوں۔''

☆☆☆

' مجھے اب اپنی آنکھیں کھول دینی چاہئیں۔' روبی نے سوچا۔ ' مجھے حقیقت قبول کر لینی چاہیے۔ مجھے مرنے کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔ ڈاکٹر کلثوم نے پوری کوشش کی تھی۔ رونے چلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔' اگرچہ روبی کی آنکھیں برسنے کے لیے تیار تھیں جب ڈاکٹر کلثوم نے اسے اندوہناک خبر سنائی تھی۔

☆☆☆

''آپ نے بچے کے بارے میں روبی کو بتایا؟'' ڈاکٹر نے شاکر سے پوچھا۔

''ہاں، ڈاکٹر۔ یہ بہت مشکل تھا۔ پہلی بار تو بہت دشوار...... انتہائی دشوار۔ میں تو بیٹے کی خوش خبری سنانے جا رہا تھا۔ لل...... لیکن یہ کیا ہو گیا؟''

''صبر کریں، مسٹر شاکر۔'' ڈاکٹر کلثوم نے کہا۔ ''کیا آپ کی بیگم کو بچے کی تدفین کے بارے میں پتا ہے؟''

''نہیں ابھی نہیں۔'' شاکر نے کہا۔ ''کیا آپ سمجھتی ہیں کہ روبی اس حد تک سنبھل چکی ہے کہ میں یہ اطلاع اسے دوں؟''

''میں نہیں سمجھتی کہ وہ یہ سن کر آپ کے خلاف سوچے گی...... وہ اتنی سمجھ دار ہے کہ سمجھتی ہے...... تدفین کے معاملے میں تاخیر ممکن نہیں تھی۔''

''ڈاکٹر، وہ ایک متوازن سوچ رکھنے والی باہمت خاتون ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں، مجھے بتا دینا چاہیے۔''

ارادے اور خواہش کے ملاپ سے جنم لینے والی جرم کی بازگشت

سنہری موقع مقدر سے ملتا ہے... اور اس موقع سے ہر صورت استفادہ لازمی قرار پاتا ہے... سوچنے اور غور کرنے سے تاخیر ہو سکتی ہے... اور تاخیر سراسر گھاٹے کا سودا ہے...

دوسرا بچہ

جمال دستی

''ٹھیک ہے، میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتی۔''

''او کے ڈاکٹر، شکریہ۔''

''اگرچہ میں سمجھتی ہوں کہ آپ کے لیے یہ ایک مشکل کام ہے۔'' ڈاکٹر کلثوم نے کہا۔ ''لیکن یہ زیادہ بہتر ہے کہ ڈاکٹر کے بجائے کوئی ایسا شخص یہ بات بتائے جس کو وہ اپنا سمجھتی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آسان ہو یا مشکل کسی کو تو نومولود کی تدفین کے بارے میں بتانا ہی ہے۔''

''ایگریڈ...... لیکن ایک بات کا خیال رکھیے گا، کیس اتنا بگڑ گیا تھا کہ اب کئی پیچیدگیاں جنم لے چکی ہیں۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔ ''وہ اب اولاد حاصل نہیں کر سکے گی۔ میرا مطلب ہے کہ آپ لوگ اب دوسرے بچے کے بارے میں ہرگز نہ سوچیں...... ایسی کوئی بھی کوشش آپ کی بیوی کی ہلاکت کو یقینی بنا دے گی۔'' ڈاکٹر نے انکشاف کیا۔

''میں ذمے داری لیتا ہوں...... میں اسے قائل کر لوں گا۔ پہلے مجھے اس کمرے کی ترتیب بدلنی پڑے گی۔ جو ہم نے متوقع بے بی کے لیے بڑے ارمانوں سے ترتیب دیا تھا۔ ورنہ وہ کمرا مستقل روبی کی ذہنی پریشانی کا باعث بنتا رہے گا۔''

''آپ ٹھیک سوچ رہے ہیں لیکن میری وارننگ کو ہمیشہ ذہن میں رکھیں، اولاد کو اب ہمیشہ کے لیے بھول جائیں ورنہ آپ بیوی کو کھو دیں گے...... گڈ لک۔'' ڈاکٹر یہ کہہ کر رخصت ہو گئی۔

☆☆☆

روبی پوری طرح ہوش و حواس میں تھی۔ تکلیف قابلِ برداشت تھی۔ وہ نئے انداز سے سوچ رہی تھی۔ اپنے اوپر گزرنے والے سانحے سے وہ آگاہ تھی، ابتدا میں اسے موت کا خیال آیا تھا......

وہ شاکر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ یقیناً بہت پریشان رہا ہوگا۔ وہ کب سے یہاں تھا؟ وہ اب کہاں ہے؟ کیا وہ جاب پر گیا ہوگا؟ کام اس کے لیے کتنا اہم تھا...... شاکر کتنا محنتی تھا...... اسے میری دولت سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ہمارے گھر والے شروع میں کتنی غلط رائے رکھتے تھے اس کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ شاکر، روبی کی دولت کے پیچھے ہے...... لیکن آہستہ آہستہ اس نے سب کو غلط ثابت کر دیا تھا۔

''آئی لو یو شاکر۔'' وہ بڑبڑائی۔ روبی اسے خوب صورت بچوں کا تحفہ دینا چاہتی تھی...... لیکن...... اسے شاکر کے لیے خود کو ٹھیک کرنا تھا۔ میں اب اسے غیر ضروری محنت نہیں کرنے دوں گی......

روبی کو خوشی تھی کہ اسپتال آنے سے پہلے اس نے اپنی وصیت تیار کر لی تھی۔ وہ مطمئن تھی... وصیت شاکر کے حق میں تھی اور شاکر کو اس بارے میں کچھ نہیں پتا تھا۔

آہٹ پر روبی نے سر گھمایا۔ روبی کا چہرہ کملا گیا تھا۔ دروازے میں شاکر کھڑا تھا۔ چھپانے کے باوجود دکھ اس کے چہرے سے عیاں ہو رہا تھا۔

روبی تھکے تھکے انداز میں مسکرائی۔

''شاکر......''

''روبی......'' شاکر نے بیڈ کے کنارے بیٹھ کر بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

کچھ دیر بعد دونوں بولنے کے قابل ہوئے۔

''اوہ شاکر...... کتنا برا ہوا۔'' وہ سسک پڑی۔

''ہمت کرو، روبی...... تم بہت ہمت والی ہو۔''

''شاکر، تم سمیت کتنے لوگوں کو پریشانی سے گزرنا پڑا۔ ہم دونوں سب ٹھیک کر لیں گے...... ایک نیا آغاز کریں گے۔''

''شاباش! مجھے تم سے یہی توقع تھی۔''

''شاکر...... مجھے صحت یاب ہونے دو۔ ہم دوسرے بچے کے ساتھ ایسا نہیں ہونے دیں گے...... اولاد کے بغیر زندگی بہت پھیکی اور بے کیف ہوتی ہے۔''

شاکر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں خفیف سا اسرار تھا جسے روبی محسوس نہیں کر سکی۔

''ہنی، یقیناً ہم دوبارہ ایسا نہیں ہونے دیں گے...... تم بچے کا نام ابھی سے سوچ لو...... اس مرتبہ بچے کا نام تم رکھو گی۔ ہماری اولاد ضرور ہوگی۔'' اس نے پورے خلوص سے کہا کیونکہ وہ اپنے ان الفاظ پر عمل کرنے اور اپنی پیاری بیوی کی خواہش پوری کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔

☆☆☆

روبی کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ اولاد کے بارے میں ڈاکٹر نے کیا کہا تھا۔

دوسرے بچے کے لیے دوسرے اسپتال اور دوسری ڈاکٹر سے رجوع کر کے وہ آخر تک اس راز کی حفاظت کر سکتا تھا۔

شاکر نے آنکھیں موند کر اطمینان سے سوچا۔

مایا جال

مرزا جی نے کالے پیلے دھندوں سے کروڑوں کمائے، دھیلے کا ٹیکس نہیں دیا۔ روپوں کو دھڑا دھڑ ڈالرز میں بدلتے رہے۔ انہیں یقین تھا کہ اس ملک میں ڈالر کو کبھی زوال نہیں آئے گا۔ چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے، حلیہ یتیمانہ بنائے رکھتے تاکہ تاوان اور بھتے والوں کی نظروں سے بچے رہیں۔ ان کا جگری دوست لاکھ سمجھاتا کہ ٹھاٹ سے رہیں، ایسے پیسے پر ہزار بار لعنت جسے انسان دل کھول کر اپنے سکھ پر خرچ نہ کرسکے لیکن انہوں نے اپنا رنگ ڈھنگ نہ بدلا۔

جب ملک میں یہ افواہ پھیلی کہ ایف بی آر والے ٹیکس چوروں کو پکڑنے کے لیے مشتبہ گھروں پر چھاپے ماریں گے اور خفیہ تجوریوں میں چھپا ہوا سارا مال و زر برآمد کرلیں گے تو مرزا گھبرا گئے۔ انہوں نے سنا تھا کہ سوئزرلینڈ میں خفیہ بینک اکاؤنٹ کھولے جاتے ہیں جن کی رازداری پر دنیا کا کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا۔

اپنے سارے ڈالرز ایک سوٹ کیس میں چھپا کر وہ کسی نہ کسی طرح جنیوا پہنچنے میں کامیاب ہوگئے اور حسبِ عادت ایک سستے ہوٹل میں قیام پذیر ہوئے۔ شہر اجنبی، لوگ ناآشنا، معلومات کس سے اور کیسے حاصل کریں ..... دو دن اسی پریشانی میں گزارنے کے بعد ہوٹل کے ایک خدمت گار کو اعتماد میں لیا۔

وہ مرزا کی شکستہ انگریزی کے باوجود مسئلہ سمجھ گیا اور بتایا کہ اس کا ایک جاننے والا خفیہ بینک اکاؤنٹ کا دھندا کرتا ہے۔ مرزا کی دلی مراد بر آئی۔ اگلے دن وہ اپنے صحت مند بریف کیس میں ڈالرز سمیٹ کر اس خدمت گار کے ساتھ ہو لیے۔ وہ ٹیکسی سے شہر کے قلب میں واقع کاروباری مرکز میں پہنچا۔ وہاں سے عقبی گلیوں سے گزرتا ہوا ایک بلند عمارت میں داخل ہوا۔ مرزا کسی بچے کی طرح اس کے پیچھے چلے جارہے تھے۔ عمارت کی چوتھی منزل پر وہ دونوں ایک دفتر میں داخل ہوئے جہاں خشک اور سخت گیر چہرے والا ایک معنک مقامی کمپیوٹر پر مصروفِ کار تھا۔ اس نے ان دونوں پر ذرا بھی توجہ نہیں دی۔ آخرکار خدمت گار ہی نے اسے مخاطب کیا۔ معنک کی چبھتی ہوئی تیز نظروں کے جواب میں مرزا نے اپنا مدعا بیان کیا۔

اس نے مرزا کو بتایا کہ وہ انتہائی خفیہ دھندا تھا جس میں گاہک کے نام اور شہریت کی قطعی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ بس اکاؤنٹ نمبر ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اس نمبر کے حوالے سے ایک فون کال پر فنڈز فوری طور پر دنیا کے کسی بھی حصے میں منتقل کرائے جاسکتے ہیں۔

مرزا نے اپنا بریف کیس خالی کیا۔ بینکر نے بے نیازی سے صرف گڈیاں گنیں۔ نوٹ گننے کی زحمت کیے بغیر ساری گڈیاں اس نے ایک کونے میں کھسکا دیں۔ اپنے کمپیوٹر سے ایک رسید نکالی، اسے لفافے میں بند کر کے مہر لگائی اور لفافہ مرزا کو دے کر بولا۔ ”اس میں اکاؤنٹ نمبر ہے۔ اسے بہت احتیاط سے رکھنا۔ نمبر یاد ہوجائے تو رسید کو لفافے سمیت جلا دینا۔“

مرزا اس کی شخصیت اور رویّے سے اتنے مرعوب تھے کہ لفافے کو وہیں کھولنے کی ہمت نہیں کرسکے۔ خدمت گار انہیں تیزی سے باہر لے گیا۔ ”بس اب تمہارا کام ہوگیا۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ تمہاری رقم کہاں ہے!“

انہیں ٹیکسی میں بٹھا کر وہ خدمت گار رفوچکر ہوگیا۔ اپنے کمرے میں جا کر لفافہ کھولا تو رسید پر تحریر تھا۔ ”بہت مسرت کے ساتھ گنے بغیر ایک بڑی رقم ڈالرز کی صورت میں وصول پائی۔ تم ہمارے پہلے گاہک ہو، تمہارا اکاؤنٹ نمبر ایک ہے۔ امید ہے کہ ابھی اور بھی آئیں گے۔“ رسید پر بینک کا نام تھا نہ پتا اور نہ کوئی فون نمبر۔ مرزا صاحب کے پسینے چھوٹ گئے۔ خدمت گار کو تلاش کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ دیہاڑی پر ملازم تھا اور غائب ہے۔ مرزا کو علاقے کا نام معلوم تھا نہ پُرپیچ راستے یاد تھے۔ بینک پہنچنا ناممکن تھا۔

رو پیٹ کر رہ گئے۔ ایف بی آر کو بیس پچیس فیصد ٹیکس دے دیا ہوتا تو یوں دیارِ غیر میں نہ لٹتے۔ کسی کو تو ان کے کالے دھن کا کیا پتا چلتا، انہیں خود معلوم نہیں تھا کہ ان کا سارا مال کہاں گیا!

چڑیاں سارا کھیت چگ گئی تھیں۔ واردات ایسی تھی کہ کسی سے کچھ کہہ سکتے تھے، نہ شکایت کرسکتے تھے۔ قہرِ درویش برجانِ درویش کے مصداق روتی صورت لے کر دل گرفتہ انداز میں وہیں لوٹ آئے جہاں انہوں نے لوٹ کا مال بنایا تھا۔

کراچی سے ولید بلال کی تحریر

اسے جھوٹ اور سچ کی تلاش تھی... جھوٹ بولنے والوں اور بزدلوں کی نفسیات بھی عجیب ہوتی ہے... یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کا جھوٹ زیادہ دیر نہیں چلے گا... معصوم بننے کا کوئی فائدہ نہیں... اس کے باوجود وہ سچائی کو چھپانے کے لیے جھوٹ کی رسی کو دراز کرتے چلے جاتے ہیں...

اس نوجوان کا قصہ جو سچ کی تلاش میں متواتر حالت سفر میں تھا...

آوارہ گولی

امجد رئیس

ایسٹر کے تہوار کے بعد وہ تیسرا دن تھا۔ لیو کے مے خانے میں متعدد اسٹول خالی پڑے تھے لیکن نوجوان سیدھا ہک مین کے قریب والے اسٹول پر جا کر جم گیا۔ نوجوان، ہک مین کے پیچھے کچھ دیر بعد ہی مے خانے میں داخل ہوا تھا۔ یوں لگا تھا کہ وہ ہک مین کے تعاقب میں لیو کے مے خانے تک پہنچا ہے۔

عام طور پر ہک مین کسی کی ہمراہی کا بُرا نہیں مناتا تھا۔ تاہم پیر کی شام وہ تھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور تنہائی کا

خواہش مند تھا۔
نوجوان کی عمر بائیس، تیئس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ ہک مین نے اپنا اسٹول کچھ پرے کھسکا لیا۔ وہ کاؤنٹر کی دوسری جانب قدرے اوپر دیوار کو دیکھ رہا تھا جہاں حنوط شدہ ہرن کا سر نصب تھا، اس کا انداز گھورنے والا تھا۔

''کتنی پُرسکون شام ہے۔'' نوجوان نے کہا۔

ہک مین نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''ہاں۔'' اس نے ہنکارا بھرا اور لیو کی جانب متوجہ ہوگیا۔ بارٹینڈر نے برف کے ٹکڑے ڈال کر وھسکی کا جام ہک مین کی طرف بڑھایا۔

ہک مین کو سرو کر کے وہ نوجوان کی طرف مڑا۔

''کیا پسند کرو گے؟'' لیو نے نوجوان کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''بیئر۔'' نوجوان نے مختصر جواب دیا۔ بیئر کا گلاس نوجوان کے حوالے کر کے لیو پھر ہک مین کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''مسٹر ہک مین! سینڈوچ نہیں چلے گا؟''

''شکریہ لیو لیکن ابھی نہیں۔ میں آج کل کوشش میں ہوں کہ کچھ وزن کم کر لیا جائے۔''

لیو نے اپنے توند نما پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور مسکرایا۔ ''یہ تو مجھے سوچنا چاہیے لیکن میں مطمئن ہوں۔ ہاں جب تک لڑکیاں شکایت کرنا نہ شروع کر دیں، کیوں؟'' اس نے ہک مین کو آنکھ ماری۔

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' ہک مین نے مسکرانے کی کوشش کی اور جیب میں ہاتھ ڈالا۔

لیو نے دونوں کی ادائیگی سمیٹی اور ایک کونے کی طرف بڑھ گیا۔

''لاس اینجلس میں پہلی بار آیا ہوں۔'' نوجوان نے پھر لب کشائی کی۔

ہک مین نے اس پر اچٹتی نظر ڈالی لیکن خاموش رہا۔ نوجوان نے اس کی پروا نہیں کی پھر بولا۔ ''میں اوریگان سے آیا ہوں۔''

''اچھی جگہ ہے۔'' ہک مین نے بالآخر جواب دیا۔ ''ہری بھری اور خوب صورت۔ تاہم بارش بہت ہوتی ہے۔'' اس نے نوجوان کو نظر بھر کر دیکھا۔ نوجوان نے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''میں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ تم بُرا تو نہیں مناؤ گے؟'' اس نے کہا۔ ''کسی نہ کسی کو تو میں نے ایک بار یہ کہانی سنانی ہے اور اگر تم شکاری ہو تو یقیناً تم دلچسپی لو گے؟''

ہک مین چند ثانیے تک نوجوان کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ ایک چھریرے بدن کا لڑکا تھا۔ بال خاکی رنگ کے تھے، شیو بڑھا ہوا تھا۔ چیک دار جیکٹ اس کے جسم پر بھاری معلوم ہو رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں عجیب سی چبھن تھی۔ زخمی نگاہ...

''کیسی کہانی؟'' ہک مین نے ایک گہری سانس لی۔

''بھٹکی ہوئی گولی... یہ ایک بھٹکی ہوئی گولی کی کہانی ہے۔''

''ٹھیک ہے، شروع کرو۔'' ہک مین نے گویا اسے اجازت دی۔

نوجوان نے لیو کو اشارہ کر کے دو جام اور منگوائے۔ ایک جام اپنے منتخب کردہ سامع کے لیے بھی پھر اس نے سپاٹ لہجے میں بولنا شروع کیا۔

''میرا نام ویزلی مائز ہے۔ گزشتہ ستمبر میں میری شادی پورٹ لینڈ میں ہوئی تھی۔ میری بیوی کا نام جوڈی تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اسکول کے زمانے سے جانتے تھے۔ وہ نیلی آنکھوں والی ایک حسین دوشیزہ تھی جس کے بال سنہری رنگت کے تھے۔ اس کی آنکھیں کسی گہری نیلی جھیل کے مانند تھیں۔

''میں نے اپنی ملازمت سے ایک ہفتے کی چھٹی لی اور ہم ہنی مون کے لیے نکل گئے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم بذریعہ کار اپنی ہی اسٹیٹ کے گرد چکر لگائیں گے۔ یہ ایک لمبی ڈرائیو تھی۔ وہ دوسرا دن تھا۔ ہم ہائی وے پر یوجین کے مشرق میں تھے۔ جوڈی نے ہائی وے پر ایک پرانی سڑک کو اندر جنگل کی طرف جاتے دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ اس طرف بلیک بیری بکثرت ملے گی۔ چنانچہ میں ہائی وے سے اتر کر اندر گھس گیا۔

''جوں جوں کار آگے بڑھ رہی تھی، سبزہ زار گھنا ہوتے ہوئے جنگل میں تبدیل ہو رہا تھا۔ جنگل بہت زیادہ گھنا ہونے سے پہلے میں نے کار ایک مناسب جگہ پر روک دی۔ ہم باہر آگئے۔ یہاں بلیک بیری کی جھاڑیاں بکثرت موجود تھیں۔ جوڈی بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے کار سے پلاسٹک کی باسکٹ نکالی اور مجھ سے آگے بھاگی۔ وہ باسکٹ میں پھل جمع کرتی جا رہی تھی۔ یہ ایک چھوٹی پہاڑی تھی۔ وہ قدرے بلندی پر چلی گئی۔ وہاں سے اس نے پُرمسرت انداز میں ہاتھ ہلایا۔

''جلدی یہاں آؤ ویزلی... دیکھو یہ کیا چیز ملی ہے؟'' اس نے مجھے پکارا۔ وہ میری منتظر تھی۔ میں تیزی سے آگے بڑھا۔ میں اس تک پہنچنے ہی والا تھا کہ ایک پٹاخے جیسی آواز آئی۔ نامعلوم گولی جوڈی کے سر میں سوراخ کرتی گزر گئی۔ میری جان سے زیادہ پیاری بیوی لمحہ بھر میں مر گئی۔ ہماری شادی کو محض دو دن ہوئے تھے۔'' نوجوان کے سپاٹ لہجے میں ارتعاش پیدا ہوگیا۔

''اوہ، یہ تو بہت خوف ناک ہے۔'' ہک مین کے منہ سے نکلا۔ وہ کچھ اور بولنا چاہ رہا تھا لیکن مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

''میں جیسے نیم پاگل ہو چکا تھا۔'' ویزلی نے بات آگے بڑھائی۔ ''دفعتاً تین مزید دھماکے ہوئے... مجھے نہیں پتا کہ گولیاں کہاں سے آئیں اور کہاں ٹکرائیں۔ میں دیوانگی کے عالم میں نامعلوم شیطان کی تلاش میں دوڑا پھر پتا نہیں کب اور کس طرح میں واپس جوڈی کی لاش تک آیا کیونکہ انہوں نے چھ گھنٹے بعد شاک کی حالت میں مجھے وہاں پایا۔ اگر ہائی وے کی گشتی پولیس نے ہماری کار شاہراہ سے اترتے نہ دیکھی ہوتی اور وہ تفتیش کے لیے نہ نکلتے تو میں اور جوڈی آج بھی وہیں پڑے ہوتے شاید مردہ ڈھانچوں کی صورت میں۔''

''بہرحال یہ بھی اچھا ہوا۔'' ہک مین نے کہا۔

''کیا واقعی؟'' نوجوان نے کہا۔ ''نہیں، کچھ بھی اچھا نہیں ہوا۔ جوڈی کی جگہ مجھے مر جانا چاہیے تھا۔ اگلے پانچ مہینے میں نے اسپتال میں گزارے۔ ایک سو سینتالیس دن کیونکہ صرف میری ذہنی حالت خراب تھی بلکہ عالمِ جنون میں بھاگ دوڑ کے دوران کسی جگہ ٹھوکر کھا کر گرنے سے میری ٹانگ بھی ٹوٹ چکی تھی۔''

''پولیس نے پتا نہیں چلایا کہ کون فائرنگ کر رہا تھا؟''

''کچھ خاص نہیں۔ وہ اتنا ہی جان سکے کہ وہ تیس سے ساٹھ کی ہرن مارنے والی رائفل تھی۔ ایک خالی وھسکی کی بوتل وہاں ملی جہاں سے گولیاں چلائی گئی تھیں۔ ان کا اندازہ تھا کہ فائرنگ کرنے والا ایک پرانے اشتہاری کھمبے پر نشانہ بازی کر رہا تھا۔ اس کی تین گولیاں کھمبے پر لگیں جبکہ پہلی گولی نے جوڈی کی جان لے لی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ اس کی کسی آوارہ گولی نے ایک انسانی زندگی نگل لی ہے۔''

''یہ واقعی ایک دردناک حادثہ تھا۔'' ہک مین نے کہا۔ ''کیا بھاگ دوڑ کے دوران میں تم کچھ جان سکے؟''

گاواچی گان

''چین کی دھارمک کتھاؤں (مذہبی کہانیوں) میں اس کا ذکر کہیں موجود نہیں اور آج کی جدید نسل بھی اس عظیم کردار کی ادبی خدمات سے واقفیت نہیں رکھتی، کیونکہ اس پر تحقیق نہ ہونے کے برابر ہوئی۔ مشہور دانشور کنفیوشس بھی اس کا کسی نہ کسی وقت میں احسان مند ضرور رہا تھا۔ اس کو صرف نام کی مناسبت سے چین سے نسبت دی گئی ہے ورنہ یہ عالمی سرمایہ ہے ملکی یا علاقائی نہیں۔ گاواچی گان ایک گمشدہ دانشور تھی جس کے عظیم مقالات اور افکار آج بھی بہت ساری جگہ رائج ہیں جس میں صبر اور استقامت سرفہرست ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ وہ اس سے واقف نہیں۔ اس کی عظمت کے لیے یہ دلیل کافی ہے کہ قدیم تہذیب کے کچھ پیروکار آج بھی اس کو مقدس سمجھتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق اس کے متعلق خاموش ہیں مگر جابجا اس کے آثار ضرور ملتے ہیں۔ خصوصاً برصغیر پاک و ہند، جنوبی ایشیا، مشرقِ وسطیٰ اور عموماً پوری دنیا کے ممالک میں اس کے انتہائی عقیدت مند موجود ہیں۔ اس کی کوئی تصنیف منظرِ عام پر نہیں آسکی اور نہ ہی ایسی کوشش کی گئی بلکہ اس کا طرزِ عمل دیکھ کر ہی لوگوں نے اس سے زندگی گزارنے کا فن سیکھا۔ اس کے رویّے اور معاونت سے اپنے مسائل کو حل کیا۔ فطرت سے اس کی وابستگی بہت دیدنی تھی اس لیے اس کا زیادہ وقت باغات اور کھیتوں کے درمیان گزرتا تھا۔ اسے علاقائی ادب میں ارادتاً اور غیر ارادتاً بھی تضحیک کا نشانہ بنایا گیا مگر اس کے پایۂ استقامت میں کوئی لغزش نہیں آئی۔ اسے بطور ضرب المثل اور مزاح کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ اردو ادب کی تاریخ میں اس کو کتنا سراہا گیا اس کے متعلق میری اپنی تحقیق زیادہ نہیں مگر علامہ محمد اقبال جیسے عظیم شاعر نے بھی اس کو موضوعِ کلام رکھا تھا اور اس پر نظم لکھی تھی جس کا عنوان تھا ''گائے اور بکری''۔ آپ شاید سوچ رہے ہیں اس پوری نظم میں اس کا ذکر کہاں ہے تو جناب اس کا نام ذرا دوبارہ ملاحظہ فرمائیں۔ ''گواچی گاں'' گمشدہ گائے یعنی the lost cow...''

تحقیق و جستجو، سید شکیل حسین کاظمی

"میری بھاگ دوڑ رائگاں نہیں گئی تھی۔" نوجوان نے جواب دیا۔ "میں نے اس شیطان کی کار دیکھ لی تھی۔ میں واضح کردوں کہ میں نے کبھی اسے حادثہ تسلیم نہیں کیا۔"

"اور کیا دیکھا تم نے؟"

"میں نے اس کے چہرے کی جھلک بھی بخوبی دیکھ لی تھی بلکہ کار پر کیلیفورنیا کا لائسنس نمبر بھی پڑھ لیا تھا۔ اس کے چہرے پر مے نوشی کے اثرات مجھے اب بھی یاد ہیں۔ وہ خالی بوتل پھینک کر کار میں نکل گیا تھا۔ وہ ڈرائیونگ کے دوران ہاتھ لہراتا گیا۔ وہ مستی میں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگلے روز اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا ہوگا۔"

"کیا اس نے بھی تمہیں دیکھا؟"

"بالکل نہیں حالانکہ میں کار کے پیچھے بھاگا تھا اور اسی وقت ٹھوکر کھا کر گرا۔ میری ٹانگ بھی ٹوٹی پھر مجھے پتا نہیں کہ میں واپس جوڈی تک کیسے پہنچا۔"

"تو پھر تم نے پولیس کو بتایا نہیں؟ وہ بہ آسانی نمبر کے ذریعے اس تک پہنچ جاتے۔ تم نے تو اس کی شکل بھی دیکھ لی تھی؟" ہک مین نے حیرت کا اظہار کیا۔

ویزلی مائز معا کھڑا ہوگیا۔ کاغذی نیپکن سے اس نے منہ صاف کیا۔ "کہانی کا بقیہ حصہ میں ابھی واپس آکر سناتا ہوں۔" وہ بولا۔

جب نوجوان لنگڑاتا ہوا واش روم کی طرف گیا تو لیو ہک مین کے قریب آیا۔ "وہ لڑکا کچھ زیادہ اونچا نہیں بول رہا تھا؟" لیو نے کہا۔ "تمہیں پریشان تو نہیں کررہا تھا؟"

"نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ اپنے سینے کا غبار نکال رہا تھا۔ اس کی بیوی کے ساتھ ایک جان لیوا حادثہ پیش آیا تھا۔" ہک مین نے بتایا۔

"اگر کوئی گڑبڑ کرے تو فوراً مجھے اشارہ کرنا، میں نمٹ لوں گا۔ میرے کان میں پڑا تھا کہ وہ اوریگان سے آیا ہے۔ وہاں کے لوگ ہماری طرح نہیں ہوتے۔" نوجوان کو واپس آتے دیکھ کر لیو وہاں سے ہٹ گیا۔ تاہم ہٹتے وقت اس نے لڑکے کو کڑی نظروں سے گھورا تھا۔

"ہاں تو میں بتا رہا تھا۔" ویزلی نے سلسلۂ کلام وہیں سے جوڑا۔ "پولیس یقیناً اسے پکڑ سکتی تھی اگر میں سب کچھ بتا دیتا۔"

"کیا مطلب؟"

"ہاں... میں نے پولیس کو کچھ نہیں بتایا۔"

"لیکن کیوں؟" ہک مین نے استفسار کیا۔ "کیا تم نہیں چاہتے تھے کہ اسے سزا ملے؟"

"بالکل، یہی تو چاہتا تھا اس لیے تو میں نے پولیس کو معلومات نہیں دی تھیں۔" ویزلی نے اپنی ہتھیلی پر مکا مارا۔ "پولیس، کچہری... کتنی سزا ملتی؟ کب ملتی... ملتی نہ ملتی، میں خود اسے سزا دینا چاہتا تھا۔ اس ملعون نے میری زندگی کی سب سے حسین شے کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا تھا۔ اس نے میری دنیا اجاڑ دی۔ میری دیرینہ چاہت کا قاتل... ہمارا ہنی مون دفعتاً موت کے اندھیروں کی نذر ہوگیا۔ میرے جینے کا جواز ختم ہوگیا تھا۔" ویزلی کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ "اس کے لیے ایک ہی سزا تھی اور وہ مجھے خود دینی تھی۔ میرے پاس جینے کا واحد جواز یہی تھا کہ میں اپنی پیاری بیوی کے قاتل کو ڈھونڈ کر خود جہنم واصل کروں۔"

"تم خود تلاش کررہے ہو اس کو؟"

"ہاں، یہ آسان تھا۔ کیلیفورنیا کے کار رجسٹریشن ڈیپارٹمنٹ کو میں نے لائسنس نمبر دیا اور بہ آسانی کار کے مالک تک پہنچ گیا۔ مجھے تھوڑی تگ و دو کرنی پڑی لیکن مجھے پتا چل گیا کہ وہ یہاں لاس اینجلس میں ہے۔" معاً ہک مین کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔

"تمہیں اس کا ایڈریس مل گیا؟"

"بالکل، آج میں اس کے گھر گیا تھا اور اس مردود کی شکل دیکھنے کے لیے انتظار کرتا رہا بالآخر وہ باہر آیا اور میں نے اسے پہچان لیا پھر اس کے پیچھے یہاں تک آگیا۔"

ہک مین نے چونک کر دیکھا۔ ویزلی کی گود میں اعشاریہ چار پانچ کا سروس آٹومیٹک پڑا تھا جو فوراً ہی نوجوان کے ہاتھ میں منتقل ہوگیا۔

"مائی سن، ایک منٹ رکو۔" ہک مین چیخا۔ "تم غلطی پر ہو۔"

"نہیں، کوئی غلطی نہیں ہے۔" نوجوان بولا۔

دونوں کی آوازیں بلند ہوئیں تو لیو فوراً وہاں پہنچ گیا۔ ویزلی نے وزنی پسٹل اٹھایا اور بلا تامل اس کے چہرے کی جانب فائر کردیا۔

لیو عقب میں بوتلوں سے ٹکرا کر زمین بوس ہوگیا۔ ہک مین اسٹول پر اس طرح سکتے کے عالم میں بیٹھا رہ گیا جیسے اسے اسٹول کے ساتھ ویلڈ کردیا گیا ہو۔ ویزلی نے پسٹل نیچے گرا دیا۔

"اب اس کی ضرورت ختم ہوگئی ہے۔" وہ سکون سے بولا۔ "بھٹکی ہوئی گولی اپنے اصل مسکن تک پہنچ گئی ہے۔"

بساطِ عشق

منظر امام

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

محبوب کے ملنے کا ایک لمحہ... مقدر کی لکیروں میں دھنک بکھیر دیتا ہے... محبت کا موسم دل میں ٹھہر جائے تو پھر صدیوں کا گہرا نقش بن جاتا ہے... بس ایک لمحہ... محبت کا جذبہ... سرتاپا سرشاری... فخر اور طاقت... کبھی امتحان کی گھڑیاں...

میزانِ محبت پر چاہتوں کا کڑا امتحان...... ایک دل ربا کہانی

غزالہ نے چائے بنانی چاہی لیکن میں نے اسے روک دیا۔

"نہیں، آج نہیں۔ آج چائے میں بناؤں گا۔" میں نے کہا۔

"وہ کیوں؟" خورشید نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لیے کہ تم دونوں کو... پتا چل جائے کہ مجھے بھی چائے بنانی آتی ہے۔" میں مسکرا کر بولا۔ "میری بیوی تو مجھے نکما ہی سمجھتی ہے۔"

"اور کیا۔" غزالہ نے کہا۔ "آپ تو اپنے ہاتھوں کو زحمت ہی نہیں دیتے۔"

"لیکن آج دے رہا ہوں نا۔" اس نے معنی خیز انداز میں خورشید کی طرف دیکھا۔ "یار خورشید! آج تمہیں ایمان داری سے فیصلہ کرنا ہوگا کہ دونوں میں سے چائے کون بہتر بناتا ہے۔"

"اوکے۔" خورشید نے شانے اچکائے۔ "اگر آج تمہیں اتنا ہی شوق ہو رہا ہے تو جاؤ تم ہی بنا کر لے آؤ۔"

میں مسکراتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا۔

میں جانتا تھا کہ میرے ہٹتے ہی کیا ہونے والا ہے۔

خورشید اور میری بیوی غزالہ ایک دوسرے سے کیا باتیں کریں گے۔ یہ کہانی ہوسکتا ہے بہت دنوں سے چل رہی ہو لیکن میں نے ایک مہینا پہلے محسوس کی تھی۔

اس قسم کے جذبات پوشیدہ نہیں رہتے۔

ایک دوسرے پر معنی خیز نگاہیں۔ میرے سامنے بے جا تکلف کا اظہار۔ پھر کسی کام سے میرے ہٹتے ہی دونوں کے درمیان مبہم سی سرگوشیاں۔

لیکن ممکن تھا یہ صرف میرا وہم ہو اس لیے میں موقع کے انتظار میں تھا۔ پھر مجھے اس قسم کے کئی مواقع ملے۔

میں عام طور پر چھ سات بجے گھر آیا کرتا ہوں لیکن اس کہانی کا ثبوت حاصل کرنے کے لیے وقت سے پہلے آکر اِدھراُدھر چھپ جاتا۔

اور ٹھیک چھ بجنے سے پہلے خورشید چوری چھپے مجھے گھر سے نکلتا ہوا دکھائی دیتا۔ یعنی میرے آنے سے پہلے۔

میں اسے دیکھ کر ایک طرف ہٹ جاتا اور وہ ایک طرف چل دیتا۔ وہ اپنی گاڑی ہمارے گھر سے بہت دور پارک کیا کرتا تھا۔

ایسا کئی بار ہوا اور جب میں نے یقین کرلیا کہ ان دونوں کے درمیان کہانی کچھ اور ہے تو ایک شام خورشید کو چائے پر بُلا لیا۔

وہ میرا دوست تھا۔ (پتانہیں دوستی کس کو کہتے ہیں)

اس کی ایک عادت تھی کہ وہ آتے ہی چائے کی فرمائش کیا کرتا۔ غزالہ فوراً اس کے لیے چائے بنانے چلی جاتی۔

لیکن اس شام چائے غزالہ نے نہیں، میں نے بنائی تھی۔

میں جب چائے کی پیالیاں لیے کمرے میں داخل ہوا تو ایسا لگا جیسے میری آہٹ پاکر دونوں کچھ باتیں کرتے کرتے خاموش ہوگئے ہوں۔

میں نے ٹرے لاکر میز پر رکھ دی۔ بغیر کسی تاثرات کے۔ سپاٹ چہرے کے ساتھ۔

"واہ! آخر تم نے چائے بنا ہی لی۔" خورشید نے کہا۔

"کیوں نہیں۔ کسی کام کا ارادہ کیا جائے تو وہ ہو ہی جاتا ہے۔" میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ "ویسے بھی انسان کو اس قسم کے کاموں کے لیے خود کو تیار رکھنا چاہیے۔ نہ جانے کس وقت ضرورت پڑ جائے۔"

خورشید نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں چائے کی پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے اسے روک دیا۔

"نہیں خورشید... ابھی چائے نہیں پینا۔"

"وہ کیوں؟" خورشید نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

"چائے کے گھونٹ لینے سے پہلے میری ایک بات سُن لو۔" میں نے کہا۔

"کیا بات ہے بھائی؟ بہت سنجیدہ ہورہے ہو... کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"ہاں، بہت خاص بات ہے۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "تم تو میرے بہت پرانے دوست ہو۔ تم تو جانتے ہو کہ میں نے زندگی کس انداز کی گزاری ہے۔"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ لیکن اس وقت کیا یاد آرہا ہے تمہیں؟"

"اس وقت مجھے اپنی وہ جان لیوا تنہائی یاد آرہی ہے جو میں نے غزالہ سے پہلے برداشت کی تھی۔"

"اوہو، آپ کیسی باتیں کرنے لگے۔" غزالہ جلدی سے بولی۔ "چائے ٹھنڈی ہورہی ہے۔"

"کوئی بات نہیں پھر گرم ہوجائے گی لیکن جو میں بتانے جارہا ہوں، وہ پھر نہیں بتاسکوں گا۔"

"چلو یار، اب بتا بھی دو۔"

"پھر یہ ہوا کہ میری اس جان لیوا تنہائی میں غزالہ میرے لیے خوشی کی خبر بن کر آگئی۔ جب میں نے پہلی بار اس کو دیکھا تو ایسا لگا جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ دیکھو یہی ہے وہ جس کی تلاش تمہاری روح کو تھی۔ جس کے بغیر تم خود کو ادھورا محسوس کرتے تھے۔ اس کو اگر تم نے حاصل کرلیا تو تمہاری ساری محرومیوں کا ازالہ ہوجائے گا۔"

غزالہ اور خورشید دونوں پہلو بدل کر رہ گئے۔ نہ جانے میری یہ باتیں ان پر کیا اثر کررہی تھیں۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "پھر یہ ہوا کہ مجھ پر غزالہ کو حاصل کرنے کا جنون سوار ہوگیا۔ میرے اس جنون کے ایک گواہ تم بھی ہو۔ کہو ایسا ہوا تھا یا نہیں؟"

"ہاں یار، ایسا ہی ہوا تھا۔" خورشید دھیرے سے بولا۔ اس کی آواز کچھ کھوکھلی ہورہی تھی۔ "لیکن پھر پوچھتا ہوں کہ اس وقت یہ باتیں کیوں کررہے ہو؟"

"اپنے آپ کو دہرانے اور یقین دلانے کی کوشش کررہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "سنتے رہو۔ میں چائے دوسری بنادوں گا۔ تم اس کی فکر مت کرو۔"

"آپ کیوں بور کررہے ہیں؟" غزالہ نے کہا۔

"نہیں غزالہ... بور نہیں کررہا۔ میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں، دس منٹ کے بعد سمجھ میں آجائے گا۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے ہزاروں دشواریوں کے بعد غزالہ کو حاصل کرہی لیا۔"

"ہاں، میں یہ بھی جانتا ہوں۔" خورشید دھیرے سے بولا۔

"اس سے اندازہ لگالو کہ غزالہ میرے لیے کتنی قیمتی ہوگی۔ میری نگاہوں میں اس کی کیا اہمیت ہوگی۔"

"توبہ ہے۔ آپ تو تقریر کرنے لگے۔" غزالہ نے کہا۔

میں نے غزالہ کی طرف دھیان دیے بغیر خورشید کو دیکھا۔ "اب خورشید، تم یہ سوچو کہ جب کسی سے اس کی کوئی قیمتی چیز چھیننے کی کوشش کی جائے تو اسے کیسا محسوس ہوگا۔"

خورشید کے چہرے پر ایک رنگ لہرا کر رہ گیا۔

"آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" غزالہ نے پوچھا۔

"جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، وہ تم دونوں کے لیے ہے۔" میں نے کہا۔ "میں بہت خوش تھا۔ غزالہ! تم کو پاکر مجھے ایسا لگا جیسے زندگی پر میرا بھی کچھ حق ہو ہی گیا ہے۔ پھر اچانک سب کچھ بدل گیا۔"

"کیسے بدل گیا؟" خورشید نے پوچھا۔

"کیسے بدل گیا؟" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "اچھا سوال ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب میں کُھل کر بات کرہی لوں۔"

دونوں میری طرف دیکھتے رہے۔

میں نے ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔ "خورشید! یہ تبدیلی تمہاری وجہ سے آئی۔" میں نے کہا۔ "تم میری پُرسکون زندگی کے لیے ایک آسیب کی طرح ہو۔ ٹھہرو، کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کوئی احمقانہ الزام نہیں لگا رہا بلکہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔"

سناٹا چھا گیا۔ دونوں کے چہرے بری طرح اتر گئے تھے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" خورشید نے کچھ دیر بعد کہا۔ "میں اور غزالہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہیں۔"

"محبت!" میرے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ آگئی۔ "تم کیا جانو محبت کیا چیز ہوتی ہے۔"

"ہوسکتا ہے کہ غزالہ سے ملنے سے پہلے مجھے نہ معلوم ہو لیکن اب میں جان چکا ہوں کہ محبت کیا ہوتی ہے۔"

"چلو تم بتاؤ۔" میں نے غزالہ کی طرف دیکھا۔ "کیا تمہیں بھی خورشید کی محبت پر بھروسا ہے؟"

"ہاں، پورا بھروسا۔" غزالہ نے دبے لفظوں میں کہا۔

درد کی ایک شدید لہر میرے سینے سے اٹھی اور پورے جسم میں پھیلتی چلی گئی۔ یہ بات وہ کہہ رہی تھی جس کے لیے میں نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔

میری آنکھوں میں آنسو آنے کے لیے بے چین ہورہے تھے۔

"مجھے افسوس ہے کہ تمہارے ساتھ یہ سب کچھ ہورہا ہے۔ لیکن بے پناہ محبت نے ہمیں ایک دوسرے سے باندھ دیا ہے۔" خورشید نے میری طرف دیکھا۔

"اور تم یہ بھول گئے کہ غزالہ تمہارے دوست کی بیوی ہے۔"

"ہر لحہ خیال رہا لیکن محبت کا جذبہ بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح ہوتا ہے۔ سب کچھ بہا کرلے جاتا ہے۔"

"اور تم دونوں اس سیلاب میں بہہ نکلے؟"

"ہاں، ایسا ہی ہوا ہے۔" اس بار غزالہ نے کہا۔ اگرچہ اس کی آواز دھیمی تھی لیکن اس کا لہجہ بااعتماد تھا۔ جیسے سوچ سمجھ کر کچھ کہنے کا فیصلہ کرچکی ہو۔

"بہت خوب۔" میرا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کیوں؟"

"شاید اس لیے کہ میں تم سے کہیں بڑھ کر غزالہ سے محبت کرتا ہوں۔" خورشید نے کہا۔

"کیا ثبوت ہے اس بات کا؟"

"کیسا ثبوت چاہتے ہو؟"

"محبت کرنے والے قربانی دینا جانتے ہیں۔ میرے دوست نما دشمن۔ تم اس معاملے میں میرا مقابلہ نہیں کرسکتے اور محبت کے راستے میں قربانی دینا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن میں دے سکتا ہوں کیونکہ میں نے واقعی محبت کی ہے۔ تمہاری طرح صرف دعوے نہیں کررہا۔"

"کیسی قربانی بتاؤ؟" خورشید جوش میں آگیا۔

"یہ چائے اٹھا کر پی جاؤ۔" میں نے پیالیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میرے دوست نما دشمن۔ تم نے کم از کم یہ تو سوچا ہوتا کہ آخر کیوں... آج میں تمہارے لیے چائے بنانے کی ضد کیوں کررہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا بکواس ہے۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ان میں سے ایک پیالی میں زہر ہے۔" میں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں بتاتے ہوئے اپنی جیب سے ایک شیشی نکالی۔ "یہ دیکھو، اس میں زہر ہے۔ بہت ہی خطرناک قسم کا۔ تم تو جانتے ہو کہ کیمسٹری میرا سبجیکٹ رہی ہے۔ مختلف قسم کے زہر پر کام بھی کرتا رہا ہوں۔ تو یہ زہر ایسا ہے جو صرف آدھے گھنٹے کے اندر پینے والے کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔"

"آپ شاید پاگل ہو گئے ہیں۔" غزالہ جلدی سے بولی۔ "یہ خطرناک کھیل ہے۔"

"ہاں بہت خطرناک۔ لیکن محبت کی راہ میں ایسے ہی کھیل ہوا کرتے ہیں اور میں تمہارے اس محبوب کو جینے کا ایک موقع بھی تو دے رہا ہوں۔ یعنی ففٹی ففٹی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وہ پیالی اٹھالے جس میں زہر نہ ہو۔ وہ پیالی میرے حصے میں آجائے۔"

"مجھے ایسا پاگل پن پسند نہیں ہے۔" خورشید نے کہا۔ "یہ خودکشی ہے۔"

"محبت کرنے والے یہ سب نہیں دیکھتے۔" میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "میں پھر کہہ رہا ہوں کہ محبت کا دعویٰ تو آسان ہے لیکن اس راہ میں اپنا ثبوت دینا بہت مشکل۔"

پھر خاموشی۔ خورشید پہلو بدلنے لگا تھا جبکہ غزالہ کی سمجھ میں نہیں آرہا ہوگا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

"اٹھاؤ نا پیالی۔" میں نے کہا۔ "تم یہ بھی تو دیکھو کہ پہلا موقع تمہیں دے رہا ہوں اور وہ اس لیے کہ کہیں تم یہ مت سمجھو کہ میں نے جو پیالی تمہارے سامنے رکھی ہے، اسی میں زہر ہے۔ نہیں، اس لیے تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم دونوں میں سے جو پیالی چاہے، اٹھا سکتے ہو۔"

"پلیز نہ کریں ایسا۔" غزالہ نے کہا۔

"کیوں نہ کروں؟ تمہیں اتنی آسانی سے ہاتھ سے کیوں جانے دوں؟ جب زندگی بھر گھاٹے ہی کا سودا کیا ہے تو ایک سودا اور سہی۔ میرا خیال ہے کہ تم ہی خورشید سے کہو۔ یہ تمہارے کہنے پر کوئی پیالی اٹھالے گا۔"

"دیکھو، ایسی حرکتیں صرف فلموں اور کہانیوں میں ہوا کرتی ہیں۔" خورشید نے کہا۔

"فلمیں اور کہانیاں بھی تو زندگی کی ہوتی ہیں۔" میں مسکرا کر بولا۔ "اسی لیے تو میں جان چھڑا رہا ہوں ایسی زندگی سے۔ فرض کرو تم نے بغیر زہر کی پیالی اٹھالی اور تمہارا کچھ نہیں ہوا تو پھر دوسری پیالی تو مجھے پینی ہے نا اور میرے لیے غزالہ کے بغیر زندگی کا تصور تو ویسے ہی دھندلا گیا ہے۔ اس لیے میرے جینے یا مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میری موت کے بعد غزالہ خود بخود تمہاری ہو جائے گی۔"

"اور میری موت کے بعد؟"

"ظاہر ہے پھر وہ میری ہی رہے گی۔ چلو، اب وقت ضائع نہ کرو۔ اٹھاؤ پیالی۔"

"نہیں۔" خورشید کھڑا ہو گیا۔ "میں اس حماقت میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

"غزالہ پلیز... سمجھاؤ اس کو۔"

غزالہ نے خورشید کی طرف دیکھا۔

"پاگل مت بنو۔" خورشید نے کہا۔ "میں پرانے زمانے کا کوئی بے وقوف عاشق نہیں ہوں جو اس قسم کے تجربے کے لیے خواہ مخواہ مر جاؤں۔ مجھے نہیں چاہیے ایسا امتحان اور ایسی قربانی۔"

"تو پھر یہ بتا کر جانا کہ تم آئندہ سے غزالہ کے راستے میں نہیں آؤ گے۔ اس کی جان چھوڑ دو گے۔"

"ایسی بے وقوفی سے تو یہی بہتر ہوگا۔"

"تو پھر جانے سے پہلے ایک بات سنتے جاؤ۔" میں نے کہا۔

"کہو۔"

"یہ دیکھو۔" میں نے ایک پیالی اٹھالی۔ "چائے اب بالکل ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میں نے ایک سانس میں پیالی ختم کر لی۔ اس کے بعد دوسری پیالی بھی ختم کر دی۔

"میرے دوست نما دشمن۔ ان دونوں میں سے کسی پیالی میں زہر نہیں تھا۔" میں نے بتایا۔

"تو پھر... یہ... یہ ڈراما۔"

"ڈراما نہیں، محبت کا امتحان۔" میں نے کہا۔ "اور افسوس کہ تم اس امتحان میں فیل ہو گئے۔"

خورشید کچھ دیر کھڑا خونخوار نگاہوں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر پاؤں پٹختا ہوا باہر چلا گیا۔

غزالہ اچانک بکھر گئی تھی۔ اس نے رونا شروع کر دیا۔

"ارے، تم کیوں رو رہی ہو؟" میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "اچھا ہوا نا تمہاری آنکھیں کھل گئیں۔"

"ہاں منیر! میری آنکھیں کھل چکی ہیں۔" غزالہ نے کہا۔ "مجھے احساس ہو گیا ہے کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو۔ تم میرے لیے سب کچھ کر سکتے ہو۔ میں ایک فریبی کے ہاتھوں میں آکر تم سے بے وفائی کا گناہ کر رہی تھی۔"

"خیر۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "اب ایک بات یہ سن لو کہ اب خود میری آنکھیں بھی کھل گئی ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں۔"

"نہیں، تم یہ... نہیں کر سکتے۔"

"یہ تو کرنا ہی ہوگا غزالہ... مجھے افسوس ہے لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ کل پھر کوئی اور خورشید تمہاری زندگی میں نہیں آجائے گا؟"

غزالہ روتی رہی اور میں اس کمرے سے باہر آگیا۔ مجھے ایک بار پھر اپنی تنہائیوں کے ساتھ رہنا تھا۔

جب کسی پیڑ کو گھن لگ جائے تو وہ... اندر ہی اندر جڑوں کو کھوکھلا کرتا چلا جاتا ہے... تو پھر ایسے پیڑ کو بچایا نہیں جا سکتا... انسان کا بھی یہی حال ہے... نظر آنے والے زخم دیکھتے ہی دیکھتے بھر جاتے ہیں... لیکن جسم کی گہرائیوں میں اُتر جانے والی کسک ہو یا انتقام کی چنگاری... وہ کبھی سرد نہیں ہوتی... جرم کی دنیا میں داخل ہو جانے والے بدنیت لوگوں کا عبرت انگیز ماجرا...

مجبوریوں اور صعوبتوں کے الاؤ میں دہک جانے والے معصوموں کا المیہ...

جائے مرگ

دانیال عارف

نادر کرمانی دیکھنے میں عام سا آدمی لگتا تھا۔ قد پانچ فٹ سات انچ تھا۔ وزن ساٹھ باسٹھ کلوگرام ہوگا۔ کسی قدر اندر دبا ہوا پیٹ اور کسی قدر ابھرا ہوا سینہ، بازو عام تھے لیکن ٹانگیں مضبوط تھیں۔ رنگت سانولی، متناسب نقوش اور سر پر کہیں کہیں سے سفید ہوتے پورے بال تھے۔ اس نے انہیں کریو کٹ کر رکھا تھا۔ چہرہ سپاٹ رہتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن پر دوسرے زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ وہ خود بھی توجہ حاصل کرنے کا قائل نہیں تھا۔ برسوں کے تجربے نے

اسے سمجھا دیا تھا کہ توجہ آدمی کو مشہور اور غافل کرتی ہے اور وہ اسی وجہ سے مارا جاتا ہے۔ جیل میں بھی اسے عام قیدی سے زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی اور وہ اسی لیے یہاں آیا تھا۔ ریکارڈ میں اس کا نام فضل خان تھا۔ یہاں کوئی اسے نادر کرمانی کی حیثیت سے نہیں جانتا تھا۔ وہ جیل کی جس بیرک میں تھا، اس کے ساتھ دو قاتل تھے جو عمر قید کی سزا کاٹ رہے تھے۔ ایک ڈاکو تھا اور ایک عام نوجوان تھا۔ ان میں وہی سب سے غیر نمایاں تھا۔

نادر کرمانی چوری کے الزام میں آیا تھا۔ ایک بنگلے میں گھستے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اور اس نے چوری کا اعتراف بھی کرلیا تھا۔ خوش قسمتی سے پولیس نے اسے زیادہ بجایا نہیں تھا اور نہ ہی اسے لاوارث جان کر اس پر مزید کیس ڈالے تھے۔ اس کے اعترافِ جرم کے بعد اسے عدالت میں پیش کیا گیا اور وہاں بھی اس کے اعتراف نے کارروائی آسان کردی۔ گرفتاری کے صرف بیس دن بعد اسے سات مہینے کی سزا سنا کر سینٹرل جیل بھیج دیا گیا۔ ذہنی طور پر وہ ایک سال کی سزا کے لیے بھی تیار تھا اس لیے جب اسے سات مہینے کی سزا ہوئی تو اسے خوشی ہوئی۔ اسے یقین تھا کہ اس نے جیل میں چال چلن ٹھیک رکھا تو جلد اسے رہا کر دیا جائے گا۔ چال چلن درست رکھنے کے لیے وہ ہر ایک سے بنا کر رکھتا تھا۔ سب سے جھک کر عاجزی سے ملتا، دیے جانے والے کام دوڑ کر کرتا تھا۔ گالی یوں سنتا جیسے کوئی اس کی تعریف کر رہا ہے۔ اس طرح وہ جیل کی اکثریت میں شامل تھا جس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا تھا۔

دونوں قاتل قیدی اس بیرک کے بادشاہ تھے۔ ڈاکو ایک طرح سے وزیر تھا جبکہ نادر اور نوجوان سلمان کا شمار رعایا میں ہوتا تھا۔ ان تینوں کی خدمت میں وہ دونوں پیش پیش رہتے تھے۔ یہ جیل کا اَن لکھا قانون تھا جتنا بڑا جرم کرکے آؤ گے، اتنا ہی اونچا مقام ملے گا۔ اس بیرک میں بھی یہ قانون رائج تھا۔ سب کے لیے ایک سا کھانا آتا تھا مگر پہلے وہ تین کھاتے اور بچا کھچا ان دونوں کو ملتا تھا۔ مشقت کے سارے کام انہیں کرنا پڑتے تھے۔ وہ انہیں حقہ گرم کرکے دیتے، چائے بناتے، برتن دھوتے، ان کے کپڑے دھوتے اور رات کو سونے سے پہلے ان کی مٹھی چاپی کرکے سوتے۔ ان کی گالیاں سنتے اور کبھی کبھی مار بھی کھاتے تھے۔ سلمان ویسے ہی مظلوم قسم کا نوجوان تھا جو صورت سے دکھی نظر آتا تھا۔ اسے بلوے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ کالج کے طلبا کسی بات پر ہنگامہ آرائی کر رہے تھے، پولیس نے دھاوا بولا اور موقع پر موجود ہر نوجوان کو پکڑ کر لے گئی۔ ان میں سلمان بھی شامل تھا جو طالب علم نہیں تھا اسی لیے باقی سب چھوٹ گئے اور اسے ہنگامہ آرائی کے الزام میں ایک سال کی سزا ہوگئی۔ وہ نادر کی یہاں آمد سے پہلے موجود تھا۔

قیدیوں کا معمول تھا، وہ صبح سویرے اٹھ جاتے تھے کیونکہ انہیں اپنے بہت سے کام خود کرنا ہوتے تھے۔ اس میں ناشتا بنانا بھی شامل تھا۔ نادر بھی ان قیدیوں میں سے تھا جو ناشتے کی تیاری میں حصہ لیتے تھے۔ وہ چائے بناتا تھا۔ چائے بڑی کیتلی میں بھر کر ہر بیرک تک جاتا اور قیدی اپنے اپنے پیالوں میں اس سے چائے وصول کرتے۔ کیتلی خالی ہوتی تو وہ اسے دوبارہ بھر کر لاتا اور اپنے حصے کے ہر بیرک تک چائے پہنچاتا۔ انہیں چائے کے ساتھ خشک نان ملتا تھا۔ عام طور سے وہ جب اپنا کام نمٹا کر واپس بیرک میں آتا تو اس کا نان بھی کبھی آدھا اور کبھی چوتھائی رہ جاتا۔ وہ اسے ہی کھا کر ناشتا مکمل کرلیتا۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے انہیں باہر جانے اور اپنی چیزیں صاف کرنے کا موقع ملتا تھا۔ دوپہر میں کھانا بنانے والوں میں سلمان شامل ہوتا۔ دوپہر کا کھانا عام طور سے پتلے دال چاول یا شوربے والی سبزی اور روٹی پر مشتمل ہوتا تھا۔ گوشت عام طور سے ہفتے میں ایک بار ملتا تھا اور نادر و سلمان کے حصے میں وہ بھی نہیں آتا تھا۔ یہ گوشت باقی تین کھاتے تھے اور انہیں شوربے پر گزارہ کرنا پڑتا۔ کپڑے دھونے کی باری مقرر تھی۔ ایک بار نادر سب کے کپڑے دھوتا تھا اور دوسری بار سلمان۔ اگر نادر کرمانی کا کوئی جاننے والا اسے یہاں دیکھ لیتا تو وہ کبھی تسلیم نہ کرتا کہ وہ نادر کرمانی ہی ہے۔ اسے اور اس کی فطرت کو دنیا میں چند لوگ ہی اچھی طرح جانتے تھے اور وہ سب نادر سے ڈرتے تھے۔

☆☆☆

نادر نے اس شخص کو منہ پر مکا مارا تو اسے بہت مزہ آیا۔ وہ اس وقت سولہ سترہ سال کا تھا۔ چنا چاٹ کے اسٹال پر بہت رش تھا اور اس آدمی نے نادر کا پاؤں کچل دیا تھا۔ اس نے بے اختیار اسے گھونسا مارا۔ حالانکہ وہ عمر اور تن و توش میں نادر سے کہیں آگے کی چیز تھا مگر مکا کھا کر وہ خوفزدہ ہوگیا۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور خون بہہ نکلا۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے نادر کو دیکھا جو اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور ہجوم سے نکل کر وہاں سے چلا گیا۔ تب نادر کو عجیب سی سرشاری کا احساس ہوا۔ اسے زندگی میں پہلے کبھی یہ احساس نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ مار پیٹ میں وہ بچپن سے ہی طاق تھا۔ چھٹی جماعت تک وہ اسکول میں رہا اور کوئی دن ایسا نہیں

گزرتا تھا جب اس کی کسی سے مار پیٹ نہ ہو۔ لیکن وہ سب اس کے ساتھ کے لڑکے ہوتے تھے مگر یہ شخص اس سے کہیں بڑا اور مضبوط تھا۔ اس کے باوجود وہ دُم دبا کر چلا گیا۔

نادر شہر کے اس پرانے اور پسماندہ علاقے میں پلا بڑھا تھا جہاں گلیوں میں جرائم کا راج تھا۔ ہر گلی اور ہر محلہ مختلف جرائم پیشہ گروہوں میں بٹا ہوا تھا جہاں نوجوان تعلیم کے بجائے جرائم کی دنیا میں اپنا مستقبل تلاش کرتے تھے۔ جہاں پستول کی گولی پیناڈول کی گولی کی طرح عام دستیاب تھی اور کوئی بھی لے سکتا تھا۔ نادر کا باپ منشیات فروش تھا۔ اس کے دو بھائی یہی کام کرتے تھے اور وہ بچپن سے انہیں جیل اور حوالات آتے جاتے دیکھ رہا تھا۔ پولیس ان کے ہاں جتنی آتی تھی، اتنے تو رشتے دار اور ملنے والے نہیں آتے تھے۔ ایسے ماحول میں پلنے والا نادر سولہ سال تک کسی قدر شریف لڑکا تھا۔ شریف ان معنوں میں کہ اس نے کسی مجرمانہ سرگرمی میں حصہ نہیں لیا تھا۔ باپ اور بیٹوں کی صحبت سے بچانے کے لیے اس کی ماں نے اسے اپنے میکے بھجوا دیا تھا۔ اصل خطرہ یہ تھا کہ اب وہ گرفتاری کی عمر کو پہنچ گیا تھا۔ گھر میں اس کا باپ یا بھائی نہ ملتے تو پولیس اسے لے جاتی۔ شاید اسی لیے پولیس کے پاس اس کا ریکارڈ نہیں تھا۔

پیسے کی کمی نہیں تھی اور عام گھروں کی طرح خرچ کی پابندی بھی نہیں تھی۔ جو جتنا چاہتا اور جس مد میں چاہتا خرچ کرسکتا تھا۔ کم عمری سے غلط عورتوں کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ اس کے باپ اور بھائیوں کو پتا تھا لیکن انہوں نے اسے ٹوکا نہیں۔ وہ تو خود ان چکروں میں رہتے تھے۔ اس نے نشہ نہیں کیا تھا البتہ پینے لگا تھا مگر وہ بھی ایک حد میں رہ کر۔۔۔۔ وہ عادی نہیں ہوا تھا۔ اس کے پاس تفریح کے مواقعوں کی کمی نہیں تھی اور وہ ان سے پورا فائدہ بھی اٹھاتا مگر اس روز اس آدمی کو مار کر اسے جو لطف آیا تو اسے پتا چل گیا کہ اس کے لیے زندگی کا اصل مزہ کس کام میں ہے۔ اسے ایک انوکھی قوت اور برتری کا احساس ہوا۔ وہ چاٹ لے کر ہجوم سے باہر آیا تو ایک شخص اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ چاٹ کے بعد وہ بوتل لینے کے لیے اٹھا تھا کہ اس آدمی نے اسے کولڈ ڈرنک لادی۔ نادر حیران ہوا تو اس نے بے تکلفی سے کہا۔

"پیو جوان۔"

"تم کون ہو؟"

"جمال نام ہے میرا۔"

"میں تمہیں نہیں جانتا۔"

"پر میں تمہیں جان گیا ہوں۔" جمال نے کہا۔ "تم نے جس طرح اس آدمی کو ہاتھ مارا، اس سے لگتا ہے کہ تم آگے جاؤ گے۔"

"آگے کہاں؟"

"دولت کی چوٹی پر جوان۔" جمال بولا۔ "بوتل پیو، گیس نکل گئی تو مزہ نہیں آئے گا۔"

بوتل ختم ہونے سے پہلے ان دونوں میں دوستی ہوگئی۔ نادر کو یہ شخص اچھا لگا جس نے اس کی حرکت کی تعریف کی تھی۔ جمال تقریباً چوبیس پچیس سال کا خوش رو اور ذرا ماڈرن نظر آنے والا شخص تھا۔ پھر ان دونوں کی ملاقات ہونے لگی۔ جلد نادر کو پتا چل گیا کہ جمال اس کے باپ اور بھائیوں کی طرح جرائم پیشہ تھا۔ مگر وہ پڑھا لکھا اور چالاک آدمی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آج تک کبھی گرفتار نہیں ہوا تھا۔ وہ بہت ہوشیاری سے ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرتا۔ اس نے نادر سے کہا۔ "دس بندے قتل کردو لیکن پولیس کے ہاتھ نہ آؤ۔ ایک بار پولیس کے ہاتھ آگئے تو سمجھ لو گئے۔ اب تم یا تو پولیس کے ٹاؤٹ بن کر رہو گے یا پھر پولیس ہر واردات کے بعد تمہارا پیچھا کرے گی۔ بے شک تم نے اس واردات میں حصہ نہ لیا ہو۔"

نادر بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ اس کے باپ بھائی دس میں سے دو بار ہی اپنی حرکتوں کی وجہ سے تھانے جاتے تھے ورنہ آٹھ بار وہ صرف اس لیے رگڑے میں آتے کہ وہ نامی گرامی ہسٹری شیٹر تھے اور علاقے میں ہونے والی ہر واردات میں ان کا ہاتھ تلاش کیا جاتا تھا۔ نادر کو جمال کی یہ بات بھی اچھی لگی۔ جمال نے اس کی تربیت کی۔ اسے اسلحہ چلانا سکھایا۔ چاقو زنی میں طاق کیا اور جسمانی لڑائی کی تربیت دی۔ اس دوران میں اس نے ایک بار بھی نادر سے نہیں کہا کہ وہ کسی واردات میں اس کا ساتھ دے۔ لڑائی بھڑائی کے ساتھ جمال نے اس کی دوسری طرح سے تربیت بھی کی۔ اسے چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا اور بولنا سکھایا۔ وہ اسے لے کر اونچی سوسائٹی کی بیٹھکوں میں جاتا۔ یہ اعلیٰ درجے کے ہوٹلز اور ریستوران ہوتے تھے جہاں سوسائٹی کی کریم آتی تھی۔ جمال اسے دکھاتا کہ وہ کس طرح زندگی گزارتے ہیں۔ ایک بار اس نے جمال سے پوچھا۔ "تم مجھے یہ سب کیوں دکھاتے ہو؟"

"ہم دولت کمانے کے لیے جرم کرتے ہیں اور دولت ان لوگوں کے پاس ہے۔ یاد رکھو، اپنے شکار کو جتنے قریب سے جانو گے اسے لوٹنا اتنا ہی آسان ہوجائے گا۔"

نادر نے اس کی یہ بات بھی گرہ میں باندھ لی۔ دو

سال بعد نادر نے پہلی بار اس کے ہمراہ ایک واردات میں حصہ لیا۔ ان کا نشانہ ایک منی چینجر تھا جو ہنڈی سے آنے والی بھاری مالیت کی رقم اپنے بنگلے میں رکھتا تھا۔ جمال نے اندر کے ایک ملازم کو ملا کر یہ واردات کی۔ ملازم نے چوکیدار کو چائے میں بے ہوشی کی دوا دے دی تھی اور وہ آرام سے اندر داخل ہو گئے۔ منی چینجر تجوری کھولنے پر آمادہ نہیں تھا لیکن جب جمال نے اس کی نوجوان بیٹی کو برہنہ کیا تو وہ مان گیا۔ لڑکی کو دیکھ کر نادر کے منہ میں پانی آگیا اور اس نے چاہا کہ جانے سے پہلے وہ اس کی عزت برباد کر جائے لیکن جمال نے اسے روک دیا۔ بعد میں اس نے نادر سے کہا۔

''یاد رکھو، انسان روپے کا زخم برداشت کر لیتا ہے لیکن عزت کا زخم کبھی نہیں بھولتا اور ہمیشہ اس کا پیچھا کرتا ہے جس نے اسے یہ زخم دیا ہو۔''

یہ بھی جمال کا اصول تھا کہ وہ صرف دولت سے مطلب رکھتا تھا۔ اس واردات میں انہیں دس لاکھ سے اوپر کی رقم ملی تھی۔ کل چار آدمی تھے۔ جمال نے سب کو لاکھ لاکھ روپے دیے اور باقی رقم اس کے پاس گئی۔ کسی نے اعتراض نہیں کیا کہ ایک تو جمال باس تھا، ساری پلاننگ اس نے کی تھی۔ پھر ان تینوں کے لیے لاکھ روپے بھی بہت بڑی رقم تھی۔ آج سے بیس سال پہلے اس کی خاصی قدر ہوتی تھی جب لاکھ روپے میں مکان مل جاتا تھا۔ نادر نے یہ رقم اس طرح خرچ کی کہ ایک مہینے بعد اس کے پاس ہزار روپے بھی نہیں تھے' اس نے کھل کر عیاشی کی تھی۔ جمال اس کا دوست اور باس بھی تھا مگر جب اس نے نادر کو اس لڑکی سے زیادتی سے روکا تو اس کے دل میں جمال کے لیے گرہ پڑ گئی۔ اسے وہ لوگ اچھے نہیں لگتے تھے جو اس کے کسی کام میں رکاوٹ بنیں مگر اس گرہ کو اس نے دل میں دبا کر رکھا۔ کنگال ہونے کے بعد اس نے جمال سے کہا۔

''کوئی اور کام تلاش کرو، ادھر مال ختم ہے۔''

''کام چھ مہینے بعد۔'' جمال نے جواب دیا۔ ''میرا اصول ہے چھ مہینے میں ایک کام کرتا ہوں۔''

دو اور ساتھی مہرداد اور شکور کو بھی جمال نے اسی طرح تلاش کیا تھا اور انہیں تربیت دی تھی' جیسے نادر کو تلاش کیا تھا اور اسے تربیت دی تھی۔ ان کا تعلق بھی نچلے طبقے کے جرائم پیشہ گھرانوں سے تھا۔ وہ پہلے سے جمال کے ساتھ کام کرتے رہے تھے اس لیے انہوں نے اپنا پیسا سنبھال کر خرچ کیا۔ آنے والے پانچ مہینے نادر پر بھاری گزرے۔ اٹھارہ سال کا ہونے کے بعد باپ اور بھائیوں نے ہاتھ کھینچ لیا تھا اور اب اسے اپنا گزارہ خود کرنا تھا۔ جمال نے اس کی کچھ مدد کی لیکن اس سے اس کا گزارہ ہونے والا نہیں تھا۔ بالآخر چھ مہینے بعد جمال نے اگلی واردات کا منصوبہ بنایا۔ اس بار اس نے ایک جیولر کو لوٹنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ایک بہت بڑی صرافہ مارکیٹ میں جیولرز کی بے شمار دکانیں تھیں۔ وہاں رات کے وقت چھ گارڈز ہوتے تھے اور مارکیٹ کا مرکزی دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔ اس بار بھی جمال نے اندر کے بھیدی سے کام لیا۔ ایک گارڈ کو ساتھ ملا کر اس نے باقی سب کو قابو کیا اور اطمینان سے گیس کٹر کی مدد سے دکان کا شٹر کاٹ کر واردات کی۔ لیکن اس بار جمال نے یہ کیا کہ آتے ہوئے اس گارڈ کو شوٹ کر دیا جس کی مدد سے اس نے یہ کام کیا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے جس ملازم سے مدد لی تھی، اسے چھوڑ دیا تھا۔ نادر نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا۔

''وہ ملازم چھپا ہوا تھا اور پھر سیٹھ نے پولیس میں رپورٹ بھی نہیں کرائی تھی۔ چوکیدار کو چائے ملازمہ نے دی تھی اس لیے اس کا نام نہیں آتا۔ لیکن اس بار پولیس رپورٹ ہوگی اور اس کے پانچ ساتھی اسے دیکھ چکے ہیں۔ پولیس اسے بجاتی تو یہ ہمارے بارے میں بک دیتا۔ یاد رکھو، واردات میں مال کی اتنی فکر مت کرو جتنی اس نشان کی کرو جو پیچھے رہ جاتا ہے اور پولیس اس کی مدد سے تمہیں قابو کر سکتی ہے۔''

اس واردات سے نادر کے حصے میں ایک لاکھ چالیس ہزار روپے آئے اور اس نے ہاتھ روک کر خرچ کیے، اس کے باوجود چار مہینے بعد وہ کنگال ہو چکا تھا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ جمال ہر چھ مہینے بعد واردات کی مشق دہراتا۔ اس دوران میں وہ بندہ تاڑتا، اس کی ریکی کرتا اور منصوبہ بناتا پھر اس پر عمل کرتا۔ اس لیے رقم کا بڑا حصہ جو ساٹھ سے ستر فیصد بنتا تھا، وہ لے جاتا تھا اور باقی تیس چالیس فیصد ان تینوں کے حصے میں آتا تھا۔ کئی سال گزرنے کے بعد ایک دن نادر نے سوچا تو وہ حیران ہوا۔ وہ جمال کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ جمال ہے اور ان کا باس ہے۔ وہ کہاں رہتا ہے؟ اس کا پس منظر کیا ہے؟ اس کا خاندان ہے یا نہیں؟ اور وہ لوٹ کے مال کا کیا کرتا ہے؟ نادر اور باقی دو اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ حد یہ کہ ان کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ جمال کا اصل نام یہی ہے یا کچھ اور ہے۔

جمال اور ان کی ملاقات ہمیشہ علاقے کے ایک ہوٹل میں ہوتی تھی۔ ہوٹل کے مالک کے توسط سے انہیں جمال کا پیغام مل جاتا اور وہ اس سے ملنے پہنچ جاتے۔ ویسے وہ ان کے گھروں سے بھی واقف تھا۔ نادر ایک کمرے کے مکان میں رہتا تھا۔ یہ اس نے کرائے پر لیا ہوا تھا اور یہاں وہ صرف رات گزارنے جاتا تھا۔ صبح سے لے کر شام تک کا وقت اور بعض اوقات اس کی رات بھی اس کمرے سے باہر گزرتی تھی۔ یہاں وہ کسی کو لے کر نہیں آتا تھا اور بلڈنگ میں رہنے والے صرف صورت سے اسے پہچانتے تھے۔ اس کے نام سے چند ہی لوگ واقف تھے۔ جمال نے انہیں حکم دیا تھا کہ وہ آپس میں تعلق نہیں رکھیں گے اور سوائے واردات کے دنوں کے وہ ایک دوسرے سے دور رہیں گے۔ اب تک وہ اس ہدایت پر عمل کرتے آئے تھے۔ اگر اتفاق سے کسی سے سامنا ہو جاتا تو وہ نظریں چرا کر نکل جاتے۔

دس برس تک نادر اسی طرح جمال کے ساتھ لگا رہا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ اور باقی دو جمال کے ہاتھوں بے وقوف بن رہے ہیں۔ محسوس تو اس نے پہلے ہی کر لیا تھا مگر اس نے فیصلہ اب کیا کہ وہ مزید اس کے ہاتھوں بے وقوف نہیں بنے گا۔ پہلے مرحلے میں اس نے جمال کے اس فیصلے سے انحراف کیا کہ وہ اس سے ہٹ کر کوئی واردات نہیں کر سکتے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ناتجربہ کار تھے اور اگر پکڑے جاتے تو پورا گروہ پولیس کی نظر میں آجاتا اس لیے اس کی طرف سے سخت حکم تھا کہ وہ ایسی کوئی حرکت نہیں کریں گے۔ شاید اسی لیے جمال نے انہیں الگ الگ رہنے کا حکم دیا تھا تاکہ وہ نہ ملیں اور نہ مل کر کچھ کرنے کا سوچیں۔ اب نادر کو احساس ہو رہا تھا کہ جمال نے کتنی ہوشیاری سے انہیں استعمال کیا تھا۔ وہ تینوں نوجوان اور ناتجربہ کار تھے۔ جمال عمر اور تجربے میں ان سے بڑا تھا۔ پھر اس نے پہلے ان کی تربیت کر کے ان پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ بہت عرصے تک تو وہ اس کے حکم کے خلاف کچھ کرنے کا سوچ ہی نہیں سکے تھے۔

نادر نے پہلے شکور اور مہرداد کو ساتھ ملانے کا سوچا مگر پھر اسے محسوس ہوا کہ اس میں خطرہ ہے۔ ممکن ہے ان میں سے کوئی جمال کو پھوٹ دے۔ اس لیے اس نے اکیلے کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ واردات کے لیے اسلحہ جمال لاتا تھا اور کام کے بعد اسے واپس لے جاتا۔ نادر نے ایک نائن ایم ایم پستول حاصل کیا۔ اس پر اسے اچھی مشق تھی اور اس کا نشانہ بھی اچھا تھا۔ اس نے ایسی واردات کا سوچا جسے اکیلا آدمی آسانی سے کر سکے۔ تب اسے سب سے آسان کام بینک اے ٹی ایم میں واردات کا لگا۔ اس نے شہر میں ایسے اے ٹی ایم تلاش کیے جو الگ تھلگ تھے اور جہاں گارڈز بھی نہیں ہوتے تھے۔ اس زمانے میں اے ٹی ایم بینکوں کے باہر فولادی باکس میں ہوتے تھے۔ نادر کے پاس ون ٹو فائیو بائک تھی۔

پہلی واردات میں اس کے ہاتھ بیس ہزار روپے لگے۔ اس نے جس شخص کو لوٹا تھا، وہ ایک وقت میں اس سے زیادہ رقم نہیں نکال سکتا تھا اس لیے اسے بیس ہزار پر قناعت کرنا پڑی لیکن یہ بھی اچھی خاصی رقم تھی۔ اے ٹی ایم کے ساتھ کیمرے ہوتے تھے لیکن وہ سن گلاسز اور پی کیپ کی مدد سے اپنا چہرہ اس طرح چھپاتا کہ اس کی شناخت ناممکن ہو جاتی۔ پہلی کامیابی کے بعد اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ تیسری واردات میں اس نے ایک بڑے میاں کو منتخب کیا۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کی کار سے نکلے تھے مگر خلافِ توقع وہ اڑ گئے اور انہوں نے اے ٹی ایم استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ نادر نے انہیں شوٹ کر دیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ قتل اسے مضطرب کر دے گا مگر وہ بالکل... پرسکون رہا بلکہ اس نے محسوس کیا کہ اسے ایک انسان کو قتل کر کے خوشی ہوئی تھی۔ اسے اپنی ناکامی کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ اس ناکامی کی کسر اس نے اگلی بار پوری کر لی جب اس نے اگلے شکار کو بڑے میاں کا حوالہ دیا اور وہ اپنا سب کچھ اس کے حوالے کرنے کو تیار ہو گیا۔ اس کی لمٹ زیادہ تھی اور اس بار نادر کو اسی ہزار کی رقم ملی۔

آنے والے پانچ سال تک نادر کامیابی سے الگ وارداتیں کرتا رہا۔ اے ٹی ایمز کی کمی نہیں تھی بلکہ ہر کچھ عرصے بعد نت نئے اے ٹی ایمز کھل رہے تھے۔ پھر اے ٹی ایم بینکوں کے ساتھ اندر ہو گئے تو نادر جیسے ڈکیتوں کے لیے اور آسانی ہو گئی۔ اب وہ تسلی سے لوگوں کی نظروں میں آئے بغیر لوٹ مار کرتا تھا۔ جہاں تک بینک کے کیمرے کی بات تھی تو اس نے کبھی اس کی پروا نہیں کی۔ اسے معلوم تھا کہ ان کیمروں کی مدد سے آج تک کوئی ڈکیت نہیں پکڑا گیا ہے۔ کیبن کے اندر وہ تسلی سے واردات کرتا تھا اور اگر کسی اے ٹی ایم میں رقم نہیں ہوتی تو وہ اپنے شکار کو دوسرے اے ٹی ایم میں لے جاتا۔ جمال حسبِ معمول چھ مہینے بعد واردات کرتا اور ہر بار پہلے سے بڑا ہاتھ مارتا۔ لیکن ان کا حصہ اس رفتار سے نہیں بڑھ رہا تھا۔ اگر نادر اپنا کام نہیں کرتا تو اس کے لیے گزارہ کرنا مشکل ہو جاتا۔ اپنی ہوشیاری کی وجہ سے

وہ پولیس سے بھی بچا ہوا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ دوران واردات یا اس کے بعد اس کا پولیس سے سامنا ہوا مگر وہ گھبرائے بغیر وہاں سے نکلنے میں کامیاب رہا۔

پانچ سال پہلے جمال نے ان کے ساتھ آخری بار واردات کی تھی۔ اس بار انہوں نے بہت بڑا ہاتھ مارا تھا۔ نشانہ پھر ایک سیٹھ تھا۔ اسے بہت بڑی رقم وصول ہوئی تھی اور یہ رقم اس کے دفتر کے سیف میں تھی۔ سیٹھ کا اکاؤنٹنٹ جمال کے ساتھ شریک تھا۔ اس واردات میں انہیں دو کروڑ روپے ملے تھے۔ مگر خلافِ توقع جمال نے ان کا حصہ فوری دینے کے بجائے انہیں ایک ساحلی ہٹ میں ملنے کو کہا اور خود رقم لے کر چلا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ اس ساحلی ہٹ پہنچے تو اسے مقفل پایا۔ جمال نے انہیں دھوکا دیا تھا۔ وہ سخت مشتعل تھے مگر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے کیونکہ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ سانپ نکل گیا تھا اور پیٹنے کے لیے لکیر تک چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔ نادر نے شکور اور مہرداد سے کہا۔ ''اس نے ہمیں استعمال کیا لیکن وہ ہمیں کام کرنا سکھا گیا ہے۔ اب ہمیں خود اپنے لیے کام کرنا ہوگا اور یہ اچھی بات ہے۔ اب ملنے والا مال ہم تینوں کے حصے میں آئے گا۔ پہلے تو اصل مال وہ لے جاتا تھا اور ہمارے پاس بس چھلکا آتا تھا۔''

شکور اور مہرداد نے اس سے اتفاق کیا اور انہوں نے اپنا گینگ بنا کر وارداتیں شروع کر دیں۔ ساتھی ملے تو نادر اب گھروں میں ڈکیتی مارنے لگا۔ وہ موقع تاڑتے تھے۔ صبح کے وقت جب مرد دفتروں یا گھر سے باہر ہوتے، اسی طرح بچے اسکول کالج گئے ہوتے تھے تو وہ کسی بہانے گھروں میں گھستے تھے۔ عام طور سے وہ گھروں میں کام کرنے والی ماسی کی آڑ میں گھستے تھے۔ چند دن نگرانی کے بعد انہیں پتا چل جاتا کہ کام والی کب آتی ہے۔ وہ اس کے پیچھے اندر گھس جاتے اور گن پوائنٹ پر سب کو قابو کر لیتے۔ اگر ہنگامہ ہوتا یا عورتیں شور مچاتیں تو بھاگ نکلتے۔ اگر خاموشی سے قابو میں آ جاتیں تو اپنا کام کرتے تھے۔ اگر کوئی چھوٹا بچہ ہوتا تو ان کا کام اور آسان ہو جاتا۔ اسے گن پوائنٹ پر رکھتے تو گھر والے سب دینے کو تیار ہو جاتے۔ ہر واردات میں انہیں کچھ نہ کچھ مل جاتا۔ کبھی تو بیس پچیس ہزار روپے یا اتنی مالیت کی قیمتی اشیا مل جاتی تھیں اور کبھی لاکھوں ہاتھ لگ جاتے۔ زیور تقریباً ہر گھر میں ہوتا تھا۔ اس طرح قیمتی موبائل، گھڑیاں اور نقدی بھی ملتی تھی۔

اب انہیں زیادہ مل رہا تھا۔ اگرچہ وہ جمال کی پلاننگ کرنے کے اہل نہیں تھے۔ جیسے وہ بڑا شکار گھیرتا تھا لیکن وہ خود کو بچانا سیکھ گئے تھے اس لیے جو ملتا اس میں بھی خوش تھے۔ پھر اپنی مرضی سے واردات کے لیے آزاد تھے۔ جب رقم کی ضرورت ہوتی تو شکار تلاش کر لیتے۔ انہیں چھ مہینے تک انتظار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جمال نہیں رہا تھا اس لیے اس کے اصولوں پر عمل بھی باقی نہیں رہا تھا۔ پہلے وہ آپس میں ملتے تھے پھر انہوں نے مل کر رہنا شروع کر دیا۔ انہوں نے بڑا اسلحہ نہیں رکھا کیونکہ یہ نظر میں آتا تھا اور پکڑے جانے کی صورت میں گلوخلاصی بھی مشکل ہو جاتی۔ اس لیے وہ صرف پستول رکھتے تھے اور عام لوگوں کے لیے یہ بھی کافی تھا۔ نادر کو اب اپنی خباثت دکھانے کا موقع بھی ملتا تھا۔ وہ جہاں واردات کرتے، لوگوں پر تشدد کرتے تھے۔ کبھی کبھی انہیں چھپی ہوئی قیمتی اشیا نکلوانے کے لیے یہ کام کرنا پڑتا تھا لیکن اکثر وہ صرف لطف اندوز ہونے کے لیے یہ کام کرتے۔ اگر کسی گھر میں جوان اور خوب صورت عورتیں یا لڑکیاں مل جاتیں تو یہ ان کے لیے بونس ہو جاتا۔ پہلے جمال انہیں روک دیتا تھا لیکن اب انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس لیے وہ دل کھول کر اپنے ارمان پورے کرتے۔

کئی سال تک انہوں نے کامیابی سے وارداتیں کیں اور ایک بار بھی نہیں پکڑے گئے۔ ہاں، ایک بار ایسا ہوا کہ وہ واردات کر کے نکل رہے تھے کہ اتفاق سے پولیس موبائل وہاں آ گئی اور نادر نے فائرنگ کر کے دو پولیس والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور پھر وہ موبائل کے ٹائر ناکارہ کر کے وہاں سے بھاگ نکلے۔ پولیس کوشش کے باوجود انہیں تلاش نہیں کر سکی تھی۔ اس ایک موقع کے سوا پولیس یا کوئی اور کبھی انہیں پکڑنے کے قریب نہیں آ سکا تھا۔ واردات کے بعد وہ کچھ عرصے باہر نکلنے سے گریز کرتے تھے اور اپنے اس گھر میں ہی آرام کرتے اور کھاتے پیتے تھے جو انہوں نے خفیہ ٹھکانے کے طور پر رکھا ہوا تھا۔ جب وہ محسوس کرتے کہ ان کی واردات کی رپورٹ نہیں کی گئی ہے یا پھر پولیس کو ان کی تلاش سے کوئی غرض نہیں ہے تو وہ واپس اپنے اصل ٹھکانے پر آ جاتے۔

موقع تاڑنے کا کام نادر کرتا تھا۔ اس روز وہ گشت پر تھا۔ بائک پر ہیلمٹ تلے چھپ کر وہ پوش علاقوں کی گلیوں کا چکر لگاتا۔ پھر کسی گھر کو تاڑ کر کئی دن اس کی نگرانی کرتا اور جب جگہ واردات کے لیے موزوں لگتی تو وہ اندر گھسنے کی پلاننگ کرتا۔ مگر اس روز اسے کچھ اور نظر آ گیا۔ ایک شخص

نئے ماڈل کی لگژری کار میں بیٹھ رہا تھا۔ وہ جس گھر کے سامنے تھا، اس کے دروازے پر ایک خوب صورت عورت گود میں ایک سال کے بچے کو لیے اس شخص کو ہاتھ کے اشارے سے خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ مکان دو سو چالیس گز پر تھا اور بہت اسٹائلش بنا ہوا تھا۔ اس علاقے میں اتنے بڑے پلاٹ کی مالیت دو کروڑ روپے سے زیادہ تھی۔ نادر اس شخص کو دیکھ کر اتنا حیران ہوا کہ بائک لہرا گئی اور اس نے مڑ کر نادر کی طرف دیکھا۔ اس نے شکر ادا کیا کہ وہ ہیلمٹ میں تھا ورنہ جمال سے کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ پشت دیکھ کر بھی اسے پہچان سکتا تھا۔

وہ جمال ہی تھا۔ اگرچہ اس کے بال لائٹ براؤن تھے اور اس نے فرنچ کٹ رکھی ہوئی تھی۔ سن گلاسز کے ساتھ اس کی شخصیت بدلی ہوئی تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ نادر اسے پہچان نہ پاتا۔ گلی کے سرے پر پہنچ کر وہ رکا اور بائک کے بیک ویو مرر میں جمال کو دیکھنے لگا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور مخالف سمت میں روانہ ہو گیا۔ کچھ توقف کے بعد نادر بھی اس کے پیچھے روانہ ہوا۔ رہائشی علاقے کی حد تک اس نے فاصلہ رکھا تھا لیکن جب وہ بڑی سڑک پر آیا تو جمال کی کار کے پاس آ گیا۔ اسے خدشہ تھا کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ جمال کہاں جا رہا ہے۔ یہ وقت اور اس کے جانے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی دفتر جا رہا ہو۔ اس کا رخ کلفٹن کی طرف تھا۔ کار ایک ایسی عمارت میں داخل ہوئی جس میں دفاتر تھے اور اس کے نچلے دو فلور پارکنگ کے لیے مخصوص تھے۔ گیٹ پر گارڈ موجود تھے۔ جب جمال کی کار اندر چلی گئی تو کچھ دیر بعد نادر گیٹ پر پہنچا اور گارڈ سے کہا۔

''میں انٹرویو کے لیے آیا ہوں۔ مجھے رائن انٹرنیشنل کے آفس جانا ہے۔''

اس کمپنی کا بورڈ باہر لگا ہوا تھا۔ گارڈ نے اسے اندر جانے کی اجازت دے دی مگر بائک اسے عمارت کے باہر پارک کرنے کو کہا۔ جب وہ اندر پہنچا تو اس نے جمال کو لفٹ کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کے لفٹ میں جاتے ہی نادر آگے آیا۔ اس نے لفٹ کے نمبر دیکھے اور جیسے ہی لفٹ چار نمبر پر رکی، اس نے لفٹ کا بٹن دبا دیا۔ لفٹ واپس آئی تو اس نے چار نمبر کا بٹن دبا دیا۔ مگر اس فلور پر کئی دفاتر تھے اور اندر جائے بغیر یہ جاننا ناممکن تھا کہ جمال کس دفتر میں گیا ہے اور وہ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کہ جمال کے سامنے جائے۔ وہ اسے پہچان جاتا تو ہوشیار ہو جاتا۔ نادر کو جلدی بھی نہیں تھی۔ وہ آرام سے بھی یہ کام کر سکتا تھا۔ اگلے دن وہ پھر اسی عمارت میں تھا اور اس بار وہ جمال سے پہلے اوپر موجود تھا۔ اس نے دیکھ لیا کہ جمال، احسن اینڈ کمپنی کے دفتر میں گیا ہے۔ نادر صبر و سکون سے پیچھے لگا رہا اور دو ہفتے میں وہ جمال کے بارے میں تقریباً سب جان چکا تھا۔

جمال کا نام یہاں احسن شیخ تھا۔ وہ اس کمپنی کا مالک تھا جو بیرونِ ملک سے مختلف برانڈز کا دو نمبر منگوا کر ملک بھر میں سپلائی کرتی تھی۔ گویا یہاں بھی وہ غلط کام ہی کر رہا تھا۔ اس کے دفتر میں چار افراد کام کرتے تھے۔ ان میں بڑی حسین سی سیکریٹری بھی شامل تھی۔ صائمہ صرف سیکریٹری نہیں تھی۔ احسن یا جمال نے اسے دفتر کے پاس ہی ایک چھوٹا فلیٹ لے کر دیا ہوا تھا اور یقیناً اسے تنخواہ سے زیادہ ہی ادا کرتا ہوگا کیونکہ وہ ہفتے میں دو راتیں صائمہ کے فلیٹ میں گزارتا تھا۔ اپنی نوجوان اور حسین بیوی ہوتے ہوئے بھی۔ نورین وفا شعار اور خدمت گزار بیوی کی طرح اس کا گھر سنبھالتی تھی اور اس کے دو بچے پالتی تھی۔ بڑی بیٹی کی عمر چار سال تھی اور وہ اسکول جاتی تھی جبکہ بیٹا ابھی سوا سال کا تھا۔ احسن کے ٹھاٹ باٹ اور لائف اسٹائل بتاتا تھا کہ اس کی آمدنی اچھی خاصی ہے۔ اس کے پاس نئے ماڈل کی قیمتی کار تھی اور گھر تو تھا ہی بہت شاندار۔

نادر کو یقین تھا کہ احسن نے یہ سب ڈکیتی کی رقوم سے حاصل کیا ہے۔ وہ بڑا حصہ لیتا تھا اور یقیناً اسے بچا کر رکھتا ہوگا۔ انہیں وہ اتنا دیتا تھا کہ وہ بس گزارہ کر سکیں اور مسلسل اس کے محتاج رہیں۔ اس نے ذہن میں ایک ہدف بنایا ہوگا اور جب یہ ہدف حاصل کر لیا تو انہیں ہری جھنڈی دکھا کر غائب ہو گیا۔ جمع کی ہوئی رقم سے اس نے اپنی زندگی بنا لی تھی۔ وہ جس ذہن کا آدمی تھا، وہ ایسا کر سکتا تھا لیکن نادر اور اس کے ساتھی یوں زندگی نہیں گزار سکتے تھے۔ ان کا طرزِ زندگی ہی الگ تھا۔ جمال نے ان کے ساتھ آخر میں غلط کیا تھا اور نادر کے دل میں اسی کا خیال آیا۔ ساری معلومات کر کے جب اس نے شکور اور مہرداد کو بتایا تو وہ اچھل پڑے۔ شکور نے جوش سے کہا۔

''اس کمینے کو چھوڑنا نہیں ہے۔''

''زیادہ جوش میں مت آؤ۔'' نادر نے کہا۔ ''مت بھولو کہ وہ ہمارا استاد رہا ہے۔''

''استاد کی ایسی کم تیسی۔'' مہرداد بولا۔ ''وہ ہمارا حصہ مار گیا تھا۔ ہر ایک کے حصے میں کم سے کم بیس پچیس لاکھ

روپے آتے مگر اس نے ایک روپیا بھی نہیں دیا۔"
"میں کون سا اس کی عزت کرنے کو کہہ رہا ہوں۔" نادر نے بدمزگی سے کہا۔ "میرا مطلب ہے اسے تر نوالہ مت سمجھو۔ اس نے جتنا ہمیں سکھایا ہے، خود اس سے زیادہ ہی جانتا ہوگا۔"

"اس کی عزت تو ہم کریں گے اور اس کے سامنے کریں گے۔" شکور نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "تم نے بتایا ہے اس کی بیوی نوجوان اور حسین ہے۔"

نادر مسکرایا۔ "تم نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔ پر جو کرنا ہے خوب سوچ سمجھ کر اور پوری پلاننگ سے کرنا ہے۔ وہ شریفانہ زندگی گزار رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ شریف ہو گیا ہے۔ اتنا تو اسے بھی پتا ہوگا کہ اس شہر میں کبھی بھی ہم سے سامنا ہو سکتا ہے۔ اس نے کچھ نہ کچھ بندوبست کر رکھا ہوگا۔"

"ہاں، کام پکا کرنا ہوگا۔" مہرداد نے کہا۔ "صرف انتقام ہی نہیں لینا ہے، اس سے اپنا حصہ بھی نکلوانا ہے۔"

"اس سے زیادہ ہی ملے گا۔" نادر نے یقین سے کہا۔ "وہ اپنی دولت گھر میں رکھتا ہوگا۔"

"ہاں، سب سے بڑی دولت تو گھر میں ہی ہے۔" شکور نے پھر معنی خیز انداز میں کہا۔ اس کا اشارہ احسن کی بیوی کی طرف تھا۔

نادر سوچ بچار میں لگ گیا۔ بالآخر اس نے ایک پلان تیار کیا اور اپنے ساتھیوں کے سامنے رکھا۔ کچھ بحث کے بعد اس کی نوک پلک درست کی گئی۔ ان تینوں میں شکور تالے کھولنے کا ماہر تھا اس لیے اصل کام اسے کرنا تھا۔ احسن کی کار دفتر کی پارکنگ میں کھڑی ہوتی تھی اور دس بجے کے بعد وہاں بہت لوگ نظر آتے تھے۔ وہاں صرف دفتر والوں کو گاڑیاں پارک کرنے کی اجازت تھی۔ باہر کا کوئی آدمی اپنی گاڑی اندر نہیں لے جا سکتا تھا۔ شکور کوریئر والا بن کر اندر پہنچا۔ بائک اس نے باہر چھوڑ دی جو مہرداد وہاں سے لے گیا۔ اندر پہنچ کر شکور نے اپنی تالا کھولنے کی صلاحیت کا استعمال کیا اور کار کی ڈکی کھول لی۔ اس وقت تین بجے تھے اور احسن ٹھیک پانچ بجے دفتر سے اٹھ جاتا تھا۔ شکور کو اس سے کہیں زیادہ وقت ڈکی میں گزارنا تھا مگر یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ڈکی میں خاصی جگہ تھی۔ وہ آرام سے لیٹ سکتا تھا۔ شکور نے ڈکی بند کر لی۔ اندر سے اس کا لاک آرام سے کھل سکتا تھا۔ اس کا موبائل پر نادر اور مہرداد سے رابطہ تھا۔ وہ باہر موجود تھے۔ اگر کوئی مسئلہ ہوتا اور شکور پکڑا جاتا تو وہ اسے آزاد کرا لیتے۔

احسن ٹھیک پانچ بجے دفتر سے نکلا اور کار لے کر روانہ ہو گیا۔ نادر اور مہرداد الگ الگ بائکس پر اس کے پیچھے تھے۔ وہ راستے میں ایک مارکیٹ میں رکا اور اس نے کچھ خریداری کی۔ اس میں بچوں کے لیے کچھ کھلونے اور کھانے پینے کی اشیا شامل تھیں۔ عیاشی کی زندگی اور آرام و سکون نے اس پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ اس کا رنگ مزید صاف ہو گیا تھا اور صحت پہلے سے بہتر ہو گئی تھی۔ اس کی عمر کم سے کم بیالیس برس تھی مگر وہ اپنی عمر سے دس برس چھوٹا لگتا تھا۔ دفتر سے نکلنے کے ایک گھنٹے بعد وہ اپنے گھر میں تھا۔ احسن نے ہارن دیا تو ایک نوعمر ملازمہ نے دروازہ کھولا۔ وہ گاڑی اندر لے گیا۔ مکان پوری طرح کورڈ تھا۔ یہ ایک منزلہ تھا مگر زینہ اوپر ایک بند کمرے تک جاتا تھا اور اس کا دروازہ بند کر لینے سے کوئی اوپر سے بھی اندر نہیں گھس سکتا تھا۔ ویسے مکان کی ساخت ایسی تھی کہ اوپر جانا بھی آسان کام نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے یہ پلان بنایا تھا۔ شکور نے انہیں ایس ایم ایس کے ذریعے مطلع کیا کہ وہ ٹھیک ہے اور اب تک کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔

نادر اور مہرداد اسی علاقے میں رہے۔ وہ وقفے وقفے سے شکور سے ایس ایم ایس پر رابطہ کر رہے تھے۔ وہ انہیں بتا رہا تھا کہ مکان کے اندر ابھی سرگرمیاں جاری ہیں۔ رات گیارہ بجے تک مکان کے پورچ میں کھلنے والے دروازے بند کر دیے گئے۔ اس کا مطلب تھا کہ مکین اب آرام یا سونے کی تیاری کر رہے ہیں۔ بارہ بجے شکور حرکت میں آیا۔ اس نے ڈکی کھولی اور باہر نکل آیا۔ سب سے پہلے اس نے گیٹ کھولا۔ چھوٹا گیٹ اندر سے بس کنڈی لگا کر بند کیا گیا تھا۔ نادر اور مہرداد باہر موجود تھے، وہ فوراً اندر آ گئے۔ پورچ میں راہداری کا دروازہ تھا، جو لاؤنج تک جاتی تھی اور نشست گاہ کا دروازہ تھا جو پورچ میں کھلتا تھا۔ سیڑھیوں کے نیچے چھوٹا واش روم تھا۔ اس کا دروازہ بیک وقت پورچ اور ساتھ میں چھوٹے بیڈروم میں نکلتا تھا۔ راہداری اور نشست گاہ کے دروازے اندر سے بند تھے لیکن اتفاق سے واش روم کا دروازہ کھلا مل گیا اور وہ اس کی مدد سے اندر آئے۔ درمیان میں بڑا سا لاؤنج اور اس کے ساتھ اوپن کچن تھا۔ نشست گاہ اور چھوٹا بیڈروم تاریک تھا، البتہ لاؤنج میں ایک لائٹ جل رہی تھی۔ آخر میں دو بیڈروم برابر برابر تھے۔ احسن کے بیڈروم کا دروازہ اندر سے بند تھا اور اندر سے آتی دبی دبی آوازیں بتا رہی تھیں کہ دونوں میاں بیوی بیدار اور

مصروف ہیں۔

دوسرا کمرا بچوں کا تھا۔ بچی بستر پر تھی اور بچہ پالنے میں تھا۔ نوعمر ملازمہ فرش پر بچھے بستر پر بے خبر سو رہی تھی۔ نادر نے بچی کو اٹھایا اور احسن کے بیڈروم کے دروازے پر دستک دی۔ وہ سب مسلح اور ہوشیار تھے۔ قدرتی طور پر وہ سمجھے کہ بچی ہے اور احسن کی بیوی نے دروازہ کھول دیا۔ نادر نے بچی کے سر پر پستول رکھا ہوا تھا اس لیے عورت کی چیخ حلق میں گھٹ گئی۔ پھر وہ تینوں اندر گھس گئے۔ احسن بپھر کر اٹھا لیکن پھر بیٹی کو گن پوائنٹ پر دیکھ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ مہرداد اور شکور نے آرام سے اسے قابو کر کے سامنے کھڑکی کی گرل کے ساتھ رسی سے باندھ دیا۔ اس کا منہ ٹیپ سے بند کر دیا گیا۔ اس کی بیوی نائٹی میں تھی اور خود کو ان لوگوں سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ انہوں نے احسن کی بیوی کو بھی باندھ دیا اور اس کا منہ بھی ٹیپ سے بند کر دیا۔ آنے والے کچھ گھنٹے احسن اور اس کی بیوی پر بہت بھاری گزرے۔ پہلے ان تینوں نے مکمل تلاشی لے کر رقم اور زیور برآمد کیا۔ پھر انہوں نے ایک طرف دیوار میں لگی چھوٹی سی تجوری تلاش کر لی۔ یہ نمبرز سے کھلتی تھی۔ احسن نے بڑی مشکل سے اس کا نمبر بتایا۔

یہاں احسن کے سامنے مکافاتِ عمل آیا تھا۔ کبھی اس نے کسی کو مجبور کرنے کے لیے اس کی عزت کو بے لباس کیا تھا۔ آج اس کے سابق ساتھیوں نے اس کی زبان کھلوانے کے لیے اس کی عزت کو بے لباس کر دیا تھا۔ تجوری میں ڈالرز اور یورو کی صورت میں بہت بڑی رقم تھی۔ اس کے علاوہ کچھ جڑاؤ زیوارت تھے جو یقیناً بہت قیمتی تھے۔ اس کے بعد بھی انہوں نے احسن پر تشدد کیا کہ اگر اس نے کچھ اور چھپایا ہو تو وہ بھی بتا دے مگر اس کے پاس اب کچھ نہیں تھا۔ وہ اسے چاقوؤں سے گودتے رہے۔ اس کا ایک کان اور نچلا ہونٹ بھی کاٹ دیا تھا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ اب اس کے پاس دینے کے لیے اور کچھ نہیں ہے تو وہ شیطان بن گئے اور احسن کے سامنے اس کی بیوی پر ٹوٹ پڑے۔ مگر انہیں زیادہ موقع نہیں ملا۔ کچھ دیر بعد انہیں احساس ہوا کہ عورت سانس نہیں لے رہی تھی۔ احساسِ ذلت نے اس کا دل بند کر دیا تھا اور وہ خاموشی سے مر گئی تھی۔ نادر بدمزہ ہوا۔ احسن بے ہوش ہو گیا تھا۔

وہ صبح کے قریب اس کے گھر سے نکلے۔ اس وقت احسن بھی قریب المرگ تھا۔ اس کا بہت زیادہ خون بہہ گیا تھا۔ وہ تینوں خوش تھے۔ انہوں نے نہ صرف اپنا انتقام لے لیا تھا بلکہ بہت بڑی دولت بھی حاصل کر لی تھی۔ یہ اتنی دولت تھی کہ ان کی زندگی سنور سکتی تھی مگر وہ حرام، زندگی سنوارنے کے لیے نہیں بلکہ عیاشی کے لیے کماتے تھے۔ انہوں نے رقم اور زیورات آپس میں تقسیم کر لیے۔ اس وقت نادر نے فیصلہ کیا کہ وہ اب ان سے کچھ عرصے الگ رہے گا۔ اسے ڈر تھا کہ اب پولیس زیادہ شدومد سے انہیں تلاش کرے گی کیونکہ کیس میڈیا پر آ گیا تھا اور پولیس پر بہت دباؤ تھا۔ اسے اصل خطرہ شکور اور مہرداد سے تھا۔ وہ اتنے محتاط نہیں تھے۔ وہ پکڑے جاتے تو اس کا نام بھی بک دیتے۔

نادر کی چھٹی حس نے اسے درست خبردار کیا تھا مگر خطرہ پولیس کی طرف سے نہیں تھا۔ احسن بچ گیا تھا۔ خون بہہ جانے کے بعد بھی اور اسپتال میں دو مہینے تک داخل رہنے کے بعد وہ زندگی کی بازی جیت گیا۔ شاید انتقام کی آرزو نے اسے زندہ رکھا تھا اور اس نے اسپتال سے نکلتے ہی ان تینوں کی تلاش شروع کر دی۔ شکور اور مہرداد سامنے تھے۔ انہوں نے چھپنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ لگ گئے اور یکے بعد دیگرے ان کی لاشیں مختلف جگہوں پر ملیں۔ نادر نے اخبارات میں ان کی جو تصاویر دیکھی تھیں، اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ روپوش تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ احسن پولیس کی بہ نسبت اسے زیادہ بہتر تلاش کر سکتا ہے کیونکہ وہ اسے جانتا ہے۔ اس نے شکور اور مہرداد سے بھی خود انتقام لیا تھا۔ وہ کرائے کی ایک چھوٹی سی کھولی میں چھپا ہوا تھا اور اس نے اپنے حصے میں آنے والی دولت اسی کھولی کی کچی زمین میں دفن کر رکھی تھی۔

وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس شہر بلکہ اس ملک میں بھی وہ محفوظ نہیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ یہاں سے نکل جائے گا۔ اس نے پاسپورٹ کے لیے درخواست دی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے اس نے جعلی نام سے شناختی کارڈ بھی بنوا لیا تھا۔ پاسپورٹ اس کے ہاتھ آتا تو وہ یہاں سے نکل جاتا۔ مگر انہی دنوں پاسپورٹ کے معاملے میں تاخیر ہو رہی تھی۔ اس لیے ارجنٹ درخواست کے باوجود اس کا پاسپورٹ نہیں آ رہا تھا۔ پھر ایک صبح وہ باہر نکلا تو اسے لگا کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ جلد اس نے دیکھ لیا کہ وہ احسن تھا جو بھیس بدل کر اس کے پیچھے تھا۔ وہ ہراساں ہو کر بھاگا اور پھر ایک جگہ جان چھڑا کر ایک بنگلے میں داخل ہوا تھا کہ اندر موجود ملازموں نے اسے پکڑ لیا۔ اس پر چور ہونے کا الزام لگایا۔ اتفاق سے اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا، وہ خاموشی سے پٹتا

رہا پھر بنگلے کے مالک نے پولیس بلا لی اور اس نے چور ہونے کا اعتراف کرلیا۔ اس نے سوچا کہ وہ جیل میں احسن سے محفوظ رہے گا اس لیے اس نے اپنا نام غلط بتایا۔ اس نے کہا کہ اس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ اس کا حلیہ بھی غریبانہ سا تھا۔ اس پر مقدمہ چلا اور اسے سزا ہوگئی۔ اب وہ جیل میں احسن سے محفوظ تھا۔ اسے امید تھی کہ احسن اس کے غائب ہونے کے بعد ٹھنڈا بیٹھ جائے گا۔ رہائی کے بعد وہ کوٹھری سے اپنی رقم لے گا۔ اس کا پاسپورٹ بھی بن کر آ گیا ہوگا اور وہ ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلا جائے گا۔

☆☆☆

سلمان مسکین اور کسی قدر غمگین سا نوجوان تھا۔ وہ خاموشی سے سب کی خدمت کرتا اور جب فارغ ہوتا تو ایک طرف چپ چاپ بیٹھ جاتا۔ خود سے کسی سے بات نہیں کرتا تھا، ہاں کوئی بات کرتا تو اس کا جواب دیتا۔ نادر اس سے انسیت محسوس کرنے لگا تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی۔ کبھی کبھی اس کا دل کرتا کہ اسے اپنی اصلیت بتادے۔ اسے بتائے کہ وہ ایسا نہیں ہے جیسا یہاں بن کر رہتا ہے۔ اگر وہ اپنی اصلیت پر آجائے تو یہ قاتل اور ڈاکو اس کے پیر چاٹیں۔ ابھی جو اسے گالیاں دیتے ہیں، ان کی زبان سے آواز نہیں نکلے گی۔ پھر اسے اپنی سوچ پر ہنسی آتی۔ ٹھیک ہے اس کے ساتھی جانتے تھے کہ وہ کس قدر سفاک آدمی ہے۔ وہ اس سے ڈرتے تھے لیکن ضروری نہیں تھا کہ دوسرے بھی اس سے ڈرتے۔ وہ خود کو سمجھاتا کہ وہ یہاں چھپنے آیا ہے، اپنے بارے میں اعلان کرنے نہیں آیا ہے۔

اس کی رہائی کا وقت قریب آرہا تھا۔ سلمان اس سے چند دن پہلے رہا ہو جاتا۔ ایک دن وہ بیرک کی صفائی کر رہے تھے۔ باقی تین یہاں نہیں تھے۔ وہ باہر کھلی دھوپ کے مزے لوٹ رہے تھے اور صفائی کا کام ان کے سپرد کر گئے تھے۔ بیرک کی ہر ہفتے صفائی ہوتی تھی۔ سلمان دیواروں سے جالے صاف کر رہا تھا۔ کھلی جگہ ہونے کی وجہ سے مٹی بہت آتی تھی۔ جالے بنتے اور پھر پھیلتے جاتے تھے۔ نادر جھاڑو لگا رہا تھا۔ پھر اسمیٹ کر وہ دونوں تھک کر بیٹھ گئے۔ وہ صبح سے مصروف تھے۔ نادر نے کہا۔ ”بس کچھ دن رہ گئے ہیں رہائی میں۔“

”آپ بھی چلے جاؤ گے۔“ سلمان نے کہا۔

”تم کہاں جاؤ گے؟“

”پتا نہیں۔“ سلمان نے دکھی انداز میں کہا۔

نادر کو پہلی بار خیال آیا کہ اس نے کبھی سلمان سے اس کے بارے میں نہیں پوچھا۔ اس نے خود بھی نہیں بتایا۔

”تمہارا دنیا میں کوئی تو ہوگا؟“

”جب یہاں آیا تو ماں اور بہن تھی۔“

نادر نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تھی..... اور اب؟“

سلمان نے گہری سانس لی۔ ”اب نہیں ہیں۔“

”اوہ۔“ نادر نے افسوس کیا۔ ”چل یار جو اللہ کی مرضی۔“

”ہاں، اس کی مرضی ہے..... میں یہاں بیٹھا ہوں۔“ سلمان بولا پھر اس نے نادر کی طرف دیکھا۔

”آپ نے کبھی اپنے بارے میں نہیں بتایا۔“

نادر نے پُرخیال انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

سلمان نے ہچکچا کر کہا۔ ”سچ بتاؤں؟“

”ہاں، سچ سچ بتاؤ کہ تم میرے بارے میں کیا سوچتے ہو؟“

”مجھے لگتا ہے آپ وہ نہیں جو خود کو ظاہر کرتے ہو۔“ سلمان نے کہا۔ ”آپ اصل میں کچھ اور ہو۔“

نادر حیران ہوا۔ سلمان نے اس کے بارے میں بالکل ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔ وہ فکرمند ہو گیا جب سلمان جیسا سیدھا آدمی سمجھ سکتا تھا تو دوسرے تو بہت ہوشیار اور چھٹے ہوئے لوگ تھے۔ اس نے سلمان سے پوچھا۔ ”تم نے کسی اور سے یہ بات تو نہیں کی ہے؟“

”نہیں، میں نے کبھی کسی سے آپ کے بارے میں بات نہیں کی۔“ سلمان نے سادگی سے کہا۔ ”میں تو سوائے آپ کے اور کسی سے بات نہیں کرتا۔“

”تم نے کبھی ان لوگوں کی باتیں سنی ہیں جو وہ میرے بارے میں کر رہے ہوں۔“ نادر نے باقی تین کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے سر ہلایا۔

”کئی بار.....“

”کیا کہتے ہیں؟“

”وہ سمجھتے ہیں آپ بہت ڈرپوک آدمی ہو..... جب آپ ان کی ہر بات مانتے ہو تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔“

نادر نے سکون کا سانس لیا۔ ”پر تم ایسا نہیں سمجھتے؟“

”نہیں۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔ ”مجھے لگتا ہے آپ اندر سے بالکل مختلف ہو۔“

”میں ایسا ہی ہوں۔“ نادر نے پہلی بار اقرار کیا۔

”تبھی آپ اپنے بارے میں نہیں بتاتے؟“

”تمہیں بتاؤں گا جانے سے پہلے۔“ نادر نے کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ ملک سے باہر نہ جانے والا ہوتا تو اس لڑکے کو ساتھ رکھ لیتا۔ وہ جرم نہیں کر سکتا تھا، اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ اسے گھر میں ملازم رکھ سکتا تھا۔ اسے تنخواہ دیتا اور اسے ٹھکانا بھی مل جاتا۔ مگر وہ اسے باہر نہیں لے جا سکتا تھا۔ نادر کو جیل آئے ہوئے پانچ مہینے پورے ہو گئے تھے۔ رمضان میں قیدیوں کی سزا معاف ہو جاتی تھی اور اسے بھی ایک مہینے کی معافی مل گئی تھی۔ ایک مہینے بعد وہ آزاد ہو جاتا۔ جب وہ جیل آیا تو اس نے سوچا تھا کہ رہا ہونے کے بعد وہ احسن سے شکور اور مہرداد کا بدلہ لے گا مگر اب اس کا خیال بدل گیا تھا۔ اسے احسن سے خوف آرہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بس یہاں سے نکل جائے گا۔ پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔ احسن ملک سے باہر اسے تلاش کرنے نہیں آسکتا تھا۔ اس کے پاس اتنی رقم ضرور تھی کہ وہ باہر آرام سے رک سکتا تھا اور کوئی کاروبار بھی کر سکتا تھا۔ اسے احسن سے الجھنے کے بجائے یہاں سے نکلنے کی ضرورت تھی۔

سردی شدید ہو گئی تھی۔ رات سوتے وقت سب کمبل اوڑھتے تھے اور اس کے باوجود بعض اوقات سردی شدت اختیار کر جاتی تو وہ ٹھٹھرتے رہتے۔ رات کا وقت تھا، نادر کمبل میں لیٹا ہوا تھا اور سلمان ڈاکو کے پاؤں دبا رہا تھا۔ باقی دو خراٹے لے رہے تھے۔ انہیں شراب کا ایک پوّا مل گیا تھا۔ اس ڈاکو کو اس میں سے حصہ نہیں ملا تھا اس لیے وہ جاگ رہا تھا اور سلمان سے پاؤں دبوا رہا تھا۔ ویسے بھی اس کی رہائی میں دو دن باقی رہ گئے تھے، پرسوں صبح اسے رہا کر دیا جاتا۔ اس لیے ڈاکو چاہتا تھا کہ اس سے زیادہ سے زیادہ خدمت کرا لے۔ نادر کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اسے ہلکا سا بخار تھا اور سر میں درد ہو رہا تھا۔ سلمان ڈاکو کی ٹانگیں دبا کر اس کے پاس آیا۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بخار چیک کیا پھر بولا۔ ”میں آپ کے لیے چائے بناتا ہوں۔“

”نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“

”نہیں، میں چائے کے ساتھ دوا دیتا ہوں۔“ سلمان نے اپنائیت سے کہا۔

وہ کچھ دیر میں اس کے لیے چائے بنا لایا۔ پیراسیٹامول کی گولی کے ساتھ اسے چائے دی تو نادر کو عجیب سا لگا۔ بہت عرصے بعد کسی نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا تھا۔ وہ ذرا اوپر ہو کر بیٹھ گیا۔ اب ڈاکو بھی خراٹے لینے والوں میں شامل ہو گیا تھا۔ بخار اور موسم کی وجہ سے

اسے چائے پینے میں مزہ آرہا تھا۔ سلمان اس کے پاس بیٹھا تھا۔ نادر نے اس سے کہا۔ ”تم پرسوں چلے جاؤ گے؟“

”ہاں۔“

”میں تمہارے بعد رہا ہوں گا۔ پر میں یہاں نہیں رہوں گا، اس ملک سے چلا جاؤں گا۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ جس دشمن سے بچنے کے لیے جیل آیا تھا، وہ میری تاک میں ہوگا۔ اس سے بچنے کے لیے مجھے باہر جانا ہوگا۔ یہاں رہا تو وہ کبھی نہ کبھی مجھے تلاش کر کے مار دے گا۔“

سلمان نے حیرت سے کہا۔ ”وہ اتنا خطرناک ہے؟“

”ہاں کیونکہ وہ میرا استاد ہے۔ اسی نے مجھے سب سکھایا تھا۔“ نادر نے کہا اور پھر بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ وہ سلمان کو اپنی زندگی کی کہانی سنانے لگا۔ کیسے وہ جرائم کی دنیا میں آیا۔ پھر چالاک جمال یا احسن اسے اور اس کے ساتھیوں کو استعمال کرتا رہا۔ آخر میں وہ انہیں چھوڑ کر غائب ہوگیا اور وہ خود وارداتیں کرنے لگے۔ سلمان حیرت اور خوف سے سن رہا تھا۔ اگرچہ اس نے پہلے ہی نادر سے کہہ دیا تھا کہ وہ جو ہے، اسے چھپاتا ہے لیکن اس نے بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس قدر سفاک اور خطرناک شخص ہوگا۔ پھر نادر کہانی کے اس حصے تک پہنچا جب اس نے جمال کو دیکھ لیا۔ اس کا اصل نام احسن تھا۔

”آپ نے اس کے ساتھ کیا کیا؟“

نادر نے پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، ہم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہوگا؟“

”بہت برا.... اسے مارا ہوگا۔“

”نہیں، اس سے بھی بُرا کیا۔“

”اس سے بُرا کیا ہو سکتا ہے؟“ سلمان نے سادگی سے کہا۔

نادر نہ جانے کس کیفیت میں تھا، اس نے سلمان کو سب بتا دیا کہ انہوں نے احسن، اس کی بیوی اور اس کے گھر میں کیا کیا تھا۔ حد یہ کہ انہوں نے ان کی ملازمہ کو بھی نہیں بخشا تھا۔ جب احسن کی بیوی مر گئی تو وہ اپنی حیوانیت اس پر اتارنے لگے۔ وہ رات بھر وقفے وقفے سے احسن پر تشدد کرتے رہے۔ وہ چاہتے تو ایک گولی یا چاقو کے ایک وار سے اسے موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اذیت سے مرے۔ ان کی یہی خواہش احسن کی زندگی اور شکور اور مہرداد کی موت کی وجہ بن گئی۔ بہت زیادہ خون بہنے کے باوجود وہ بچ گیا اور پھر موت بن کر ان کا پیچھا کرنے لگا۔ سلمان دم بہ خود سا سن رہا تھا۔ اس بار وہ سچ میں نادر سے خوفزدہ ہوگیا اور ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اتنے سفاک انسان ہو۔“

”جو مجھے نہیں جانتے، وہ یہی سمجھتے ہیں۔“ نادر فخر سے ہنسا۔ ”پر جو جانتے ہیں، وہ مجھ سے ڈرتے ہیں۔“

”مجھے بھی آپ سے ڈر لگ رہا ہے۔“ سلمان نے کہا۔ ”پر وہ شخص کیسا ہوگا جس سے آپ بھی ڈر رہے ہیں۔“

”وہ بہت خطرناک ہے۔“ نادر نے فکرمندی سے کہا۔ ”مجھے اب بھی اطمینان نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ میرے بارے میں جان گیا ہو اور جیل سے باہر میرا منتظر ہو۔“

سلمان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے کمبل میں دبک گیا تھا۔ کچھ دیر بعد نادر بھی سو گیا۔ صبح اٹھا تو اس کی طبیعت اتنی خراب تھی کہ اس سے اٹھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اس روز وہ کام پر بھی نہیں گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر اسے چھٹی دے دی گئی۔ سلمان کام پر چلا گیا۔ دوپہر کے وقت نادر کچھ دیر کے لیے باہر نکلا مگر اس سے زیادہ دیر باہر نہیں رہا گیا۔ اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ واپس جا کر لیٹ گیا۔ اس سے کھانا بھی نہیں کھایا جا رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسی طرح اس کی طبیعت خراب رہی اور وہ رہا کر دیا گیا تو وہ سب کیسے کرے گا جو اس نے سوچا ہوا تھا۔ شام کے وقت اس کی طبیعت کسی قدر بہتر ہوئی مگر رات ہوتے ہی پھر بخار اور جسم میں درد شروع ہوگیا۔ سلمان کہیں سے اس کے لیے دوا لے آیا تھا، دوا کھا کر نادر سو گیا۔ قاتل قیدیوں کو آج بھی بوتل ملی تھی۔ اس بار انہوں نے ڈاکو کو بھی اس میں شامل کر لیا۔ وہ سلمان کو بھی پلانے کے موڈ میں تھے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ بارہ بجے تک انہوں نے بوتل ختم کر دی اور دو بجے تک وہ نشے کی حالت میں اول فول بکتے ہوئے سو گئے۔ ان کے سوتے ہی سلمان حرکت میں آگیا۔

نادر گہری نیند میں تھا پھر اسے لگا اس کا دم گھٹ رہا ہے اور کوئی اسے تھپڑ مار رہا ہے۔ بڑی مشکل سے اس کی آنکھ کھلی۔ تب اسے سلمان نظر آیا جو رہ رہ کر اس کے منہ پر تھپڑ مار رہا تھا اور دبی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”اٹھ.... کتے.... اٹھتا کیوں نہیں ہے؟“

نادر کو لگا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ سلمان میں بھلا اتنی جرأت کہ وہ اسے تھپڑ مارے اور اسے یوں مخاطب کرے۔ مگر پھر وہ پوری طرح بیدار ہوگیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ کمبل تلے اس کا جسم بندھا ہوا ہے۔ پھر اس نے بولنا چاہا تو اپنا منہ بھی بند پایا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور زکام کی وجہ سے ناک تقریباً بند ہونے کی وجہ سے وہ سانس بھی مشکل سے لے پا رہا تھا اور اسی وجہ سے اسے اپنا دم گھٹتا ہوا لگ رہا تھا۔ سلمان کے تاثرات بالکل بدلے ہوئے تھے۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی سادہ اور ڈرپوک سا لڑکا ہے جو کسی کی آنکھوں میں دیکھ کر بات بھی نہیں کر سکتا۔ اس کے چہرے پر وحشت اور آنکھوں میں سرخی تھی۔ اسے بیدار ہوتا دیکھ کر اس نے ہاتھ روک لیا۔ اسی لمحے باہر گشت کرنے والا جیل گارڈ آیا تو سلمان نے پھرتی سے کمبل اس کے منہ تک اوڑھا دیا اور خود بھی اس کے پاس لیٹ گیا۔ گارڈ کے جوتوں کی آواز بیرک کے سامنے تک آئی اور پھر آگے چلی گئی۔ گارڈ کے جاتے ہی سلمان نے اپنے اور اس کے سر سے کمبل ہٹایا اور آہستہ سے بولا۔

”تم ہوش میں ہو؟“

نادر نے سر ہلایا اور ناک سے آواز نکالنے کی کوشش کی۔ جیسے پوچھنا چاہ رہا ہو کہ وہ اس کے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ سلمان نے جواب دیا۔ ”بتاتا ہوں.... بتاتا ہوں....“ وہ اٹھ کر بیرک کے دروازے تک گیا اور دائیں بائیں دیکھ کر واپس آیا۔ بیرک کے سامنے بلب روشن تھا اور اس کی روشنی اندر تک آرہی تھی۔ سلمان واپس آکر اپنی جگہ لیٹ گیا۔ اس نے پتا نہیں کہاں سے یہ ڈوری لی تھی جس سے نادر کو باندھا ہوا تھا۔ اس کے منہ میں رومال ٹھنسا ہوا تھا اور اوپر دوسرا رومال بندھا تھا۔ سلمان نے اس پر کمبل ٹھیک کیا اور بولا۔ ”تمہیں بتایا نا تھا کہ میں بے گناہ پکڑا گیا تھا.... فساد تو دور کی بات ہے، میں کسی سے نظر اٹھا کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی ماں کا ایک ہی بیٹا اور بہن کا ایک ہی بھائی تھا۔ میرا باپ بچپن میں گزر گیا۔ میری ماں نے مجھے گھروں میں کام کر کے پالا مگر اس نے مجھے گھر سے نکلنے نہیں دیا۔ میں نے دنیا کا سامنا نہیں کیا۔ پڑھنے میں بہت تیز تھا۔ میں نے میٹرک میں پورے اسکول میں ٹاپ کیا تھا مگر جب مجھے شیلڈ دینے کے لیے اسٹیج پر بلایا گیا تو میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور مجھ سے نظریں نہیں اٹھائی جا رہی تھیں۔ اسکول میں میرا کوئی دوست نہیں تھا۔ میں کسی سے گھلنے ملنے والا لڑکا نہیں تھا۔ میں سوائے تعلیم کے ہر شعبے میں پیچھے تھا۔ یہی حال محلے میں تھا۔ وہاں میں کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ بات تو تب کرتا جب میں گھر سے باہر نکلتا۔ میں اسکول سے گھر آتا اور پھر ضرورت کے لیے ہی گھر سے نکلتا تھا۔“

سلمان دھیمی آواز میں لیکن تیز تیز بول رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے اندر کی گھٹن نکال رہا ہو اور نادر کو سنانا اس کا مقصد نہ ہو جو پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سلمان نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم سوچ سکتے ہو میں کس قسم کا لڑکا تھا۔ ہم بہت غریب تھے۔ ایک کمرے کے کوٹھری نما مکان میں رہتے تھے جس کا فرش بھی کچا تھا۔ ماں کماتی تھی اور ہم تین کھاتے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں اب کالج میں پڑھنے کے بجائے ماں کا ہاتھ بٹاؤں گا۔ میں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ یہاں بھی کم گوئی اور جھجک آڑے آئی۔ میں کسی سے بولتے ہوئے شرماتا تھا کہ وہ مجھے ملازمت دے دے۔ پھر قدرت نے مدد کی، ماں جس گھر میں کام کرتی تھی، اس کے مالک نے مجھے اپنی دکان پر رکھ لیا۔“

گارڈ کے قدموں کی آہٹ آئی تو سلمان چپ ہو کر جلدی سے کمبل میں ہوگیا۔ اس وقت نادر کو ہوش آیا اور اس نے آتے ہوئے گارڈ کو متوجہ کرنے کے لیے جسم ہلانا اور کلبلانا شروع کیا تھا کہ ایک نکیلی چیز اس کی گردن سے لگ گئی اور سلمان کی سرگوشی سنائی دی۔ ”یہ چھری ہے، ساکت ہو جاؤ ورنہ گردن میں اتر جائے گی۔“

نادر یک دم ساکت ہوگیا۔ پہلی بار اسے اندازہ ہوا کہ دوسروں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دینے والے شخص کو زندگی سے کتنا پیار ہے کیونکہ اب اس کی جان پر بن آئی تھی۔ گارڈ چلا گیا تو سلمان نے اپنے اور اس کے منہ سے کمبل ہٹایا۔ نادر نے اس کے پاس چھوٹی سے چھری دیکھی۔ یہ باورچی خانے میں استعمال ہونے والی عام سی چھری تھی لیکن اس میں کسی انسان کو موت کے گھاٹ اتارنے کی پوری صلاحیت تھی۔ سلمان نے چھری دھار والی طرف سے اس کے منہ پر پھیری مگر اس طرح کہ اس کی کھال نہ کٹے اور وہ اس کی دھار محسوس کر لے۔ سلمان نے آگے کہنا شروع کیا۔ ”میں اس کے پاس کام کرتا تھا۔ صبح دس بجے جاتا اور رات بارہ بجے واپسی ہوتی تھی۔ چودہ گھنٹے کی اس نوکری کے بدلے مجھے چھ ہزار روپے ملتے تھے۔ اس میں سے بھی ہزار روپے دوپہر کے کھانے کے کٹ جاتے تھے۔ مجھے پانچ ہزار روپے ملتے تھے مگر میں اس میں بھی خوش تھا کہ میں اب ماں سے لے نہیں رہا ہوں، اسے کچھ دے رہا ہوں۔ پھر اس روز دکان پر گیا تو حالات خراب ہونے کی وجہ سے مارکیٹ بند

تھی۔ میں واپس آرہا تھا کہ کالج کے سامنے سے گزرتے ہوئے پولیس نے گرفتار کرلیا۔ مجھے پر فساد اور ہنگامہ آرائی کا الزام لگا۔ جو اصل قصور وار تھے، وہ تھانے سے چھوٹ کر چلے گئے اور مجھے عدالت میں پیش کردیا گیا جہاں میری ماں نے پتا نہیں کہاں سے پیسے کرکے ایک سستا وکیل کیا اور اس سستے وکیل کی مہربانی سے میں ایک سال کے لیے جیل آگیا۔ ساری جمع پونجی اس مقدمے کی نذر ہوگئی۔ قرض ادھار کی نوبت آئی اور اسے اتارنے کے لیے ماں نے پہلی بار میری بہن کو کام کرنے کے لیے کہیں بھیجا۔"

سلمان چپ ہوگیا۔ وہ یوں گہرے سانس لے رہا تھا جیسے خود پر قابو پانے کی کوشش کررہا ہو۔ پھر وہ بولنے لگا۔ "میری بہن بہت معصوم تھی، صرف سولہ سال کی۔ اس نے دنیا نہیں دیکھی تھی۔ ماں نے ہمیں باہر جانے ہی نہیں دیا۔ اسکول بھی اس نے پانچویں تک پڑھا تھا۔ محسنہ نے زندگی میں پہلی بار کہیں کام کیا تھا۔ بیگم صاحبہ کی شرط تھی کہ وہ ان کے پاس رہے گی۔ ان کے دو بچے تھے اور انہوں نے ان کے لیے محسنہ کو رکھا تھا۔ وہ وہیں رہتی تھی۔ اگر قرض کا چکر نہ ہوتا تو ماں کبھی اس سے کام نہ کراتی اور کبھی اسے کسی کے ہاں نہ چھوڑتی۔ لیکن انسان کو مجبوریاں ہی مارتی ہیں۔ وہ بھی مجبور تھی۔ روز قرض خواہوں کو اپنے دروازے پر نہیں دیکھ سکتی تھی۔"

نادر کی آنکھیں پھیل رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بات سمجھ رہا ہے مگر سلمان اس کے تاثرات پر توجہ دیے بغیر بولتا رہا۔ "جب میں گرفتار ہوا اور مجھے بے گناہ ایک سال کی سزا ہوئی تو میرے اندر بغاوت سی آگئی۔ جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں تھا تو سزا کس بات کی؟ مجھے اوپر والے سے شکوے شکایتیں ہونے لگیں۔ میں انسانوں سے نہیں بول سکتا لیکن اس سے تو بول سکتا تھا۔ میں ہر رات اس سے پوچھتا کہ مجھے بے گناہ یہاں کیوں بھیجا اور پھر میری بہن کی خبر آئی۔ اس نے خودکشی کرلی تھی۔ پھر ماں اس کے صدمے سے مرگئی تو میں تڑپ کر رہ گیا۔ میں یہاں بے بس اور قید تھا۔ ان کو قبرستان تک بھی نہیں پہنچا سکتا تھا۔ میرے شکوے اب گستاخی کی حد تک جا پہنچے تھے۔ میں اس سے لڑنے لگا تھا کہ سب میرے ساتھ کیوں؟ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟ لیکن اب مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں جان گیا ہوں کہ اس نے مجھے یہاں کیوں بھیجا ہے۔ نادر! تجھے وہ معصوم لڑکی یاد ہے جسے تو نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ بے آبرو کیا تھا؟"

نادر کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ سب سمجھ گیا تھا اور اب اس کے چہرے پر صحیح معنوں میں دہشت تھی۔ اس نے سر ہلایا۔ سلمان نے سرگوشی میں کہا۔ "وہ میری بہن تھی۔"

☆☆☆

صبح بیرک کا دروازہ کھلا اور گارڈ نے کرخت لہجے میں سلمان سے کہا۔ "چل، تیری رہائی کا آرڈر آگیا ہے۔"

باقی چار پڑے تھے اور لگ رہا تھا بے خبر سو رہے ہیں۔ گارڈ سلمان کو لے گیا اور آدھے گھنٹے بعد وہ جیل سے رہا ہوگیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد بیرک میں موجود افراد جاگنے لگے۔ ڈاکو اٹھا اور پھر ایک قاتل اٹھا۔ جب اس نے اپنا کمبل ہٹایا تو اچھل پڑا۔ اس کا لباس خون خون ہو رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک خون آلود چھری تھی۔ اسی لمحے گارڈ وہاں آگیا۔ اس نے اندر کا منظر دیکھا تو سیٹی بجائی اور ذرا سی دیر میں نصف درجن گارڈ بیرک کے اندر تھے۔ دوسرا قاتل بھی اٹھ گیا تھا مگر نادر لیٹا رہا اور جب اس کا کمبل ہٹایا گیا تو نیچے سے اس کی زخموں سے چور لاش نکلی۔ اس کے بے لباس جسم کا شاید ہی کوئی حصہ ایسا تھا جس پر زخم نہ ہوں۔ کیس واضح تھا۔ مقتول کے ساتھ قاتل بھی رنگے ہاتھوں موجود تھا اور آلۂ قتل بھی دستیاب تھا اس لیے کسی نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا کہ یہ قتل اس نے نہیں کیا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ کام سلمان کا ہے لیکن یہ زیادہ ناقابلِ یقین بات تھی۔ سب جانتے تھے کہ سلمان چیونٹی بھی نہیں مار سکتا تھا۔ انسان کا قتل اور وہ بھی اتنی سفاکی سے اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

☆☆☆

سلمان نے اخبار میں مکمل خبر دیکھی اور مسکرا دیا۔ وہ پکڑے جانے کے خوف سے گھر نہیں گیا تھا مگر اب وہ آزاد تھا۔ وہ گھر جا سکتا تھا۔ اس کا گھر خالی پڑا تھا۔ سلمان کو پتا چلا کہ ایک محلے والے نے اسے کسی کو کرائے پر دے دیا تھا مگر وہ بھی غائب ہوگیا اور تب سے یہ خالی پڑا تھا۔ جو سامان تھا، وہ چور اچکے لے گئے تھے، اب سوائے در و دیوار کے وہاں کچھ نہیں تھا۔ سلمان گھر میں آیا۔ اس نے خالی مکان کو دیکھا اور پھر واحد کمرے میں آیا تو چونک گیا۔ وہ برسوں یہاں رہا تھا۔ اس نے پہلی نظر میں محسوس کرلیا کہ کسی نے کونے میں کچی زمین کھودی تھی۔۔۔ لیکن کیوں؟ اس نے سوچا اور پھر فیصلہ کیا کہ وہ اس جگہ کو کھود کر دیکھے گا۔ اگلے دن اس نے کوٹھری کا فرش کھودا تو دو فٹ بعد پھاؤڑا کسی چیز سے ٹکرایا۔ یہ ایک بکس تھا۔ سلمان نے اسے کھولا تو اس کے اندر رقم اور جڑاؤ زیورات موجود تھے۔

مسافر

سمن با حلیم

روشن خیالی اپنے وسیع تر مفہوم میں دراصل سوچ کی ترقی ہے... اس کا مقصد بنی نوع انسان کو خوف و دہشت اور غلامی سے آزادی دلانا ہے... اپنی ہر زیادتیوں... اور غلطیوں کو جائز قرار دے کر نفسانی جبلتوں اور وحشتوں کے اسیر سوداگروں کا گھناؤنا کھیل... انہیں معلوم نہیں تھا کہ وقت کی رفتار جب بدلتی ہے تو ہر شے میں تغیر بپا ہو جاتا ہے...

ایک باپ اور بیٹی کے درمیان جاری حیات و موت کی رسا کشی...

"تم پاگل ہوگئے ہو تنویر۔" ملک فیاض نے غصے سے کہا۔ "تم جیسے لوگوں کو یہ زندگی راس نہیں آئے گی۔"

"ملک صاحب! اب اس کی پروا ہی کس کو ہے۔" تنویر نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر بلا کا سکون اور بے خوفی تھی۔ "میں نے اپنے مالک سے ناتا جوڑ لیا ہے۔ اب میں اسی کے راستے پر چلنے کی کوشش کررہا ہوں۔"

"مولوی بننے کی کوشش کررہے ہو؟"

"نہیں ملک صاحب! صرف انسان بننے کی جدوجہد

کر رہا ہوں۔ مولوی ہونا تو بہت بڑی بات ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے تمہاری یہ کروٹ ہمارے لیے کتنے نقصان کی بات ہے؟"

"جانتا ہوں ملک صاحب! آپ کو ایک لاکھ ہفتے کا گھاٹا ہو جائے گا۔ میں تو مشورہ دوں گا کہ آپ بھی اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی کوشش کریں۔ یہ زندگی کتنے دنوں کی ہے ملک صاحب! کچھ دنوں کے بعد تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔"

"کس نے چابی دے دی ہے تمہیں؟"

"میں نے اپنے اندر کی آواز سن لی ہے ملک صاحب۔" تنویر نے کہا۔ "اور میرا خدا گواہ ہے کہ میں بہت مطمئن ہوں۔"

ملک فیاض گہری نگاہوں سے سامنے بیٹھے ہوئے تنویر کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

تنویر ایک کسرتی بدن کا خوب صورت شخص تھا۔ اس کی عمر تیس بتیس سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس کی شہرت اور ہیبت نے اسے جرائم کی دنیا کا ایک افسانوی کردار بنا دیا تھا۔

لوگ اس سے خوف زدہ رہا کرتے۔ وہ اکیلا واردات کرنے کا عادی تھا۔ ڈاکے سے لے کر اغوا برائے تاوان تک۔ اس نے لاکھوں کمائے تھے اور اسی طرح پیسے لٹاتا بھی رہا تھا۔

وہ ہر ہفتے ملک فیاض کو ایک لاکھ روپے پہنچا دیا کرتا۔ ملک فیاض اس علاقے کا ایک بڑا پولیس آفیسر تھا اور اس کی وجہ سے تنویر کو کچھ آسانیاں بھی مل جاتی تھیں۔

باہمی اشتراک سے زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی کہ ایک ہفتے تنویر نے فیاض کے لیے کچھ نہیں بھیجا۔ اس وقت فیاض نے کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔ ایسا کئی بار ہو چکا تھا۔

تنویر اگر ایک ہفتے پیسے نہیں دے پاتا تھا تو اگلے ہفتے اس کمی کو پورا کر دیتا۔ لیکن دوسرے کے بعد جب تیسرا ہفتہ بھی ہو گیا تو اس نے اپنے خاص آدمی راجا سے تنویر کے بارے میں دریافت کیا۔ "راجا! یہ تنویر کہاں رہتا ہے آج کل... کئی ہفتوں سے دکھائی نہیں دیا۔"

"ملک صاحب! کیا آپ کو اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم؟"

"کیوں، کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"اس نے تو ایک بڑی دکان میں ملازمت کر لی ہے۔" راجا نے بتایا۔ "کاؤنٹر پر بیٹھتا ہے۔"

"کیا کہہ رہا ہے؟ تنویر نے ملازمت نہیں کی ہو گی۔ وہ اس اسٹور میں لمبا ہاتھ مارنا چاہتا ہو گا۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ وہ ملازمت وغیرہ کا بندہ نہیں ہے۔"

"اب سمجھ میں آ گئی جی۔ اسی لیے میں اسے دیکھ کر حیران ہو گیا تھا۔"

"اب دیکھ لینا اسٹور کا کیا حشر ہوتا ہے۔" فیاض اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔

لیکن ڈیڑھ مہینا گزرنے کے بعد بھی جب نہ تو اسٹور کا کچھ ہوا اور نہ ہی تنویر اس کے پاس آیا تو ملک فیاض کا ماتھا ٹھنکا۔ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔ اس نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے تنویر کو بلا بھیجا۔

تنویر نے آتے ہی بتایا تھا۔ "ملک صاحب! میں نے جرم سے توبہ کر لی ہے۔ اب میں اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"پاگل مت بنو۔" فیاض نے سمجھانے کی کوشش کی۔ "نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو جا رہی ہے۔"

"نو سو چوہے کھا کر بلی نے توبہ کر لی ہے ملک صاحب... اور اوپر والا توبہ قبول کر لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے میری توبہ بھی قبول ہو جائے۔"

"اوئے، ایمانداری کی زندگی تم لوگوں کے لیے نہیں بنی۔" فیاض نے کہا۔ "یہ شریفوں کے نخرے ہیں، ان ہی کے لیے رہنے دو۔ تم یہ بتاؤ، یہ ملازمت تمہیں کیا دے رہی ہے؟"

"دس ہزار روپے مہینا۔"

"بس؟" فیاض ہنس پڑا۔ "دس ہزار تو تمہارے دو دن کا خرچ ہے۔"

"خرچ ہے نہیں ملک صاحب... خرچ تھا لیکن خدا کی مہربانی سے اب سب کچھ بدل چکا ہے۔"

دفعتاً ملک فیاض نے اپنا لہجہ نرم کر لیا۔ "چل بھائی! مرضی ہے تیری۔ جس طرح زندہ رہنا چاہتا ہے رہ لے۔ اب کوئی تجھے مجبور تو نہیں کر سکتا نا۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ ملک صاحب" تنویر نے کہا۔ "تو اب میں جاؤں؟"

"ہاں جاؤ۔"

تنویر کے جانے کے بعد ملک فیاض نے راجا کو بلا لیا۔ "دیکھ راجا! یہ جو تنویر ہے نا، یہ بڑا ملنگ بننے کے چکر میں ہے۔ درویش ہوتا جا رہا ہے سالا۔ نیک بننے چلا ہے۔ اب بتا اسے سیدھے راستے پر کیسے لایا جائے؟"

راجا بہت شاطر قسم کا انسان تھا۔ اس نے ایک مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "ملک صاحب! اس

میں کون سی مشکل ہے۔ اس کے راستے بند کر دیں، خود ہی سیدھے راستے پر آ جائے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"تنویر جس سپر اسٹور میں ملازم ہوا ہے، اس کے مالک کو بلا کر ذرا سمجھا دیں۔ خود ہی نوکری سے جواب دے دے گا۔ اس کے بعد بھی جہاں جہاں یہ کام کرے، وہاں ایسی ہی باتیں کر دیں جی۔ ہر طرف سے مار کھا کر ہماری ہی طرف آئے گا۔ یہ پیٹ کی مار بہت بُری ہوتی ہے۔"

"ہاں، یہ بات کی تُو نے۔" فیاض خوش ہو گیا۔ "تُو واقعی کام کا آدمی ہے۔"

دوسرے دن سپر اسٹور کا مالک ملک فیاض کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ ایک پولیس آفیسر کے اس طرح بلانے پر بہت... بے چین دکھائی دے رہا تھا۔ "بھائی صاحب! پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔" فیاض نے کہا۔ "آپ کو ہم نے آپ کا بھلا سمجھانے کے لیے بلایا ہے۔ آگے آپ کی مرضی ہے۔"

"بتائیں جناب! ایسی کیا بات ہے؟"

"آپ نے تنویر نام کے کسی بندے کو ملازمت دی ہے؟"

"جی ہاں، وہ بہت ایماندار اور محنتی آدمی ہے۔"

"اس کی ایمانداری اور محنت تو اس وقت سامنے آئے گی حاجی صاحب جب آپ کے اسٹور میں جھاڑو پھر چکی ہو گی۔"

"جی؟" اسٹور کے مالک نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"وہ ایک ہسٹری شیٹر ہے حاجی صاحب۔" فیاض نے بتایا۔ "نہ جانے کتنے کیسز ہیں اس پر۔ اغوا برائے تاوان، ڈاکے، اقدامِ قتل اور نہ جانے کیا کیا۔ آپ کہیں تو اس کی فائل دکھا دوں؟"

"نہیں، نہیں۔ آپ کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے۔ آپ نے ہمیں بہت بڑے نقصان سے بچا لیا ہے۔ آپ کا احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ میں آج ہی اس کم بخت کی چھٹی کر دوں گا۔"

تنویر کو اسی شام اسٹور سے فارغ کر دیا گیا۔

اب اس کے لیے آزمائش کے سلسلے شروع ہو گئے۔ اس نے یہ سنا تھا کہ جب کوئی شخص برائیاں چھوڑ کر نیکی کے راستے پر چلنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ اس کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ اس کا امتحان شروع ہو گیا تھا۔

اس قسم کی باتیں اس کے حوصلے کو پست نہیں کر سکتی تھیں۔ اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ وہ بُرائی کے راستے پر قدم بھی نہیں رکھے گا۔

اسے ایک اور ملازمت مل گئی۔ یہ بہت معمولی سی ملازمت تھی۔ وہ ایک پڑھا لکھا انسان تھا لیکن اپنے بدنما ماضی کی وجہ سے کھل کر سامنے نہیں آ سکتا تھا۔

یہ ملازمت ایک فیکٹری میں تھی۔ ملک بھر میں یہ ہوزری کی سب سے بڑی فیکٹری تھی۔

تنویر کو شفٹ انچارج کی ملازمت ملی تھی لیکن اس کا ماضی فیاض کی وجہ سے پھر آڑے آ گیا تھا۔ اس بار ملک فیاض خود فیکٹری کے مالک وقار خان کے پاس آیا تھا۔ کیونکہ وقار خان بہت دولت مند انسان تھا اور دولت کے ساتھ ساتھ اس نے سیاسی جوڑ توڑ کے ذریعے طاقت بھی حاصل کر لی تھی۔

فیاض نے جب اسے تنویر کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ ایسا کوئی آدمی ہماری فیکٹری میں آ گیا ہو۔ لیکن میں ان معاملات کو نہیں دیکھتا۔ میں نہیں جانتا کہ کس کو رکھا جاتا ہے کس کو نہیں۔ یہ کام سپروائزر کا ہو گا، اسی نے رکھا ہو گا۔"

"بس سر جی! ہم نے تو آپ کو سمجھا دیا ہے۔ تنویر ایک خطرناک آدمی ہے۔"

"چلیں جی، آپ کا شکریہ۔" وقار خان نے کہا۔ "میں اسے ابھی ہٹا دیتا ہوں۔"

تنویر کو وہاں سے بھی ہٹا دیا گیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے لیے زمین تنگ ہوتی جا رہی ہو۔ اس کے ماضی کے سائے اس سے پہلے ہی پہنچ جاتے تھے اور وہ سائے اس کی نیکی کی کوششوں کو کسی عفریت کی طرح نگل جاتے تھے۔

اس شام وہ بہت اداس تھا۔

اس کی اداسی اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ وہ چائے پینے کے لیے ایک ہوٹل میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟

وہ چائے کے گھونٹ لے رہا تھا کہ ایک آدمی اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ "تنویر استاد! کیسے ہو تم؟" اس نے بے تکلفی سے تنویر کو مخاطب کیا۔

تنویر اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا پھر اسے یاد آیا کہ اس کے سامنے جو شخص آ کر بیٹھا ہے اس کا نام دلدار ہے۔ وہ پولیس کے لیے مخبر کا کام کرتا ہے۔ خاص طور پر فیاض کے لیے۔

''کیابات ہے،تم نے مجھے پہچانا نہیں؟'' ولدار نے پوچھا۔
''ہاں پہچان گیا ہوں۔تم ولدار ہو۔'' تنویر نے کہا۔
''میں جانتا ہوں استاد کہ تم بہت پریشان ہو۔'' ولدار ہمدردانہ لہجے میں بولا۔''اور تمہاری پریشانی کی وجہ بھی جانتا ہوں۔''

''کیا جانتے ہو؟''

''یہی کہ تم ایک اچھا انسان بننے کی کوشش کررہے ہولیکن ہر قدم پر رکاوٹیں کھڑی ہورہی ہیں۔'' ولدار نے کہا۔''اور جانتے ہو کہ یہ رکاوٹیں کون کھڑی کررہا ہے... ملک فیاض۔''

تنویر کو اندازہ تو تھا لیکن یقین نہیں تھا اور ولدار نے اسے یقین دلادیا تھا۔

''تنویر استاد! میں بہت بُرا انسان ہوں۔'' ولدار نے کہا۔''زندگی بھر جھوٹ سچ بولتا رہا ہوں لیکن اس کے باوجود میرے سینے میں ایک چھوٹا سا چراغ ضرور روشن ہے۔ ملک فیاض نہیں چاہتا کہ تم سیدھے راستے پر آؤ۔ کیونکہ اس میں اس کا سراسر نقصان ہے۔''

''ہاں یار، یہ بات تو ہے۔اب میں اس کے لیے سوائے دعا کے اور کیا کرسکتا ہوں۔''

''تنویر استاد! کیا تمہیں یہ سن کر غصہ نہیں آیا؟''

''نہیں۔'' تنویر مسکرادیا۔''بلکہ خوشی ہوئی ہے کہ میرا امتحان لیا جارہا ہے۔خدا مجھے ثابت قدم رکھے۔''

☆☆☆

صحرا سمٹتا جارہا تھا۔

لیکن نہیں۔صحرا سمٹتا کہاں ہے۔ وہ تو پھیلتا جاتا ہے۔حدِ نگاہ تک۔صحراؤں میں چلنے والی خاص طرح کی گاڑی بہت تیزی سے اپنا سفر طے کررہی تھی۔

اس جیپ میں چار افراد سوار تھے۔ باذل، منہار، کرم اور ساگر۔ یہ چاروں انتہائی خطرناک ڈاکو تھے۔ باذل ان کا سردار تھا۔

اٹھائیس تیس برس کا ایک کڑیل انسان۔ گھنی مونچھیں، چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد اور کسرتی بدن کا ایک ایسا شخص جسے صحرائی طوفان کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

وہ جدھر سے گزرتا سناٹا ہوجاتا۔اس کا نام دور دور تک دہشت کی علامت بنا ہوا تھا۔اس نے نہ جانے کتنے ڈاکے مارے ہوں گے۔کتنے خون کیے ہوں گے۔باذل کے پاس ایسی باتوں کا کوئی حساب نہیں تھا اور وہ حساب کرتا بھی نہیں تھا۔

حکام نے اس کے سر کی قیمت مقرر کررکھی تھی۔بیس لاکھ روپے۔لیکن ابھی تک کوئی اس انعام کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔

اس وقت انہیں صحرا میں بہت دور تک سفر کرنا تھا۔ اس وقت ان لوگوں کی منزل کندھ کوٹ تھی۔

کندھ کوٹ ایک بہت بڑی بستی تھی۔اس پورے علاقے کا حکمران بخت نواز تھا۔

اس علاقے کا بے تاج بادشاہ بہت بڑا وڈیرا۔نہ جانے کتنے ڈاکو اس کے یہاں پرورش پایا کرتے۔اس کی شاندار حویلی کا دور دور تک کوئی جواب نہیں تھا۔

اس حویلی میں ملازمین اور خادموں کی پوری فوج رہا کرتی۔یہ سب بخت نواز کے خوف سے کانپتے رہتے۔وہ جب چاہتا اس کی بندوق کی ایک گولی کسی کے سینے میں اتر جایا کرتی۔پھر کس کی مجال تھی کہ وہ اپنے سگے کی موت پر ماتم کرنے کی ہمت بھی کرتا۔

باذل اپنے ساتھیوں کے ساتھ کندھ کوٹ ہی کی طرف جارہا تھا۔ بخت نواز نے اسے طلب کیا تھا۔باذل اپنی سلطنت کا ویسے تو خود حکمران تھا لیکن کبھی کبھی اسے ایسے وڈیروں کی بات بھی ماننی پڑتی تھی۔

راستے بھر خاموشی رہی..... ان میں سے کوئی بھی کچھ نہیں بولا تھا۔بس ایک جگہ رک کر انہوں نے ریت پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا تھا۔اس کے بعد ان کا سفر پھر شروع ہوگیا۔

کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد وہ کندھ کوٹ پہنچ گئے۔ بخت نواز کی حویلی بھی ان کی دیکھی بھالی تھی۔ان کی جیپ کو دیکھ کر بڑا گیٹ کھول دیا گیا۔

انہیں عالی شان قسم کی بیٹھک میں پہنچا دیا گیا۔پھر ان کے لیے چائے ناشتے کا بندوبست کردیا گیا۔ابھی تک بخت نواز ان کے سامنے نہیں آیا تھا۔باذل کے ساتھیوں کو مہمان خانے لے جایا گیا۔اس بیٹھک میں صرف باذل رہ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد بخت نواز اندر سے برآمد ہوا۔وہ پچاس پچپن سال کا ایک مضبوط جسم کا انسان تھا۔اس نے ایک قیمتی شال اوڑھ رکھی تھی۔باذل نے آگے بڑھ کر جلدی سے اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔''بیٹھ جاؤ بابا۔'' بخت نواز نے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔''راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی بابا؟''

''نہیں سائیں، آپ کی دعا سے تکلیف کیا ہوتی تھی؟'' باذل نے کہا۔''یہ صحرا تو ہمارا گھر ہے سائیں۔''

''ہاں جانتے ہیں ہم۔'' بخت نواز نے اپنی گردن ہلائی۔''اس وقت ہم نے ایک ضروری کام سے بلایا ہے بابا۔''

''آپ بس حکم دیں سائیں۔''

''کام ذرا ہوشیاری سے ہونا چاہیے۔''

''آپ فکر نہ کریں سائیں۔''

''بابا! کل مجھے ایک جلسے میں تقریر وقریر کرنی ہے۔'' بخت نواز نے بتایا۔''سیاسی جلسہ ہے۔میں ایم این اے کے لیے کھڑا ہورہا ہوں۔میری بات سمجھ رہے ہونا؟''

''جی سائیں! سمجھ گیا ہوں۔آپ الیکشن لڑ رہے ہیں۔''

''ہاں بابا، یہ سیٹ مل گئی تو میرے ساتھ تمہارے بھی مزے آجائیں گے۔'' بخت نواز نے کہا۔''خیر، تمہارا کام یہ ہوگا بابا کہ تم مجھے تقریر نہیں کرنے دو۔ذرا فائرنگ شائرنگ ہونی چاہیے لیکن ہم کو بچا کر بابا... ایسا نہ ہو ہم ہی کو لڑھکا دو۔آس پاس کے دو چار بندے چلے جائیں تو وہ چلتا ہے۔''

''میں نہیں سمجھا سائیں... اس سے کیا ہوگا؟''

''بے وقوف، یہ سیاست کے کھیل ہیں۔تم نہیں سمجھو گے۔'' بخت نواز ہنس پڑا۔''میں اس کا سارا الزام اپنے مخالف پر لگادوں گا۔پھر تو جیت اپنی ہوگی۔''

''سمجھ گیا سائیں لیکن اتنا دور جانے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ حکم کریں تو وہ بندہ ہی نہ رہے۔''

''نہیں، اس سے کام خراب ہوجائے گا۔'' بخت نواز نے کہا۔''لوگ سمجھ جائیں گے کہ یہ کام ہم نے کروایا ہے۔ ہم تو اس کو سیاسی مار مارنا چاہتے ہیں بابا۔لیکن کام ایسا ہو کہ کسی کو پتا نہیں چلے کہ یہ کام تم لوگوں نے کیا ہے۔جانتے ہو بابا، آج کل یہ ٹی وی چینل والے بہت تیز ہوگئے ہیں۔قبر کے مردے کو بھی کھینچ لاتے ہیں۔''

''ایسا ہی ہوگا سائیں۔'' باذل نے اطمینان دلایا۔

''بس بابا، اب تم جاؤ۔مہمان خانے میں آرام کرو۔ سب کچھ ہے وہاں۔'' بخت نواز نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی نکال کر باذل کی طرف پھینک دی۔ ''لو بابا، اپنا خرچہ پانی۔''

''آپ کی مہربانی سے سائیں سب کچھ ہے اپنے پاس۔''

''رکھ لو بابا، لکشمی کو انکار نہیں کرتے۔''

بخت نواز کا جلسہ دوسرے دن شام کو تھا۔باذل اور اس کے ساتھی منہ اندھیرے حویلی سے نکل کر اپنے اڈے کی طرف روانہ ہوگئے تھے۔

باذل نے اس سلسلے میں بہت احتیاط سے کام لیا تھا۔ اس نے کندھ کوٹ میں موجود اپنے دو ساتھیوں کی ڈیوٹیاں لگادی تھیں۔

یہ دونوں بندے کندھ کوٹ ہی میں رہا کرتے تھے اور ان کا کام شہر میں ہونے والے ہر نئے واقعے کی خبر باذل تک پہنچانا تھا۔ویسے وہ باذل کے لیے اس سے پہلے بھی اس قسم کے کئی کام کرچکے تھے۔

ان دونوں نے بہت ہوشیاری اور پلاننگ کے ساتھ اپنا کام پورا کیا تھا۔بھگدڑ اور فائرنگ سے چار آدمی ہلاک ہوگئے تھے لیکن بخت نواز کا کام بن گیا تھا۔

☆☆☆

افشین ایک ذہین اور خوب صورت لڑکی تھی۔

ایک دولت مند باپ کی ضدی اور خودسر اولاد۔اس نے زندگی کا ابھی تک صرف ایک پہلو دیکھا تھا اور وہ پہلو تھا دولت اور اس کے نتیجے میں ملنے والی طاقت۔

افشین نے زندگی کے دکھ کبھی برداشت نہیں کیے تھے۔وہ پھولوں کے بستر پر سونے والی اور کلیاں بچھے ہوئے راہ گزر پر چلنے والی لڑکی تھی۔

ایک شاندار گاڑی اس کے دولت مند باپ نے خرید کر اس کے حوالے کردی تھی۔وہ لانگ ڈرائیو کی شوقین تھی۔اس ڈرائیو میں وہ کبھی کبھی ذیشان کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لیتی تھی۔

ذیشان اس کے باپ کے دوست کا بیٹا تھا اور اس کا تعلق بھی دولت مند طبقے سے تھا۔

افشین نے پہلی بار اس کو دیکھ کر پسند نہیں کیا تھا لیکن آہستہ آہستہ دونوں میں دوستی ہوتی چلی گئی۔ ایک دن ذیشان نے اس سے اپنی پسند یا محبت کا اظہار کردیا۔

افشین یہ سن کر بہت دیر تک ہنستی رہی۔ذیشان جھلا کر رہ گیا۔''کیوں، ہنس کیوں رہی ہو؟ کیا میں نے تمہیں کوئی لطیفہ سنادیا ہے؟''

''جو کچھ تم کہہ رہے ہو، وہ لطیفے سے کم نہیں ہے۔'' افشین نے کہا۔''اس قسم کی باتیں ہمارے طبقے کے لوگ نہیں کرتے۔یہ گھسی پٹی رومانویت ہے۔فلموں میں بھی اچھی نہیں لگتیں۔''

''لیکن میں کیا کروں؟ میں نے جو محسوس کیا، وہ بتا دیا ہے۔''

''کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کے قریب آگئے ہیں۔'' افشین نے کہا۔''بس ہمارے لیے اتنا ہی بہت ہے۔آئندہ سے ایسی باتیں مت کرنا۔''

ذیشان نے اس کے بعد پھر اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔

ایک شام لانگ ڈرائیو ہی کے دوران میں ان دونوں کے ساتھ وہ کچھ ہو گیا جس کا انہوں نے تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔ گاڑی تو افشین ہی چلا رہی تھی۔ ذیشان اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا کہ اچانک ایک تیز رفتار جیپ اس طرح ان کے سامنے آ کر رک گئی کہ افشین کے بریک لگاتے لگاتے ان کی گاڑی اس جیپ سے ٹکرا چکی تھی۔

نقصان تو کوئی خاص نہیں ہوا تھا لیکن یہ بہت انہونی سی بات تھی۔ ذیشان نے جیپ والوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا جس کے جواب میں جیپ سے تین آدمی اتر کر گاڑی کے پاس آ گئے۔

وہ تینوں مسلح تھے جبکہ ان کا چوتھا ساتھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا رہا۔ افشین اور ذیشان خوف زدہ ہو کر آنے والوں کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ سب قدآور اور خطرناک قسم کے لوگ تھے۔ ''چلو جیپ میں بیٹھو، جلدی۔'' آگے والے نے اپنا ریوالور لہراتے ہوئے کہا۔

''کک... کون ہو تم...؟'' ذیشان نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

''واہ، ابھی بھی نہیں سمجھے۔'' آنے والا ہنس پڑا۔ ''ہم تمہیں اغوا کر رہے ہیں۔''

''نہیں۔'' افشین چیخ اٹھی۔

''خاموش۔'' ریوالور کی نال افشین کی کنپٹی سے لگا دی گئی تھی۔ ''آواز نکلے گی تو پھر گولی چل جائے گی۔''

ان دونوں کو جیپ میں بٹھا دیا گیا۔

پھر انہیں اندازہ نہیں ہو سکا کہ کتنی دیر کے سفر کے بعد وہ جیپ ایک گھنے جنگل میں داخل ہوئی تھی اور کس طرح انہیں جیپ سے اتار کر ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

تنویر کے لیے وہ رات بہت بھاری تھی۔

شام کے وقت اس کی ملاقات ایک ایسے آدمی سے ہوئی جو اس زمانے میں اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا رہتا تھا جب تنویر اپنی برائیوں کے راستے پر چل رہا تھا۔

اس شخص کی تجوری تنویر کے ایک اشارے پر کھل جاتی۔ وہ تنویر کے قدموں میں نوٹوں کے ڈھیر لگا دیتا تھا لیکن اس شام اس نے تنویر کو کچھ رقم دینے سے معذرت کر لی تھی کیونکہ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ تنویر اب اس کے کسی کام نہیں آ سکتا۔

تنویر نے اس سے صرف پچاس ہزار مانگے تھے جو اس کے لیے بہت معمولی رقم تھی لیکن اس نے روکھا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ ''تنویر بھائی! تم تو جانتے ہو کہ آج کل کاروبار کی کیا پوزیشن ہے۔''

''ہاں، یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔'' تنویر معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔ ''مجھے تم سے کوئی شکایت بھی نہیں ہوگی کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ تم اسی قسم کی باتیں کرو گے۔ خیر، میرا خدا مالک ہے۔ تم خوش رہو۔''

اس کی طبیعت بہت بوجھل ہو رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کے لیے اس قسم کی رکاوٹیں کھڑی ہو جائیں گی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اس نے جس راہ کا انتخاب کیا ہے، اس پر چلنا کوئی اتنا آسان نہیں۔

اس وقت رات کے بارہ یا ساڑھے بارہ بجے تھے جب دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ اس وقت کون آ سکتا تھا؟ پہلے بھی رات کے وقت اس کے پاس کوئی نہیں آتا تھا۔ لیکن اب کون آیا تھا؟

دروازے پر دلدار کھڑا تھا۔ پولیس کا مخبر... جو پھولی ہوئی سانسوں سے کہہ رہا تھا۔ ''تنویر بھائی! جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل لو۔''

''وہ کیوں؟''

''ملک فیاض چھاپا مارنے آ رہا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''تمہارے گھر سے ہیروئن نکلے گی اور دو کلاشنکوف برآمد کی جائیں گی۔ وہ پوری پلاننگ کر چکا ہے۔''

''اوہ، اب سمجھا۔'' تنویر نے گردن ہلا دی۔ ''کتنی دیر میں آ رہے ہیں وہ لوگ؟''

''دو گھنٹوں میں۔'' دلدار نے بتایا۔ ''تم اپنا کوئی بندوبست کر لو۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ بھائی۔ میں کچھ ایسا بندوبست کروں گا کہ ملک فیاض کے ہوش اڑ جائیں گے۔ تم اب جاؤ، میں تمہارا یہ احسان یاد رکھوں گا۔''

دلدار کے جانے کے بعد تنویر نے برابر والے پڑوسی رحمت اللہ کا دروازہ بجا دیا۔ رحمت اللہ صاحب کسی دفتر میں کام کرتے تھے۔ انتہائی نیک اور معقول آدمی تھے۔

''رحمت صاحب! میں آپ کو اس وقت ایک زحمت دینے آیا ہوں۔''

''ہاں ہاں کہو۔''

''آپ کا میرے بارے میں کیا خیال ہے، سچ بتائیں... کیا میں خود کو بدلنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں؟''

''ہاں میاں، یہ بات تو ہے۔ تم میں حیرت انگیز تبدیلیاں آئی ہیں۔''

''بس تو آپ میرے حق میں گواہی دیجیے گا۔'' تنویر نے کہا۔ ''میں ذرا خورشید صاحب اور نیاز علی کو بھی اٹھا دیتا ہوں۔''

''لیکن بات کیا ہے؟''

''یہ میں ابھی بتاتا ہوں۔''

تنویر نے خورشید اور نیاز علی کے ساتھ محلے کے اور بھی دو چار آدمیوں کو جگا دیا تھا۔ وہ سب حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''آپ لوگ میری بات سنیں۔'' تنویر نے کہا۔ ''جس وقت میں جرم کے راستے پر تھا، اس وقت کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ میرے دروازے پر بھی آ سکے۔ لیکن میں نے جب سے نیکی کے راستے پر چلنے کی کوشش کی ہے، مجھ پر عذاب نازل کیے جا رہے ہیں۔ یہ عذاب انسانوں کے لائے ہوئے ہیں۔ اب میں آپ لوگوں کو یہ زحمت دے رہا ہوں کہ میں نے اپنے گھر میں ہیروئن اور کلاشنکوف چھپا رکھی ہے آپ لوگ وہ برآمد کر کے مجھ پر احسان کریں۔''

''یہ کیا مذاق ہے؟'' محلے کے ایک صاحب ناراض ہونے لگے۔ ''اس وقت تمہیں یہ کیا سوجھی؟''

''پلیز، آپ لوگ میرا یہ بوجھ ہلکا کر دیں۔'' تنویر نے کہا۔ ''لیکن ذرا جلدی۔ کیونکہ وقت ختم ہوتا جا رہا ہے اور ایک ایک چیز پر دھیان دیجیے گا۔ کچن سے لے کر باتھ روم تک کھنگال ڈالیں۔''

محلے والے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر تنویر کے مکان میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے پورے مکان کو چھان ڈالا لیکن کچھ بھی نہیں مل سکا۔

''نہیں بھئی، تمہارے مکان میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' محلے والوں نے کہا۔

''اب مجھے اجازت دیں کہ میں آپ میں سے کسی کے مکان میں کچھ دیر کے لیے بیٹھ جاؤں۔'' تنویر ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تھوڑی دیر کے بعد یہ ساری کہانی آپ کی سمجھ میں آ جائے گی۔''

رحمت اللہ صاحب نے تنویر کو اپنے گھر میں بٹھا لیا۔ دلدار کی اطلاع درست ثابت ہوئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ملک فیاض کی سربراہی میں پولیس کی دو گاڑیاں شور مچاتی ہوئی پہنچ گئیں۔

تنویر کے مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پولیس والے

مسافر

میری دو پتلونیں پھاڑ چکا ہے۔ آج میں نے نکلنے سے پہلے پتلون پر کلوروفارم چھڑک لی تھی

اندر داخل ہو گئے۔ اس دوران میں محلے والے بھی گھر کے باہر جمع ہو چکے تھے۔

تنویر، رحمت صاحب کے گھر میں بیٹھا رہا۔

کچھ دیر بعد ملک فیاض گھر سے باہر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کلاشنکوف دبی ہوئی تھی اور دوسرے ہاتھ میں ہیروئن کے پیکٹس سے بھرا ہوا شاپر تھا۔ اس نے دونوں چیزیں محلے والوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھیں جناب! اس بدمعاش کے گھر سے یہ ہیروئن اور یہ کلاشنکوف ملی ہے اور خود بھاگا ہوا ہے۔''

اب محلے والوں کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ تنویر نے محلے والوں سے اپنے گھر کی تلاشی کے لیے کیوں کہا تھا۔ اس کے گھر میں کچھ بھی نہیں تھا لیکن پولیس نے برآمدگی دکھا دی تھی۔

''یہ غلط ہے جناب۔'' رحمت صاحب نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''تنویر کے گھر میں کچھ بھی نہیں تھا۔''

''یہ آپ کو کیسے معلوم؟'' ملک فیاض نے تیکھی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

''اس لیے کہ محلے کا بچہ بچہ ابھی کچھ دیر پہلے پورے گھر کی تلاشی لے چکا ہے۔'' رحمت صاحب نے بتایا۔ ''تنویر کو شبہ ہو گیا تھا کہ آپ یہ ڈراما کرنے والے ہیں اس لیے اس نے یہ احتیاطی تدبیر کر لی تھی۔ اب اگر آپ نے جھوٹا الزام لگایا تو یہ پورا محلہ اس کے حق میں گواہی دینے کو

تیار ہے۔"

ملک فیاض کی بہت سبکی ہوئی۔ وہ غیظ اور جھلاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد تنویر، رحمت صاحب کے گھر سے نکل کران لوگوں کے سامنے آ گیا۔ وہ بہت اداس تھا۔

"آپ لوگوں نے جس طرح میرا ساتھ دیا ہے اس کے لیے میں زندگی بھر آپ لوگوں کا احسان نہیں بھلا سکتا۔ لیکن اب مجھے احساس ہو گیا ہے کہ میرے لیے اس شہر میں رہنا ناممکن ہے۔ اسی لیے مجھے یہاں سے جانا ہوگا۔"

"لیکن کہاں جاؤ گے؟" کسی نے پوچھا۔

"کسی ایسی جگہ جہاں میرا بدنام ماضی میرے ساتھ نہ ہو۔" اس نے کہا۔ "جب میں غلط راستوں پر چل رہا تھا، اس وقت زندگی مجھ پر ہر طرح مہربان تھی اور جب میں نے سیدھی راہ اختیار کی تو دنیا بھر کے عذاب مجھ پر ٹوٹنے لگے۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب میری آزمائشیں ہیں۔ بہر حال جو خدا کی مرضی۔"

"تنویر! ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔" محلے والوں نے کہا۔ "ہم تمہارے لیے احتجاج کریں گے۔ تمہارے لیے آواز اٹھائیں گے۔"

"مجھ جیسے بدنام زمانہ انسان کے لیے بہت بڑی بات ہے کہ آپ جیسے لوگ میرا ساتھ دے رہے ہیں لیکن میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی پر کوئی آنچ آئے۔ اسی لیے مجھے سکون کی زندگی گزارنے کے لیے کسی طرف چلے جانا چاہیے۔"

☆☆☆

افشین اور ذیشان کو باذل کے اڈے پر پہنچا دیا گیا تھا۔

ان دونوں کو اغوا کرنے والے باذل ہی کے آدمی تھے۔ راستے بھر خوف سے افشین کی حالت خراب رہی تھی۔ ذیشان اسے تسلیاں دیتا رہا لیکن خود اس کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔

اس نے ایسے واقعات صرف فلموں میں دیکھے تھے۔ اس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ یہ سب خود اس کے ساتھ بھی ہوگا۔ شہر کی آرام دہ زندگی گزارنے والے ذیشان کے لیے یہ سب کچھ ایک بھیانک خواب کی طرح تھا لیکن ایسا خواب جس کا تسلسل ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

ان دونوں کو باذل کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ باذل بہت دلچسپی سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے افشین کے پاس جا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لڑکی! تو بہت خوب صورت ہے لیکن مجھے تیری خوب صورتی سے کچھ نہیں لینا۔"

"تو پھر یہ بتاؤ، ہمیں کیوں اٹھایا ہے؟" ذیشان نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

"تاوان کے لیے۔ تم دونوں دولت مند باپ کی اولادیں ہو۔" باذل نے کہا۔ "دس بیس کروڑ تو مل ہی جائیں گے... کیوں ساتھیو؟" اس نے یہ بات اپنے ساتھیوں کو دیکھتے ہوئے پوچھی۔

سب ایک ساتھ خوشی کے نعرے لگانے لگے۔

"لیکن ہمارے والدین کے پاس اتنی دولت نہیں ہے کہ وہ ہمارے لیے دس بیس کروڑ دے سکیں۔" ذیشان نے کہا۔

"جھوٹ بولتے ہو تم۔" باذل دہاڑا۔ "تم کیا سمجھتے ہو کہ ہمارے بندے تم دونوں کو یونہی اٹھا کر لائے ہیں؟ نہیں... ہمارے بندوں نے تم دونوں کی پوری خبر نکالی ہے۔"

افشین کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ ذیشان نے اسے سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا کہ باذل نے دھمکی دی۔ "خبردار! جو اس کو ہاتھ لگایا۔"

اس نے اپنی بندوق کا رخ ذیشان کی طرف کر دیا۔

ذیشان دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"جاؤ، اس چھوکری کو الگ کوٹھری میں بند کر دو۔" باذل نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

افشین میں اب احتجاج کرنے کی بھی ہمت اور طاقت نہیں رہی تھی۔ وہ یہ سب کچھ ایک سناٹے کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ جو کچھ بھی تھا، وہ ایک المناک اور گہرے خواب کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ اسے ایک طرف لے گئے جبکہ ذیشان وہیں کھڑا رہا۔ اس میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر کسی کو روکنے کی کوشش کرتا۔

پھر بھی اس نے ہمت کر کے باذل سے کہا۔ "دیکھو، تمہیں جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ میں دونوں گھروں کے فون نمبر دے دیتا ہوں۔ ان سے بات کر کے اپنا معاملہ طے کر لو۔"

"معاملہ تو تیرے گھر والوں سے طے ہوگا۔"

"اور لڑ... لڑکی؟"

"اس کے لیے ہم نے دوسری بات سوچ رکھی ہے۔"

بہت خوب! آج خاتونِ اوّل ڈرائیونگ سیکھنے نکلی ہیں

باذل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

تنویر کے لیے اپنے شہر کی زمین تنگ کر دی گئی تھی۔

صرف ملک فیاض ہی نہیں بلکہ دوسرے جرائم پیشہ افراد بھی اس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ اس شہر ہی سے کوچ کر جائے۔ کسی ایسی جگہ جہاں کوئی اس کا جاننے والا نہ ہو، جہاں اس کا ماضی اس کے ساتھ نہ چپتا ہو۔

اس نے طویل فاصلے کی بس پکڑ لی۔ اس کے ذہن میں کسی خاص مقام کا تعین نہیں تھا۔ اس نے یہ سوچ رکھا تھا کہ جہاں اسے سکون ملے گا، وہ وہیں بسیرا کر لے گا۔ چھوٹا موٹا کام تو ہر جگہ مل ہی سکتا ہے۔

لیکن بس کسی خاص منزل پر بھی نہیں پہنچ سکی تھی۔ ایک ویرانے میں آ کر اس میں خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ پھر اسے کچے میں اتار کر روک دیا گیا تھا۔ رات کا وقت تھا اور سڑک کے دونوں طرف سوائے گہری تاریکی کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ بھی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ دونوں طرف سپاٹ میدان ہیں یا گھنے جنگل۔

بس مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ ان میں مرد اور عورتیں دونوں ہی شامل تھے۔ بچے بھی تھے۔ بس کے اس طرح اچانک رک جانے پر دہشت سی پھیل گئی۔ ہر ایک نے یہ سن رکھا تھا کہ ایسے ویرانوں میں مسافروں کو لوٹ لیا جاتا ہے۔

ہر شخص ڈرائیور اور کنڈیکٹر سے صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ ان کے پاس اس کے علاوہ اور کیا جواب ہو سکتا تھا کہ بس میں اچانک کوئی خرابی ہو گئی ہے جو ان دونوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔

"بھائی! کیا آس پاس کوئی ایسی بستی نہیں ہے جہاں مکینک مل سکے؟" تنویر نے بس کے ڈرائیور سے پوچھا۔

"بابا! یہاں سے پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک بڑی بستی ہے کندھ کوٹ۔" ڈرائیور نے بتایا۔

"کیا وہاں مکینک ہوتا ہے؟"

"ہاں ہوتا ہے۔" ڈرائیور نے بتایا۔ "لیکن وہاں جائیں کیسے؟ دو چار کلومیٹر کی بات تو نہیں ہے نا۔"

"کوئی نہ کوئی راستہ تو نکالنا ہوگا۔"

"راستہ ایک ہی ہے۔ اگر کوئی دوسری گاڑی ادھر سے گزرے تو اس سے بولا جائے۔ شاید وہ کندھ کوٹ تک لے جائے۔ پھر وہاں سے مکینک کو لانا آسان ہو جائے گا۔"

اس سوال کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا کہ کندھ کوٹ تک کیسے جایا جائے؟ مسافروں پر خوف طاری تھا۔ انہوں نے ان علاقوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ یہاں ڈاکوؤں کی حکمرانی ہوا کرتی تھی۔

مسافر ایک دوسرے کو تسلیاں دے رہے تھے۔ تنویر کو رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بس سے کچھ فاصلے پر چلا گیا۔ اس طرف بالکل اندھیرا تھا۔

اس سے کچھ فاصلے پر بس کھڑی ہوئی تھی۔ بس کی روشنیاں سڑک پر دھبے ڈال رہی تھیں۔ تنویر اندھیرے میں بیٹھ کر اندھیرے ہی کا حصہ بن گیا تھا۔

پھر اچانک کچھ ہوا۔

دو گاڑیاں نہ جانے کس طرف سے نکل کر بس کی طرف آ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی گولیاں چلنے لگیں۔ شاید گاڑی والوں نے ہوائی فائرنگ کی تھی۔

بس کی طرف سے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ تنویر اندھیرے میں چھپا ہوا ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا

جو بندوقیں لہراتے ہوئے گاڑیوں سے اتر اتر کر بس کو گھیرے میں لے رہے تھے۔

جو خدشہ تھا وہ پورا ہو گیا تھا۔ بس والوں کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا تھا۔ تنویر کی قسمت اچھی تھی کہ وہ عین وقت پر بس سے کچھ فاصلے پر چلا گیا تھا۔ وہ اسی جگہ بیٹھا ہوا بس کی طرف دیکھتا رہا۔

پھر اس نے ایک لڑکی کی چیخیں سنیں۔ دو ڈاکو اس لڑکی کو بس سے اتار کر گھسیٹتے ہوئے ایک گاڑی کی طرف لے جا رہے تھے۔ لڑکی بری طرح چیخ رہی تھی لیکن مسافروں میں سے کس میں اتنی ہمت تھی کہ وہ ڈاکوؤں کو روکنے کی کوشش کرتا۔

تنویر کے لیے اس لڑکی کی چیخیں ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھیں۔ ان چیخوں نے اس کے اندر کے پرانے تنویر کو اچانک بیدار کر دیا تھا۔

وہ زمین پر پیٹ کے بل لیٹ کر کسی سانپ کی طرح رینگتا ہوا اس گاڑی کی طرف بڑھنے لگا جس میں اس لڑکی کو بٹھایا گیا تھا۔

اندھیرے کی وجہ سے اس کے دیکھ لیے جانے کا امکان نہیں تھا۔

جیپ کے پاس آکر اس نے گردن اٹھائی۔ اس جیپ میں وہ لڑکی سہمی ہوئی بیٹھی تھی اور صرف ایک ڈاکو اس کے پاس تھا۔ شاید اسے لڑکی کی نگرانی کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا جبکہ اس کے دوسرے ساتھی بس میں لوٹ مار کر رہے تھے۔

تنویر کے لیے اس اکیلے ڈاکو کو قابو میں کرنا کوئی مشکل نہیں ہوا۔ اس نے کسی چیتے ہی کی طرح اس پر چھلانگ لگائی اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ وہ آواز بھی نہیں نکال پایا۔

تنویر نے نہ صرف اس کی بندوق اپنے قبضے میں کر لی تھی بلکہ اسے بے ہوش کر کے ایک طرف ڈال دیا تھا جبکہ وہ لڑکی پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

ڈاکو سے اطمینان کے بعد تنویر نے لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔ ''جلدی چلو۔ گھبراؤ نہیں۔ میں بھی بس کے مسافروں میں سے ایک ہوں۔''

وہ لڑکی اس وقت اتنی زیادہ گھبرائی ہوئی تھی کہ اس نے تنویر کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ دونوں اندھیرے میں ایک طرف رینگ گئے۔

''بس اب جتنی تیز دوڑ سکتی ہو دوڑ جاؤ۔'' تنویر نے کہا۔

اندھیرے میں کچھ دور جانے کے بعد انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ گھنے درختوں کے درمیان آگئے ہیں۔ ہر طرف پریشان کر دینے والا گھپ اندھیرا اور الجھے ہوئے راستے۔

اندھیرے میں انہیں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر اچانک سڑک کی طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ لڑکی چیخ کر تنویر سے لپٹ گئی۔

''گھبراؤ نہیں۔'' تنویر نے اسے تسلی دی۔ ''شاید انہیں تمہارے فرار کا پتا چل گیا ہے اسی لیے وہ خوف زدہ کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ کر رہے ہیں۔''

اس نے لڑکی کے رونے کی آواز سنی۔ وہ آہستہ آہستہ روئے جا رہی تھی۔ ''خدا کے لیے رونا بند کرو۔'' تنویر نے کہا۔ ''ہم ابھی خطرے سے دور نہیں ہوئے۔ وہ تمہارا پیچھا کر رہے ہوں گے۔''

لڑکی نے اپنی سانسیں تک روک لی تھیں۔ وہ دوڑتے چلے گئے۔ جھاڑیاں ان کا راستہ روک رہی تھیں۔ انہیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس طرف جا رہے ہیں بس جان بچانے کی فکر انہیں دوڑائے... جا رہی تھی۔

☆☆☆

باذل کے سامنے افشین ایسی لگ رہی تھی جیسے کوئی معصوم سی فاختہ۔

باذل اسے تولنے والی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے دہاڑتے ہوئے کہا۔ ''چھوکری! کیا تجھے اندازہ ہے کہ میں تیرے ساتھ کیا کرنے والا ہوں؟''

افشین تھوک نگل کر رہ گئی۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ پورے بدن پر لرزہ طاری تھا۔ ''چل اٹھ، کونے میں کیوں پڑی ہے؟ تیرے ناخن تو بہت بڑے بڑے ہیں۔ حملہ کر مجھ پر۔ وہ دیکھ... وہ کونے میں ایک بندوق پڑی ہوئی ہے۔ اسے اٹھا کر گولی چلا دے مجھ پر۔''

''خدا... خدا کے لیے معاف کر دو۔'' افشین روتے ہوئے بولی۔

''تو حملہ کیوں نہیں کرتی؟ مجھے ایسی عورت پسند نہیں ہے جو اپنی عزت بچانے کے لیے شور بھی نہ کر سکے۔ مجھے شیرنیاں پسند ہیں۔ پھاڑ دے مجھ کو۔ مار مجھے۔ ناخنوں سے میرا چہرہ بگاڑ دے۔''

لیکن افشین اپنی جگہ پر کھڑی کانپتی رہی۔

''تف ہے تجھ پر۔'' باذل غصے سے بولا۔ ''میں نے تجھے کیا سمجھا تھا اور تو کیا نکلی۔ خیر، اب تو آرام کر۔ مجھے تجھ سے ابھی کچھ نہیں لینا دینا۔''

''مجھے جانے دو۔'' افشین روتے ہوئے بولی۔

''ہاں، ہاں چھوڑ دوں گا تجھے۔ تیرا اچار نہیں بناؤں گا۔'' باذل نے کہا۔ ''یہ لے اپنا موبائل۔'' اس نے موبائل افشین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''نمبر ملا اپنے باپ کا اور اسے بتا دے کہ تیرے ساتھ کیا گزری ہے۔''

افشین نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے پاپا کا نمبر ملایا۔ ''پاپا! مم... میں یہاں ہوں...'' وہ اس سے آگے کچھ نہیں بول پا رہی تھی۔

باذل نے اس کے ہاتھ سے موبائل جھپٹ لیا۔ ''سنو سیٹھ صاحب! تمہاری بیٹی اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ میرا نام سنو گے تو بخار آجائے گا۔ باذل نام ہے میرا... باذل۔ چلو تم سے پھر بات کروں گا۔''

اس نے موبائل آف کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا پھر اس نے افشین کی طرف دیکھا۔ ''آرام کر۔ کل صبح تجھ سے بات ہوگی۔''

باذل کے جانے کے بعد بھی اس کی دہشت اس کمرے میں رہی تھی۔

افشین ایک کونے میں بیٹھی کانپ رہی تھی۔ زندگی نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ کل تک اس کے ایک اشارے پر اپنی جانیں دینے والے نہ جانے کہاں رہ گئے تھے۔

اب اس کے سامنے جو کچھ بھی تھا، وہ بہت بھیانک تھا۔ ایک خطرناک آدمی نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ یہ سب کچھ ایک لمحے کی تبدیلی تھی اور یہ لمحہ بہت طویل ہوتا جا رہا تھا۔

ایک بار پھر قدموں کی آہٹ گونجی۔ افشین بھڑک کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ساتھی ذیشان کو بھی اس کوٹھری میں دھکیل دیا گیا تھا۔ اس کی حالت شاید افشین سے بھی زیادہ خراب تھی۔

افشین جلدی سے اس کے پاس پہنچ گئی۔ ''بتاؤ، کیا ہوا؟ تمہیں کیسے آنے دیا؟ اس نے تو تمہیں الگ رکھا ہوا تھا؟''

''افشین! ہم بہت خطرناک آدمی کے چنگل میں پھنس گئے ہیں۔'' ذیشان نے کہا۔ ''یہاں سے نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ ہمارے والدین ان کا مطالبہ پورا کر دیں۔''

''میرے پاپا سے اس نے بات تو کی ہے۔'' افشین نے بتایا۔ ''لیکن ابھی اپنا مطالبہ نہیں بتایا ہے۔''

''میرے گھر والوں سے رابطہ نہیں ہو پا رہا۔'' ذیشان نے بتایا۔ ''شاید سگنل کی خرابی ہے۔''

اسی وقت باہر سے ڈھول پیٹے جانے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ ڈھول ایک ترتیب اور آہنگ کے ساتھ بجائے جا رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔

اسی وقت کوٹھری میں ایک ڈاکو داخل ہوا... ''باہر نکلو، تم دونوں۔ سردار بلا رہا ہے۔''

''نہیں، میں نہیں جاؤں گی۔'' افشین نے خوف زدہ ہو کر ذیشان کا بازو تھام لیا تھا۔

''جانا پڑے گا افشین۔'' ذیشان نے کہا۔ ''یہ خطرناک لوگ ہیں۔''

چھوٹے سے میدان میں باذل ایک اونچی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ بہت سے الاؤ روشن تھے۔ اس جنگل کی خاموشی کو ڈھول کی آوازیں توڑ رہی تھیں۔ کچھ عجیب، پُراسرار اور بھیانک سا ماحول تھا۔

گھنا جنگل، خطرناک صورتوں والے ڈاکو۔ ڈھول بجاتے ہوئے لوگ اور الاؤ کی روشنی۔ ان دونوں کو باذل کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ وہ بہت گہری نگاہوں سے ان دونوں کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے اشارے پر ڈھول پیٹنے والوں نے ڈھول بجانے بند کر دیے۔

ایک اعصاب شکن سا سناٹا در آیا تھا۔ دونوں کو اپنی دھڑکنیں تک صاف سنائی دینے لگیں۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا؟

''کیوں، بہت محبت ہے تم دونوں میں؟'' باذل نے گہری سانس لی۔ ''ایک دوسرے کے عاشق معشوق ہو؟''

''نہیں سردار! ہم صرف دوست ہیں۔'' ذیشان نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بتایا۔

''دوست!'' باذل ہنس پڑا۔ ''واہ، کیا دوستی ہے۔ خیر، آج جشن کی رات ہے۔ آج دوست ایک طرف چپ چاپ بیٹھے گا اور دوستی ناچے گی۔ چلو ناچو۔'' یہ اس نے افشین سے کہا تھا۔

اس کے اشارے پر دوبارہ ڈھول بجنے لگے اور افشین کو ناچ کا آغاز کرنا پڑا۔

☆☆☆

جنگل ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

نہ جانے وہ کس طرف نکل آئے تھے۔ لڑکی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ چلتے چلتے کئی بار لڑکھڑا کر گر پڑی لیکن تنویر اسے سہارا دیے ہوئے چلنے پر مجبور کرتا رہا۔

وہ جانتا تھا کہ ڈاکو ان کی تلاش میں پورا جنگل چھان ماریں گے۔ اسی لیے انہیں کسی محفوظ جگہ پہنچنا ضروری تھا

"میں اب نہیں چل سکتی۔" لڑکی ڈوبتی ہوئی آواز میں بولی اور لڑکھڑا کر گر پڑی۔ تنویر بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ وہ بھی بری طرح ہانپ رہا تھا۔

اس کے اندازے کے مطابق دونوں نے اچھا خاصا فاصلہ طے کرلیا تھا۔ پھر اچانک ان دونوں کو کچھ محسوس ہوا۔

یہ ڈھول پیٹنے کی آوازیں تھیں۔ اس جنگل میں وہ آوازیں کسی عفریت کی طرح پھیلتی جارہی تھیں۔ "یہ... یہ کیا ہورہا ہے؟" لڑکی نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"شاید، آس پاس کوئی بستی ہے۔" تنویر نے کہا۔ "ہوسکتا ہے وہاں کوئی جشن ہورہا ہو۔"

"چلو، وہیں چلتے ہیں۔" لڑکی جلدی سے بولی۔

"اس طرح نہیں۔" تنویر نے سرگوشی کی۔ "ہم دور سے دیکھیں گے۔ اس کے بعد بستی میں جائیں گے۔ پتا نہیں کون لوگ ہیں۔"

کچھ دیر آرام کے بعد وہ پھر چلنے کے قابل ہو چکے تھے۔ ڈھول کی آوازیں اب تک آرہی تھیں۔ وہ انہی آوازوں کی طرف چل پڑے۔ بہت آہستہ آہستہ۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے۔ ایک دوسرے کا سہارا بنے ہوئے۔

ابھی تک انہیں ایک دوسرے کے نام بھی نہیں معلوم ہوسکے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے لیکن جان بچانے کے بے پناہ خوف نے انہیں ایک دوسرے کے قریب کردیا تھا۔

وہ جیسے جیسے آگے بڑھتے جارہے تھے، ڈھول کی آوازیں اور واضح ہوتی جارہی تھیں۔ بالآخر انہیں درختوں کے ایک سلسلے کی دوسری طرف روشنی بھی دکھائی دے گئی۔ یہ شاید الاؤ کی روشنی تھی۔ زرد اور تھرتھراتی کانپتی ہوئی۔

"سنو۔" تنویر نے سرگوشی کی۔ "اس وقت تمہارا روشنی کے پاس جانا مناسب نہیں ہے۔ تم یہیں رہنا۔ میں جائزہ لے کر آتا ہوں۔"

"نہیں۔" لڑکی نے خوف زدہ ہوکر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "میں اکیلی نہیں رہ سکوں گی۔"

"سمجھا کرو۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔" تنویر نے کہا۔ "میں بس پانچ منٹ میں واپس آرہا ہوں۔"

تنویر کی واپسی جلد ہی ہوگئی تھی۔

لڑکی ایک درخت کے تنے سے چمٹی بیٹھی تھی۔ تنویر نے پہلے اسے آواز دی۔ پھر اس کے پاس ہی جا کر بیٹھ گیا۔ "یہ لوگ ڈاکو معلوم ہوتے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "شاید شہر سے ایک لڑکی اور ایک لڑکے کو پکڑ لائے ہیں۔"

"میرے خدا!" لڑکی نے ایک گہری سانس لی۔ "لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے بہت قریب سے جائزہ لیا ہے۔" تنویر نے بتایا۔

"اور یہ ڈھول پیٹنے کی آوازیں؟" لڑکی نے پوچھا۔ "یہ کیوں آرہی ہیں؟"

"وہ ڈاکو اس بے چاری سے زبردستی ڈانس کروا رہے ہیں۔" تنویر نے بتایا۔

لڑکی سہم کر خاموش ہوگئی۔

☆☆☆

ملک فیاض کے لیے یہ شہرہ تھا کہ وہ ایک بہادر اور بے خوف قسم کا پولیس آفیسر ہے۔

جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک ظالم اور راشی انسان تھا اس لیے اس کی دہشت پھیلی ہوئی تھی جبکہ اندر سے وہ بہت بزدل واقع ہوا تھا۔

وہ مجرموں کے خلاف سازشیں تو کرسکتا تھا لیکن انہیں للکارتا ہوا ان کے سامنے نہیں آسکتا تھا۔ اسی لیے جب اعلیٰ حکام نے اسے طلب کیا تو وہ بہت گومگو کی کیفیت میں ان کے سامنے پہنچا تھا۔

وہاں پولیس، آرمی، انٹیلی جنس کے لوگوں کے علاوہ دو اور سویلین بھی تھے جن میں سے ایک کو وہ اچھی طرح جانتا تھا جبکہ دوسرا اس کے لیے اجنبی تھا۔

"ملک فیاض! معاملہ بہت گمبھیر ہے۔" اس سے کہا گیا۔ "اور تمہارے شانوں پر ایک بہت بڑی ذمے داری ڈالی جارہی ہے۔"

"حاضر ہوں جناب۔"

"یہ صاحب ابراہیم بھائی ہیں۔" ایک آفیسر نے ایک سویلین کی طرف اشارہ کیا۔ "ان کی بیٹی کو باذل ڈاکو نے اغوا کرلیا ہے۔"

"جی جناب! معلوم ہے مجھے۔"

"اور یہ شاہ صاحب ہیں۔ ان کا بیٹا بھی اسی لڑکی کے ساتھ اغوا ہوا ہے۔ باذل ڈاکو سے دونوں کی بات ہوچکی ہے۔ اس نے دس دس کروڑ روپے مانگے ہیں۔"

"یہ تو بہت بڑی رقم ہے جناب۔"

"ہاں ہے تو بڑی رقم... لیکن اولاد کے سامنے تو کچھ بھی نہیں ہے۔" ابراہیم بھائی نے کہا۔ "ان لوگوں سے میرا رابطہ ہوچکا ہے۔"

"مسئلہ یہ ہے کہ وہ علاقہ جنگلوں کا ہے۔ اگر یہ واردات شہر میں ہوتی تو ہم کسی نہ کسی طرح ان ڈاکوؤں سے نمٹ لیتے لیکن وہاں ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ پہلے بھی ہم نے کئی کارروائیاں کی ہیں لیکن سب ناکام ہوئیں۔ کیونکہ وہ پورا علاقہ درختوں سے گھرا ہوا ہے۔ میلوں میل تک کچھ پتا نہیں چلتا۔"

"سمجھ گیا جناب! یہ تو واقعی بہت خطرناک صورتِ حال ہے۔"

"اسی لیے ہم یہ ذمے داری تمہیں دے رہے ہیں کہ تم ایک بہادر انسان ہو۔"

"جی۔" ملک فیاض حیران رہ گیا۔ "میں نہیں سمجھا جناب! مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"تم بیس کروڑ روپے اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔" اس سے کہا گیا۔ "وہ جگہ بھی طے ہوگئی ہے جہاں تمہیں پیسے لے کر پہنچنا ہے۔ دوسری طرف سے وہ ڈاکو ان دونوں کو لے کر پہنچیں گے۔ تم پیسے ان کے حوالے کرو گے اور ان دونوں کو لے کر واپس آجاؤ گے۔"

"لیکن جناب!" ملک فیاض کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ "یہ تو بہت ذمے داری کی بات ہے۔"

"اسی لیے تو تمہارا انتخاب ہوا ہے۔"

"لیکن میں اکیلا۔"

"اکیلے نہیں۔ تمہارے ساتھ دوسرے پولیس والے بھی ہوں گے لیکن یہ قافلہ کندھ کوٹ میں رک جائے گا۔ کندھ کوٹ سے تم جیپ لے کر اکیلے جنگل کی طرف جاؤ گے۔"

"آپ لوگوں نے مجھے بہت بڑی ذمے داری دے دی ہے جناب۔" ملک فیاض پریشان ہورہا تھا۔

"اس کا اندازہ ہے ہمیں۔ لیکن یہ کام تمہارے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔ بس اب چلنے کی تیاری کرو۔ ہمارے پاس صرف دو دنوں کی مہلت ہے۔"

☆☆☆

جنگل کی صبح بہت خوب صورت تھی۔

پرندوں کی آوازوں نے ایک ایسا خوشگوار اثر مرتب کیا تھا کہ وہ دونوں مبہوت ہوکر رہ گئے۔ اس لڑکی کا نام فرزین تھا۔ وہ ایک عام سے تاجر کی بیٹی تھی اور اپنے باپ کے ساتھ لاہور جارہی تھی کہ اس کے ساتھ راستے میں یہ سانحہ پیش آگیا تھا۔

تنویر نے اسے کھل کر اپنے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن اتنا ضرور تھا کہ رات بھر میں فرزین کو اس کے کردار کا اندازہ ہوگیا تھا۔ تنویر کسی محافظوں کی طرح اس کی دیکھ بھال کرتا رہا تھا۔

وہ دونوں الاؤ والی بستی سے کچھ دور نکل آئے تھے۔ یہ جنگل کسی طرح محفوظ تو نہیں ہوسکتا تھا لیکن اتنا ضرور تھا کہ انہوں نے سکون سے رات گزار لی تھی۔

صبح ان کے لیے کئی مسائل لے کر آئی تھی۔ تنویر نے فرزین سے کہا۔ "دیکھو، ہمیں کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکلنا ہے۔ جنگل چاہے لاکھ وسیع سہی لیکن کہیں نہ کہیں تو ختم ہونا ہے۔"

"لیکن ہم کس طرف جائیں گے؟"

"یہ تو خود میں بھی نہیں بتا سکتا۔" تنویر نے کہا۔ "لیکن نکلنے کی کوشش تو کرنی ہے نا۔ یہاں تو ویسے بھی بھوکے پیاسے مرجائیں گے۔"

رات بھر کے آرام نے انہیں تازہ دم کردیا تھا۔

دونوں پھر چل پڑے۔ دن کی روشنی نے جنگل کی ہیبت ناکی کو بڑی حد تک کم کردیا تھا پھر بھی دیکھ لیے جانے کا خوف تو لگا ہوا تھا۔ اس لیے وہ بہت احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے۔

"نہ جانے وہ لڑکی کون ہوگی جس کو یہ کم بخت اٹھا کر لے آئے ہیں۔" فرزین نے چلتے چلتے کہا۔ "اور اس سے زبردستی رقص بھی کروا رہے ہیں۔"

"خدا جانے کون ہے۔ ویسے میں اگر اکیلا ہوتا تو شاید اسے نکال لے جانے کی کوشش ضرور کرتا۔" تنویر نے کہا۔ فرزین نے گزشتہ رات تنویر کی بہادری دیکھ لی تھی۔ وہ اسی قسم کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

پھر اچانک درختوں کے سلسلے ختم ہوگئے اور ایک بستی سامنے آگئی۔ یہ خاصی بڑی بستی تھی۔ بے شمار کچے پکے مکانات اور سڑکیں۔ دور سے کسی مل کی چمنی بھی دکھائی دے رہی تھی۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" فرزین نے تنویر سے پوچھا۔

"پتا نہیں، میں خود پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔" تنویر نے جواب دیا۔

کچھ دور چلنے کے بعد دکانوں پر لگے ہوئے بورڈز سے اندازہ ہوگیا کہ یہ کندھ کوٹ تھا اور اچانک تنویر کو ایک ایسا آدمی دکھائی دے گیا جسے وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

بلکہ اس کی ساری پریشانیاں اس آدمی کی وجہ سے ہی تھیں۔ وہ ملک فیاض تھا۔ وہ اس وقت ایک دکان کے باہر دو تین پولیس والوں کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔

تنویر اس لڑکی کا ہاتھ تھام کر ایک آڑ میں ہوگیا۔

فرزین بہت غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''کیا تم اس پولیس والے سے خوف زدہ ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' تنویر نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں جانتا ہوں اس کو اور میری ساری پریشانیاں اسی آدمی کی وجہ سے ہیں۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ یہاں کیوں دکھائی دے رہا ہے؟''

فرزین کچھ پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''اوہ، شاید تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں کوئی جرائم پیشہ شخص ہوں۔'' تنویر نے کہا۔ ''کسی حد تک تم صحیح سمجھی ہو۔ اب تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میری کہانی کیا ہے تاکہ میری طرف سے تمہارا دل صاف ہو جائے اور تم مجھ پر اعتبار کرنے لگو۔''

''تو پھر بتاؤ۔''

''یہاں نہیں۔ پہلے رہنے کا کوئی ٹھکانا تلاش کرلیں۔ ہمیں واپسی کے سفر کا انتظام بھی تو کرنا ہے۔ ساری زندگی تو ہم نہیں رہ سکتے۔'' ملک فیاض اپنے ساتھی پولیس والوں کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر کسی طرف چلا گیا تھا۔ وہ دونوں آڑ سے نکل کر پھر ایک طرف چل پڑے۔

اچانک ایک جیپ ان کے پاس آکر رک گئی۔

اس جیپ میں محافظوں کے ساتھ بخت نواز بیٹھا ہوا تھا۔ اس علاقے کا بادشاہ۔ بخت نواز کی نگاہیں بُری طرح فرزین پر مرکوز تھیں۔ تنویر نے فرزین کو اپنی آڑ میں کر لیا تھا۔

بخت نواز جیپ سے اتر کر ان دونوں کے پاس آگیا۔ اس کے دونوں محافظ بھی اتر آئے تھے۔ ''کون ہو تم دونوں؟'' بخت نواز نے پوچھا۔

''مسافر۔'' تنویر نے مختصر سا جواب دیا۔

''اوہ، میری حویلی مسافروں کے لیے کھلی رہتی ہے۔ مہمان تو اوپر والے کی رحمت ہوتے ہیں۔ ویسے کہاں جانا ہے تم دونوں کو؟''

''سائیں! ہماری بس کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا تھا۔'' تنویر نے بتایا۔ ''ہم بڑی مشکلوں سے بھاگے ہیں۔''

''یہ تو بہت ظلم ہے بابا۔ یہ ڈاکو بہت سر اٹھانے لگے ہیں۔'' بخت نواز نے کہا۔ ''خیر، آؤ ہمارے ساتھ۔ دو چار دن مہمان رہ کر چلے جانا۔''

''نہیں جناب! ہمارے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔'' تنویر نے کہا۔ ''آپ ہمیں جانے دیں۔''

''یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔'' بخت نواز فرزین کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم مہمان بنے بغیر چلے گئے تو یہ ہماری توہین ہوگی بابا... آؤ۔''

فرزین نے تنویر کا ہاتھ تھام کر اسے اس طرح دبا دیا جیسے وہ تنویر کو روکنا چاہتی ہو۔

''چلو بابا، کیا سوچ رہے ہو؟''

تنویر اس وقت بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ شخص صرف مہمان بنانے کے لیے ساتھ نہیں لے جا رہا بلکہ اس کی نگاہیں فرزین پر ہیں۔ اگر فرزین ساتھ نہ ہوتی تو شاید وہ بہت کچھ کر گزرتا لیکن فرزین کی وجہ سے بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔

اس نے فرزین کو تسلی دی۔ ''گھبراؤ نہیں۔ یہ صاحب بہت مہمان نواز معلوم ہوتے ہیں۔ ہم ایک دو دن ان کے مہمان بن کر واپس چلے جائیں گے۔''

☆☆☆

باذل ایک بار پھر بخت نواز کے سامنے تھا۔

بخت نواز کا موڈ بہت خراب ہو رہا تھا۔ ''تم نے سارے معاملات خود ہی طے کر لیے۔ مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے سائیں۔'' باذل جلدی سے بولا۔ ''میں تو خود آپ کو بتانے والا تھا۔''

''وہ لڑکی کیسی ہے؟''

''بہت خوب صورت ہے۔'' باذل نے بتایا۔

''کتنے میں بات ہوئی ہے؟''

''بیس کروڑ سائیں۔ بیس کروڑ بہت ہوتے ہیں۔''

''وہ بیس کروڑ یہاں آچکے ہیں۔'' بخت نواز مسکرا کر بولا۔ ''ایک بے وقوف پولیس والا لے کر آیا ہے۔ اس کے ساتھ دو اور پولیس والے بھی ہیں۔ اسی حویلی میں رقم اور ان دونوں کا تبادلہ ہوگا۔ میں نے ہی اعلیٰ آفیسروں کو اس بات پر راضی کیا تھا۔''

''جی سائیں، آپ حکم دیں۔''

''تم ان دونوں کو پولیس والوں کے حوالے کر کے ان سے رقم وصول کرو گے اور جب وہ واپس جانے لگیں تو راستے میں گھیر کر پولیس والوں کو مار دینا اور ساتھ میں اس نوجوان کو بھی۔ اور لڑکی کو غائب کر دینا... پھر یہی سمجھا جائے گا کہ ڈاکوؤں نے ایسا کیا ہے۔ سارا الزام تم پر آجائے گا۔''

''الزام کی تو کوئی پروا نہیں ہے سائیں، بس آپ کا سایہ سلامت رہے۔''

''بیس میں سے پانچ تم رکھ لینا پھر اس لڑکی اور پندرہ کروڑ کو میرے پاس پہنچا دینا۔''

"ایسا ہی ہوگا سائیں۔"

"بس اب جاؤ اور اپنے آدمیوں کو پولیس والوں کی واپسی کے راستے میں بٹھا دو۔ اور ہاں، وہ دونوں کہاں ہیں؟"

"انہیں یہیں کندھ کوٹ کے ایک گھر میں رکھا ہے سائیں۔"

"ٹھیک ہے۔ آدھ گھنٹے بعد ان دونوں کو یہیں لے کر آجانا۔" بخت نواز نے کہا۔ "لین دین یہیں ہوگی۔"

باذل کو ہدایت دینے کے بعد وہ ایک دوسرے بڑے کمرے میں آگیا۔ اس کمرے میں تنویر اور فرزین بیٹھے ہوئے تھے۔

"تم لوگوں نے کچھ کھایا؟" بخت نواز نے پوچھا۔

"جی جناب! آپ کا بہت بہت شکریہ۔" تنویر نے کہا۔ "لیکن اچھا ہوتا آپ اگر جانے کی اجازت دے دیتے۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔" بخت نواز غرا کر بولا۔ "یہاں کوئی ہماری مرضی کے خلاف باہر نہیں جاسکتا۔" اس نے اپنے تیور اچانک بدل لیے تھے۔

پھر وہ اس کمرے سے باہر چلا گیا۔

فرزین بری طرح کانپنے لگی۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" اس نے روتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گئے ہیں۔" تنویر نے کہا۔ "لیکن تم پریشان مت ہو۔ مجھے اپنے خدا پر پورا بھروسا ہے۔ جس طرح اس نے اب تک سلامت رکھا ہے، اسی طرح آئندہ بھی ہماری حفاظت فرمائے گا۔"

"ایسا لگتا ہے جیسے پورا معاشرہ ہی ظالم اور ڈاکو ہوگیا ہے۔"

"ہاں، اب تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔" تنویر نے ایک گہری سانس لی۔ "بہرحال میں ذرا باہر کے حالات کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔"

"نہیں، مجھے ڈر لگے گا۔"

"تم دروازہ اندر سے بند کرلینا اور جب تک میری آواز نہ سنو دروازہ نہیں کھولنا۔"

اس کمرے سے باہر ایک طویل برآمدہ تھا۔ ایک کونے میں ایک بڑا سا ہال نما کمرا تھا۔ برآمدے سے اتر کر ایک باغ تھا۔ اونچے اونچے درخت۔ فوارے لگے ہوئے تھے۔ ایک راستہ ان درختوں کے درمیان سے ہوتا ہوا باہر گیٹ تک چلا گیا تھا۔

اچانک گیٹ کی طرف سے ملک فیاض اور پولیس والے آتے دکھائی دیے۔ انہوں نے بریف کیس اٹھا رکھے تھے۔ تنویر فوری طور پر آڑ میں ہوگیا۔

وہ لوگ کونے والے بڑے کمرے میں چلے گئے تھے۔

یہاں ملک فیاض کی موجودگی تنویر کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ پولیس والوں سے ذرا پیچھے دو اور آدمی بھی تھے۔ تنویر انہیں بھی دیکھ کر حیران رہ گیا۔

ان میں ایک کو وہ اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ اسی فیکٹری کا مالک تھا جہاں تنویر نے ملازمت کی تھی اور ملک فیاض کے کہنے پر اسے ملازمت سے نکال دیا گیا تھا۔

ان سبھوں کا یہاں جمع ہونا یونہی نہیں ہوسکتا تھا۔ یقیناً کوئی خاص بات تھی۔

اچانک کوئی ٹھنڈی چیز اس کی گردن سے آلگی۔

"اوئے تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

کسی نے اس کی گردن پر ریوالور کی نال رکھ دی تھی۔ یہ ایک لمحے کی کہانی تھی۔ اس ایک لمحے نے پرانے تنویر کو بیدار کردیا تھا۔

اس نے بجلی کی سرعت سے جھکائی دے کر ریوالور پر نہ صرف ہاتھ ڈال دیا بلکہ اس کا بھرپور وار اس محافظ کی کنپٹی پر بھی پڑا تھا جس نے اسے دھمکانے کی کوشش کی تھی۔

ایک طویل کراہ کے ساتھ وہ ایک طرف لڑھک چکا تھا۔

برآمدہ ابھی تک سنسان تھا۔ سب لوگ کونے والے بڑے کمرے میں داخل ہوچکے تھے۔ تنویر نے بے ہوش محافظ کو اٹھا کر سیڑھیوں کے نیچے ڈال دیا اور پھر ایک دوسرا گروپ آتا ہوا دکھائی دے گیا۔

چند خطرناک صورت طویل قامت لوگ اور ان کے آگے آگے چلتے ہوئے ایک نوجوان لڑکی اور ایک نوجوان لڑکا۔ یہ دونوں قیدی معلوم ہوتے تھے۔

تنویر نے اس لڑکی کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی تھی جس کو ناچنے کے لیے مجبور کیا جارہا تھا۔ ذرا سی دیر میں سب کچھ اس کی سمجھ میں آچکا تھا۔

وہ برآمدے سے اتر کر حویلی کے درختوں کے درمیان چکر لگاتا ہوا کونے والے کمرے کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔

ایک بڑی سی کھڑکی تھی جس سے اندر کے حالات دیکھے جاسکتے تھے۔ اس وقت وہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ کھڑکی

کے پاس بھی ایک درخت تھا۔

وہ درخت کے درمیان چھپ کر اندر کے حالات دیکھ اور سن رہا تھا۔

اندر بہت سے لوگ تھے۔ بخت نواز، ڈاکو، فیکٹری کا مالک، لڑکا اور لڑکی، ملک فیاض اور اس کے ساتھ آنے والے پولیس کے سپاہی۔

باتوں سے پتا چل گیا تھا کہ پولیس والے اور دونوں سولین اپنے ساتھ جو رقم لے کر آئے تھے، وہ ڈاکوؤں کے حوالے کردی گئی تھی اور ڈاکوؤں کو دونوں یرغمالی واپس کرنے تھے۔

معاملات طے پاچکے تھے۔

اب انہیں چلنے کی تیاری کرنی تھی کہ اچانک کچھ اور ہوگیا۔

ایک ڈاکو جو بریف کیس کھول کر دیکھ رہا تھا، اس نے اچانک اعلان کیا۔ "بات سنو، اس میں روپے کم ہیں۔ یہ بیس کروڑ نہیں ہیں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" ملک فیاض دہاڑا۔

"سائیں! ہمارا یہ بندہ نوٹوں کو سونگھ کر بتا سکتا ہے کہ اس میں کتنی کمی ہوگی۔"

"سردار! کم از کم پانچ کروڑ کم لگتے ہیں۔"

باذل نے اپنی جیب سے ریوالور نکال کر اس کا رخ ملک فیاض کی طرف کردیا۔ "اب بتاؤ کہاں گئے پانچ کروڑ؟ ورنہ یہیں دفن کردیے جاؤ گے۔"

ملک فیاض نے بے بسی سے اپنی گردن جھکا لی۔

"ہاں، وہ ہم نے پہلے ہی نکال لیے تھے۔"

"بس تو اب یہ دونوں اس وقت تک ہمارے پاس رہیں گے جب تک کمی پوری نہیں ہوتی... اور اب اس دھوکے کے لیے دس کروڑ اوپر سے دینے پڑیں گے۔"

باذل نے آگے بڑھ کر لڑکی کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ لڑکی نے بلند آواز میں رونا شروع کردیا۔ کمرے میں عجیب قسم کا تناؤ پیدا ہوگیا تھا۔

"سائیں! آپ کیا کہتے ہیں؟" باذل نے بخت نواز کی طرف دیکھا۔

"بابا! جو تمہاری مرضی ہے وہ کرو۔" بخت نواز غصے سے بولا۔ "ان لوگوں نے دھوکا دیا ہے۔ اس کی سزا تو ملنی چاہیے نا۔"

باذل لڑکی کا ہاتھ تھام کر اسے گھسیٹتا ہوا دروازے کی طرف لے جانے لگا۔ اسی وقت ایک گولی چلی اور باذل ایک چیخ کے ساتھ ایک طرف الٹ گیا۔ دوسری گولی نے دوسرے ڈاکو کو ڈھیر کردیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کوئی کھڑکی کے ذریعے کمرے میں کود آیا۔ یہ تنویر تھا۔ اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بخت نواز کے پیچھے جا کر اس کی گردن سے ریوالور لگا کر اسے بے بس کردیا تھا۔

"اب تم ہم سب کو خیروخوبی کے ساتھ یہاں سے باہر نکالو گے۔" تنویر نے کہا۔

ملک فیاض اور فیکٹری کے مالک پر سکتہ سا طاری ہوگیا تھا۔

"جلدی کرو۔" تنویر غرایا۔ "ورنہ تم بھی یہاں تڑپتے ہوئے دکھائی دو گے اور ہم تمہیں یرغمالی بنا کر اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ کیونکہ تم لوگوں کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔"

☆☆☆

شہر کے قریب لا کر بخت نواز کو جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

تنویر ان سب کو اس علاقے سے باہر نکال لایا تھا۔

ملک فیاض نے بتا دیا تھا کہ اس نے وہ پانچ کروڑ کہاں نکال کر رکھے تھے۔

تنویر نے بھی اپنی کہانی سنا دی تھی۔ بخت نواز کو رخصت کردینے کے بعد تنویر اور فرزین گاڑی سے اتر آئے تھے۔

"تنویر! تم اب ہمارے ساتھ چلو۔" ملک فیاض نے کہا۔ "ہم نے تمہیں بہت غلط سمجھا تھا۔"

"میری فیکٹری کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہوئے ہیں۔" افشین کے باپ نے کہا۔

"آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ... لیکن اب میری منزل کچھ اور ہے۔" تنویر دھیرے سے بولا۔ "اب مجھے وہیں سے اپنا سفر شروع کرنا ہے جہاں سے ختم ہوا تھا۔"

"اور میں اس سفر میں تمہارے ساتھ ہوں۔" فرزین بول پڑی۔ "میری برادری اب مجھے کسی بھی قیمت پر قبول نہیں کرے گی کیونکہ ان کے خیال میں، میں نے بہت دن ڈاکوؤں کے ساتھ گزارے ہیں۔ میں ناپاک ہوچکی ہوں۔"

تنویر نے آسمان کی طرف دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا اور اپنی گردن جھکا لی۔ اسے زندگی گزارنے کا وسیلہ فراہم ہوگیا تھا۔

دھن کے بندھن میں بندھ کے ہر بندھن سے آزاد ہوجانے والے ہوس پرست کا چشم کشا فسانہ

قرضِ جاں

سلیم فاروقی

انسان سمندر کے جھاگ کی طرح ہے... جو پانی کی سطح پر تیر رہا ہو... جب ہوا چلتی ہے تو وہ اس طرح غائب ہوجاتا ہے جیسے کبھی تھا ہی نہیں... اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا ایک سرائے فانی ہے... اس کے باوجود انسان اس حقیقت سے نظریں بچا کے ایسے کام کرتا ہے... جس سے انسانیت شرما جائے... ایک ایسے ہی نوجوان کی ... زندگی کے پیچ و خم... جو ہر موڑ پر ایک نیا رخ اختیار کررہے تھے... ایک پل کی لغزش بعض اوقات زندگی بھر کا روگ بن جاتی ہے... وہ بھی غلطی کرکے تمام عمر کے لیے قرضِ جاں کا مقروض بن چکا تھا...

ایک مصروف دن کا آغاز ہوچکا تھا۔ آج بھی سب کچھ ہمیشہ کی طرح تھا۔ وہی ٹریفک کا شور، وہی کھڑکھڑاتی اور دھواں چھوڑتی بسیں، وہی لوگوں کی بھیڑ! مجھے ان مناظر سے اب وحشت سی ہونے لگی تھی۔ کوئی بس یا ویگن آتی تو لوگ ایک دوسرے کو دھکیلتے، پاؤں کچلتے دیوانہ وار اس کی طرف لپکتے لیکن بس میں پہلے ہی اتنے انسان لٹک رہے ہوتے کہ بس میں مزید گنجائش نہ ہوتی۔ اس کے باوجود کچھ جیالے جان پر کھیل کر کسی نہ کسی طرح ایک پیر یا صرف اس کا پنجہ ہی ٹکانے کی جگہ نکال لیتے اور بس آگے بڑھ جاتی۔ مجھے وہ منظر دیکھ کر ابلتے ہوئے دودھ کا خیال آتا۔ دودھ بھی ابلنے کے بعد اسی طرح پتیلی کے کناروں سے چھلک جاتا ہے۔

میں ہمیشہ گھر سے کم از کم ڈیڑھ گھنٹا پہلے نکلتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ پہلی کوشش میں تو بس ملنا مشکل ہے۔ دو چار بسوں کے پیچھے دوڑ کر اور دھکے کھا کر میں کسی نہ کسی طرح بس پکڑنے میں کامیاب ہوپاتا تھا۔ کبھی کبھی تو بس اسٹاپ ہی پر اتنی دیر ہوجاتی کہ میں آفس سے لیٹ ہوجاتا۔ غنیمت تھا کہ انیس صاحب کا تبادلہ ہوگیا تھا اور ان کی جگہ مسعود صاحب نے لے لی تھی۔ مسعود صاحب اپنے ماتحتوں کے ساتھ بہت نرمی سے پیش آتے تھے۔ انیس صاحب کی طرح کبھی سخت سست نہ کہتے، کبھی وقت کی پابندی پر لیکچر نہ جھاڑتے۔ پہلے وہ دیر سے آنے والے ماتحت کو غور سے دیکھتے پھر دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالتے اور اپنے کام میں مصروف ہوجاتے۔ ان کے اس عمل سے مجھ پر گویا گھڑوں پانی پڑ جاتا اور میں دل ہی دل میں عہد کرتا کہ آئندہ وقت پر آنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔

آج بھی ہمیشہ کی طرح دو بسیں نکل چکی تھیں۔ اب میں تیسری بس کا انتظار کررہا تھا۔ تیسری بس آئی تو وہ بھی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی لیکن میں اپنے کپڑوں اور چمکتے ہوئے جوتوں کی پروا کیے بغیر لوگوں کے اس جم غفیر میں کود گیا۔ پھر وہی حال ہوا کہ دیکھنا چاہوں کہ یہ گردن میں بانہیں کس کی ہیں، دھڑ تو میرا ہے مگر اس دھڑ میں ٹانگیں کس کی ہیں؟

میں آفس پہنچا تو آٹھ بجنے میں تین منٹ تھے۔ گویا میں اپنے محنت سے استری کیے ہوئے کپڑوں اور چمکتے ہوئے جوتوں کی قربانی دے کر وقت پر آفس پہنچ چکا تھا۔

آفس سپرنٹنڈنٹ مسعود صاحب اپنی سیٹ پر موجود تھے۔ پھر دوسرے لوگ بھی ایک ایک کرکے آنے لگے۔

سرورق کی پہلی کہانی

مسعود صاحب کی وجہ سے سبھی وقت کے پابند ہوگئے تھے۔ میں نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کمپیوٹر آن کرلیا۔ دفتر میں آنے والی تمام ای میلز چیک کرنا بھی میری ذمے داری تھی۔ اس کے بعد میں آفس کے دوسرے کام دیکھتا تھا۔

ابو ایک سرکاری اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ زندگی بھر انہوں نے اسکول ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت کی تھی تو کہیں جا کر ان کی ترقی ہوئی تھی۔ ہمارے گھر میں مجھ سمیت صرف چار افراد تھے۔ امی، ابو، مجھ سے چھوٹی سیما اور میں۔ میں نے انٹرنیشنل ریلیشنز میں ماسٹرز کیا تھا اور کئی مہینے تک ملازمت کے لیے دھکے کھانے کے بعد گریڈ گیارہ کی یہ کلرکی ملی تھی۔ میں تو شاید انکار کردیتا لیکن ابو کی انتھک محنت دیکھ کر مجھے شرمندگی ہوتی تھی۔ میں ان کا ہاتھ بٹانا چاہتا تھا۔ یوں میں نے کلرکی بھی قبول کرلی۔

دفتر میں زیادہ کام نہیں ہوتا تھا، چار بجے تک چھٹی بھی ہوجاتی تھی۔ بس دفتر آنے جانے کی اذیت مار ڈالتی تھی۔

اس دن بھی حسبِ معمول کام ختم کرنے کے بعد میں کمپیوٹر کھول کر بیٹھ گیا۔ پہلے میں نے اپنی ذاتی ای میلز چیک کیں پھر فیس بک کھول کر بیٹھ گیا۔ یہ میرا روزانہ کا معمول تھا۔ گھر میں پرانا سا ایک کمپیوٹر تو تھا لیکن انٹرنیٹ کی سہولت نہیں تھی۔

چھٹی کے بعد میں بس اسٹاپ پر پہنچا تو پھر اسی اذیت کا سامنا تھا۔

میں گھر پہنچا تو شدید تھکن غالب تھی۔ جاتے ہی میں باتھ روم میں گھس گیا۔ نہا دھو کر، تازہ دم ہوکر نکلا تو کچھ جان میں جان آئی۔

میں آئینے کے سامنے کھڑا اپنے بال سنوار رہا تھا کہ سیما آگئی۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔ میں نے ہنس کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے سیما... بہت دانت نکل رہے ہیں؟“

”بھائی! بات ہی ایسی ہے۔“ وہ ہنس کر بولی۔ ”آپ سنیں گے بلکہ دیکھیں گے تو آپ بھی خوش ہوجائیں گے۔“

”میں دیکھوں گا... کسے؟“ میں نے الجھ کر پوچھا۔

”آیئے، میں آپ کو سرپرائز دوں۔“ وہ مجھے کھینچتی ہوئی کمرے سے باہر لے گئی۔ میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ”یہ... یہ... کس... کی ہے یہ؟... کون لایا ہے؟“ میں نے چمچماتی ہوئی موٹر سائیکل کو دیکھ کر کہا۔ اس کی سیٹ اور ہینڈل پر ابھی تک پلاسٹک چڑھا ہوا تھا اور نمبر پلیٹ تک نہیں تھی۔

”ہوگئے نا حیران!“ سیما چہک کر بولی۔ ”یہ آپ کی ہے۔ امی نے اس مقصد کے لیے کمیٹی ڈالی تھی۔ احسن بھائی ابھی شوروم سے لے کر آئے ہیں۔“

”احسن!“ میں نے کہا۔ ”کہاں ہے احسن؟“ احسن میرا بچپن کا دوست تھا اور ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتا تھا۔

”وہ تو خود آپ کو سرپرائز دینا چاہتے تھے لیکن ابھی کچھ دیر پہلے کسی کا ٹیلی فون آگیا تو وہ چلے گئے۔ کہہ رہے تھے کہ ایک گھنٹے تک آتا ہوں۔“

موٹر سائیکل دیکھ کر مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میری بھوک پیاس سب ہوا ہوگئی۔

میں دوبارہ لاؤنج میں آیا تو وہاں امی اور ابو بھی موجود تھے۔ میں بے اختیار امی سے لپٹ گیا اور بولا۔ ”تھینک یو امی...“

ابو کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔

تھوڑی دیر بعد احسن بھی آگیا اور مجھے خریداری کی رسید دے کر بولا۔ ”بائیک کا رجسٹریشن نمبر تمہیں پرسوں تک مل جائے گا۔ اس وقت تک رسید جیب میں رکھو اور اس

بائک پر جا کر سب کے لیے مٹھائی لے کر آؤ۔“

میں نے اپنے دوستوں کی موٹر سائیکلیں بہت چلائی تھیں لیکن یہ احساس ہی عجیب تھا کہ اب میں خود ایک عدد نئی بائک کا مالک تھا۔

میں دوسرے دن وقت سے کافی پہلے دفتر پہنچ گیا۔ اس وقت صرف چاچا نوردین موجود تھا۔ وہ جھاڑ پونچھ میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیرت سے بولا۔ ”علی بیٹے! کیا بات ہے، کیا رات بھر سوئے نہیں ہو یا فجر کے فوراً بعد گھر سے نکل گئے تھے؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے چاچا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”میں نے بائک لے لی ہے۔ میں گھر سے تو روزانہ کی طرح نکلا تھا لیکن آفس پہنچنے میں مجھے صرف بائیس منٹ لگے ہیں۔“

”ارے بیٹا! یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ اللہ مبارک کرے۔“

نوردین کی طرح مسعود صاحب بھی مجھے دفتر میں دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔

میں نے حسبِ معمول سرکاری ڈاک دیکھی پھر دفتر کے دوسرے کام نمٹائے اور کمپیوٹر پر اپنی میل چیک کرنے لگا۔ مجھے کبھی کوئی اہم ای میل موصول نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سرسری نظر اپنے ان باکس پر ڈالی پھر چونک اٹھا۔ وہاں کسی اینا نامی لڑکی کی میل تھی۔ میں نے الجھ کر سوچا، یہ اینا کون ہے؟

میں نے اس کی میل کھول لی۔ اس نے لکھا تھا۔ ”ڈیئر فرینڈ! میں نے کل آپ کی پروفائل دیکھی تو بہت پسند آئی۔ میں آپ سے دوستی کرنا چاہتی ہوں اور مجھے آپ سے ایک کام بھی ہے۔ کام میں اسی وقت بتاؤں گی جب آپ میری اس میل کا جواب دیں گے، اینا۔“

میں نے وہ چند سطریں دوبارہ پڑھیں پھر کئی بار پڑھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ اینا کون ہے اور اسے میری پروفائل میں کیا نظر آیا ہے کہ یہ مجھ سے دوستی کرنا چاہتی ہے۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ ممکن ہے یہ کسی دوست کی شرارت ہو۔ وہ اینا بن کر مجھے بے وقوف بنا رہا ہو۔ میں نے سر جھٹک کر سوچا، دیکھا جائے گا۔

پھر میں نے اینا کو لکھا۔ ”مس اینا! میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میری پروفائل میں ایسی کیا بات ہے جو آپ کو پسند آئی ہے۔ آپ میرے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ آپ پہلے اپنا تعارف کرا دیں۔“

میں نے اسے جواب دے کر کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کر دیا کیونکہ دفتر میں چھٹی ہو چکی تھی اور سب لوگ جا چکے تھے۔

واپسی کا سفر بہت خوش گوار تھا۔ اب نہ لوگوں کے دھکوں کا خطرہ تھا، نہ کپڑے خراب ہونے کا خوف۔ میں اطمینان سے گھر پہنچ گیا۔ اس دن پہلی مرتبہ مجھے انٹرنیٹ کی کمی محسوس ہوئی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ کسی نیٹ کیفے میں چلا جاؤں، پھر خیال آیا کہ اینا یا جو کوئی بھی وہ تھی، کون سا میرے انتظار میں بیٹھی ہوگی کہ میرا جواب ملتے ہی مجھے میل کر دیتی۔

میں نے جیسے تیسے رات گزاری۔ اس دن معمول کے مطابق میں صبح سویرے جوگنگ کے لیے بھی نہیں گیا۔ وقت تھا کہ گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو میں چونک اٹھا۔ دروازہ کھولا تو ٹریک سوٹ میں احسن کھڑا تھا۔ وہ پسینے میں شرابور تھا۔

”یار علی! تُو آج جوگنگ کے لیے کیوں نہیں آیا؟“ اس نے پوچھا۔ ”طبیعت تو ٹھیک ہے تیری؟“

”طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بس آج آنکھ ہی ابھی کھلی ہے۔“ پھر میں خفیف ہو کر بولا۔ ”تو اندر تو آ۔“

”نہیں یار!“ احسن نے کہا۔ ”مجھے ابھی آفس کا کچھ کام کرنا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میں نے اطمینان سے ناشتا کیا۔ اب مجھے ایسی کوئی جلدی نہیں تھی۔ سیما کالج جانے لگی تو میں نے اسے بھی روک لیا۔ اس کا کالج میرے آفس کے راستے میں تھا۔

میں آفس پہنچا تو آٹھ بجنے میں دس منٹ تھے۔ روزمرہ کے کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اپنی میل چیک کی تو میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ وہاں اینا کا جواب موجود تھا۔ میں نے اردگرد دیکھا لیکن کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں نے ای میل کھولی۔ جواب میں اینا نے لکھا تھا۔ ”مسٹر علی! آپ شاید مجھے کوئی ایسی ویسی لڑکی سمجھ رہے ہیں۔ میرا پورا نام اینا اینڈرسن ہے اور میں لاس ویگاس کے ایک بینک میں آفیسر ہوں۔ میں آپ کو اپنی دو تصویریں بھیج رہی ہوں تاکہ آپ کو کسی قسم کا کوئی شبہ نہ رہے۔ مجھے آپ سے جو کام ہے، وہ میں آپ کا جواب موصول ہونے پر بتاؤں گی۔ ہاں، جواب کے ساتھ اپنی تصاویر ضرور بھیجیے گا۔ یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ آپ نے میری دوستی کو قبول کر لیا ہے۔ آپ کی اینا۔“

میرے ہاتھ پیر لرزنے لگے۔ یونیورسٹی کے زمانے میں کئی لڑکیوں سے میری دوستی رہی تھی لیکن کسی لڑکی نے آج تک مجھے خط نہیں لکھا تھا۔ اتنی اپنائیت سے ایس ایم ایس نہیں کیا تھا کہ ”آپ کی اینا۔“

میں ہواؤں میں اڑنے لگا۔ میں نے پھر اردگرد کا جائزہ لیا اور اس کی تصویریں ڈاؤن لوڈ کر لیں۔ وہ بلا کی خوب صورت تھی۔ ایک تصویر میں وہ کسی پارک میں کھڑی تھی۔ جسم پر نیلے رنگ کی چست جینز اور چست اورنج ٹی شرٹ میں اس کا سراپا قیامت ڈھا رہا تھا۔ دوسری تصویر میں وہ ایک شان دار آفس میں بیٹھی تھی۔ اس نے کوٹ پہن رکھا تھا۔ بڑی سی میز پر ایک طرف کئی ٹیلی فون سیٹ رکھے تھے۔ اس کے سامنے لیپ ٹاپ تھا اور وہ کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہو۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

اچانک مسعود صاحب کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ”علی صاحب!“

”جی سر... وہ... میں ذرا...“

”ارے آپ تو پریشان ہو گئے۔“ مسعود صاحب ہنس کر بولے۔ ”میں صرف یہ پوچھ رہا تھا کہ میں نے سیکریٹری ایسٹ کو جو جواب لکھوایا تھا، وہ آپ نے میل کر دیا؟“

”جی سر! وہ تو میں نے لنچ سے پہلے ہی بھیج دیا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

میری حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے چوری کرتے ہوئے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ کمپیوٹر کی ایل سی ڈی پر اس وقت بھی اینا کی مسکراتی ہوئی تصویر موجود تھی۔

میں نے جیب سے یو ایس بی نکالی اور اینا کی ای میل اور دونوں تصویریں یو ایس بی میں محفوظ کرنے کے بعد اس کی میل اور تصویریں ڈیلیٹ کر دیں۔ آفس کا کمپیوٹر تو کوئی بھی استعمال کر سکتا تھا۔ وہاں ایسے ایسے لوگ موجود تھے جو تھوڑی سی کوشش کے بعد کوئی بھی آئی ڈی کھول سکتے تھے۔

میں نے گھر آ کر یو ایس بی اپنی الماری میں حفاظت سے رکھ دی۔ میں نے سوچا تھا کہ اینا کی تصویروں کا پرنٹ نکلوا لوں گا۔

پھر میں نہانے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔

شام کی چائے میں ابو اور امی کے ساتھ لاؤنج میں پیتا تھا۔

چائے پیتے ہوئے ابو نے کہا۔ ”علی! میرا ایک شاگرد محکمۂ خارجہ میں اعلیٰ عہدے پر ہے۔ کل اتفاقاً اس سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے اسے تمہارے بارے میں بتایا تو اس نے کہا کہ علی کو مقابلے کا امتحان پاس کرا دیں۔ میں اسے فوراً ہی اپنے محکمے میں اپائنٹ کر لوں گا۔“

”ابو! مقابلے کا امتحان پاس کرنے کے بعد تو مجھے کسی سفارش کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔“

”خام خیالی ہے تمہاری۔“ ابو نے کہا۔ ”بہت سے امیدوار امتحان پاس کرنے کے باوجود ویٹنگ لسٹ پر رہتے ہیں۔ اس انتظار میں کئی سال گزر جاتے ہیں لیکن کہیں ان کی تعیناتی نہیں ہوتی۔ تم کل سی ایس ایس کا فارم تو لے کر آؤ، پھر دیکھتے ہیں۔ کوشش کرنے میں حرج ہی کیا ہے؟“

ابو تو یوں کہہ رہے تھے جیسے سی ایس ایس کا امتحان پاس کرنا کوئی مذاق ہو۔ ہاں، کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

میں وہاں سے اٹھ کر ایک مرتبہ پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرے پیچھے پیچھے سیما بھی کمرے میں آ گئی اور بولی۔ ”بھائی! آپ کو کوئی پریشانی ہے؟ کوئی مسئلہ ہے؟“

”مجھے... نہیں... کوئی پرابلم نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”پھر آپ اتنے پریشان پریشان سے کیوں ہیں؟ میں کئی دن سے آپ کو پریشان دیکھ رہی ہوں۔“

سیما نے دو دن کو ”کئی دن“ بنا دیا تھا۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے سیما۔“

”شیور؟“ سیما نے پوچھا۔

”شیور۔“ میں نے جواب دیا۔

وہ میرے جواب سے مطمئن تو نہیں ہوئی لیکن اس نے مزید کچھ نہیں پوچھا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اپنے البم سے اپنی دو تین تصویریں نکالیں اور ان کا جائزہ لیا۔ ایک تصویر گھر کے باہر کی دیوار کے ساتھ تھی۔ میں نے اس تصویر میں پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی، چہرے پر ”رے بن“ کا چشمہ تھا۔ پس منظر میں گھر کی دیوار تھی جس پر خوب صورت سی ایک بیل بھی لگی ہوئی تھی۔ اس بیل کی وجہ سے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کسی پارک میں کھڑا ہوں۔ دوسری تصویر ٹریک سوٹ میں تھی۔ میرے دوستوں اور کزنز کا خیال تھا کہ میں بہت وجیہہ و خوب رو ہوں۔ دراز قد، ورزشی جسم، گندمی رنگت اور براؤن بال۔

میری یہ دونوں تصویریں بہترین تھیں۔ میں اینا کو

بھی تصویریں بھیجنا چاہتا تھا۔

میں تصویریں لے کر کمپیوٹر کی ایک دکان میں چلا گیا۔ وہاں نہ صرف ٹائپنگ کا بندوبست تھا بلکہ وہاں تصویریں اور دوسرے کاغذات اسکین بھی ہوتے تھے۔

اب یہ میری بدقسمتی تھی کہ وہاں کا اسکینر ہی خراب تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے علاقے میں کوئی دوسری دکان بھی نہیں تھی جہاں سے تصویریں اسکین ہو سکتیں۔ اس کے لیے مجھے بہت دور جانا پڑتا۔ میں شاید وہاں بھی چلا جاتا لیکن اچانک مجھے خیال آیا کہ میں یو ایس بی لانا تو بھول ہی گیا۔ میں نے سوچا کہ اب اگلی دفعہ اپنی تصویریں بھیجوں گا لیکن فی الحال اینا کو جواب دینا ضروری تھا۔

میں وہاں سے ایک نیٹ کیفے پر پہنچا اور ایک کیبن میں بیٹھ گیا۔ میں نے جواب میں اینا کو لکھا۔ ”ڈیئر اینا! تمہاری تصویریں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور یقین بھی آ گیا کہ کوئی میرے ساتھ شرارت نہیں کر رہا۔ میرا پورا نام علی عرفان ہے۔ میں ایک سرکاری ادارے میں ملازم ہوں۔ میری فیملی چھوٹی سی ہے۔ میرے علاوہ صرف ایک بہن ہے اور امی ابو ہیں۔ میں نے آئی آر میں ماسٹرز کیا ہے۔ اپنی تصویریں فوری طور پر میں اس لیے نہیں بھیج سکا کہ وہ فوری طور پر اسکین نہیں ہو سکیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے تمہاری دوستی قبول نہیں۔ مجھے تمہاری دوستی قبول کر کے فخر ہوگا۔ تمہارے جواب کا منتظر رہوں گا، صرف تمہارا علی۔“ میں نے جواب دوبارہ پڑھا اور اسے اینا کی آئی ڈی پر بھیج دیا۔

رہ رہ کر اینا کا پُرکشش چہرہ اور خوب صورت سراپا یاد آرہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اینا سے بہت سی باتیں کروں۔ اس کی آواز سنوں۔

میرا اندازہ تھا کہ اس کی طرح اس کی آواز بھی خوب صورت ہوگی۔ میں اینا کے تصور میں اتنا گم تھا کہ دو دفعہ بائک ایک کار اور ویگن سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ ویگن والا مجھے بُرا بھلا کہتا ہوا چلا گیا۔

میں گھر پہنچا تو ابو کھانے پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ وہاں غیر متوقع طور پر احسن کو دیکھ کر مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔

”یار! تم ہو کہاں؟“ احسن نے پوچھا۔ ”اور سیل فون رکھنے کا فائدہ ہی کیا۔ تم نے میری کال بھی ریسیو نہیں کی۔“

”میرا سیل فون سائیلنٹ پر تھا۔“ میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ”چلو، تم کھانا تو کھاؤ۔“

کھانے کے بعد میں نے سیما کو چائے کے لیے کہا اور احسن کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ پہلے میں نے سوچا کہ احسن کو سب کچھ بتا دوں لیکن یہ سوچ کر یہ خیال ترک کر دیا کہ احسن فضول میں نہ صرف میرا مذاق اڑائے گا بلکہ ممکن ہے وہ یہ بات دوسروں کو بھی بتا دے۔ وہ اس بات کو کبھی سنجیدگی سے نہ لیتا کہ امریکا کی ایک بینکر حسینہ مجھ سے دوستی کی خواہش مند ہے۔ میں نے احسن کو اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے ٹال دیا۔ یہ بات نہیں تھی کہ احسن میرے ساتھ مخلص نہیں تھا۔ بات یہ تھی کہ اینا سے دوستی کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی اس دوستی کو اہمیت نہ دیتا۔

احسن کے جانے کے بعد میں دوبارہ لاؤنج میں آ گیا اور ٹی وی دیکھنے لگا۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اب مجھے انٹرنیٹ ڈیوائس لگوا لینا چاہیے۔

☆☆☆

میں نے اپنی میل کھولی تو اینا کا جواب موجود تھا۔ اس کے علاوہ میرے دو دوستوں کی ای میلز بھی موجود تھیں۔ انور انگلینڈ میں تھا اور سعید امریکا میں۔ میں نے سب سے پہلے اینا کی میل دیکھی۔ جیسے جیسے میں اس کی میل پڑھتا گیا، میرا دورانِ خون تیز ہوتا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت میرا چہرہ بھی سرخ ہو رہا ہوگا۔ اینا نے لکھا تھا۔ ”ڈیئر فرینڈ! مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے میری دوستی کی آفر قبول کر لی۔ میں تم سے انتہائی اہم کام لینا چاہتی ہوں۔ معاملہ کروڑوں ڈالرز کا ہے۔ کیا میں تم پر اعتماد کر سکتی ہوں؟ مجھے نہ جانے کیوں لگتا ہے کہ تم قابلِ اعتبار آدمی ہو۔ میرے پاس خطیر رقم ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں اس رقم کو کس منافع بخش کاروبار میں لگاؤں؟ آج کے دور میں کسی پر اعتبار کرنا کتنا مشکل ہے، یہ تم بھی جانتے ہوگے۔ میرے اردگرد بھی لالچی اور ہوس کے مارے لوگ ہیں۔ میں اس دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔ والدین، بہن بھائی، کوئی بھی نہیں ہے۔ ایسے میں تم خود اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں کتنی بڑی مصیبت میں مبتلا ہوں۔ یہاں کے لوگوں پر تو مجھے بالکل اعتبار نہیں ہے۔ تم پہ اعتبار کر کے میں ایک جوا کھیل رہی ہوں۔ اس کے باوجود نہ جانے مجھے کیوں یقین ہے کہ تم میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤ گے۔ ہم پاکستان میں جو بھی کاروبار کریں گے، اس میں تم ففٹی پرسنٹ کے حصے دار ہوگے۔ اب اگر تم راضی ہو تو مجھے اپنا بینک اکاؤنٹ بھیج دو تاکہ رقم میں تمہارے اکاؤنٹ میں منتقل کر سکوں۔ اگر تمام امور طے پا گئے تو میں اس ماہ

کے آخری ہفتے میں پاکستان آؤں گی... تمہاری اپنی اینا۔“

اس کی ای میل کو میں نے کئی دفعہ پڑھا لیکن میری سمجھ میں نہ آسکا کہ اینا آخر چاہتی کیا ہے۔ ای میل کے ساتھ اس نے اپنا ٹیلی فون نمبر بھی لکھا تھا۔

میرا ذہن یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ کوئی کروڑ پتی لڑکی اتنی بھولی یا اتنی تنہا ہو سکتی ہے کہ اسے پوری دنیا میں کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جس پر وہ اعتبار کر سکے۔ پھر اسے سرمایہ کاری یا بزنس کا چکر چلانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ وہ خود بینکر تھی تو اسے محفوظ سرمایہ کاری کے طریقے بھی معلوم ہوں گے۔ پھر وہ امریکا چھوڑ کر پاکستان ہی میں سرمایہ کاری کیوں کرنا چاہتی تھی؟

میں نے سوچا کہ اپنا اکاؤنٹ نمبر اسے بھیج دیتا ہوں۔ بھلا اس سے مجھے کیا فرق پڑے گا؟ میرے اکاؤنٹ میں کون سے لاکھوں روپے تھے۔ اس میں مشکل سے ڈیڑھ دو ہزار روپے ہوں گے۔ وہ مجھے مالی طور پر کیا نقصان پہنچا سکتی تھی۔

میری چیک بک میز کی دراز ہی میں ہوتی تھی۔ میں نے اپنا اکاؤنٹ نمبر نوٹ کر لیا، پھر اینا کو لکھا۔ ”ڈیئر اینا! دو ہی دن میں تم سے عجیب سا اپنائیت کا رشتہ استوار ہو گیا ہے۔ میری طرف سے تم بے فکر رہو۔ میں ہر طرح سے تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔ تم مجھ پر اعتبار کر سکتی ہو۔ تمہاری آمد کا میں نے ابھی سے انتظار شروع کر دیا ہے، مجھے تمہارے جواب کا شدت سے انتظار رہے گا، تمہارا اور صرف تمہارا علی۔“

اینا کو ای میل کرنے کے بعد میں نے کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کیا اور اردگرد دیکھا۔ ایک دو کے علاوہ دفتر کے تمام لوگ جا چکے تھے۔ صرف مسعود صاحب موجود تھے۔ وہ بھی اب اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔

میں نے سوچا کہ اب میں اینا کے بارے میں احسن کو سب کچھ بتا دوں گا۔ رات کو کھانے کے بعد میں بائک لے کر احسن کی طرف چلا گیا۔ احسن نارتھ ناظم آباد میں رہتا تھا۔ مجھے دیکھ کر احسن کی والدہ اور بہنیں خوش ہو گئیں۔

”بہت دن بعد چکر لگایا علی بیٹا!“ خالہ نے کہا۔ میں احسن کی امی کو خالہ کہتا تھا۔

”بس خالہ...“

”اب یہ مت کہیے گا علی بھائی کہ وقت نہیں ملتا۔ یہ جملہ بہت پرانا ہو گیا ہے۔“ احسن کی بہن سعدیہ منہ بنا کر بولی۔ وہ سیما کی ہم عمر تھی۔

”نہیں، وقت تو ملتا ہے لیکن آفس سے واپس آنے کے بعد اتنی تھکن ہو جاتی ہے کہ...“

”میں ہل کر پانی بھی نہیں پیتا۔“ سعدیہ نے ٹکڑا لگایا۔

اسی وقت احسن آ گیا اور بولا۔ ”تو کب آیا؟ میں تو ابھی تیری ہی طرف جانے والا تھا۔“

میں کچھ دیر خالہ کے پاس بیٹھا پھر احسن کے ساتھ لان میں جا بیٹھا۔ چائے پیتے ہوئے میں نے احسن کو اینا اور اس کی ای میلز کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

احسن بے ساختہ ہنسنے لگا۔ پھر وہ ہنسی ضبط کر کے بولا۔ ”واہ یار! یہ تو ”جوک آف دی ایئر“ ہے۔“

”یار! میں تجھ سے مشورہ مانگ رہا ہوں اور تو بات کو مذاق میں اڑا رہا ہے۔“

”گویا آپ سنجیدہ ہیں؟“ احسن نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یار! تو کیا عقل سے بالکل ہی پیدل ہو گیا ہے؟“ احسن پھر ہنسنے لگا۔ ”ایک کروڑ پتی دوشیزہ، حسن و جمال میں یکتا، امریکی بینک کی ایک افسر امریکا اور یورپ چھوڑ کے پاکستان میں سرمایہ کاری کرنا چاہتی ہے؟ وہ بھی ایک ایسے شخص کے ساتھ جسے وہ جانتی بھی نہیں ہے، کیا بکواس ہے یار؟“

اس کے انداز پر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ ”یار! میں نے اس پر کب اعتبار کر لیا ہے؟“

”میں تجھے اتنا گھامڑ سمجھتا بھی نہیں۔“ احسن نے منہ بنا کر کہا۔

”یار! اگر اینا فراڈ بھی ہے تو اس ایڈونچر میں حرج ہی کیا ہے؟“

”یعنی اب بھی آپ کے دل میں کہیں یہ خواہش خوابیدہ ہے کہ ممکن ہے وہ حسینہ فراڈ نہ ہو؟“ احسن نے تضحیک آمیز انداز میں کہا۔ ”اور کیا ضروری ہے کہ وہ کوئی حسینہ ہی ہو، اینا کے پردے میں کوئی نیگرو بھی تو ہو سکتا ہے؟“

”میں نے کب کہا ہے کہ اینا یا وہ جو کوئی بھی ہے، سچ بول رہی ہے مگر میں نے اسے اپنا اکاؤنٹ نمبر بھیج دیا ہے۔“

”کیا؟“ احسن چونک کر بولا۔ ”پہلے تو مجھے صرف شبہ تھا لیکن اب یقین ہو گیا ہے کہ تیری عقل واقعی خبط ہو گئی ہے۔ گھامڑ آدمی، اس فراڈ کو اپنا بینک اکاؤنٹ نمبر دینے کی کیا ضرورت تھی؟“ پھر احسن چڑ کر بولا۔ ”اب یہ مت کہنا کہ میں بھی اینا سے مذاق کر رہا ہوں۔“

"یار! بات تو یہی ہے۔" میں نے کہا۔ "یوں بھی میرے اکاؤنٹ میں مشکل سے ڈیڑھ دو ہزار روپے ہی ہوں گے۔ وہ مجھے کوئی نقصان پہنچا ہی نہیں سکتی۔"

"پھر تو مجھ سے کیا پوچھنا چاہ رہا ہے؟" احسن نے سرد لہجے میں کہا۔

"تو مرچیں کیوں چبا رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"تیرے اس کارنامے کے بعد کیا میں خوشی سے ناچوں؟" احسن نے مجھے گھورا۔ "بس اب اس کی کسی اور ای میل کا جواب مت دینا۔"

میں خاموش ہوگیا۔ میں احسن سے مزید بات کرتا تو وہ مزید طنز کرتا، میرا مذاق اڑاتا۔

دوسرے دن بھی میں وقت سے کچھ پہلے آفس پہنچ گیا اور جاتے ہی اپنا کمپیوٹر سسٹم آن کر دیا۔ توقع کے مطابق اینا کی ای میل موجود تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ مجھے تمہارا اکاؤنٹ نمبر مل گیا ہے۔ مجھے چند روز کے لیے اٹلی جانا ہے اس لیے کچھ دن تم سے رابطہ نہ ہو سکے گا۔ میں نے تمہارے ملک میں بزنس کرنے کا پلان تقریباً مکمل کرلیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اسلام آباد میں اپنا ہیڈ آفس قائم کریں۔ میں پاکستان میں ایک ٹی وی چینل اور موبائل کمپنی شروع کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے جگہ کا بندوبست تمہیں کرنا ہوگا۔ یہ تو ہمارے بزنس کا ایک خاکہ سا ہے۔ میں اٹلی سے واپس آنے کے بعد یہ منصوبہ تقریباً مکمل کرلوں گی۔ اس دوران میں تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ اب ایک ہفتے بعد رابطہ ہوگا۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔" آخر میں اس نے لکھا تھا۔ "تمہاری اور صرف تمہاری اینا۔"

ای میل پڑھ کر مجھے عجیب سا لگا کہ کوئی حسین امریکی دوشیزہ مجھے اس انداز میں بھی مخاطب کر سکتی ہے۔ اب مجھے احسن کا خیال درست ہی لگ رہا تھا کہ اینا کے پردے میں کوئی غنیا مجھے بے وقوف بنا رہا تھا۔ میں نے بھی سوچ لیا کہ میں بھی اسے ایسا جواب دوں گا کہ وہ تلملا کر رہ جائے گی، یا رہ جائے گا۔

تین دن کی اعصابی کشیدگی کے بعد اس دن مجھے خاصا سکون ملا۔ اس دن میں نے پہلے کی طرح دل لگا کر کام کیا اور اینا کے آسیب کو ذہن سے جھٹک دیا۔

دوسرے دن صبح جوگنگ کرتے ہوئے احسن سے ملاقات ہوئی لیکن میں نے اینا کے موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔

جب ہم جوگنگ کر کے واپس جا رہے تھے تو احسن نے پوچھ ہی لیا۔ "علی! اس بینکر حسینہ کی کوئی ای میل آئی؟"

میں نے چونک کر احسن کی طرف دیکھا۔ احسن کے چہرے پر تضحیک یا طنز کا کوئی تاثر نہیں تھا۔

"آئی ہے۔" میں نے ہنس کر جواب دیا۔ احسن نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا تو میں بولا۔

"یار! اس مرتبہ تو اس نے حد ہی کر دی۔ اس نے لکھا ہے کہ وہ پاکستان میں ایک ٹی وی چینل اور موبائل فون سروس کمپنی قائم کرنا چاہتی ہے۔ کچھ دن مجھ سے رابطے میں نہیں رہے گی کیونکہ وہ اٹلی جا رہی ہے۔"

احسن بے اختیار قہقہہ لگا کر بولا۔ "یار! یہ گورے ہم لوگوں کو پتھر کے زمانے کا آدمی سمجھتے ہیں۔ ٹی وی چینل یا موبائل فون کمپنی کوئی دو چار لاکھ میں قائم ہو سکتی ہے؟ اس کے لیے اربوں روپیا چاہیے... اربوں۔" پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ "یہ بھی کتنی احمقانہ بات ہے کہ وہ اٹلی جا رہی ہے اس لیے رابطے میں نہیں رہے گی، یار! بقول تیرے وہ بینک میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے لیے اپنے آفس سے بلکہ دنیا بھر سے رابطے میں رہنا بہت ضروری ہے۔ اب تو لیپ ٹاپ اتنے عام ہو گئے ہیں کہ وہ عام آدمی کی دسترس میں ہیں۔ کیا اینا کے پاس لیپ ٹاپ نہیں ہوگا؟ اب تو ایسے سیل فون بھی مارکیٹ میں آ گئے ہیں جن پر ہر قسم کی سہولت میسر ہے۔"

پھر کئی دن یوں ہی گزر گئے۔ میں نے اینا کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

چھ دن بعد میں نے اپنے کام نمٹا کر اپنا میل بکس چیک کیا تو میں بری طرح چونک اٹھا۔ وہاں اینا کی ای میل موجود تھی۔ میں نے اس میل کو کھولا تو میری سانسوں کی گردش تیز ہوگئی۔ اس نے لکھا تھا۔ "پیارے علی! میں اٹلی کے کامیاب دورے کے بعد ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی پہنچی ہوں۔ میں نے یہ دن جس کرب میں گزارے ہیں، وہ میں ہی جانتی ہوں۔ شاید تم بھی بے چین ہو گے۔ اب میں تمہیں ایک اہم بات بتانے والی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس بات کا تذکرہ کسی سے بھی نہیں کرو گے۔ میں بینکر تو ضرور ہوں لیکن اتنی دولت مند نہیں ہوں لیکن تمہاری مدد سے ہم دونوں کروڑ پتی ہو سکتے ہیں۔ ہمارے بینک میں عراق کے ایک کروڑ پتی شخص کا اکاؤنٹ تھا۔ امریکا، عراق جنگ میں وہ عراقی کروڑ پتی اپنے خاندان سمیت مارا گیا۔ بینک نے کئی مرتبہ اس سے رابطے کی کوشش کی لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے اپنے طور پر معلومات حاصل

کیں تو اس کی موت کا انکشاف ہوا۔ اکاؤنٹ کے وارثوں میں اس کی بیوی اور بیٹے کا نام تھا لیکن وہ دونوں بھی اس جنگ میں مارے گئے۔ عراقی کے اکاؤنٹ میں چار کروڑ سے زائد کی رقم ہے۔ وہ اکاؤنٹ لاوارث ہے۔ اب تمہیں صرف اتنا کرنا ہوگا کہ اس عراقی عباد المصطفیٰ کی وراثت کا دعویٰ کرنا ہوگا۔ میں نے تمہیں اس کام کے لیے یوں منتخب کیا ہے کہ تم مسلمان ہو۔ تم مجھے میل کرو گے کہ میں عباد المصطفیٰ کا وارث ہوں۔ اس قسم کے تمام اکاؤنٹس میں ہی ڈیل کرتی ہوں۔ ہر بینک بیلنس کا کوئی نہ کوئی وارث نکل ہی آتا ہے لیکن کئی ماہ کے باوجود اس عراقی کا کوئی وارث سامنے نہیں آیا۔ تمہاری میل ملتے ہی میں رقم تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دوں گی۔ میں یہاں کا کام سمیٹنے کے بعد ہی پاکستان آؤں گی۔ اس دوران میں تم ایک مرتبہ پھر میری آفر پر اچھی طرح غور کرلو۔ بس اتنا دھیان رکھنا کہ جب تک کام شروع نہ ہو جائے، کسی کو ہرگز نہ بتانا، صرف تمہاری اینا۔"

یہ میل پڑھ کر میں سناٹے میں رہ گیا۔ اب یہ معاملہ کچھ سنجیدہ بلکہ خطرناک رخ اختیار کرتا جا رہا تھا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ مجھے فوری طور پر اس معاملے سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے۔ مجھے اس تمام معاملے میں بددیانتی اور جرم کی بو محسوس ہو رہی تھی۔

میں گھر جا کر بھی مسلسل اسی معاملے پر غور کرتا رہا۔ میں نے لاکھ اس معاملے کو ذہن سے جھٹکنا چاہا لیکن اس میں کامیاب نہ ہوا۔ بالآخر میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں اینا سے کہہ دوں گا کہ میں اس معاملے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔

رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے دوسرے دن میں جوگنگ کے لیے بھی نہ جا سکا۔ اس دن آفس جانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن آفس میں ایک اہم میٹنگ تھی اس لیے جانا ضروری تھا۔

میں ناشتا کر ہی رہا تھا کہ احسن آ گیا۔ اس نے تشویش سے پوچھا۔ "علی! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں یار! طبیعت ٹھیک ہے، بس صبح آنکھ دیر سے کھلی..."

"احسن بیٹا! ناشتا کرلو۔" امی نے کہا۔

"ناشتا تو میں نے کرلیا ہے، بس ایک کپ چائے پیوں گا۔" احسن نے کہا۔

چائے پیتے ہوئے میں بالکل خاموش تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ احسن کو اینا کی میل کے بارے میں بتا دوں لیکن پھر مجھے اینا کی ہدایت یاد آ گئی۔

"کن سوچوں میں گم ہے علی؟" احسن نے اچانک پوچھا۔ "کیا اب کوئی نئی ای میل موصول ہوئی ہے؟"

ای میل کے نام پر میں بُری طرح چونکا اور جلدی سے کہا۔ "نہیں یار! اس کی طرف سے کوئی ای میل نہیں ملی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ ابو اور سیما دونوں جا چکے تھے اور امی کچن میں مصروف تھیں۔

پھر احسن نے مجھے اینا کے بارے میں کریدنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے کچھ بھی نہ بتایا۔

اس کے رخصت ہونے کے بعد میں بھی آفس کے لیے روانہ ہوگیا۔ پھر آفس کے کاموں اور میٹنگ کی وجہ سے لنچ تک مصروف رہا۔ لنچ کے بعد میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی میل چیک کرلی۔ آج اینا کی کوئی میل نہیں تھی۔

☆☆☆

پانچویں دن مجھے اینا کی ایک اور ای میل ملی۔ اس نے لکھا تھا۔ "ڈیئر علی! مجھے یقین ہے کہ تم نے اب تک فیصلہ کرلیا ہوگا کہ تم میرے ساتھ کام کرو گے۔ عباد المصطفیٰ کا بینک بیلنس چار کروڑ ہے۔ اگر تم نے میرے ساتھ کام کرنے کی ہامی بھرلی تو میں دوسرے ہی دن تمام رقم تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دوں گی۔ تمہارے جواب کا بے تابی سے انتظار کروں گی، تمہاری اور صرف تمہاری اینا۔"

ای میل پڑھ کر میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ اس کی دھمک مجھے اپنے کانوں میں محسوس ہو رہی تھی۔ سرد موسم کے باوجود میرا چہرہ پسینے میں تر ہوگیا تھا اور سانس بُری طرح پھول گیا تھا۔ میں نے رومال سے چہرے کا پسینا خشک کیا اور سامنے رکھا ہوا پانی کا گلاس اٹھا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

"علی صاحب!" مسعود صاحب کی آواز سن کر میں بُری طرح چونکا اور گھوم کر ان کی طرف دیکھا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" ان کے لہجے میں تشویش تھی۔

"سر! آج صبح ہی سے میری طبیعت کچھ بوجھل تھی۔" میں نے کہا۔ مسعود صاحب نہ جانے کب سے میرا جائزہ لے رہے تھے۔ "اب شاید مجھے بخار بھی ہوگیا ہے۔"

"اوہو، آپ آج چھٹی کرلیتے۔" مسعود صاحب کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

”سر! میں چھٹی کیسے کرلیتا۔ آج اتنی اہم میٹنگ بھی تو تھی۔“ میں نے کہا۔ میری آواز کا ارتعاش مسعود صاحب نے بھی محسوس کیا ہوگا۔

”اب تو میٹنگ بھی ہو چکی۔“ انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔ ”اب آپ گھر چلے جائیں۔“

میں خود بھی کچھ دیر کے لیے تنہائی اور ذہنی یکسوئی چاہ رہا تھا اس لیے میں فوراً اپنے سامنے بکھری ہوئی فائلیں سمیٹنے لگا۔

امی بے وقت مجھے دیکھ کر پریشان ہوگئیں۔ میں نے انہیں مطمئن کر دیا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، بس آج کام کرنے کا موڈ نہیں تھا اس لیے آدھے دن کی چھٹی کرلی ہے۔ میں نے اس دن لنچ بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے امی سے سینڈوچز بنوائے اور گرما گرم چائے پی کر کمرے میں چلا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں اس معاملے میں کسی کو رازدار بھی نہیں بنا سکتا تھا۔ دوسری طرف چار کروڑ کی خطیر رقم تھی۔ اتنی رقم تو میری کئی پشتیں مل کر بھی نہیں کما سکتی تھیں۔ اسی ادھیڑبُن میں نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے بھی میری طبیعت کچھ بوجھل ہوگئی تھی لیکن اس کے باوجود میں جوگنگ کے لیے چلا گیا۔ احسن سے ملاقات ہوئی لیکن میں نے اسے کچھ بھی نہیں بتایا۔ میری خاموشی دیکھ کر اس نے پوچھا بھی کہ تمہیں کوئی پرابلم تو نہیں ہے؟ میں نے جبراً ہنس کر کہا۔ ”یار! مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ بس رات کو نیند بہت دیر سے آئی تھی اس لیے...“

”او بھائی!“ احسن نے ہنس کر کہا۔ ”یہ تیری راتوں کی نیند کیوں اڑ گئی ہے... کہیں اینا کا کوئی چکر تو نہیں ہے؟“

”یار! میں اینا کا باب بند کر چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

احسن نے مجھے مزید کریدنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے کچھ بھی نہیں بتایا۔ میں تو خود بھی اس وقت تک یقین اور بے یقینی کے درمیان لٹک رہا تھا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں اب بھی یہ خیال موجود تھا کہ اب اینا کی طرف سے اس ڈرامے کا کلائمکس ہوجائے گا اور وہ کہہ دے گی کہ تم ایشیائی کتنی جلدی بے وقوف بن جاتے ہو۔ بھلا کوئی لڑکی اتنا بڑا خطرہ مول لے کر کسی اجنبی کو اتنی بڑی رقم دے سکتی ہے؟ پھر میں سر جھٹک کر سوچتا کہ اس سے میری صحت پر کیا اثر پڑے گا۔

میں نے زبردستی ناشتا کیا کیونکہ میرا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

میں آفس پہنچا تو اپنے روزمرہ کے کام میں لگ کر تھوڑی دیر کو سب کچھ بھول گیا۔ لنچ کے بعد اپنے ضروری کام نمٹا کر میں نے اپنی ای میل چیک کی تو ان باکس میں اینا کی میل موجود تھی۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ میل کھولی تو میرا ذہن بھک سے اڑ گیا، ہاتھ پیر کانپنے لگے اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ گویا پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ میں نے اینا کی میل دوسری دفعہ، پھر تیسری دفعہ پڑھی اور میں آہستہ آہستہ ہوش میں آگیا۔

اینا نے لکھا تھا۔ ”ڈیئر علی! میں اپنا کیریئر داؤ پر لگا کر تم پر اعتبار کررہی ہوں۔ اگر تم نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تو میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔ بینک کو ابھی نہیں تو کچھ عرصے بعد اس فراڈ کا علم ہوجائے گا۔ میں اس سے پہلے ہی ملازمت چھوڑ دوں گی۔ ایک ہفتہ مجھے اپنے دوسرے مسائل حل کرنے میں لگے گا۔ اگر حالات ہمارے حق میں ہوئے تو میں اس ماہ کی بائیس تاریخ تک کراچی پہنچ جاؤں گی۔ میں نے چار کروڑ .... تمہارے اکاؤنٹ میں منتقل کردیے ہیں۔ تم سے ایک درخواست ہے علی! جب تک میں پاکستان پہنچ نہ جاؤں، تم اس رقم کو ہاتھ مت لگانا۔ خدا نے چاہا تو اب بائیس تاریخ کو کراچی میں ملاقات ہوگی۔ ہاں، تم اپنا فون نمبر مجھے بھیج دینا تاکہ میں ٹیلی فون پر تم سے بات کرسکوں۔ بائیس تاریخ تک کے لیے خدا حافظ، تمہاری اور صرف تمہاری اینا۔“

میں کئی منٹ تک سناٹے میں رہا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اتنی بڑی رقم کا مالک بن گیا ہوں۔ مجھ سے آفس میں وقت گزارنا دوبھر ہوگیا۔

آفس سے چھٹی ہوتے ہی میں سیدھا ایک قریبی اے ٹی ایم پر پہنچا۔ وہ اے ٹی ایم اسی بینک کا تھا جس میں میرا اکاؤنٹ تھا۔ میں نے اے ٹی ایم کارڈ نکالا اور کانپتے ہاتھوں سے مشین میں ڈال دیا اور اپنا اکاؤنٹ بیلنس معلوم کرنے کے لیے ”بیلنس“ کو ٹچ کردیا۔ دوسرے ہی لمحے اے ٹی ایم سے نکلی ہوئی سلپ میرے ہاتھ میں تھی۔ ایک مرتبہ پھر میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ رقم میرے اکاؤنٹ میں پہنچ چکی تھی۔

میں وہاں سے نکلا تو ہاتھ پیر قابو میں نہیں تھے۔ میں بائک کو لے کر پیدل ہی نزدیکی ریسٹورنٹ تک چلا گیا۔

وہاں بیٹھ کر میں نے گرما گرم چائے کے ساتھ دو سموسے کھائے تو میری حالت کچھ سنبھلی۔ چائے پیتے ہوئے میں نے سوچا کہ اب میں احسن کو سب کچھ بتادوں گا۔

میں احسن کے گھر پہنچا تو وہ آفس سے آچکا تھا اور باتھ روم میں تھا۔ میں خالہ کے پاس بیٹھ گیا اور ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد احسن بھی آگیا۔ ہم نے ایک ساتھ چائے پی پھر میں احسن کو لے کر لان میں آگیا۔

”علی۔ کیا بات ہے یار! تو اتنا پریشان کیوں ہے؟“ احسن نے پوچھا۔ ”تو مجھے کئی دن سے ٹال رہا ہے لیکن اب میں تیری بکواس نہیں سنوں گا۔ مجھے صاف صاف بتادے کہ بات کیا ہے؟“

”یار! وہی بتانے تو تجھے باہر لان میں لایا ہوں۔“ میں نے جواب دیا پھر احسن کو سب کچھ تفصیل سے بتادیا۔

”تو کیا جاگتے میں خواب دیکھنے لگا ہے؟“ احسن میری بات سن کر بولا۔ ”یا مجھے اپنی طرح گھامڑ سمجھتا ہے؟“

میں نے بغیر کچھ کہے جیب سے اے ٹی ایم کی سلپ نکالی اور احسن کے حوالے کردی۔

”یہ کیا ہے؟“ احسن نے ناکافی روشنی میں وہ سلپ دیکھنے کی کوشش کی۔

”یہ میرا بیلنس ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے اے ٹی ایم سے یہ سلپ نکالی ہے۔“

احسن وہاں سے گیٹ کے نزدیک چلا گیا۔ وہاں خاصی روشنی تھی۔ گیٹ لیمپ کی روشنی میں احسن نے وہ رسید پڑھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ متغیر ہوا پھر وہ فوراً ہی سنبھل کر بولا۔ ”یار! یہ تو کسی کی بھی رسید ہوسکتی ہے۔ عموماً لوگ بیلنس معلوم کرنے کے بعد بے احتیاطی میں سلپ وہیں چھوڑ جاتے ہیں۔“

”تیرا خیال ہے کہ میں اب بھی جھوٹ بول رہا ہوں؟“ میں نے جھنجلا کر کہا۔ ”اگر ایسا ہے تو اسی وقت تو میرے ساتھ اے ٹی ایم تک چل۔ میں تیری موجودگی میں اے ٹی ایم سے بیلنس معلوم کروں گا۔“

میرا اعتماد دیکھ کر احسن بھی سنجیدہ ہوگیا اور بولا۔ ”علی! اگر واقعی ایسا ہے تو یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میری چھٹی حس کسی خطرے کو محسوس کررہی ہے۔“

”اب تک تجھے میری بات پر یقین نہیں آیا تھا، اب تُو خطرے کی بو سونگھنے لگا؟“ میرے لہجے میں طنز تھا۔

”میں مذاق نہیں کررہا ہوں علی!“ احسن بھی جھنجلا گیا۔ ”تیرا دماغ تو ماؤف ہو چکا ہے ورنہ تو بہت ذہین ہے۔ تُو خود سوچ کوئی انجان لڑکی امریکا جیسے دور دراز ملک سے تجھ جیسے کسی ایشیائی اور پاکستانی کو اتنی بڑی رقم کیوں دے گی؟ اب یا تو وہ لڑکی پاگل ہے یا پھر تجھے بے وقوف بنا کر کسی مصیبت میں پھنسانا چاہتی ہے۔“

احسن کی باتوں میں وزن تھا۔ انہی خطوط پر اب تک میں بھی سوچتا رہا تھا۔ میں نے خود سے سوال کیا، کیا واقعی اینا کا ذہنی توازن درست نہیں ہے؟

میں نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا۔ ”نہیں، اینا پاگل نہیں ہے۔ کوئی پاگل لڑکی ای میل پر اس قسم کی باتیں تو کرسکتی ہے لیکن اتنی خطیر رقم نہیں بھیج سکتی۔“

میں ان خیالات میں گم تھا کہ احسن نے مجھے چونکا دیا۔ ”علی! اس پریشانی کا صرف ایک ہی حل ہے، تو محکمۂ داخلہ کے کسی ذمے دار افسر کے پاس جا اور اسے سب کچھ بتا دے۔“

”یار! پھر مجھے تمام رقم بھی سرکار کے حوالے کرنا پڑے گی۔“

”ہاں تو؟“ احسن نے مجھے گھورا۔

”یار! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے کیا فائدہ ہوگا؟“

”یہ فائدہ کیا کم ہے کہ تُو حکومت کی پناہ میں آجائے گا۔“ پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ”ایک بات اور ہے، کوئی لڑکی امریکا جیسے ملک سے کروڑوں ڈالرز کا فراڈ کر کے بھاگ کیسے سکتی ہے۔ ان کی ایف بی آئی تو مجرم کو پاتال سے بھی نکال لاتی ہے۔“

”پھر... پھر یہ سب کیا ہے؟“ میں بری طرح الجھ گیا تھا۔ احسن کی تمام باتیں درست تھیں لیکن وہ خطیر رقم بھی ایک حقیقت تھی جو میرے اکاؤنٹ میں منتقل ہوچکی تھی۔ پھر مجھے ایک اور خیال آیا، میں نے احسن سے کہا۔ ”یار! میرے لیے تو پھر بھی پریشانی رہے گی۔ اگر یہ واقعی اینا کی کوئی چال ہے تو رقم جانے کی صورت میں وہ الٹا مجھ پر الزام لگادے گی۔ تو کہہ رہا ہے کہ میں حکومت کی پناہ میں آجاؤں گا، حکومت تو...“

”یار! یہ رسک تو لینا پڑے گا۔“ احسن نے کہا پھر وہ ہنس کر بولا۔ ”اور زیادہ ٹینشن مت لے۔ ڈیڈی کے ایک کزن جمیل الرحمٰن صاحب ہوم سیکریٹری ہیں۔ میں کل ہی ان سے بات کرتا ہوں۔ وہ اسلام آباد میں ہوتے ہیں۔ اگر یہاں ہوتے تو کل ہی تجھے ان سے ملوا دیتا۔“

''یار! ابھی پورے آٹھ دن ہیں ہمارے پاس۔ آج چودہ تاریخ ہے، اپنا بائیس کو آئے گی۔ مجھے کچھ سوچنے دے اور تو بھی اس مسئلے پر غور کر۔'' میں نے کہا۔ ''میں اب چلتا ہوں۔''

''اب اتنی دیر رکا ہے تو کھانا کھا کر جانا۔'' احسن نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں تو نے ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا ہو گا۔''

میں گھر آکر بھی دیر تک اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ مجھے بھی اپنا مشکوک لگ رہی تھی۔ انسان چاہے ارب پتی ہو یا اس نے دولت ناجائز طریقے سے حاصل کی ہو، وہ بغیر سوچے سمجھے اور دیکھے بھالے اتنی خطیر رقم کسی کے حوالے نہیں کرسکتا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ جیسا مجھے نظر آرہا تھا، ایسا تھا نہیں اور اپنا یا اس کے پردے میں جو بھی تھا، وہ مجھے قربانی کا بکرا بنانا چاہتا تھا۔ میں نے بھی فیصلہ کرلیا کہ قربانی کا بکرا تو میں بھی نہیں بنوں گا۔ یہ فیصلہ کرکے میں سکون سے سو گیا۔

دوسرے دن میں نے مسعود صاحب کو ٹیلی فون کردیا کہ آج میری طبیعت خراب ہے اس لیے آفس نہیں آسکوں گا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ امی اور سیما کے اکاؤنٹ بھی میں آپریٹ کرتا تھا۔ آپریٹ بھی کیا، بس اکاؤنٹ کھولتے وقت میں نے ہی امی اور سیما کے دستخط کیے تھے۔ پھر ایک دو دفعہ ان کے اکاؤنٹ سے تھوڑی بہت رقم نکالی تھی، تب بھی چیک پر میں نے ہی دستخط کیے تھے۔ میں اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ میں نے بازار جاکر موٹے موٹے اور مضبوط قسم کے سوٹ کیس خریدے۔ میں نے اس دن موٹر سائیکل گھر میں ہی چھوڑ دی تھی۔ دونوں سوٹ کیس لے کر میں گھر پہنچا اور دونوں سوٹ کیس اپنے کمرے میں بیڈ کے نیچے رکھ دیے۔ میرے کمرے کا ایک دروازہ باہر بھی کھلتا تھا۔ وہاں سے میں سیدھا بینک پہنچا تو بینک منیجر خود میرے استقبال کو دوڑا دوڑا آیا اور بولا۔ ''علی صاحب! آپ ادھر میرے کمرے میں چل کر بیٹھیں۔'' پھر اس نے چپراسی سے کہا۔ ''جلدی سے اچھی سی چائے لے کر آؤ۔''

میں جانتا تھا کہ منیجر میری نہیں بلکہ اس خطیر رقم کی خوشامد کررہا ہے جو میرے اکاؤنٹ میں پہنچ چکی تھی۔ ایک دفعہ میں نے کسی سے دو ہزار روپے قرض مانگے تھے۔ اس کے پاس پیسے نہیں تھے تو اس نے مجھے چیک دے دیا تھا۔ میں بھاگم بھاگ یہاں آیا تھا کیونکہ اس دوست کا اکاؤنٹ بھی اسی بینک میں تھا۔ بینک بند ہونے ہی والا تھا۔ میں نے چیک دیا تو یہ کہہ کر مجھے چیک لوٹا دیا گیا کہ دستخط میں فرق ہے۔ مجھے اس روز شدید ضرورت تھی۔ اس دوست سے دوبارہ دستخط کرانے یا دوسرا چیک لینے کا وقت بھی نہیں تھا۔ میں نے منیجر کی خوشامد کی کہ آپ ان صاحب سے ٹیلی فون پر بات کرلیں، کوئی مسئلہ ہے تو میرے سیل فون سے کال کرلیں یا میں خود اس دوست کا نمبر ملا دیتا ہوں۔ آپ اس سے تصدیق کرلیں لیکن میری طرح میرا دوست بھی چھوٹا سا اکاؤنٹ ہولڈر تھا اس لیے منیجر نے رعونت سے انکار کردیا۔ مجھے اپنی وہ بے بسی اور توہین آج تک یاد تھی بلکہ میں جب بھی اس بینک منیجر کا منحوس چہرہ دیکھتا تھا، مجھے وہ وقت یاد آجاتا تھا۔

''فرمایئے علی صاحب! کیسے زحمت کی؟'' منیجر نے مجھے خیالات سے چونکا دیا۔

''میں اپنا اکاؤنٹ بند کرنے آیا ہوں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''آ... آپ... کا مطلب ہے کہ... آپ...''

''جی ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''سر! ہم سے کوئی کوتاہی ہوگئی یا آپ کو بینک کی سروس سے کوئی شکایت ہے؟'' منیجر بوکھلا کر بولا۔ کوئی پندرہ بیس لاکھ کا اکاؤنٹ بھی بند ہوجائے تو منیجر سے جواب طلب کرلیا جاتا ہے۔ میرے اکاؤنٹ میں تو چار کروڑ تھے۔

''مجھے بینک سے جو بھی شکایت ہے، وہ میں لکھ دوں گا۔'' میرا لہجہ پہلے کی طرح سرد تھا۔

اسی وقت چپراسی چائے لے کر آگیا۔ منیجر نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔ ''اچھا، پہلے آپ چائے تو پی لیں۔''

''چائے پینے میں وقت ضائع مت کریں۔'' میں نے اس مرتبہ درشت لہجے میں کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ اتنی رقم بینک میں موجود نہیں ہوگی۔ آپ کو بندوبست کرنا پڑے گا۔''

''آپ درست کہہ رہے ہیں۔'' منیجر کا لہجہ بھی سرد ہوگیا۔ ''اصولاً تو آپ کو کم سے کم چوبیس گھنٹے پہلے اطلاع دینا چاہیے تھی۔''

''وھاٹ ڈو یو مین مسٹر منیجر؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''سر! آپ کو کوئی شکایت ہے تو مجھے بتائیں۔ میں آپ کو...''

''پلیز!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کریں۔ میرا اکاؤنٹ بند کردیں۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''اوکے، آپ مجھے لکھ دیں کہ چوبیس گھنٹے سے پہلے آپ ادائیگی نہیں کریں گے۔'' اب میرا انداز جارحانہ تھا۔ ''میں ابھی آپ کے ہیڈ آفس بات کرتا ہوں۔''

''میں آپ کو بارہ گھنٹے میں ادائیگی کردوں گا۔'' منیجر نے مردہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن اکاؤنٹ بند مت کریں۔ دو چار لاکھ اس میں چھوڑ دیں۔''

''اوکے۔'' میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''میں اکاؤنٹ بند نہیں کروں گا لیکن مجھے پانچ بجے سے پہلے پہلے کیش چاہیے۔ اس وقت دس بجے ہیں۔ سات گھنٹے بہت ہیں۔''

منیجر کچھ سوچتا رہا، پھر اسی طرح مرے مرے انداز میں بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں کوشش کرتا ہوں۔''

''کوشش نہیں، مجھے کیش چاہیے۔'' میں نے درشتی سے کہا۔

''ٹھیک ہے، آپ ساڑھے چار بجے تک آجائیں۔''

خطرہ تو میں نے مول لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ چار کروڑ روپے کا تصور بھی سحر انگیز تھا۔ اتنی رقم میں زندگی بھر تو کیا، دو زندگیوں میں بھی نہیں کما سکتا تھا۔ میں نے تو اس سے پہلے یک مشت صرف ایک لاکھ روپے دیکھے تھے۔ وہ بھی میرے اپنے نہیں تھے۔

یہی سوچتا ہوا میں گھر آگیا۔ میرے کمرے کا ایک دروازہ باہر سے بھی کھلتا تھا۔ اس لیے میں اس دروازے سے گھر میں داخل ہوتا تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوسکتی تھی۔ یوں بھی دن کے وقت گھر میں سوائے امی کے اور ہوتا بھی کون تھا۔

میں باہر والے دروازے سے گھر میں داخل ہوا تاکہ امی زیادہ سوال جواب نہ کریں۔

میں یکسو ہوکر کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ میں نے منیجر سے کیش کے لیے کہا تھا۔ مجھے تو خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ چار کروڑ کی رقم کتنی جگہ گھیرے گی؟ میں بینک سے اسے کیسے لاؤں گا؟ پہلے میں نے اپنا بریف کیس خالی کیا لیکن جلد ہی مجھے احساس ہوگیا کہ بریف کیس اتنے کیش کے لیے ناکافی ہوگا۔ مجھے اس کا کوئی اور بندوبست کرنا ہوگا۔

اسی دوران میں میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے خواب میں بھی کرنسی نوٹ دیکھے۔ نوٹ برف کے گالوں کی طرح آسمان سے گر رہے تھے اور میرے اردگرد اکٹھے ہوتے جارہے تھے۔ میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی سوا چار بجا رہی تھی۔

میں نے اپنی بائیک وہیں چھوڑی اور دونوں سوٹ کیس لے کر مین روڈ تک آگیا۔ جلد ہی مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ میں ٹیکسی کے ذریعے چار بج کر چالیس منٹ پر بینک پہنچ گیا۔

منیجر مجھے اپنے کمرے میں لے گیا اور بولا۔ ''علی صاحب! ایک مرتبہ پھر سوچ لیں۔ آج کل حالات ٹھیک

کو اتنی خطیر رقم دے دی۔ ہاں، مجھ سے یہ ضرور پوچھا جاسکتا تھا کہ اتنی رقم تمہارے پاس کہاں سے آگئی؟ سب سے بڑا خطرہ یہ بھی تھا کہ میرے پاس اس رقم کی موجودگی کا کوئی جواز نہیں تھا۔

میرا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ سوچتے سوچتے اچانک مجھے اپنے ایک دوست شہباز خان کا خیال آیا۔ وہ پشاور کا رہائشی تھا اور تعلیم کے لیے کراچی آیا تھا۔ یونیورسٹی ہی میں اس سے میری دوستی ہوئی تھی۔ پھر یہ دوستی بے تکلفی میں بدل گئی تھی۔ شہباز خان شکار کا دلدادہ تھا۔ میں اکثر اس کے ساتھ شکار پر اندرونِ سندھ بھی چلا جاتا تھا۔ میں نے سوچا کہ ان حالات میں شہباز خان ضرور میری مدد کرے گا۔ میں نے دوسرے دن پشاور جانے کا فیصلہ کرلیا۔

میں اپنے کمرے سے باہر نکلا اور دوسرے دروازے سے گھر میں داخل ہوا۔ امی کو بالکل علم نہیں ہوا تھا کہ میں سارا دن گھر میں رہا ہوں۔

کھانے کے بعد میں نے امی سے کہا۔ ''امی! میں اپنے ایک دوست کی شادی میں لاہور جارہا ہوں۔''

امی نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولیں۔ ''کس دوست کی شادی ہے؟''

میں امی کے سوال پر کچھ بوکھلا سا گیا۔

میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی امی نے کہا۔ ''اچھا... اچھا، میں سمجھ گئی۔ تم افتخار کی شادی میں جارہے ہو۔''

''جی امی!'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''بھائی! افتخار بھائی نے ہم لوگوں کو شادی میں نہیں بلایا؟'' سیما نے منہ بنا کر کہا۔

''اس نے تو پوری فیملی کو بلایا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ امی نہیں جائیں گی اس لیے...''

''ہاں بیٹا۔'' امی نے کہا۔ ''میں اتنا لمبا سفر کر بھی نہیں سکتی۔''

افتخار اسکول میں میرے ساتھ پڑھتا تھا پھر میٹرک کے بعد اس کے والد کا ٹرانسفر پنجاب کی طرف ہوگیا تھا۔ اس سے ٹیلی فون پر رابطہ رہتا تھا۔ احسن سے بھی اس کی دوستی تھی لیکن مجھ سے کچھ زیادہ ہی دوستی تھی۔ میں نے افتخار کا نام لے تو دیا تھا لیکن یہ بھول گیا تھا کہ امی کے پاس بھی اس کا نمبر تھا۔ وہ اسے شادی کی مبارک باد دینے کے لیے ٹیلی فون بھی کرسکتی تھیں۔ میں نے ٹیلی فون پر لاہور جانے

نہیں ہیں۔ آپ اتنا کیش لے کر...''

''منیجر صاحب!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں حالات کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ نے خود ہی کسی کو اطلاع دے دی ہو کہ...''

''آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں؟'' منیجر نے میری بات کاٹ دی۔ اس مرتبہ اس کا لہجہ خاصا درشت تھا۔

''میں الزام نہیں لگا رہا ہوں بلکہ... خیر چھوڑیں... آپ کیش منگوائیں۔'' میں نے چیک لکھ کر اس کے حوالے کردیا۔ ''میں وعدے کے مطابق اکاؤنٹ بند نہیں کررہا ہوں۔ میں نے اپنے اکاؤنٹ میں پانچ لاکھ روپے چھوڑ دیے ہیں۔''

''تھینک یو علی صاحب!'' منیجر نے کہا۔

پھر جب تک میں نے چائے ختم کی، بینک کا ایک ملازم کیش لے آیا۔

میں نے نوٹوں کا جائزہ لیا۔ وہ سب استعمال شدہ نوٹ تھے۔ ابھی میں جائزہ لے ہی رہا تھا کہ بینک کا وہی ملازم ایک دفعہ پھر مزید کیش لے کر آگیا۔

میں نے دل ہی دل میں خود کو سراہا کہ میں رقم کے لیے دو سوٹ کیس لایا تھا۔

تمام رقم آرام سے ان دونوں سوٹ کیسوں میں سما سکتی تھی۔

''سر! آپ نے کوئی بزنس شروع کردیا ہے؟'' منیجر اپنے تجسس سے مجبور ہوکر بولا۔

''ابھی تو نہیں کیا ہے لیکن جلد ہی اپنا کاروبار شروع کردوں گا۔'' میں نے کہا اور رقم دونوں سوٹ کیسوں میں رکھ کر انہیں لاک کردیا۔

میں دونوں سوٹ کیس لے کر بینک سے باہر نکلا تو آنے جانے والا ہر شخص مجھے مشتبہ لگ رہا تھا۔ دونوں سوٹ کیسوں کا وزن بھی اچھا خاصا تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ وزن میرے ذہن پر تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد مجھے ٹیکسی مل گئی۔

میں باہر کے دروازے سے گھر میں داخل ہوا اور دونوں سوٹ کیس بیڈ کے نیچے رکھ دیے۔

میں نے یہ قدم اٹھا تو لیا تھا لیکن اب مجھے گھبراہٹ ہورہی تھی۔ جب اینا پاکستان پہنچے گی تو اس کا ردِعمل کیا ہوگا؟ وہ قانونی طور پر تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ دنیا کی کوئی عدالت اس کے اس بیان کو تسلیم نہ کرتی کہ اس نے مجھ اجنبی

والی فلائٹ کے بارے میں معلوم کیا۔ لاہور کے لیے ایک فلائٹ صبح نو بجے اور دوسری دوپہر ساڑھے بارہ بجے تھی۔ میں نے صبح کی فلائٹ سے جانے کا فیصلہ کرلیا۔

میں نے سوٹ کیس میں نوٹوں کے ساتھ اپنے کپڑوں کے دو تین جوڑے اور ضرورت کا دوسرا سامان بھی رکھ لیا تھا۔ میں نے ایک سوٹ کیس سے نوٹوں کی ایک گڈی بھی نکال لی تھی۔ میں نے رات ہی کو ایک ٹریولنگ ایجنسی سے لاہور کا ٹکٹ خریدا تھا اور اپنی سیٹ کنفرم کرالی تھی۔

یہ تو غنیمت ہے کہ اس دن احسن نہیں آیا ورنہ وہ مجھ سے افتخار کے بارے میں ہزاروں سوالات کرتا اور اسے مطمئن کرنا مشکل ہوجاتا۔

دوسرے دن علی الصباح میں امی اور سیما سے مل کر روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

میں لاہور پہنچا تو دن کے گیارہ بجے تھے۔ ائرپورٹ سے میں سیدھا ہوٹل پہنچا۔ یہ صاف ستھرا ہوٹل تھا۔ میں جان بوجھ کر کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں نہیں ٹھہرا تھا۔

میں نے نہا دھو کر ہوٹل کی روم سروس سے کھانا منگوایا۔ کھانا کھاتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ افتخار لاہور ہی میں تو رہتا ہے، مجھے اس سے رابطہ کرنا چاہیے۔ اس کا سیل نمبر میرے پاس موجود تھا۔

میں نے کھانے کے بعد افتخار کا نمبر ملایا۔ چند لمحے بعد افتخار کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''ہاں بھئی علی! کیسے فون کیا؟''

''یار! میں لاہور آیا ہوا ہوں اور ہوٹل ڈی لکس میں ٹھہرا ہوں۔''

''کیا، جب یہاں گھر موجود ہے تو ہوٹل میں ٹھہرنے کی کیا تک ہے؟'' اس نے ناگواری سے کہا۔ ''میں پندرہ بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔''

''افتخار... میری بات...'' لیکن وہ سلسلہ منقطع کر چکا تھا۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ میرے سامنے موجود تھا۔

''پہلے تو بغیر اطلاع کے لاہور آیا پھر ہوٹل میں ٹھہر گیا۔'' افتخار نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

''یار! حالات کچھ ایسے ہیں کہ میں...''

''کیسے حالات؟'' افتخار نے میری بات کاٹی۔

''میں آج کل بہت پریشانی میں مبتلا ہوں یار۔'' میں نے کہا۔ ''پولیس میرے پیچھے ہے اور وہ کسی بھی وقت مجھے گرفتار کرسکتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تجھے یا انکل کو کسی قسم کی پریشانی ہو۔'' میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

''او بھائی! تُو نے کوئی قتل کر دیا ہے؟ کسی بڑی شخصیت یا اس کے بچے کو اغوا کرلیا ہے؟ ایسی کیا آفت آگئی ہے؟''

''کچھ ایسا ہی سمجھ لے۔'' میں نے جواب دیا۔

''تُو نے اگر دس قتل بھی کیے ہیں تو فکر مت کر، میں تجھ پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔'' افتخار نے کہا۔ ''تو یہاں سے تو چل۔''

''یار! مجھ سے ایک غلطی ہوگئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے امی کو بتایا تھا کہ میں افتخار کی شادی میں لاہور جارہا ہوں۔''

''میری شادی میں؟'' افتخار خوش دلی سے ہنسا۔

''ہاں یار! امی کو ابھی ان معاملات کا علم نہیں ہے۔ میں قبل از وقت انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔''

افتخار کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار ظاہر ہوگئے۔ اس نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''یار! آنٹی تو پولیس کو بتا دیں گی کہ تو میرے پاس آیا ہے۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں تجھے ایسی جگہ بھجوا دوں گا کہ کسی کو تیرا سراغ نہیں ملے گا۔ چل اب اپنا سامان اٹھا اور یہاں سے نکل۔''

ہوٹل سے چیک آؤٹ کرنے کے بعد میں افتخار کے ساتھ اس کے بنگلے پر گلبرگ آگیا۔ اس کا آبائی گاؤں تو جہلم کے قریب تھا لیکن وہ خود کاروبار کے سلسلے میں لاہور میں رہتا تھا۔

وہ دن میں نے افتخار کے بنگلے پر گزارا۔ شام کو میں نے احسن کو کال کی۔

احسن نے فوراً کہا۔ ''علی! تم کہاں ہو... یوں اچانک کیوں غائب ہوگئے؟''

''یار! میں افتخار کی شادی میں آیا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور امی کو بتا کر آیا ہوں، اچانک تو غائب نہیں ہوا۔''

''دیکھ علی!'' احسن نے کہا۔ ''تو اپنے جھوٹ سے آنٹی کو تو مطمئن کرسکتا ہے لیکن مجھے نہیں۔ مجھے سچ سچ بتا دے کہ کیا بات ہے؟''

''میں سچ ہی کہہ رہا ہوں... میں افتخار...''

''افتخار کی شادی نہیں ہو رہی ہے۔'' احسن نے میری

بات کاٹ دی۔ ''تو شاید بھول گیا کہ افتخار کا ایک بھائی وقار بھی ہے۔ ہمارے اس سے بھی تعلقات تھے۔ اس سے ابھی تھوڑی دیر پہلے میری بات ہوئی ہے۔ افتخار کی شادی کی خبر پر وہ بھی حیران تھا۔'' پھر وہ درشت لہجے میں بولا۔ ''علی! اب مجھے سچ سچ بتا دے۔ کہیں تُو نے اپنے اکاؤنٹ سے کیش تو نہیں نکال لیا؟''

''ہاں یار!'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''میں نے اپنے اکاؤنٹ سے تمام کیش نکال لیا ہے۔''

''شٹ!'' احسن نے کہا۔ ''یہ تُو نے کیا حماقت کی ہے؟'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''اب تو پہلی فرصت میں اپنی سم بدل دے اور وہ نمبر مجھے ضرور بتا دینا۔''

''کیوں، کوئی پرابلم ہوگیا ہے کیا؟''

''ابھی تو پرابلم نہیں ہوا ہے۔ میں احتیاطاً ایسا کرنے کو کہہ رہا ہوں۔''

افتخار کمرے میں آیا تو میں نے اس سے کہا۔ ''یار! مجھے موبائل فون کی کوئی سم منگوا دے۔''

''پہلے میں تجھے کسی محفوظ مقام پر بھیج دوں۔'' افتخار نے کہا۔ ''ہمارا ایک کارندہ ہے اقبال۔'' افتخار نے کہا۔ ''اب تجھ سے کیا چھپانا، وہ ہمارے لیے قانونی اور غیر قانونی ہر قسم کے کام کرتا ہے۔ ہمارے دشمنوں کی کھڑی فصلوں میں آگ لگاتا ہے، ان کے آدمیوں کو اغوا کرتا ہے، الیکشن کے دوران ہمارے مخالفین کے جلسے درہم برہم کرتا ہے اور ہمارے اشارے پر کسی کو قتل بھی کرسکتا ہے۔''

میں نے غور سے افتخار کو دیکھا۔ اس وقت وہ مجھے اس افتخار سے بالکل مختلف نظر آیا جو میرا دوست تھا۔ میرے سامنے ایک سفاک اور ظالم جاگیردار اور صنعت کار بیٹھا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں اس کے پاس کیوں آگیا؟

''کیا سوچ رہا ہے علی؟'' افتخار نے مجھے چونکا دیا۔ ''میں نے اقبال کو بلایا ہے۔ تُو اس کے ساتھ بالکل محفوظ رہے گا۔ میں بھی تجھ سے رابطے میں رہوں گا اور ملاقات بھی کرتا رہوں گا۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''اقبال میرے اعتماد کا آدمی ہے۔ وہ مر جائے گا لیکن تجھ پر آنچ نہیں آنے دے گا۔''

میں کیا کہہ سکتا تھا۔ اب تو میں افتخار کے رحم و کرم پر تھا۔ اس نے ملازم سے موبائل کے دو تین سم کارڈز بھی منگوا لیے تھے۔

''یار! تُو تو بالکل گم صم ہو کر رہ گیا ہے۔'' افتخار نے کہا۔ ''او یار! اب تجھے کوئی خطرہ نہیں ہے، بے فکر ہوجا۔''

اس نے مجھ سے اب تک یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ مجھے کراچی سے بھاگنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ بس وہ میری مدد کو تیار ہوگیا تھا۔

شام کو میں افتخار کے ساتھ باہر نکلا۔ ابھی میرے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ خطرہ تو اس وقت پیدا ہوتا جب اینا پاکستان آجاتی۔ ابھی اس کی آمد میں تین دن باقی تھے۔

میں نے باہر نکلنے سے پہلے سوٹ کیس سے نوٹوں کی ایک اور گڈی نکال لی تھی۔ میں نے اپنے لیے ڈھیروں شاپنگ کر ڈالی۔ اپنے لیے پینٹ شرٹس اور بہترین قسم کے کرتہ شلوار کے علاوہ پرفیومز، شیونگ کی بیش قیمت کٹ، کلائی کی قیمتی گھڑی، مہنگا ترین سیل فون، جوتے، تھری پیس سوٹ اور اعلیٰ قسم کی ٹائیاں خریدیں۔ میں نے زبردستی افتخار کو بھی شاپنگ کرادی۔

افتخار بھی حیران تھا کہ میں اتنی شاپنگ کیسے کر رہا ہوں؟ لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔

شاپنگ کے بعد ہم لوگ لاہور کی سڑکیں ناپتے رہے۔ واپسی پر ہم نے بہترین سے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا اور گھر لوٹ آئے۔

ڈرائنگ روم میں خوب رو سا ایک نوجوان موجود تھا۔ اس نے افتخار کو سلام کیا۔ سر کی جنبش سے افتخار نے اس کے سلام کا جواب دیا پھر اس سے مخاطب ہوا۔ ''یار بالے! تجھ سے ایک کام ہے۔''

''حکم کریں ملک صاحب!'' اس نے کہا پھر مسکرا کر بولا۔ ''ابھی الیکشن تو دور ہیں سرکار۔''

''یہ میرے دوست علی ہیں۔'' افتخار نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''کراچی سے آئے ہیں۔''

بالے نے مجھے بھی سلام کیا اور بولا۔ ''ملک صاحب! آپ کے دوست ہیں تو ہمارے لیے بھی قابلِ احترام ہیں۔'' اس نے مجھ سے ہاتھ ملانے کی کوشش نہیں کی۔

''ان کے لیے کسی محفوظ جگہ کا بندوبست کرنا ہے۔ ایسی جگہ جہاں پرندہ بھی پر نہ مار سکے...'' افتخار نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''مسئلہ ہی کوئی نہیں ہے ملک صاحب!'' بالے نے کہا۔

''علی!'' افتخار نے مجھے مخاطب کیا۔ ''یہ اقبال ہے، بالے کے نام سے مشہور ہے۔ تم اس پر بھی اتنا ہی اعتماد اور بھروسا کرسکتے ہو جتنا مجھ پر۔'' وہ بالے سے بولا۔ ''تم جا کر کسی جگہ کا بندوبست کرو۔ میں بعد میں تمہیں بلا لوں گا۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' اقبال نے جواب دیا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''ملک صاحب! پرانے شہر میں میرا ایک مکان ہے۔ وہ علاقہ تو اچھا نہیں ہے لیکن مکان میں ہر طرح کی سہولت ہے۔ علی صاحب کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

افتخار نے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔ ''یار! مکان پرانے لاہور میں ہو یا ڈیفنس میں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''ٹھیک ہے سر جی۔'' اقبال نے جواب دیا۔ ''میں اس مکان کو ٹھیک ٹھاک کرتا ہوں۔ صرف دس منٹ کے نوٹس پر علی صاحب کو اس مکان میں شفٹ کرسکتا ہوں۔''

میں نے اب تک اقبال کو بہ غور نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے لباس اور بات چیت سے شریف اور معصوم لگ رہا تھا۔ اس کا قد درمیانہ لیکن جسم کسرتی اور مضبوط تھا۔ جلد کی رنگت سرخ و سفید تھی اور سر کے بال تقریباً غائب تھے۔ اس نے اومیگا کی قیمتی گھڑی باندھ رکھی تھی اور وہ سفید کلف دار شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔

''ٹھیک ہے بالے۔'' افتخار نے کہا۔ ''تم اپنا سیل نمبر علی کو دے دو۔ اگر میں موجود نہ بھی ہوا تو یہ تم سے رابطہ کر لے گا۔''

اقبال نے مجھے اپنا فون نمبر دیا اور میرا سیل نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کرنے کے بعد چلا گیا۔

''مجھے ابھی گاؤں جانا ہے۔ یہاں چاچا غلام حسین موجود ہے۔ تمہیں کوئی ضرورت ہو تو اسے بتا دینا۔ ویسے تمہارے بیڈ روم میں ٹی وی، ڈی وی ڈی پلیئر اور کمپیوٹر موجود ہے۔ فریج میں کھانے پینے کا سامان موجود ہے۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو چاچا غلام حسین سے کہہ دینا۔ میں اب چلتا ہوں۔'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہزار ہزار روپے کے کئی نوٹ نکال کر میری طرف بڑھائے۔ ''یہ رکھ لو۔''

''نہیں افتخار۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔''

''رکھ لے یار۔'' افتخار نے زبردستی نوٹ میری جیب میں ٹھونس دیے۔ ''تجھے پیسوں کی ضرورت تو پڑے گی۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

میں اسے گاڑی تک چھوڑنے گیا۔ چاچا غلام حسین بھی وہاں موجود تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے چاچا سے بولا۔ ''چاچا! مہمان کا خیال رکھنا۔''

''آپ فکر مت کریں ملک صاحب! میں علی صاحب کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے غلام حسین سے کافی لانے کو کہا اور اپنے کمرے میں آگیا۔ چاچا غلام حسین فوراً ہی کافی لے آیا۔

میں نے ٹی وی کھول کر مختلف نیوز چینلز دیکھے لیکن وہاں کوئی ایسی قابلِ ذکر چیز نہیں تھی۔ پھر میں کمپیوٹر پر جا بیٹھا۔ میں نے اپنی میل کھولی تو ایک میل دیکھ کر میرا دل بے اختیار بری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ اینا کی میل تھی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ میل پڑھنا شروع کی۔ اس نے لکھا تھا۔ ''ڈیئر علی! میں نے تمہیں اس سے قبل بھی ایک میل بھیجی تھی لیکن تم نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تمہارے لیے خوش خبری ہے۔ میرا کام خلافِ توقع چند دن پہلے ہی ختم ہو گیا ہے۔ میں کل رات کی فلائٹ سے پاکستان آرہی ہوں۔ یعنی پاکستان میں اس وقت رات بلکہ صبح کے چار بجے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے ریسیو کرنے ائرپورٹ ضرور آؤ گے۔ ہاں، اپنا سیل نمبر مجھے بھیج دو۔''

میرے ہاتھ پیروں میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ گویا وہ گھڑی آگئی تھی جس کا مجھے انتظار تھا۔

میں نے فوراً اپنی نئی سم سے احسن کا نمبر ملایا۔ کئی گھنٹیاں بجنے کے بعد احسن کی بھاری آواز سنائی دی۔

''ہیلو!''

''احسن! میں...''

''ہاں علی!'' احسن نے کہا۔ ''سب خیریت ہے نا؟''

''یار! وہ اینا وقت سے پہلے ہی یعنی کل صبح چار بجے کراچی پہنچ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''آنے دے۔'' احسن نے کہا۔ ''تُو ہے کہاں؟''

''میں لاہور میں ہی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تُو مجھے وہاں کے حالات سے آگاہ رکھنا اور امی ابو اور سیما کا خیال رکھنا۔ ہاں، تو میرا ایک اور نمبر بھی نوٹ کر لے۔ ممکن ہے میں یہ نمبر بھی آف کر دوں۔''

''اتنا پریشان مت ہو یار!'' علی نے کہا۔ ''تُو نے تو قبل از مرگ ہی واویلا شروع کر دیا۔''

''میں واویلا نہیں کر رہا ہوں اور تُو ذرا آسان اور سلیس اردو میں بات کیا کر۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''یہ قبل از مرگ کیا ہوتا ہے؟''

''اس کا مطلب ہے کہ تو کچھ زیادہ ہی ٹینشن میں ہے۔'' احسن ہنس کر بولا۔ ''قبل از مرگ کا مطلب ہے موت سے پہلے۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''یار علی! کیا میں صبح ائرپورٹ چلا جاؤں؟ میں بھی ایک نظر دیکھ لوں گا کہ وہ اینا ہے یا ہارلم کا کوئی جوزف؟''

''تو اینا کو پہچانے گا کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اندازے سے اسے پہچان لوں گا۔ کوئی خوب صورت امریکن دوشیزہ اگر کسی کو تلاش کر رہی ہو تو وہ زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتی۔''

''جیسے تیری مرضی۔'' میں نے کہا پھر رسمی جملوں کی ادائگی کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔

اب مجھے ایک نئی پریشانی نے گھیر لیا تھا۔ نہ جانے اب کیا ہونے والا تھا۔ زیادہ امکانات تو یہی تھے کہ اینا میری تلاش میں دھکے کھا کر واپس چلی جاتی۔ میں نے اپنا کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا۔ لے دے کر اس کے پاس صرف میری ای میلز ہوسکتی تھیں۔ ان سے میری لوکیشن کے بارے میں معلوم ہونا ممکن نہیں تھا۔ نہ میں نے اسے اپنا سیل نمبر دیا تھا، نہ گھر کا ایڈریس۔ اس کے پاس تو میری تصویر بھی نہیں تھی۔ میں فضول میں اس سے خوف زدہ تھا۔

میں کچھ دیر بیٹھا ٹی وی کے چینلز بدلتا رہا پھر میں نے ٹی وی آف کر دیا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور چاچا غلام حسین اندر داخل ہوا۔ ''صاحب جی!'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''کھانا آپ یہیں کھائیں گے یا ڈائننگ روم میں لگا دوں؟''

''ڈائننگ روم میں لگا دو چاچا۔'' میں نے کہا۔ ''میں بس ابھی آرہا ہوں۔''

☆☆☆

ساری رات میں بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ میں سونے کی کوشش کرتا رہا لیکن نیند نہیں آئی۔ گھڑی نے چار بجائے تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور سوچا اب تک اینا کی فلائٹ آچکی ہوگی۔ نہ جانے احسن ائرپورٹ پہنچا یا نہیں؟ پھر میں نے سوچا کہ وہ پہنچا ہوگا تو ائرپورٹ پر ہوگا۔

میں نے بے اختیار احسن کا نمبر ڈائل کر دیا۔

دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی۔ مجھے یہ سوچ کر مایوسی ہوئی کہ احسن ائرپورٹ نہیں پہنچا ورنہ فوراً میری کال ریسیو کر لیتا۔ سیل فون کی بیل بج بج کر بند ہوگئی اور ریکارڈنگ سنائی دی۔ ''آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد کال کریں، شکریہ۔''

میں نے جھنجلا کر سیل فون بستر پر اچھال دیا۔ بستر پر گرتے ہی سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے لپک کر سیل فون اٹھا لیا۔ سیل فون کی اسکرین پر احسن کا نام دیکھ کر میں نے فوراً کال ریسیو کر لی۔

''ہاں احسن!'' میں نے بے تابی سے کہا۔

''یار! میں اس وقت ائرپورٹ پر موجود ہوں۔ ابھی تک مجھے اینا دکھائی نہیں دی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ایسی کوئی امریکن دوشیزہ جس پر اینا کا شبہ کیا جائے۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''تیرے سیل فون میں کریڈٹ ہے تو آن لائن رہ۔ میں آنے والے مسافروں کو دیکھتا ہوں۔''

''میرے کریڈٹ کی فکر مت کر۔'' میں نے کہا۔ ''میرے سیل فون میں بہت کریڈٹ ہے اور اضافی کارڈز بھی ہیں۔''

احسن خاموش ہو گیا لیکن مجھے لوگوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔

اچانک احسن کی آواز آئی۔ ''خوب صورت سی ایک امریکن لڑکی باہر نکلی ہے۔ وہ متلاشی نظروں سے اردگرد کا جائزہ لے رہی ہے۔'' احسن گویا رننگ کمنٹری کر رہا تھا۔ ''ارے...''

''کیا ہوا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''اس خوب صورت دوشیزہ کے ساتھ ایک دراز قد امریکن بھی ہے۔ اس نے بہترین تراش کا سوٹ پہن رکھا ہے۔ لگتا ہے وہ امریکن کوئی بیوروکریٹ ہے یا کسی ملٹی نیشنل کمپنی کا بڑا عہدے دار... عام امریکی عموماً جینز یا جیکٹ پہنتے ہیں۔''

''یہ تم نے فرض کر لیا ہے کہ...''

''میں نے فرض نہیں کیا ہے بلکہ میرا مشاہدہ ہے۔'' احسن نے جواب دیا۔ ''عام امریکی لباس کے سلسلے میں اتنا اہتمام نہیں کرتا ہے۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''ہم اس پر کیوں بحث کر رہے ہیں؟ آنے والی دوشیزہ اینا نہیں ہوسکتی۔ اینا تو تنہا آنے والی تھی۔''

میں پھر ملی جلی آوازوں کا شور سننے لگا۔ شاید کوئی فلائٹ اسی وقت جانے والی بھی تھی۔

اچانک پھر احسن کی آواز آئی۔ ''علی! اسی وقت ایک اور دراز قد حسینہ ارائیول لاؤنج سے باہر آئی ہے... لیکن... یہ کیا... اس کے ساتھ بھی ایک خوش لباس اور دراز قد امریکن ہے۔ وہ وہاں کھڑے ہوئے لوگوں خاص طور پر نوجوانوں کو بہت غور سے دیکھ رہی ہے...''

میرا دورانِ خون تیز ہو گیا۔ احسن بات کرتے کرتے خاموش ہو گیا تھا۔

اچانک وہ مضطرب ہو کر بولا۔ ”وہ لڑکی میری ہی طرف آرہی ہے... وہ...“

پھر میرے کانوں میں مترنم سی ایک آواز آئی۔ ”ایکسکیوزمی!“

”آپ نے مجھ سے کچھ کہا میڈم؟“ احسن نے انگلش میں پوچھا۔

”جی ہاں۔“ لڑکی کی آواز آئی۔ ”کیا... آپ... علی ہیں؟“

میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔

احسن بھی کچھ بوکھلا گیا تھا۔ ”میں... آپ کا مطلب ہے کہ میں... علی... نہیں میڈم! میں علی نہیں ہوں۔“ پھر وہ سنبھل کر بولا۔ ”ویسے آپ علی کا حلیہ بتائیں، ممکن ہے میں اسے تلاش کرسکوں۔“

”میں نہیں جانتی۔“ لڑکی نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”اس سے نیٹ پر میرا رابطہ تھا۔“

”ویسے ایک علی کو میں بھی جانتا ہوں۔“ احسن نے کہا۔ ”وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔“

”اس طرح تو اس ملک میں لاکھوں علی ہوں گے۔“ غراتی ہوئی سی ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ ”یہاں تو ہر دوسرے آدمی کے نام کے ساتھ علی لگا ہوتا ہے۔“

”آپ...“ احسن نے کچھ کہنا چاہا۔

”یہ میرے دوست ہیں آسٹن۔“ لڑکی نے جلدی سے کہا۔

”اینا!“ مرد کی درشت آواز سنائی دی۔ ”تم نے علی کا سیل نمبر یا ایڈریس کیوں نہیں لیا... اب اگر وہ نہ آیا تو تم اسے کہاں تلاش کرو گی؟“

میرے خون کی گردش پھر تیز ہوگئی۔ آنے والی اینا ہی تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس بے بی آسٹن کو میں کہاں فٹ کروں۔

پھر اینا کی آواز سنائی دی۔ ”سوری مسٹر! میں نے فضول میں آپ کو ڈسٹرب کیا۔“

”سوری کی ضرورت نہیں ہے میڈم!“ احسن نے کہا۔ ”مجھے تو آپ کی پریشانی کا احساس ہے۔“

میں سیل فون کان سے لگائے بیٹھا تھا۔ مسلسل کان سے لگانے کی وجہ سے سیل فون گرم ہوگیا تھا۔ کچھ دیر بعد احسن کی آواز ابھری۔ ”علی... کیا تو موجود ہے؟“

”ہاں، میں موجود ہوں لیکن میرا نام مت لے۔“

”وہ لوگ اب جاچکے ہیں۔“ احسن نے کہا۔

”تُو نے اس سے یہ کیوں کہا کہ تیرا ایک دوست بھی علی ہے؟“

”یار! بات کو سمجھا کر۔ کل کلاں کو اگر وہ کسی نہ کسی طرح تیرے گھر تک پہنچ جاتی ہے جس کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں، تو وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان جائے گی۔ اس وقت میں اس سے یہ تو کہہ سکوں گا کہ میں نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا۔“ پھر وہ بولا۔ ”یار! پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ اب تو بھی سو اور میں بھی گھر جا رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے یار!“ میں نے کہا۔ ”مجھے حالات سے باخبر رکھنا، خدا حافظ۔“

احسن نے بھی خدا حافظ کر کے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد میں بھی سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن بہت دیر تک کروٹیں بدلنے کے باوجود مجھے نیند نہ آئی۔ جسم سے زیادہ میرے ذہن پر بوجھ تھا۔ میں اب یہ سوچ رہا تھا کہ نہ جانے اینا کا ردِعمل کیا ہوگا؟ مجھے امی، ابو اور سیما کا خیال آیا۔ جب ابو کو یہ معلوم ہوگا کہ ان کا بیٹا کروڑوں کی رقم لے کر فرار ہوگیا ہے تو ان کے دل پر کیا گزرے گی؟ امی کیا سوچیں گی اور سب سے بڑھ کر سیما کا کیا حال ہوگا؟

یہی ساری باتیں سوچتے سوچتے نہ جانے کب مجھے نیند آگئی۔

میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی ساڑھے بارہ بجا رہی تھی۔ میرا جسم بری طرح ٹوٹ رہا تھا اور مجھے چکر سے آرہے تھے۔

اسی وقت چاچا غلام حسین نے دروازہ کھول کر میرے کمرے میں جھانکا۔ مجھے جاگتا ہوا دیکھ کر وہ جھجکتا ہوا میرے کمرے میں آگیا اور بولا۔ ”صاحب جی! صبح سے میں چار پانچ چکر لگا چکا ہوں۔ آپ گہری نیند سو رہے تھے۔“ پھر بولتے بولتے اس نے غور سے میری شکل دیکھی اور پُرتفکر لہجے میں بولا۔ ”صاحب! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے چاچا!“ میں نے کہا۔ ”تم مجھے ایک کپ کافی اور پیناڈول کی دو ٹیبلٹس لا دو۔“

اس نے آگے بڑھ کر میری کلائی تھامی پھر چونک کر بولا۔ ”آپ کو تو بہت تیز بخار ہے جی۔“

”ہاں، میں بخار کی گولیاں کھا لوں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

”دوا خالی پیٹ نہیں کھانی چاہیے صاحب۔“ چاچا ہمدردی سے بولا۔ ”میں پہلے آپ کے لیے جوس اور ڈبل

[illegible]

باہر نکل گیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ ایک ٹرے میں جوس کا گلاس، کچھ سلائس اور ابلے ہوئے انڈے لے کر آ گیا۔ پھر اس نے زبردستی مجھے سلائس کھانے پر مجبور کر دیا اور جوس کا گلاس میرے ہاتھ میں پکڑا دیا پھر ہنس کر بولا۔ ''صاحب جی! کبھی کبھی ملک صاحب کے ساتھ بھی زبردستی کرنا پڑتی ہے۔ انہیں تو میں نے گودوں میں کھلایا ہے اس لیے وہ میری بات مان لیتے ہیں ورنہ دوسرے نوکروں کا تو دم نکلتا ہے انہیں دیکھ کر۔'' اس کے لہجے میں فخر تھا۔ اس کے لیے یہ بھی اعزاز کی بات تھی کہ چھوٹے ملک صاحب کو اس نے گودوں میں کھلایا تھا۔

''چاچا! اب تو مجھے ٹیبلٹ لا دو۔'' میں نے جوس کا گھونٹ زبردستی گلے سے اتارتے ہوئے کہا۔

''ابھی لایا صاحب جی۔'' چاچا نے کہا اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔ فوراً ہی وہ ایک خوش پوش شخص کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ چاچا نے اس کا بریف کیس اٹھا رکھا تھا۔ چاچا نے ہنس کر کہا۔ ''میں نے ڈاکٹر صاحب کو بلا لیا تھا۔ ملک صاحب بیمار ہوتے ہیں، تب بھی میں ایسا ہی کرتا ہوں۔''

اس بوڑھے کی ساری زندگی جاگیرداروں کی ٹھوکریں اور جھڑکیاں کھاتے گزر گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھا۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔

ڈاکٹر نے میرے نزدیک کرسی پر بیٹھ کر اپنا بریف کیس کھولا اور اس میں سے تھرمامیٹر نکال کر میرے منہ میں لگا دیا۔ پھر اس نے اسٹیتھواسکوپ سے میرا معائنہ کیا، میری نبض دیکھی اور تھرمامیٹر منہ سے نکال کر بخار دیکھنے لگا۔ پھر وہ نرم لہجے میں بولا۔ ''علی صاحب! آپ کو تو اچھا خاصا بخار ہے۔''

''آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ شاید بھول گئے کہ آپ کی دیکھ بھال چاچا غلام حسین کے ذمے ہے۔ اس نے نہ صرف مجھے آپ کا نام بتایا ہے بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ آپ کراچی سے آئے ہیں۔''

ایک لمحے کو مجھے چاچا غلام حسین سے خوف سا محسوس ہوا۔ ابھی اس نے ڈاکٹر کو میرے بارے میں بتایا تھا۔ بعد میں محلے کے دوسرے گھروں کے نوکروں کو بھی بتا سکتا تھا۔

ڈاکٹر نے مجھے فوری طور پر ایک انجکشن دیا اور ایک پرچے پر کچھ دوائیں لکھ کر چاچا غلام حسین کو دیں اور بولا۔

[illegible] دوائیں بھی دلوادوں گا اور استعمال کا طریقہ بھی بتا دوں گا۔''

ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں کچھ دیر تو کسلمندی سے لیٹا رہا پھر میری آنکھ لگ گئی۔ میری آنکھ دوبارہ کھلی تو چاچا میرے بیڈ کے نزدیک ہی کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس میں آٹھ بج رہے تھے۔ گویا میں چھ سات گھنٹے تک سوتا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے جو انجکشن دیا تھا، اس میں کوئی مسکن دوا تھی جس کے زیرِ اثر میں سوتا رہا تھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے صاحب؟'' چاچا نے بہت اپنایت سے پوچھا۔

''اب تو میری طبیعت بہت بہتر ہے۔'' میں نے اٹھ کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ میں نے سونے سے پہلے صرف دو سلائس اور ایک گلاس جوس لیا تھا۔ اب مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے چاچا سے کھانا لانے کو کہا اور خود واش روم میں گھس گیا۔

میں کھانا کھا کر چائے پی رہا تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ اسکرین پر احسن کا نام تھا۔ میں نے جلدی سے کال ریسیو کر لی اور بولا۔ ''بولو احسن! کوئی خاص خبر؟''

''خاص خبر یہ ہے کہ اینا آج کافی دیر تک بینک میں گزارنے کے بعد وہاں سے نکلی ہے۔ شاید اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔'' احسن نے کہا۔

''کیسا مقصد؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا اینا نے تمہیں بتایا ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے؟''

''اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا لیکن اس کے چہرے کی مایوسی دیکھ کر میں نے خود ہی اندازہ لگا لیا۔'' احسن نے کہا۔

''اور وہ بے بی آسٹن کہاں تھا؟''

''بے بی آسٹن!'' احسن نے حیرانی سے دہرایا۔ ''اچھا وہ آسٹن... وہ آج اینا کے ساتھ نہیں تھا۔''

''تو کسی طرح بینک منیجر یا وہاں کے کسی اور شخص سے معلوم کر کہ اینا وہاں کیوں آئی تھی؟''

''تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' احسن نے اچانک پوچھا۔

''ہاں یار!'' میں نے کہا۔ ''ایسی کوئی خاص بات نہیں، بس ہلکا سا بخار آ گیا تھا۔ اب میں ٹھیک ہوں۔''

''ٹھیک ہے، اب میں تجھے کل کال کروں گا۔'' احسن نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

دواؤں میں کوئی ٹرنکولائزر بھی تھی۔ دوا لیتے ہی مجھے پھر نیند آنے لگی۔ میں نے اٹھ کر ٹی وی کھولا اور ایک نیوز

چینل لگا لیا۔ وہاں سے ہمیشہ کی طرح سیاست داں آپس میں کالج کے لڑکوں کی طرح لڑ رہے تھے۔ میں نے دوسرا چینل لگایا، وہاں سے بھی اسی قسم کا واہیات پروگرام آرہا تھا۔ میں چینل بدلتے ہی بدلتے بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ رات کو تین بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو شدید سردی کا احساس ہوا۔ میں نے ٹی وی آف کیا اور بیڈ پر لیٹ کر پھر سو گیا۔

دوسرے دن میری آنکھ کھلی تو میری طبیعت بہت بہتر تھی۔ حسبِ معمول چاچا غلام حسین نے کمرے میں جھانکا، پھر ہنس کر بولا۔ ''آج تو بہت سویرے اٹھ گئے ہو صاحب جی؟''

''ہاں چاچا! رات کو نیند بھی اچھی آئی۔ اب طبیعت بھی ٹھیک ہے۔''

''ملک صاحب آپ کو پوچھ رہے تھے۔''

''افتخار کب آیا؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے آئے ہیں۔'' چاچا غلام حسین نے بتایا۔

میں جلدی جلدی ہاتھ منہ دھو کر باہر نکلا اور سٹنگ روم کی طرف بڑھا۔ افتخار وہیں بیٹھا تھا۔ ابھی میں لاؤنج ہی میں تھا کہ اچانک میں نے فائر کی آواز سنی۔ میں نے چونک کر لان میں کھلنے والی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہاں کا منظر عجیب تھا۔ گیٹ کے پاس چوکیدار غیر فطری انداز میں آڑا ترچھا پڑا ہوا تھا اور کئی مسلح افراد گیٹ سے اندر کی طرف آرہے تھے۔ میں جلدی سے نیچے جھک گیا اور جھکے جھکے کچن کی طرف بڑھا۔ وہاں سے سٹنگ روم قریب تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ لوگ کون ہیں اور انہیں اتنی جلدی میری یہاں موجودگی کی اطلاع کیسے مل گئی؟ میرے پاس تو کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔ میں نے خود کو ملامت کی کہ میں نے ہزاروں روپے کی شاپنگ کر ڈالی لیکن کوئی چھوٹا موٹا ماؤزر نہیں خریدا۔ پیسا خرچ کیا جائے تو ماؤزر یا رائفل کیا راکٹ لانچر بھی مل جاتا ہے۔

چاچا غلام حسین سراسیمگی کی حالت میں وہاں آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''چاچا! گھر میں کوئی ہتھیار ہے؟''

چاچا غلام حسین نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''ہاں جی، ایک رائفل ہے اور ریوالور تو ملک صاحب کے کمرے میں بھی ہے۔''

میں یہ سنتے ہی کوریڈور میں نکل آیا۔ چاچا غلام حسین نے برآمدے کا داخلی دروازہ مقفل کر دیا تھا۔ آنے والے دروازے پر زوردار ضربیں لگا رہے تھے۔ پھر انہوں نے بند دروازے پر فائرنگ شروع کر دی۔ وہ فائر شاید سیون ایم ایم کا تھا۔ گولیاں لکڑی کے موٹے دروازے سے گزر کر اندر کی دیوار سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں نے ایک لمحے کو سوچا پھر پیٹ کے بل رینگتا ہوا افتخار کے کمرے کی طرف بڑھا۔ افتخار نہ جانے خود کہاں تھا اور کس حال میں تھا؟ مجھے شرمندگی اس بات کی تھی کہ میری وجہ سے وہ بھی اس مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ میں کرالنگ کرتا ہوا کسی نہ کسی طرح افتخار کے کمرے میں پہنچ گیا۔ رائفل تو مجھے دیوار پر لٹکی نظر آ گئی۔ میں نے رائفل شانے سے لٹکا کر اس کے میگزین کی تلاش میں افتخار کی الماری کھولی تو مجھے میگزینز کے ساتھ ساتھ مشین پسٹل اور اس کے میگزینز بھی مل گئے۔ میں نے مشین پسٹل کو لوڈ کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ پہلے ہی لوڈ ہے۔ مشین پسٹل اور اس کے میگزینز جیکٹ کی جیب میں ڈال کر میں نے رائفل لوڈ کی اور پھرتی سے کمرے کے دروازے کے نزدیک پہنچ گیا۔

دروازے پر اس وقت ایک زوردار ضرب لگی اور وہ کھل گیا۔ میں کمرے کے دروازے کی اوٹ میں چھپ گیا۔ باہر والے کچھ دیر ردِعمل کا انتظار کرتے رہے پھر وہ چاروں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ میں نے ان میں سے ایک شخص کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ فائر کے دھماکے کے ساتھ ہی کرب ناک انسانی چیخ گونجی۔ میں نے دوسرا فائر ہوا میں کیا۔

آنے والے دہشت زدہ ہو کر باہر کی طرف بھاگے۔ میں تیزی سے باہر نکلا اور برآمدے کے دروازے سے بھاگنے والوں پر پھر ایک فائر کر دیا۔ پھر اذیت بھری چیخ بلند ہوئی اور آنے والے حواس باختہ ہو کر گیٹ سے باہر نکل گئے۔

میں دوڑتا ہوا لان میں آیا اور مزید دو ہوائی فائر کر دیے۔ فوراً ہی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور ایک دم وہاں سکوت چھا گیا۔

فائرنگ کی آواز سن کر افتخار بھی سٹنگ روم سے باہر آ گیا تھا۔

میں رائفل لے کر واپس پلٹا تو افتخار برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ''سوری یار! میری وجہ سے تمہیں پریشانی اٹھانا پڑی۔ بہتر یہی ہے کہ میں یہاں سے کہیں اور منتقل ہو جاؤں۔''

''اپنی ہی بکواس کرتے رہو گے یا دوسرے کی بھی سنو گے؟'' افتخار نے کہا۔ ''تم پہلے تو اس غلط فہمی کو دل سے نکال دو کہ یہ حملہ آور تمہاری جان لینے آئے تھے۔ یہ میرے

لیے آئے تھے۔ اگر تم نہ ہوتے تو شاید اس وقت میں بھی زندہ نہ ہوتا۔'' افتخار نے بے اختیار مجھے سینے سے لگا لیا۔

''او بھائی! زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے کیوں گناہ گار کرتے ہو؟''

پھر اس کے استفسار پر میں نے اسے بتایا کہ میں نے کیسے حملہ آوروں کو اندر داخل ہوتے دیکھا اور ہتھیاروں تک رسائی کیسے حاصل کی۔

''یار! تم نے تو کمال کر دیا۔'' افتخار نے کہا۔ ''میں اس اچانک افتاد سے کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گیا تھا۔ سٹنگ روم سے میرے کمرے کا فاصلہ بھی زیادہ ہے۔ میں بھی باہر نکلتا تو کسی اندھی گولی کا نشانہ بن جاتا۔''

''اپنی باتوں میں ہمیں چوکیدار کا تو خیال ہی نہیں آیا۔'' میں نے کہا۔ ''وہ بے چارہ نہ جانے زندہ ہے یا...''

''چوکیدار کو ہوش آ گیا ہے۔'' چاچا غلام حسین نے بتایا۔

اچانک مجھے حملہ آوروں کے اس ساتھی کا خیال آیا جسے میں نے برآمدے میں زخمی کیا تھا۔ نہ جانے وہ زندہ بھی تھا یا... مر گیا تھا؟ میں برآمدے میں آیا تو وہ شخص آڑا ترچھا پڑا ہوا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ وہ زندگی سے ناتا توڑ چکا تھا۔

افتخار نے بہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لیا پھر آہستہ سے بولا۔ ''یہ تو رحمو ہے۔''

میں نے گھوم کر استفسار طلب نظروں سے افتخار کو دیکھا۔

''یہ چودھری امانت کا کارندہ ہے۔ کئی افراد کے قتل کا الزام ہے اس پر... دو دفعہ جیل بھی جا چکا ہے۔ مجھے اس کا بندوبست کرنا پڑے گا۔'' افتخار نے کہا۔

پھر اس نے گاؤں ٹیلی فون کر کے اپنے باپ کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد مختلف جگہ ٹیلی فون کرتا رہا۔

اس نے مجھ سے وہ رائفل لے لی جس سے رحمو ہلاک ہوا تھا۔ اس نے رائفل سے میرے فنگر پرنٹ اچھی طرح صاف کیے اور اس پر اپنے فنگر پرنٹ ثبت کر دیے۔ پھر اس نے پولیس کو ٹیلی فون کر دیا اور مجھ سے بولا۔ ''پولیس کے آنے پر تم اندر چلے جانا۔''

پولیس کی کارروائی میں دو تین گھنٹے ضائع ہو گئے۔

ابھی پولیس والے موجود ہی تھے کہ افتخار کے والد ملک اللہ داد خان بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ خاصی بھاری بھرکم اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ اس عمر میں بھی ان کی صحت قابلِ رشک تھی اور وہ افتخار سے زیادہ جوان اور توانا لگ رہے تھے۔

ضابطے کی کارروائی کے بعد پولیس چلی گئی تو چاچا غلام حسین بڑے ملک صاحب کے لیے حقہ لے آیا۔ وہ لاؤنج میں پڑی کرسی پر بیٹھ کے حقہ گڑگڑانے لگے۔

''اباجی کو معلوم نہ ہو کہ تو کراچی سے فرار ہو کر آیا ہے۔'' افتخار نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ان سے ملاقات کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کسی کا ٹیلی فون آیا تو وہ اچانک ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور افتخار سے دو چار ضروری باتیں کر کے عجلت میں روانہ ہو گئے۔

افتخار انہیں گاڑی تک چھوڑنے گیا۔ اچانک میری نظر ایک پرس پر پڑی جو کرسی کے پاس گرا ہوا تھا۔ میں نے وہ پرس اٹھا لیا۔ پرس کھلتے ہی مجھے بڑے ملک صاحب کی تصویر نظر آئی۔ ان کا شناختی کارڈ اوپر ہی کے فلیپ میں لگا ہوا تھا۔ اس کے نیچے شفاف پلاسٹک کے کئی فلیپ تھے۔ ان میں سے ایک فلیپ میں ملک صاحب کے جاننے والوں کے وزیٹنگ کارڈز تھے۔ اگلا فلیپ کھولتے ہی میرا ذہن بھک سے اڑ گیا۔ وہاں اینا کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ وہی اینا جس نے میرے اکاؤنٹ میں ایک خطیر رقم منتقل کی تھی۔ میں اسے لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔

اسی وقت افتخار لوٹ آیا۔ میں نے اس سے کہا۔

''انکل اپنا پرس یہیں بھول گئے۔''

''یہ تمہیں کہاں سے ملا؟'' افتخار نے پرس میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

''یہ یہیں فرش پر پڑا تھا۔''

''یار! اس میں تو اباجی کا آئی ڈی کارڈ بھی ہے اور کریڈٹ کارڈز بھی ہیں۔'' اس نے فوراً سیل فون پر نمبر ملایا اور بولا۔ ''اباجی! آپ اپنا پرس یہیں بھول گئے ہیں... جی اباجی... وہ اس وقت... میرے پاس ہے... ٹھیک ہے۔'' اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ ''اباجی کسی کو ریسیو کرنے پنڈی جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ میں اپنا پرس واپسی میں لے لوں گا۔''

''یار افتخار!'' میں نے کہا۔ ''اگر تو... بُرا نہ مانے تو میں ایک بات پوچھوں؟''

افتخار نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر بولا۔ ''علی! تجھے یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

''یار... وہ... میں نے... انکل... کے پرس میں کسی امریکن لڑکی کی تصویر دیکھی ہے... وہ...''

''وہ اباجی کی بزنس پارٹنر کلارا ہے۔'' افتخار ہنس کر

بولا۔ ''اب اس نے یہاں ایک این جی او قائم کرنے کا ارادہ بھی کیا ہے۔ وہ اسی سلسلے میں پاکستان آ رہی ہے۔''

افتخار کی بات سن کر میرے ذہن میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ گویا اینا یہاں آ رہی تھی۔

''وہ یہاں لاہور آئے گی؟'' میں نے پوچھا۔

''امریکا سے وہ کراچی پہنچے گی۔ این جی او کا ہیڈ آفس کراچی ہی میں ہو گا۔ کراچی ہی سے وہ اپنی ٹیم کے ساتھ اندرونِ سندھ میں بھی کام کرے گی۔ پھر وقت ملا تو اسلام آباد بھی آئے گی۔''

''یار! پارٹنر وہ انکل کی ہے اور تفصیلات تُو بتا رہا ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''اس این جی او میں مجھے بھی کام کرنا ہے۔'' افتخار ہنس کر بولا۔ ''لیکن تجھے کلارا کی اتنی فکر کیوں پڑ گئی؟''

''یار! میں نے انکل کے پرس میں اس کی تصویر دیکھی تو پوچھ لیا۔'' میں نے جواب دیا۔

افتخار کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے سیل فون جیب سے نکالا اور بولا۔ ''ہاں رحیم! کوئی خاص بات؟ نہیں اباجی تو پنڈی گئے ہیں... کیا ہوا ہے؟... اچھا میں پہنچ رہا ہوں۔'' وہ سلسلہ منقطع کر کے مجھ سے بولا۔ ''یار! دشمنوں نے ہمارے ایک گاؤں پر حملہ کر کے کئی افراد کو زخمی کر دیا ہے۔ رحیم خان ہمارا منیجر ہے۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ ہم جوابی کارروائی کریں یا بڑے ملک صاحب کا انتظار کریں۔ اباجی کا موبائل فون آف ہے۔ مجھے ہی گاؤں جانا پڑے گا۔''

''تیرے دشمن یہاں دوبارہ بھی تو حملہ کر سکتے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''اب وہ یہاں آئیں گے تو مارے جائیں گے۔'' افتخار نے کہا۔ ''میں نے گاؤں سے چار آدمی بلائے ہیں۔ وہ یہاں موجود رہیں گے۔''

''او بھائی! ان سے مجھے تو ملوا دے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ نہ ہو کہ وہ شبے میں مجھ ہی کو گولی مار دیں۔''

افتخار نے روانگی سے پہلے اقبال کو بلایا تھا اور چاروں گارڈز سے میرا تعارف کرایا تھا۔

میں نے سوچا، افتخار کروڑپتی شخص ہے۔ دنیا کی ہر چیز، ہر نعمت اسے میسر ہے لیکن وہ سکون سے محروم ہے۔ ایسی دولت کا کیا فائدہ کہ انسان سکون کو ترس جائے۔ ''تم خود بھی تو اب اسی کشتی کے سوار ہو علی صاحب!'' میرے اندر سے آواز آئی۔ واقعی جب سے میرے پاس دولت آئی تھی، میں سکون کی سانس کو ترس گیا تھا۔

میرے خیالات کے تسلسل کو سیل فون کی بیل نے توڑ دیا۔ میں نے سیل فون جیب سے نکالا، اسکرین پر احسن کا نام تھا۔ میں نے دوسری ہی بیل پر اس کی کال ریسیو کر لی۔

''ہاں، احسن! خیریت؟''

''خیریت نہیں ہے علی! اینا کو نہ جانے کہاں سے تیرا پتا مل گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے تیرا پتا بینک سے حاصل کیا ہے۔''

''پھر... پھر کیا ہوا؟'' میں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

''وہ تیرے گھر آئی تھی۔ اس نے انکل اور آنٹی سے بہت بُری طرح بات کی۔ اس نے تجھ پر الزام لگایا کہ تو اس کے کروڑوں روپے لے کر بھاگ گیا ہے۔''

''پھر؟'' میں نے بمشکل خود پر قابو پا کر کہا۔

''تھوڑی دیر بعد وہ اپنے ساتھ دو تین مقامی لوگوں اور ایک غیر ملکی کو بھی لے آئی۔ وہ لوگ گھر کی تلاشی لینا چاہتے تھے۔ ان لوگوں نے انکل کے ساتھ اتنی بدتمیزی کی کہ ان کی طبیعت خراب ہو گئی اور انہیں اسپتال لے جانا پڑا۔''

''اب ابو کی طبیعت کیسی ہے؟'' میرے دل میں درد کی ایک لہر سی اٹھی۔

''انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور ان کی حالت نازک ہے۔''

''میں آ رہا ہوں احسن۔'' میں نے جواب دیا۔

''تیرے آنے سے معاملات مزید بگڑ جائیں گے۔'' احسن نے کہا۔ ''میں انکل کے پاس ہوں تُو ان کی فکر مت کر۔ اللہ بہتر کرے گا۔ اپنا خیال رکھنا۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں صوفے پر گر گیا اور بلک بلک کر رونے لگا۔ صرف میری وجہ سے میرا باپ ان حالوں کو پہنچا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں ابھی اڑ کر کراچی پہنچ جاؤں۔ پھر میں نے اپنے دل کو سمجھایا کہ اگر وہاں میرے ساتھ کچھ ہوا تو ابو کو مزید صدمہ ہو گا۔ میں دل پر پتھر رکھ کر بیٹھ گیا۔

پھر ساری رات میں نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ میں نے کئی دفعہ احسن کو ٹیلی فون کرنا چاہا لیکن اس کا سیل آف تھا۔

صبح پانچ بجے کے قریب احسن کی کال آئی۔ میں نے بے تابی سے پوچھا۔ ''ہاں، احسن! کیسی طبیعت ہے ابو کی؟''

''اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔'' احسن نے کہا۔ ''انہیں آئی سی یو سے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ کل تک انہیں گھر

جانے کی اجازت مل جائے گی۔“

”اور امی اور سیما؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ بھی ٹھیک ہیں مگر تجھ سے بہت ناراض ہیں۔“

”ان کی ناراضی تو میں وہاں آ کر دور کردوں گا۔“

”تو اپنا خیال رکھنا علی۔“ احسن نے کہا۔

”تو بھی سوچتا ہوگا کہ کتنا خودغرض بیٹا اور بھائی ہے کہ دولت کی خاطر اپنے پیاروں کو خطرات میں دھکیل دیا۔“ میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”میں کچھ نہیں سوچتا علی! سوچنا تو تجھے ہے۔“ احسن نے کہا۔ ”میرے منع کرنے کے باوجود تو نے اپنی من مانی کی۔ ہر غلطی اور بھول کی کوئی نہ کوئی قیمت تو چکانا ہی پڑتی ہے۔“

میرے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ تو گھر والوں کی فکر مت کر۔

احسن سے فون پر بات ہونے کے بعد میرے ذہن سے ایک بوجھ ہٹ گیا تھا۔ پھر میں لمبی تان کر سو گیا۔

میری آنکھ ٹیلی فون کی گھنٹی ہی سے کھلی۔ دیوار گیر گھڑی میں گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے سیل فون اٹھا کر دیکھا، وہ احسن کی کال تھی۔

”ہیلو۔“ میں نے کہا۔

”علی!“ احسن نے جلدی سے کہا۔ ”تو اس وقت کہاں ہے؟“

”کیوں، خیریت تو ہے؟“

”اینا نے آنٹی سے معلوم کرلیا ہے کہ تو افتخار کے پاس ہے۔ وہ لاہور کے لیے روانہ ہوگئی ہے۔ تو اگر واقعی افتخار کے پاس ہے تو وہاں سے کہیں اور چلا جا۔“

”میں واقعی افتخار کے پاس ہوں۔“ میں نے بوکھلا کر کہا۔

”تو پھر فوری طور پر وہ ٹھکانا چھوڑ دے۔“ احسن نے کہا۔ ”جلدی کر علی... تو شدید خطرے میں ہے۔“

ایسی نہ جانے کیا بات تھی کہ احسن اتنا بوکھلایا ہوا تھا۔

میں نے اسی وقت افتخار کو ٹیلی فون کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن افتخار نے ٹیلی فون نہیں اٹھایا۔ میں نے مایوس ہو کر لائن کاٹ دی۔

فوراً ہی افتخار کا ٹیلی فون آ گیا۔ وہ بولا۔ ”سوری یار! میں کچھ مصروف تھا۔ تو مجھے کال کر رہا تھا؟“

”ہاں یار! مجھے یہاں خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ میں یہاں سے کہیں اور شفٹ ہونا چاہتا ہوں۔“

”ایسی کیا بات ہوگئی؟“ افتخار نے کہا۔ ”تو فکر مت کر، میں اقبال کو بھیجتا ہوں۔“

”اقبال تو تیرے ساتھ ہی تھا۔“ میں نے کہا۔

”نہیں یار! وہ رات میں واپس لاہور آ گیا تھا۔ وہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر تیرے پاس ہوگا۔“

واقعی پھر آدھا گھنٹا گزرنے سے پہلے ہی اقبال وہاں موجود تھا۔ وہ گاڑی لے کر آیا تھا۔ وہ بغیر کسی سوال جواب کے مجھے گاڑی میں بٹھا کر پرانے شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔

وہ مجھے ایک گنجان آبادی میں لے گیا لیکن جس مکان میں لے گیا، وہ بہت صاف ستھرا تھا۔

اس نے مجھ سے کہا۔ ”علی صاحب! یہ مکان ہر طرح سے محفوظ ہے۔ آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ آپ آرام کریں۔ میں آپ کے لیے کھانے کو کچھ بھجواتا ہوں۔“

میں آرام تو خیر کیا کرتا، مجھے عجیب سی گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ پریشان کن خیال بھی موجود تھا کہ میں نے کراچی سے فرار ہو کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ پھر میں خود ہی اپنی بات کا جواب دیتا کہ خطرہ تو فرار نہ ہونے میں بھی تھا۔ اب تو ایک غلطی کر ہی لی ہے۔ جو ہوگا سو دیکھا جائے گا۔

مجھے یوں ہی بیٹھے نہ جانے کتنی دیر ہو چکی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو میں چونک اٹھا۔ مجھے اپنی بے پروائی پر بھی شدید غصہ آیا کہ اقبال کے جانے کے بعد میں نے دروازہ اندر سے لاک نہیں کیا تھا۔ آنے والا دشمن نہیں تھا۔ وہ خطرہ تو اس وقت پیدا ہوتا جب اینا لاہور پہنچ جاتی۔

دستک ایک مرتبہ پھر ہوئی تو میں دروازے کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”میں آپ کے لیے چائے لے کر آئی ہوں۔“ باہر سے ایک مترنم نسوانی آواز سنائی دی۔

میں نے دروازہ کھول دیا۔ میں اسے دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ وہ اتنی ہی خوب صورت تھی۔ اس نے سستا سا سوٹ پہن رکھا تھا جو اس کے دل کش اور متناسب سراپا پر اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی سنہری رنگت اور سیاہ گھنے بال اس کی شخصیت کی دل کشی میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔

میں یک ٹک نظریں جمائے اسے تک رہا تھا۔

”چائے... لے لیں۔“ اس کی پُرکشش آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

”ہاں... آئیے۔“ میں نے چونک کر کہا اور ایک طرف ہو کر اسے راستہ دے دیا۔ وہ چائے کی ٹرے تھامے

ہوئے قیامت خیز چال چلتی ہوئی کمرے کی طرف بڑھی۔ مجھے شرمندگی بھی ہو رہی تھی کہ مجھے اس طرح گھورتے دیکھ کر وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی؟

اس نے چائے کی ٹرے ایک چھوٹی میز پر رکھ دی۔ اس ٹرے میں چائے کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ ایک پلیٹ میں سموسے، دوسری پلیٹ میں سینڈوچز، فرنچ فرائز اور پکوڑے تھے۔

وہ لڑکی ابھی تک سہمی سہمی سی کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے پُرکشش چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ... کون ہیں... اور یہ... چائے؟“

”میرا نام مریم ہے۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”میں برابر والے مکان میں رہتی ہوں۔ اقبال صاحب نے یہاں چائے لانے کو کہا تھا اس لیے...“

”مریم! آپ نے تو بہت زیادہ اہتمام کرلیا۔ اس زحمت کی کیا ضرورت تھی؟“ میں نے ہنس کر کہا۔

”اس میں زحمت کیسی؟“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”ہاں، آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو، بلاتکلف برابر والے دروازے پر دستک دے دیجیے گا۔“ یہ کہہ کر وہ لہراتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

مجھے ایسا لگا جیسے کمرا خالی اور بے رنگ ہو گیا ہو۔ میں نے تو اس سے یہ بھی نہ پوچھا کہ اقبال سے تمہارا رشتہ کیا ہے؟ پھر میں سموسوں کی پلیٹ لے کر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد دروازے پر پھر دستک ہوئی تو میں دستک کے انداز ہی سے سمجھ گیا کہ مریم آئی ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ ہوا کے جھونکے کی طرح اندر داخل ہوئی اور برتن اٹھانے لگی۔ اچانک وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ”آپ ٹی وی ہی کھول لیں۔ کم سے کم یہ سناٹا تو کم ہوگا۔“

میں اس سے کیا کہتا کہ سناٹا تو تمہارے آتے ہی ختم ہوگیا ہے۔ میرے دل میں تو جلترنگ سے بج رہے ہیں لیکن میں اس سے یہ کہہ نہیں سکتا تھا۔

وہ برتن اٹھا کر جاتے ہوئے بولی۔ ”دیکھیے... کوئی تکلف مت کیجیے گا اور کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بلاتکلف مانگ لیجیے گا۔“

”مریم!“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اقبال سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟“

”بظاہر تو کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن وہ ہمارے محسن ہیں۔ ابو کے انتقال کے بعد انہوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا ہے، ہر طرح سے ہماری مدد کی ہے۔“

میں نے مریم سے یہ نہیں پوچھا کہ اقبال نے کیا مدد کی ہے؟ میں نے صرف اتنا کہا۔ ”تمہارا بار بار یہاں آنا مناسب نہیں ہے۔ تم اپنے کسی بھائی کو بھیج دیا کرو۔“

میری بات سن کر وہ اچانک افسردہ ہوگئی اور آہستہ سے بولی۔ ”بھائی... میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ گھر میں صرف میں ہوں یا امی ہیں۔“ پھر وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”آپ پریشان نہ ہوں۔ اس محلے میں، کسی کی اتنی جرأت نہیں ہے کہ مجھے غلط نظروں سے دیکھ بھی سکے۔ اقبال صاحب اس کی آنکھیں نکال لیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ پہلے کی طرح اچانک لہراتی ہوئی چلی گئی۔

میں دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخر مریم کون ہے اور اقبال ان ماں بیٹی پر اتنا مہربان کیوں ہے؟ کیا اس میں بھی مریم کے حسن کا کمال ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو مجھے بالکل حیرت نہ ہوتی۔ وہ ایسے ہی حسن بلاخیز کی مالک تھی کہ اس کے لیے کوئی بھی پاگل ہو سکتا تھا۔

سناٹا اچانک گہرا ہو گیا تھا۔ میں نے ٹی وی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں لیکن اس کمرے میں ٹی وی نہیں تھا۔ ممکن ہے دوسرے کمرے میں ہو۔ میں نے تو ابھی تک اس مکان کا جائزہ بھی نہیں لیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس مکان میں کتنے کمرے ہیں، باہر نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ ہے یا نہیں... چھت پر کیا ہے؟

میں نے مکان کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ میں جس کمرے میں تھا، وہ بیڈروم تھا۔ اس میں معقول سا ایک بیڈ اور دو تین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کے ایک گوشے میں میرے سوٹ کیس رکھے ہوئے تھے۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو برآمدہ تھا۔ برآمدے کی دوسری طرف دو کمرے تھے۔ ان میں سے ایک کمرا مقفل تھا، دوسرا کمرا ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ وہاں پرانا سا ایک قالین، ایک صوفہ سیٹ، ایک سیٹی اور چند کرسیاں رکھی تھیں۔ کمرے میں ایک طرف ٹرالی پر ٹی وی بھی رکھا ہوا تھا۔ دوسرے مقفل کمرے میں شاید مالک مکان یا اقبال کا کچھ سامان تھا۔ برآمدے سے آگے چھوٹا سا صحن تھا۔ اس میں ایک طرف کچن اور باتھ روم تھے۔ ان کے ساتھ ہی زینہ تھا۔

میں زینے کے ذریعے چھت پر چلا گیا۔ چھت پر بھی بغیر پلاستر کا ایک کمرا تھا۔ اس کا دروازہ نہیں تھا۔ کمرے میں پرانا فرنیچر، ڈبے، بوتلیں اور اسی طرح کا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ چھت کے گرد تقریباً چھ فٹ اونچی چار دیواری تھی۔ وہاں ایک طرف جھلنگا سی ایک چارپائی اور ایک چوکی بھی

پڑی ہوئی تھی۔

میں پورے مکان کا جائزہ لینے کے بعد بیڈ روم میں لوٹ آیا۔

تقریباً آٹھ بجے دروازے پر مریم کی مانوس دستک سنائی دی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ ٹرے دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے اندر آ گئی۔ وہ اندھیرے سے روشنی میں آئی تو اس کا نکھرا نکھرا اور بنا سنورا وجود دیکھ کر مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ اس نے لباس کے سلسلے میں بھی خاص اہتمام کیا تھا۔ بالوں کو سنوار کر اس نے جوڑا بنا رکھا تھا۔ وہ تنگ پاجامے اور لمبی قمیص میں ملبوس تھی اور اس نے کوئی مسحور کن پرفیوم بھی لگا رکھا تھا۔

مجھے یوں والہانہ انداز میں گھورتا دیکھ کر وہ کچھ شرما گئی لیکن اس کے انداز سے یہ لگ رہا تھا کہ اس نے میرے یوں گھورنے کا بُرا نہیں مانا ہے۔

اس نے ٹرے میز پر رکھتے ہو ـــ [illegible] ـــ ے پوچھا۔ ''آپ کا نام علی ہے؟''

میں نے چونک کر اسے دیکھا پھر بولا۔ ''ہاں، میرا نام علی ہے... لیکن... تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' میں اچانک آپ سے تم پر آ گیا۔

''آپ کیا سمجھ رہے تھے، آپ نہیں بتائیں گے تو کیا مجھے آپ کا نام معلوم نہیں ہوگا؟''

میں ہنس کر بولا۔ ''مریم! تم نے مجھے نام بتانے کا موقع ہی کب دیا۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' مریم شوخی سے بولی۔ ''کیا نام بتانے کے لیے بھی دو چار گھنٹے چاہئیں؟''

''اگر تم بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟'' میں نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔ ''اچھا چھوڑو... کوئی اور بات کرو۔''

''آپ پہلے کھانا کھا لیں۔'' مریم نے کہا۔ ''میں آپ کے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔''

''نہیں۔'' میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ''چائے بعد میں لے آنا، پہلے کھانا کھا لو۔''

''میں...؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں، تم۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کیا تم کھانا نہیں کھاتی ہو؟''

''لیکن... میں...''

''کچھ مت بولو۔'' میں نے کہا۔ ''چلو کھانا نکالو۔''

اس نے کھانا نکالا اور پلیٹ مجھے دے کر خود بھی کھانے لگی۔

''تم نے اپنے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں۔'' میں نے کہا۔

''میرے بارے میں سن کر کیا کریں گے علی صاحب؟'' وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

''اگر بتانا چاہو تو بتا دو ورنہ کوئی بات نہیں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولی۔ ''ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے جو آپ سے چھپاؤں گی۔'' مریم نے کہا پھر طویل سانس لے کر بولی۔ ''میرے ابو... اقبال کے ساتھ کام کرتے تھے۔ ہم لوگ ماڈل ٹاؤن میں رہتے تھے۔ کافی عرصے تک مجھے معلوم ہی نہ ہوا کہ ابو کیا کام کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ ہفتوں کے لیے غائب ہو جاتے پھر لوٹتے تو میرے لیے بہت سے تحفے لے کر آتے۔

''میں بی اے فائنل میں تھی کہ امی کا انتقال ہو گیا۔ اس دن پہلی دفعہ میں نے ابو کو گھر پر دیکھا۔ اس دن اقبال صاحب کو بھی دیکھا۔ وہ امی کی موت پر آئے تھے پھر وہ اکثر آنے لگے۔

ایک دن وہ بہت گھبرائے ہوئے آئے اور بولے۔ ''مریم...! اٹھو، میرے ساتھ چلو۔''

''کہاں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ وقت باتوں کا نہیں ہے۔ اپنا ضروری سامان ایک بیگ میں رکھو اور جلدی نکلو یہاں سے۔''

''لیکن ابو... میں ابو کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گی۔''

''ابو بھی آ جائیں گے۔'' اقبال سخت لہجے میں بولے۔ ''وقت ضائع مت کرو مریم! موت ہمارے تعاقب میں ہے۔''

''میں نے جلدی جلدی اپنے کچھ کپڑے اور دوسری ضروری چیزیں ایک بیگ میں بھریں اور چلنے کو تیار ہو گئی۔''

''تمہاری امی کا انتقال ہو چکا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''پھر یہ کون ہے جسے تم اپنی امی کہہ رہی تھیں؟''

''یہ بھی اقبال کے لیے کام کرتی ہے۔'' مریم نے ایک اور انکشاف کیا۔ ''اقبال مجھے یہاں لے آئے۔ دوسرے دن مجھے معلوم ہوا کہ دشمنوں نے ابو کو قتل کر دیا ہے۔ پہلے امی، پھر ابو کی موت سے میں بالکل ٹوٹ کر رہ گئی۔ اس وقت زینت خالہ نے مجھے بہت تسلی دی، میرا غم بانٹا اور مجھے ایک مرتبہ پھر جینے پر مجبور کر دیا۔ اقبال بھی میری دل جوئی کرتے تھے۔ انہوں نے میرا بہت خیال

رکھا۔ مجھے دنیا کی ہر آسائش دی۔ بس یہ پابندی لگا دی کہ میں گھر سے باہر نہ نکلوں۔ اگر نکلنا بہت ضروری ہو تو پھر عبایا پہن کر اور چہرے پر نقاب لگا کر نکلوں۔" اس نے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ "بس میری اتنی ہی کہانی ہے۔"

اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو میں چونک اٹھا۔ ابھی تک مجھے کسی کا خطرہ نہیں تھا لیکن میرے دل میں چور تھا اس لیے میں بار بار چونک اٹھتا تھا۔ میں نے دروازے کے قریب جا کر آہستہ سے پوچھا۔ "کون؟"

"علی! دروازہ کھولیں میں اقبال ہوں۔" باہر سے اقبال کی آواز سنائی دی۔

میں نے دروازہ کھول دیا۔ اقبال اندر آ گیا۔ وہ اس وقت جینز اور جیکٹ میں تھا۔

اس کی نظر مریم پر پڑی تو چہرے پر ناگواری کے تاثرات ظاہر ہوئے پھر فوراً ہی غائب ہو گئے۔ اس نے ایک نظر مریم کا جائزہ لیا اور بولا۔ "مریم! علی صاحب کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

"یہ آپ ان ہی سے پوچھیں۔" مریم نے جواب دیا۔

"نہیں، مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہہ دیجیے گا۔" اقبال نے کہا۔

مریم کھانے کے برتن سمیٹ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کہا۔ "یار! مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں اس لڑکی سے گھریلو ملازمہ کی طرح کام لیے جاؤں۔"

"مجھے خود بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔" اقبال نے جواب دیا۔ "لیکن فی الحال ہمیں رازداری کی ضرورت ہے اور مریم بہت با اعتبار ہے۔"

"پھر بھی یار! اس کی ماں کیا سوچے گی؟" میں نے جان بوجھ کر ماں کا تذکرہ کیا۔

"وہ کیا سوچے گی؟" اقبال نے کہا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ "آپ اب آرام کریں، مجھے ابھی ایک ضروری کام سے جانا ہے۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میں بستر پر لیٹا دیر تک کروٹیں بدلتا رہا پھر میری آنکھ لگ گئی۔

میں مشکل سے آدھا گھنٹا سویا تھا پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے کسی نے دروازے پر دستک دی ہو۔ باہر صحن میں اندھیرا تھا۔ میں اندھیرے میں گھورتا رہا۔ دستک دوبارہ ہوئی تو میں چونک اٹھا۔ میں نے تکیے کے نیچے سے ماؤزر نکالا۔ یہ افتخار کا ماؤزر تھا جو میں وہاں سے چلتے ہوئے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

میں نے مریم کی مانوس دستک کو پہچان لیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ حواس باختہ سی اندر آ گئی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر میں بھی پریشان ہو گیا اور بولا۔ "خیریت تو ہے مریم؟"

"خیریت نہیں ہے۔" مریم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اقبال آپ کی جان کا دشمن ہو رہا ہے۔"

"اقبال؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "کیوں؟"

"باتوں میں وقت ضائع مت کریں علی!" اس نے مضطرب ہو کر کہا۔ "اگر آپ مجھ پر اعتبار کرتے ہیں تو فوراً یہاں سے نکلیں۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی۔"

میں عجلت میں اندر آیا۔ جلدی جلدی جوتے پہنے۔ دونوں سوٹ کیس اٹھائے اور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ماؤزر میں نے پشت پر پینٹ کی بیلٹ میں اڑس لیا تھا۔

اچانک دروازہ کھلا اور اقبال اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر مریم کے حلق سے سہمی سی ایک چیخ برآمد ہوئی۔

اقبال کے ہاتھ میں گن تھی۔ وہ درشت لہجے میں بولا۔ "ذلیل، کمینی، احسان فراموش... میرے احسان کا تو نے خوب بدلہ چکایا ہے۔ پہلے میں تجھ ہی کو ختم کروں گا۔"

اس نے گن مریم کی طرف تان دی اور ٹریگر دبانے ہی والا تھا کہ میں چیخ کر بولا۔ "اقبال! یہ کیا کر رہے ہو؟"

"بکواس بند کر۔" اس نے مجھے جھڑک دیا۔ "اس کے بعد تیرا بھی یہی حشر کروں گا۔"

میں نے غیر محسوس طور پر ماؤزر نکال لیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ اقبال فائر کرتا، میرے ماؤزر نے شعلہ اگلا۔ دھماکے کی آواز رات کے سناٹے میں کچھ زیادہ ہی سنائی دی۔ میں نے جھٹکا کھا کر اقبال کو اوندھے منہ زمین پر گرتے دیکھا۔ وہ چند لمحے تڑپ کر ساکت ہو گیا۔

اس کی پھٹی ہوئی بے نور آنکھیں آسمان کو تک رہی تھیں۔

مریم غیر شعوری انداز میں مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ میں نے آہستگی سے اسے علیحدہ کیا تو وہ بھی کچھ جھینپ سی گئی۔ میں نے اس سے کہا۔ "اب فوراً یہاں سے نکلو... اس سناٹے میں فائر کی آواز دور دور تک سنی گئی ہوگی۔"

میں نے نوٹوں کے دونوں سوٹ کیس اٹھائے اور مریم سے اپنا چھوٹا سوٹ کیس اٹھانے کو کہا جس میں میری ضرورت کا سامان تھا۔

مجھے وہاں سے نکلنے کے لیے ایک گاڑی کی ضرورت تھی۔ میں اقبال کی ڈبل کیبن پک اپ کو تو بھول ہی گیا تھا۔

میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس کی جیب میں تقریباً بیس، بائیس ہزار کے کرنسی نوٹ، ایک کنگا، رومال اور گاڑی کی چابیاں تھیں۔ میں نے اس کی تمام چیزوں کو واپس اس کی جیب میں ٹھونسا اور گاڑی کی چابیاں لے کر صحن میں نکل آیا۔

میں نے مریم سے کہا۔ "تم گھر جا کر سو جاؤ، تم سے کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ میں نے فائر کی آواز سنی تھی لیکن کسی کو دیکھا نہیں۔"

مریم اچانک رونے لگی۔ وہ بہت بری طرح سسک رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"آ... آپ... مجھے یہاں چھوڑ جائیں گے؟" اس نے روتے ہوئے کہا۔

"میری زندگی تو خود خطرات میں گھری ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم میرے ساتھ جا کر کیا کرو گی؟"

"اس زندگی سے تو بہتر ہی ہوگا کہ میں آپ کے ساتھ چلوں۔" اس نے کہا۔

اس کے بہت زیادہ اصرار پر میں نے اسے بھی ساتھ لے لیا۔

ہم دونوں اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے گاڑی تک پہنچے۔ فائر کی آواز کسی نے سنی بھی ہوگی تو باہر نکلنے کے بجائے گھر میں دبک گیا ہوگا۔ ان دنوں بھی امن و امان کی صورتِ حال ایسی ہی تھی جیسی آج ہے۔

مجھے ایک خطرہ تھا کہ پولیس کی کوئی گشتی پارٹی مجھے روک نہ لے لیکن وہاں سے گلبرگ تک ہمیں پولیس کی کوئی موبائل نہ ملی۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟" مریم نے پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "ابھی تو میں سوچ رہا ہوں کہ کس طرف جاؤں۔ پہلے تو مجھے اس گاڑی سے چھٹکارا پانا ہے۔"

پھر میں نے گاڑی کا رخ اسٹیشن کی طرف موڑ دیا۔ میں نے سوچا تھا کہ گاڑی وہیں ریلوے اسٹیشن کی پارکنگ میں چھوڑ کر خود ٹیکسی میں کسی اور طرف نکل جائیں گے۔

گاڑی کو ریلوے اسٹیشن کی پارکنگ میں چھوڑنے کے بعد ہم اپنا سامان لے کر ریلوے اسٹیشن پر آ گیا۔ پھر میں نے سوچا کہ ابھی تک پولیس کو اقبال کے قتل کی اطلاع بھی نہیں ملی ہوگی۔

پنڈی جانے والی گاڑی روانگی کے لیے تیار تھی۔ میں نے جلدی سے پنڈی کے دو فرسٹ کلاس کے ٹکٹ لے لیے اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔ فرسٹ کلاس کا ڈبا تقریباً خالی تھا۔ ہم سے کچھ فاصلے پر ادھیڑ عمر کا ایک شخص اوپر والی برتھ پر سو رہا تھا۔

گاڑی اسٹیشن سے باہر نکلی تو میں نے سکون کا سانس لیا اور سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ مریم بھی کافی پُرسکون نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا تھا کہ اقبال مجھے ختم کرنا چاہتا ہے؟"

"وہ آپ سے مل کر وہاں سے گیا نہیں تھا بلکہ میرے گھر میں آ گیا تھا۔ اس نے مجھ سے چائے بنانے کو کہا۔ پھر چائے پی کر سگریٹ پھونکتا رہا۔ میں سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اقبال کچھ دیر بیٹھا رہا پھر دبے پاؤں اٹھا اور باہر نکل گیا۔ وہ مجھے سویا ہوا سمجھ رہا تھا۔ جس مکان میں آپ تھے، اس کی ایک چابی اقبال کے پاس بھی تھی۔ میں دروازے کے پاس پہنچی تو میں نے آپ کا دروازہ کھلنے کی خفیف سی آواز سنی۔ مجھے حیرت تھی کہ اقبال اتنے پراسرار انداز میں کیوں گیا ہے۔ میں دوبارہ لیٹ گئی۔ پھر میں نے دوبارہ اقبال کو واپس آتے دیکھا۔ میں نے پھر یہی ظاہر کیا کہ میں گہری نیند سو رہی ہوں۔

اچانک اقبال کی ہلکی سی آواز آئی۔ "یار! اس کے پاس تو میرے اندازے سے کہیں زیادہ کیش ہے... بہت زیادہ... تم یقین نہیں کرو گے... کتنا؟ میرا اندازہ ہے کہ تین چار کروڑ روپے تو ہوں گے۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں کیش نکال کر کہیں چھپا دوں گا لیکن اتنا کیش دیکھ کر تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اب اسے زندہ چھوڑنا بھی بے وقوفی ہوگی۔ وہ بعد میں ہمارے لیے مسائل پیدا کر سکتا ہے... ملک صاحب... وہ... سارے ناجائز کام مجھ سے لیتے ہیں اور دس بیس ہزار روپے دے کر ٹرخا دیتے ہیں... نہیں یار! میں ویسے بھی ان کا ساتھ چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا... میری گاڑی میں پیٹرول نہیں ہے۔ میں اس کا ٹینک فل کرا کے آتا ہوں پھر اس علی سے بھی نمٹ لوں گا... ارے نہیں یار، تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خوف زدہ اور نہتا آدمی ہے۔ اس کے لیے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔"

"پھر میں نے اقبال کو باہر جاتے دیکھا۔ وہ شاید پیٹرول ٹینک فل کرانے جا رہا تھا۔ میں جانتی تھی کہ قریب ترین پیٹرول پمپ بھی وہاں سے تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس کے جاتے ہی میں پھرتی سے اٹھی اور آپ کے پاس پہنچ گئی۔" بولتے بولتے مریم کا حلق خشک ہو گیا تھا۔

"تم نے میری خاطر اتنا بڑا خطرہ مول کیوں لیا؟"

میں نے پوچھا۔ ”اقبال کے مقابلے میں تو میں تمہارے لیے اجنبی ہوں۔“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”کبھی کبھی اجنبی بھی دل کے بہت قریب آجاتے ہیں۔“

ٹکٹ چیکر آیا تو ہماری گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

کچھ دیر بعد مریم گہری نیند سو گئی مگر میں جاگتا رہا۔

اچانک میں نے پنڈی نہ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ شہر میرے لیے محفوظ نہیں تھا۔ وہاں افتخار کے والد اور افتخار کا آنا جانا رہتا تھا۔ وہ گاڑی پشاور تک جارہی تھی۔ میں نے پشاور جانے کا ارادہ کرلیا۔

میں گاڑی میں سوار ہونے کے بعد کئی دفعہ احسن کا ٹیلی فون نمبر ڈائل کرچکا تھا لیکن اس کا موبائل فون مسلسل بند تھا۔ مجھے اس کی طرف سے پریشانی ہورہی تھی۔

دوپہر کے وقت گاڑی پنڈی پہنچی۔ میں نے پلیٹ فارم پر اترنے کے بجائے ڈائننگ کار سے کھانا منگوالیا۔ کھانا اگرچہ زیادہ اچھا نہیں تھا لیکن شدید بھوک میں وہ بھی اچھا لگ رہا تھا۔ ٹکٹ چیکر دوبارہ آیا تو میں نے اس سے پشاور تک کے ٹکٹ بنوالیے۔

میں مسلسل احسن کو کال کرتا رہا لیکن اس کا موبائل فون ابھی تک بند تھا۔ میری پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔

ہم پشاور پہنچے تو دن ڈھل چکا تھا۔ وہ گاڑی خاصی لیٹ تھی۔

وہاں میں نے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں رہنے کے بجائے حیات آباد کے نزدیک صاف ستھرے سے ایک ہوٹل میں کمرا بک کرالیا۔

مریم کے جسم پر وہی ایک جوڑا تھا جو وہ پہنے ہوئے تھی۔ میں نے اسے ڈھیروں شاپنگ کرادی۔ اس کے لیے چھوٹا سا ایک سوٹ کیس بھی خرید لیا۔

مجھے پشاور آئے تیسرا دن تھا اور احسن سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ اب میری پریشانی گھبراہٹ میں بدل چکی تھی۔۔۔۔ آخر احسن نے سیل فون کیوں بند کر رکھا تھا؟ مریم نے کہا کہ ممکن ہے ان کا سیل فون کہیں گم ہوگیا ہو یا چوری ہو گیا ہو۔

یہی ایک امکان میرے ذہن میں بھی تھا۔

پھر میں نے گھبرا کر سیما کا نمبر ڈائل کردیا۔ اس کا ٹیلی فون بھی بند تھا۔ امی اور ابو سے بات کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ اسی پریشانی میں تھا کہ اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے چونک کر سیل فون کی اسکرین پر نظر

[illegible]

میں اس کی کال ریسیو کروں یا نہ کروں؟ پھر میں نے کال ریسیو کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

”ہیلو!“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”علی! تُو خیریت سے تو ہے؟“

”ہاں، میں بالکل خیریت سے ہوں۔“ میں نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

”تو اقبال کے مرنے سے اتنا گھبرایا کہ وہاں سے فرار ہی ہوگیا۔“

”ہاں یار، میری سمجھ ہی میں نہیں آیا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

”اقبال اپنی ذاتی دشمنی کی وجہ سے مارا گیا ہے۔“ افتخار نے کہا۔ ”زینت نے پولیس کو یہی بیان دیا ہے کہ پہلے اقبال کی تلخ کلامی ہوئی پھر اسے گولی ماردی گئی۔ اس بیان میں تیرا ذکر کہیں نہیں ہے۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔

”اب تو مجھے بتادے کہ تو نے اقبال کو کیوں مار دیا؟“ افتخار نے پوچھا۔

اس کی بات پر میں بری طرح اچھل پڑا۔ میں نے محتاط انداز میں کہا۔ ”اگر میں اسے نہ مارتا تو وہ مجھے مار دیتا۔ تُو نے مریم کو تو دیکھا ہوگا۔ اقبال کا خیال تھا کہ میں مریم کو ورغلا رہا ہوں۔“

”اچھا۔“ افتخار ہنس کر بولا۔ ”یہ چکر تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ مریم بھی۔۔۔“

”ہاں، وہ بھی میرے ساتھ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تُو ہے کہاں؟“ افتخار نے اچانک پوچھا۔

”اس وقت تو میں گجرات میں ہوں، کل شاید کراچی چلا جاؤں۔“

”یار! اگر وقت ہو تو لاہور سے ہو کر کراچی جانا۔“

”ہاں، وقت ملا تو میں تیرے پاس ضرور آؤں گا۔“ میں نے سلسلہ منقطع کرکے مریم کو افتخار کی کال کے بارے میں بتایا۔

”زینت آنٹی بہت اچھی ہیں۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ انہوں نے مجھے بچانے کے لیے اتنا بڑا جھوٹ بول دیا۔“

افتخار کے ٹیلی فون کے بعد میں مطمئن ہوگیا تھا کہ اب کم از کم مجھے افتخار یا اس کے باپ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

اگلے دن میں کراچی کے لیے سیٹیں بک کرانے گیا تو معلوم ہوا کہ کل تک کوئی بھی سیٹ خالی نہیں ہے۔ قومی ائرلائن میں، نہ کسی دوسری ائرلائن میں۔

اس سے اگلے دن میں نے دگنے پیسے خرچ کرکے فلائٹ میں سیٹیں بک کرالیں۔

☆☆☆

میں کراچی پہنچا تو دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ اپنا شہر دیکھ کر مجھے خاصی طمانیت کا احساس ہوا۔ میں گھر پہنچنے کے لیے اتنا بے قرار تھا کہ ہر طرح کی احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر میں ائرپورٹ سے سیدھا گھر پہنچ گیا۔ ٹیکسی میں نے گلی کے نکڑ پر ہی چھوڑ دی لیکن گھر پہنچ کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ بیرونی آہنی گیٹ میں پڑا ہوا تالا میرا منہ چڑا رہا تھا۔

میں نے اپنے پڑوسی بیگ صاحب کی ڈوربیل بجا دی۔ تھوڑی دیر بعد گیٹ کھلا اور انکل بیگ باہر نکل آئے۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمودار ہوئے اور وہ درشت لہجے میں بولے۔ ”اب تم یہاں کیا لینے آئے ہو علی؟“

”میں سمجھا نہیں انکل۔۔۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ میں نے الجھ کر پوچھا۔

”میاں! میں اور کیا کہوں، جب تم نے اپنے باپ کے جنازے میں آنا بھی گوارا نہ کیا تو اب۔۔۔“

”کیا کہہ رہے ہیں انکل؟“ میں نے وحشت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”کیا ابو۔۔۔“

”ہاں۔“ انہوں نے میری بات کاٹ دی۔ ”ان کا انتقال تو اسی رات ہوگیا تھا جب انہیں دل کا دورہ پڑا تھا۔“

ان کے الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح میرے کانوں میں پڑ رہے تھے۔ میرا سر بُری طرح چکرایا اور اگر میں فوراً ہی دیوار کا سہارا نہ لے لیتا تو اوندھے منہ زمین پر گرتا۔

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں نے روتے ہوئے پوچھا۔ ”اور۔۔۔ امی۔۔۔ اور سیما؟“

”تم نے نہ جانے کیا چکر چلایا تھا۔“ بیگ صاحب نے درشت لہجے میں کہا۔ ”تمہاری امی، بیٹی کی عزت بچانے کے لیے گھر چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلی گئیں۔ بس مجھے اتنا ہی معلوم ہے۔“ انہوں نے بے اعتنائی سے کہا۔ ”ہاں، تمہاری امی جاتے ہوئے مجھے گھر کی چابی دے گئی تھیں کہ شاید تم لوٹ آؤ۔“ یہ کہہ کر وہ اندر گئے اور چابیاں لاکر میرے حوالے کردیں۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے تالا کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔

ہر چیز جوں کی توں تھی۔ امی کی چوکی، ابو کی مخصوص کرسی۔ سبھی کچھ تھا لیکن گھر کے مکین نہیں تھے۔

میں برآمدے میں بچھی چوکی پر ڈھیر ہوگیا اور بلک بلک کر رونے لگا۔

روتے روتے مجھے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ وہ مریم تھی۔ میرے ساتھ ساتھ وہ بھی رو رہی تھی۔

روتے روتے میری نظر ایک لفافے پر پڑی۔ ڈاک کا وہ لفافہ دروازے کے نزدیک صحن میں پڑا ہوا تھا۔ میں نے بڑھ کر وہ لفافہ اٹھالیا۔ وہ احسن کا بھیجا ہوا لفافہ تھا۔ اس کی تحریر میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ میں نے بے صبری سے لفافہ چاک کرکے اس میں سے خط نکال لیا۔

احسن نے لکھا تھا۔

”علی! تم سے بہت سی باتیں کرنا تھیں لیکن لگتا ہے اب تم سے ملاقات نہیں ہو پائے گی۔ جس دن انکل کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا، اسی دن ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر تم سے یہ بات چھپائی۔ میں تمہیں کسی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر دوسرے دن وہ امریکی لڑکی دو آدمیوں کے ساتھ تمہارے گھر آگئی اور امی اور سیما کو زبردستی اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ ان سے تمہارا پتا پوچھ رہی تھی۔ سیما نے تمہیں کال کی تو تمہارا نمبر بند تھا پھر اس نے مجھے کال کی اور بتایا کہ یہ لوگ بھیا کا پتا پوچھ رہے ہیں۔ پھر سیما کے ہاتھوں سے کسی نے سیل فون چھین لیا اور بولا۔۔۔ علی! تم جہاں بھی ہو سامنے آجاؤ ورنہ ہم تمہاری ماں اور بہن کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ہاں، تمہاری بہن کو اتنی آسانی سے نہیں ماریں گے بلکہ پہلے اس کی آبرو کو پامال کریں گے۔ میں نے جذباتی لہجے میں کہا کہ میری ماں اور بہن کو چھوڑ دو۔ میں کل شام تک کراچی پہنچ جاؤں گا۔“

”تم جب تک نہیں آؤ گے، تمہاری ماں اور بہن ہمارے قبضے میں رہیں گی۔“

”میں نے انکل سے بات کی۔ وہی انکل جو ہوم منسٹری میں سیکریٹری ہیں۔ انہوں نے کرائم برانچ کے ایک ایس ایس پی کو یہ کیس دے دیا۔ ایس ایس پی آصف بہت اچھا افسر ہے۔ اس نے بہت تیزی سے تحقیقات کیں اور مجھے بتایا کہ یہ امریکی لڑکی اس سے پہلے بھی اس قسم کی کئی وارداتیں کرچکی ہے۔ یہ یہاں کے سیدھے سادے

نوجوانوں کو اسی طرح پھنساتی ہے پھر ساری رقم ان سے لے کر انہیں بلیک میل کرتی ہے کہ ہمارے ساتھ تعاون کرو ورنہ تمہارا تعلق کسی دہشت گرد تنظیم سے قائم کردیا جائے گا۔ تمہارے خلاف وہ رقم ہی سب سے بڑا ثبوت ہوگی جو تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کرائی گئی ہے کہ تم نہ صرف دہشت گرد ہو بلکہ دہشت گردوں کا پورا نیٹ ورک چلا رہے ہو اور تمہیں بیرونی ممالک سے فنڈنگ ہورہی ہے۔ لوگ خوف زدہ ہوکر اس کے جال میں پھنس جاتے تھے۔ اس لڑکی کا تعلق ایک بین الاقوامی جرائم پیشہ تنظیم سے ہے۔ وہ مافیا اتنی طاقتور ہے کہ کئی حکومتیں بھی اس کی خدمات حاصل کرتی ہیں۔

''ایس ایس پی اسے گرفتار کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ کسی امریکی شہری کو بغیر ثبوت کے پکڑا بھی تونہیں جاسکتا۔

''اب یہی ایک طریقہ تھا کہ میں خود کو علی بن کر ان لوگوں کے پاس جاؤں اور آنٹی اور سیما کو وہاں سے نجات دلاؤں۔ میں نے یہی کیا۔ میں نے سیما کے سیل فون پر انہیں پیغام دیا کہ میں گھر میں موجود ہوں، بتاؤ کہاں پہنچنا ہے؟

''اس لڑکی نے مجھے گھر ہی پر رہنے کی ہدایت کی اور تھوڑی دیر بعد وہ خود گاڑی میں آئی اور آنکھوں پر پٹی باندھ کے اپنے ساتھ لے گئی۔ اس نے مجھ سے رقم کا مطالبہ کیا۔ میں نے کہا کہ جب تک تم میری ماں اور بہن کو نہیں چھوڑوگی، میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔

''اس نے امی اور سیما کو چھوڑ دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ اب وہ گھر میں نہ ٹھہریں بلکہ کسی رشتے دار کے گھر چلی جائیں۔

''ان کے جانے کے بعد اس امریکی لڑکی نے مجھ سے رقم کے بارے میں پوچھا۔ رقم میرے پاس تھی ہی نہیں تو میں اسے کہاں سے دیتا۔ اس نے مجھ پر تشدد کی انتہا کردی۔ میری حالت مردوں سے بھی بدتر ہوگئی۔ میرا دماغ ماؤف ہوگیا۔ اسی حالت میں ایک دن اس کا ریوالور میرے ہاتھ لگ گیا۔ میں نے نتائج کی پروا کیے بغیر اس امریکی لڑکی اور اس کے ساتھی کو گولی ماردی اور وہاں سے فرار ہوگیا۔ اس کا تیسرا ساتھی میرے تعاقب میں لگ گیا۔ میں نے لی مارکیٹ کے علاقے میں پناہ لی لیکن وہ آدمی میرے تعاقب میں وہاں بھی پہنچ گیا۔ ظاہر ہے وہ ایک بین الاقوامی جرائم پیشہ مافیا کا رکن تھا اور ہر طرح سے تربیت یافتہ تھا۔ میں یہ خط تمہیں وہیں سے لکھ رہا ہوں۔ اس امریکن ایجنٹ نے کچھ مقامی آدمیوں کی خدمات بھی حاصل کرلی ہیں اور ان لوگوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ اگر تجھے میرے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملے تو لی مارکیٹ میں ڈی لکس ہوٹل کے مالک جان محمد سے رابطہ کرنا، فقط احسن۔''

خط پڑھ کر میں سکتے میں رہ گیا۔ احسن نے میرے لیے اتنی بڑی قربانی دی۔ وہ صحیح معنوں میں میرا دوست تھا۔

میں نے اسی وقت موٹر سائیکل نکالی اور لی مارکیٹ روانہ ہوگیا۔ جان محمد کو ڈھونڈنے میں مجھے کوئی دقت نہ ہوئی۔ وہ علاقے کا مشہور آدمی تھا۔ مشہور کیا بلکہ بدنام آدمی تھا۔ میں نے اس سے احسن کے بارے میں پوچھا تو وہ چونک اٹھا پھر مجھے اس کے چہرے پر تاسف کے آثار دکھائی دیے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''واجہ! ہم علی صاحب کو بچا نہیں سکا۔ بس مجبوری تھا۔''

میں چکرا کر بیٹھ گیا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر رودوں۔ دنیا کو بتاؤں کہ میں ہی وہ خود غرض اور لالچی انسان ہوں جو دولت کی خاطر اپنے باپ کو کھا گیا۔ اپنی جان سے زیادہ عزیز دوست کو کھا گیا۔ اس دولت کی خاطر میری پھول سی نازک بہن اور نیک طینت ماں نہ جانے کہاں بھٹک رہی ہوں گی۔

اچانک میں نے ایک فیصلہ کرلیا۔ سارا کیا دھرا اس دولت ہی کا تھا۔ کاغذ کے ان حقیر ٹکڑوں کا جن کی وجہ سے میں یتیم ہوگیا تھا۔

میں نے سارے نوٹ صحن میں ڈھیر کردیے۔ پھر اپنی موٹر سائیکل سے پیٹرول نکالا اور نوٹوں پر چھڑک کر آگ لگادی۔

آگ کی رنگ برنگی لپٹیں اٹھیں اور فضا میں گم ہو گئیں۔

پھر جب تک وہ تمام نوٹ راکھ میں تبدیل نہ ہو گئے۔ میں صحن میں بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔ انہیں راکھ ہوتا دیکھ کر میرے دل کو عجیب سا سکون ملا۔

میں نے امی اور سیما کی تلاش میں کراچی کا کونا کونا چھان لیا لیکن ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اگر مریم نہ ہوتی تو شاید میں پاگل ہوجاتا یا خودکشی کرلیتا۔ مریم نے ہر ہر طرح سے میری دل جوئی کی اور تسلیاں دیں۔

مجھے آج بھی امی اور سیما کا انتظار ہے۔ ایسا لگتا ہے، جیسے وہ اچانک گھر میں داخل ہوں گی اور مسکراتی ہوئی مجھ سے لپٹ جائیں گی۔ کاش ایسا ہوجائے، کاش...!

کسی بھی شخص کی کوئی صفت ایسی نہیں ہوتی جو پیدائش سے موت تک ایک ہی حالت پر رہتی ہو... انسان محض تغیر پذیر صفات کا مجموعہ نہیں... اس مجموعے کا مرکز ایک تغیر ناپذیر حقیقت ہے... اور وہ روح ہے... روح کے دو حصے ہیں... مجرد روح اور ہوائی روح... مجرد روح عالم ملکوت کی شے ہے... مجرد روح اور جسد عنصری کے اس مرکب کا نام ہوائی روح ہے... قانونِ قدرت ہے کہ عناصر باہم مل کر مختلف صورتیں اختیار کرتے ہیں... موت بدن سے ہوائی روح کے الگ ہوجانے کا نام ہے... معدوم ہوجانے کا نہیں... موت کے بعد بھی ہوائی روح کے اثرات اس قدر باقی رہ جاتے ہیں کہ ان سے مجرد روح کا رابطہ قائم رہے... انسان کے بہت سے فعل اسرار و کشف اور الہام سے ظاہر و عیاں ہوجاتے ہیں... شعور اور لاشعور کی دبیز تہوں میں پوشیدہ عوامل کی حقیقتوں کو بیان کرتی پُرتحیر تحریر...

انسانی ذہن اور باطن کی کیفیات کا ماجرا..... سربستہ رازوں کا سنسنی خیز انکشاف

رابطہ

کاشف زبیر

شیراز سیڑھیوں سے اوپر آیا تو اسے لگا کہ معاذ کسی سے بات کررہا ہے۔ شیراز تقریباً چھتیس برس کا خوش رو اور چھریرے جسم کی وجہ سے کم عمر نظر آنے والا مرد تھا۔ معاذ اس کا بیٹا تھا اور وہ صرف پانچ سال کا تھا۔ اس سال اسے اسکول میں داخل کرانا تھا۔ شیراز نے باتھ روم میں جھانکا۔ معاذ باتھ ٹب میں بیٹھا تھا اور اس کا رخ واش بیسن کی طرف تھا۔ شیراز مسکرادیا۔ وہ اپنے بیٹے کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ وہ اکلوتا تھا اور بہن بھائی کے حوالے سے تنہائی محسوس کرتا تھا

اس لیے خود سے بات کر رہا تھا۔ ربر سے بنے ٹب میں ہوا بھری ہوئی تھی اور یہ خاص طور سے چھوٹے بچوں کے لیے بنایا گیا تھا کہ انہیں چوٹ لگنے یا ڈوبنے کا خطرہ نہ ہو۔ شیراز نے تولیا لیتے ہوئے اسے لپیٹ کر اٹھایا اور کمرے میں لے آیا۔ وہ اسے خشک کرتے ہوئے بولا۔ ''اب آپ نے سونا ہے۔''

معاذ نے اپنی چھوٹی سی انگلی اٹھا کر کہا۔ ''مجھے ٹی وی دیکھنا ہے۔''

''نہیں، سونا ہے۔'' شیراز نے کہا۔ ''میں آپ کی ماما کے ساتھ واحد انکل کے ہاں جا رہا ہوں۔''

''ٹی وی۔'' معاذ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''ابھی تو نہیں بجے ہیں۔''

''اوکے ٹی وی... لیکن آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں۔ ٹھیک نو بجے آپ کو بستر پر ہونا ہے۔''

''پرامس پاپا۔'' معاذ نے کہا تو شیراز نے اسے پیار کیا۔

''میرا اچھا بیٹا۔''

شیراز نے اسے بستر پر بٹھا کر ٹی وی آن کر دیا اور ریموٹ اسے تھما دیا۔ معاذ کارٹون شوق سے دیکھتا تھا۔ ماہا تیار ہو رہی تھی۔ وہ تقریباً تیس برس کی دبلی پتلی لیکن خوش شکل اور دل کش عورت تھی۔ سرخی مائل رنگت کی وجہ سے اس کے تیکھے نقوش اچھے لگتے تھے۔ ماہا نے پوچھا۔ ''آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟''

''معاذ کو کون دیکھے گا؟'' شیراز نے سوال کیا۔

''میں نے روبینہ آنٹی کو کہہ دیا ہے، وہ رکیں گی جب تک ہم واپس نہیں آجاتے۔'' ماہا نے کہا۔ اسی لمحے کال بیل بجی۔ ''میرا خیال ہے، وہ آگئی ہیں تم دیکھ لو۔''

روبینہ آنٹی ان کی گلی میں سامنے والی لائن میں رہتی تھیں۔ تقریباً ساٹھ برس کی خوش مزاج خاتون تھیں اور محلے والوں سے ان کی اچھی بنتی تھی کیونکہ وہ ہر ایک کے کام آتی تھیں۔ شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور ان کا اکلوتا بیٹا بیوی بچوں کے ساتھ مڈل ایسٹ میں ہوتا تھا۔ مالی لحاظ سے آسودگی تھی لیکن روبینہ آنٹی بیٹے اور اس کے بچوں کی کمی محسوس کرتی تھیں۔ یہاں وہ صرف ایک ملازمہ کے ساتھ رہتی تھیں۔ شاید اسی لیے ان کا اکثر وقت گھر سے باہر گزرتا تھا۔ ماہا کی درخواست پر وہ خوشی سے مان گئی تھیں۔ پہلے بھی وہ کئی بار معاذ کی دیکھ بھال کر چکی تھیں۔ شیراز انہیں لاؤنج میں لے آیا۔ بڑا ٹی وی یہاں تھا اور ایک ٹی وی ان کے بیڈ روم میں تھا۔ شیراز نے کہا۔ ''آپ کا شکریہ آنٹی... آپ یہاں ٹی وی دیکھیں اور فریج میں سب کچھ موجود ہے، سمجھ لیں آپ اپنے گھر میں ہیں۔''

آنٹی روبینہ مسکرائیں۔ ''اپنا گھر سمجھ کر تو آئی ہوں۔ تم لوگ بے فکر ہو کر جاؤ۔''

''معاذ اوپر ہے، وہ نو بجے سونے چلا جائے گا۔ اسے معلوم ہے کہ آپ یہاں ہیں اگر کوئی مسئلہ ہوا تو وہ آپ کو آواز دے گا۔''

''تم بے فکر رہو میں سوؤں گی نہیں۔ جاگنے کا سامان لے کر آئی ہوں۔'' انہوں نے چھوٹی سی باسکٹ سے بُنائی کی سلائیاں اور اون کا گولا نکال کر دکھایا۔ ''اپنے پوتے کے لیے سویٹر بُن رہی ہوں۔''

کل رات واحد نے کال کر کے پارٹی کا کہا تھا مگر وجہ نہیں بتائی تھی۔ دس منٹ بعد وہ دونوں تیار ہو کر باہر نکل گئے۔ نومبر کے وسط میں اچھی خاصی سردی ہو گئی تھی۔ یہ گلی دارالحکومت کے دو سیکٹرز کے درمیان تھی اور اس کے آگے پیچھے جنگل تھا۔ یہ اگایا ہوا جنگل تھا جس میں درخت ترتیب سے لگائے گئے تھے مگر برسوں گزرنے کے بعد اس نے خودرو جنگل کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ پلاٹ زیادہ بڑے نہیں تھے لیکن ایک کمپنی نے ان پر ایک جیسے گھر بنا کر فروخت کیے تھے اور یہ گھر جدید انداز کے تھے۔

شیراز کے برابر والا مکان ڈی ایس پی ملک احمد نواز کا تھا۔ وہ چہرے سے سخت نظر آتا تھا مگر عام پولیس والوں سے قطعی مختلف تھا۔ محلے کے ہر فرد سے اس کے بہترین تعلقات تھے۔ ملک احمد نواز کے دو بچے تھے۔ ایک بیٹا شاہنواز اور ایک بیٹی شائستہ تھی۔ شاہنواز ایم بی اے کے آخری سال میں تھا اور شائستہ گریجویشن کر رہی تھی۔ اس نے بھی یہ مکان تقریباً شیراز کے ساتھ لیا تھا۔ احمد نواز کے بعد واحد کا مکان تھا۔ واحد محکمۂ داخلہ میں افسر تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ وہ یہاں دس سال پہلے آیا تھا اور پرانے لوگوں میں سے تھا۔ اس کا بیٹا راحیل یونیورسٹی میں شاہنواز کے ساتھ ہی پڑھتا تھا۔ مگر وہ اس سے تین سال چھوٹا اور بی بی اے کے ابتدائی سمسٹر میں تھا۔ باہر آنے پر ماہا نے اپنی شال لپیٹ لی تھی۔

''آج سردی بہت ہے۔''

''میرا خیال ہے سونے سے پہلے ہیٹر چلانا پڑے گا۔'' شیراز نے اس کی تائید کی۔ وہ واحد کے مکان میں داخل ہوئے تو اس نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا اور بلند آواز سے بولا۔

''ہمارے محلے کا سب سے خوب صورت جوڑا۔''

واحد انصاری تقریباً بیالیس برس کا کسی قدر چھوٹے قد اور گول چہرے والا شخص تھا۔ ماتھا بال اڑنے سے فراخ ہو گیا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ہمہ وقت ایک مسکراہٹ رہتی تھی۔ مسز تنویر نے ہنس کر کہا۔ ''آپ محلے کے دوسرے جوڑوں کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں واحد بھائی۔''

''اس پر آئندہ پارٹی میں ایک ریفرنڈم کرایا جائے گا۔'' واحد نے کہا۔ ''آج کی پارٹی نئے مہمان کے اعزاز میں ہے۔''

تمام مہمانوں کے آنے کے بعد واحد نے شیراز کو کولڈ ڈرنک کا ٹن تھمایا اور آہستہ سے بولا۔ ''آج کی نئی مہمان کچھ خاص ہے۔''

نئے مہمان کا مطلب تھا کہ محلے میں کوئی نیا آیا تھا یا اگر کسی کے گھر کوئی مہمان آیا ہوتا تو پارٹی میں اسے نئے مہمان کا درجہ ملتا تھا۔ شیراز نے پوچھا۔ ''کوئی نیا آیا ہے؟''

''ہاں، بی سیون میں ایک خاتون آئی ہے، ثمینہ صادق۔''

''شادی شدہ؟''

''ہاں لیکن اب بیوہ ہے۔ ایک بارہ تیرہ سال کی بیٹی ہے۔ خود تقریباً پینتیس برس کی ہے۔'' واحد نے بتایا۔ ''دو دن پہلے شفٹ ہوئی ہے۔ کل میں اور سارہ جا کر اسے دعوت دے کر آئے تھے۔ ویسے بھی دو ہفتے سے مل کر نہیں بیٹھے تھے، میں نے سوچا اس بہانے سب مل بیٹھیں گے۔''

ثمینہ صادق جوان اور دل کش عورت تھی۔ اس کے سیاہ بال جوڑے کی صورت میں بندھے تھے اور سیاہ آنکھوں میں انوکھی چمک تھی۔ وہ خواتین کے درمیان بیٹھی نہایت بے تکلفی سے سگریٹ پی رہی تھی۔ شیراز نے اس سے پہلے سگریٹ نوش خواتین دیکھی تھیں لیکن ان میں اتنا گھریلو پن نہیں ہوتا جتنا ثمینہ صادق میں محسوس کیا جا سکتا تھا۔ واحد نے شیراز اور ماہا کا تعارف کرایا۔ شیراز نے سر ہلایا اور ماہا نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ''ویلکم...'' ماہا نے کہا۔ ''مجھے خوشی ہوئی ہے کہ آپ ہمارے محلے کا ایک حصہ بن گئی ہیں۔ اتنا سا محلہ ہے ایک خالی گھر بھی محسوس ہوتا ہے۔''

''مجھے بھی یہاں کا ماحول اچھا لگا ہے۔'' اس نے سرسری انداز میں کہا۔ ''یہاں سکون اور تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ میں خود بھی تنہائی پسند ہوں۔''

''آپ بے فکر رہیں، یہاں کوئی آپ کی تنہائی میں بلاوجہ مخل نہیں ہوگا۔'' شیراز نے کہا۔ اسی دوران میں سارہ نے کھانے کا اعلان کیا۔ اس نے شاشلک اور فرائیڈ رائس بنائے تھے۔ اب جسے کھانا تھا، وہ خود کچن میں جا کر ڈسپوزیبل پلیٹ میں نکال لاتا اور جہاں مرضی ہوتی بیٹھ کر کھاتا۔ شیراز کو بھوک لگ رہی تھی اس لیے ٹن ختم کر کے وہ اپنے لیے کھانا لے آیا اور باہر سیڑھیوں پر آ گیا جہاں احمد نواز سامنے رہنے والے تنویر سے بات کر رہا تھا۔ تنویر سی ڈی اے میں کام کرتا تھا۔ شیراز ان کی گفتگو میں شامل ہو گیا۔ احمد نواز ساٹھ سال کا ہونے والا تھا اور اگلے سال اس کی ریٹائرمنٹ تھی۔ شیراز نے پوچھا۔ ''ملک صاحب! ریٹائرمنٹ کے بعد کیا ارادہ ہے؟''

اس نے شانے اچکائے۔ ''محلے کی دیکھ بھال... مجھے تو چوبیس گھنٹے یہاں رہنے کا موقع ملے گا۔ تم جانتے ہو مجھے اس جگہ سے عشق ہے۔ اب تو گاؤں جانے کو دل بھی نہیں چاہتا۔ میری تو خواہش ہے کہ مروں تو مکان کے سامنے والے لان میں دفن کر دیا جائے۔ تم لوگوں کے ساتھ ہی رہوں۔ قبرستان یہاں سے دور ہے۔''

''ملک صاحب! ابھی تو آپ جوان ہیں، مرنے کی باتیں کیوں کرتے ہیں؟'' شیراز ہنسا۔ ''ویسے واحد کا بھی یہی ارادہ ہے۔ دونوں میں ٹکراؤ ہوگا۔''

''ہم گلی بانٹ لیں گے۔'' احمد نواز نے فوری حل نکال لیا۔

''لیکن میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔'' واحد آ گیا۔

تنویر، اس کے برابر والا رزاق شاہ اور سہیل خان سب سے شیراز کی سلام دعا اور بے تکلفی تھی لیکن دوستی صرف واحد سے تھی۔ عمروں کے فرق کے باوجود ان کے مزاج اور ذہن ملتے تھے۔ گیارہ بجے تک نصف لوگ رخصت ہو گئے کیونکہ انہیں صبح دفتر جانا تھا۔ شیراز اور کچھ دیگر جو اپنا کام کرتے تھے، ان کو فکر نہیں تھی۔ شیراز صبح دس بجے دفتر جاتا اور چار بجے واپس آجاتا تھا۔ کنسٹرکشن کے معاملات ایک فرم کے سپرد تھے مگر شیراز صرف سفارش کرتا تھا ورنہ اس سے نقشہ بنوانے والا آزاد تھا کہ جس سے چاہے کنسٹرکشن کروالے۔ البتہ شیراز تعمیراتی معیار کو سپروائز کرتا تھا کیونکہ یہ اس کی ساکھ کا معاملہ تھا۔ اس کے نقشہ کیے مکان یا تعمیر میں کوئی خرابی نکلتی تو اس کی ساکھ بھی متاثر ہوتی۔ ویسے اس کا کام مزے کا تھا۔ بارہ سال پہلے آرکیٹیکٹ میں ماسٹر کے بعد اس نے چار سال ایک فرم میں کام کیا اور پھر اپنی فرم کھول لی۔ دفتر زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ دس منٹ میں پہنچ جاتا تھا۔ اس نے گھر کے تہ خانے میں بھی ایک چھوٹا سا

سیٹ اپ بنایا ہوا تھا۔ اگر کام زیادہ ہوتا تو وہ گھر لے آتا اور یہاں کر لیتا۔ بہر حال اسے زیادہ دیر دفتر میں نہیں بیٹھنا پڑتا تھا۔

شیراز اندر آیا تو پارٹی میں اب کم لوگ رہ گئے تھے اور وہ سب نشست گاہ میں جمع تھے۔ سارہ نے ثمینہ سے کہا۔ ”آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔“

”نام تو آپ جانتے ہیں۔ میں بیوہ ہوں۔ میرے شوہر ڈاکٹر صادق حسن ماہرِ نفسیات تھے۔ دو سال پہلے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ میں بھی ماہرِ نفسیات ہوں۔“

سب نے افسوس کیا پھر شیراز نے کہا۔ ”کام دلچسپ ہے۔“

ثمینہ مسکرائی۔ ”اتنا بھی نہیں کیونکہ بہت سے لوگ بالکل پسند نہیں کرتے کہ انہیں کبھی کسی ماہرِ نفسیات کی خدمات کی ضرورت پڑے۔ ویسے میں علاج کرنے والی ماہر نفسیات نہیں ہوں۔“

”تو پھر؟“ ماہا نے پوچھا۔

”میں ریسرچ ورک کرتی ہوں۔ ایک این جی او ہے۔ ہمارے کچھ پروجیکٹس ہیں، ان پر کام کرتی ہوں۔ این جی او ڈاکٹر صاحب نے قائم کی تھی پھر میں ان کے ساتھ بطور ریسرچر منسلک ہو گئی۔ ہمارے درمیان انڈر اسٹینڈنگ ہوئی تو شادی کر لی۔“

”ریسرچ ورک؟“ شیراز نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”نفسیات اور مابعد الطبیعات۔“

”اوہ... ماورائی واقعات اور پراسرار دنیا آپ کے پروجیکٹس ہیں۔“ شیراز نے کسی قدر مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ ماہا نے اسے چٹکی کاٹی تو وہ جلدی سے بولا۔ ”پلیز... میں مذاق کر رہا ہوں۔“

”میں نے بُرا نہیں منایا۔ امید ہے آپ لوگ بھی میری اسموکنگ کا بُرا نہیں منائیں گے۔“ اس نے ایک سگریٹ اور سلگایا۔ ”آپ اسے روحانی سائنس بھی کہہ سکتے ہیں۔“

”میرا خیال ہے سائنس دو جمع دو برابر چار ہوتی ہے۔“ شیراز نے کہا۔

”اس کے برعکس فزکس ہمیں بتاتی ہے کہ مادے کی دو اکائیاں کبھی برابر نہیں ہوتیں۔“ ثمینہ نے کہا۔ ”ہماری دنیا کے ساتھ اور بھی بہت کچھ ہے جس کا ہم ادراک نہیں رکھتے ہیں۔“

”بھوتوں کی دنیا۔“ مسز تنویر نے کہا۔ ”ہم جنوں کو بھی مانتے ہیں۔“

”ہاں یہ ہوتے ہیں۔ بعض لوگ ان سے رابطہ کر لیتے ہیں۔ ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ بچوں میں اس کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ ان کا لاشعور اور تحت الشعور طاقت ور ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا بعض اوقات بچے خیالی چیزوں سے بات کرتے ہیں۔“

شیراز کو معاذ کا خیال آیا۔ ”آپ کے خیال میں وہ چیزیں خیالی نہیں ہوتی ہیں؟“

”بعض اوقات ہوتی ہیں اور بعض اوقات نہیں بھی ہوتیں۔“

”ثمینہ۔“ واحد نے بے تکلفی سے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ ماہرِ نفسیات ہپناٹزم سے کام لیتے ہیں۔ آپ ہپناٹائز کرتی ہیں؟“

”ہاں یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے، اگر معمول بننے والا تیار ہو۔“

”میں نہیں مانتا کہ کوئی آسانی سے معمول بن سکتا ہے۔“ شیراز نے کہا۔

ثمینہ نے اسے دیکھا۔ ”لوگ بہت آسانی سے معمول بن جاتے ہیں، بس انہیں تیار ہونا پڑتا ہے۔“

”کیا آپ تجربہ کر سکتی ہیں؟“ واحد نے کہا۔ اس کے لہجے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ بالکل سنجیدہ نہیں ہے۔

”بالکل اگر کوئی تیار ہو۔“

واحد نے شیراز کی طرف دیکھا تو اس نے ہاتھ اٹھایا۔ ”بالکل نہیں۔“

”یار! کوئی مشکل کام نہیں ہے... کیوں ثمینہ! میں نے ٹھیک کہا نا؟“

”درست ہے۔“ اس نے کش لے کر دھواں خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر مسٹر شیراز تیار ہوں تو...“

شیراز ہچکچایا پھر اس نے محسوس کیا کہ اگر اس نے انکار کیا تو شاید اسے بزدل سمجھا جائے گا۔ کیونکہ سب اسے متوقع نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس لیے وہ مان گیا۔ اس نے گہری سانس لی۔ ”او کے، مجھے کیا کرنا ہے؟“

”کچھ نہیں آنکھیں بند کر کے ساری توجہ میری آواز پر مرکوز کر لیں۔“

”یہاں سب کے درمیان؟“ اس نے بے یقینی سے کہا۔

”ہاں اس کے لیے ماحول کی شرط نہیں ہے۔ وہ سب بھول جائیں جو فلموں اور کہانیوں میں بتایا جاتا ہے۔“

شیراز نے آنکھیں بند کر لیں اور توجہ ثمینہ کی آواز پر مرکوز کر لی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ وہی گھسا پٹا راگ الاپے گی۔ ”تمہیں نیند آ رہی ہے۔“ مگر اس کے بجائے اس نے کہا۔ ”مسٹر شیراز! تمہیں سنیما یا تھیٹر میں سے کیا پسند ہے؟“

”سنیما۔“ اس نے جواب دیا۔

”او کے تم تصور کرو تم ایک سنیما میں ہو۔“ ثمینہ کے لہجے میں ارتعاش سا آ گیا۔ ”اس کی دیواریں اور نشستوں کے کور سرخ رنگ کے ہیں... سامنے سفید اسکرین ہے... اس کے دائیں بائیں سرخ پردے ہیں... مگر اب ان کا رنگ سیاہ ہو رہا ہے... دیواروں کا... نشستوں کا... سیاہ رنگ ہر طرف چھا رہا ہے۔“

”ہاں، سب سیاہ ہو رہا ہے۔“ شیراز نے دھیمی اور گہری آواز میں کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ٹرانس میں آ گیا ہے۔ سب دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ساکت بیٹھا تھا مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے آنکھیں بند کی ہوئی ہوں۔ کچھ اس پر یقین کر رہے تھے اور بعض کے چہروں پر بے یقینی تھی۔ وہ اسے صرف ایک تماشا سمجھ رہے تھے اور شیراز کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ ٹرانس کا ایکٹ کر رہا ہے۔ صرف اس کے برابر میں بیٹھی ماہا جانتی تھی کہ وہ ایکٹ نہیں کر رہا ہے۔ اس کا جسم سونے والی حالت میں آ گیا تھا اور ماہا اس کی یہ کیفیت اچھی طرح جانتی تھی۔

شیراز، ثمینہ کی آواز سن رہا تھا۔ ”اب پورا سنیما سیاہ رنگ میں رنگ گیا ہے۔ صرف ایک چیز سفید ہے اور وہ ہے اس کی اسکرین...“

”ہاں اب صرف اسکرین سفید ہے، باقی سب سیاہ اور تاریک ہے۔“

”اسکرین سفید ہے... تم اپنی پسندیدہ نشست پر بیٹھے ہو... بالکل وسط میں... اسکرین پر کچھ الفاظ ہیں... تم دیکھ رہے ہو... لیکن وہ واضح نہیں ہیں۔“

”ہاں، وہ واضح نہیں ہیں۔“

”تم اسے دیکھنا چاہتے ہو؟“

”ہاں، میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”او کے، تم اسکرین کے پاس جا رہے ہو... الفاظ آہستہ آہستہ نمایاں ہو رہے ہیں... اب تم دیکھ سکتے ہو... اسکرین پر کیا لکھا ہے؟“

”نیند۔“ شیراز نے کہا اور چونک کر اٹھا۔ سب ہنس رہے تھے۔ اس نے ماہا کی طرف دیکھا۔ ”کیا... کیا ہوا؟“

ماہا بولی۔ ”تم سونا چاہتے ہو۔ تم نے کہا تمہیں نیند آ رہی ہے۔“

واحد ہنسا۔ ”تم ڈراما کر رہے تھے، اصل میں تمہیں نیند آ رہی ہے۔“

”یہ ڈراما نہیں تھا۔“ ثمینہ نے اٹھ کر شال اوڑھی۔ ”مسٹر شیراز مبارک ہو... تم بہت اچھے معمول ہو۔“

”کیا مطلب؟“

”میں نے کسی کو اتنی تیزی سے اور بالکل واضح انداز میں ٹرانس میں آتے نہیں دیکھا ہے۔ تم کمیاب لوگوں میں سے ہو۔ شاید سو میں سے کوئی ایک شخص ہی اچھا معمول ہوتا ہے۔“

”بچہ جمہورا۔“ واحد نے آواز نکالی۔ ”میں کون عامل... تو کون معمول۔“

”شٹ اپ۔“ شیراز نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”میرا خیال ہے چلنا چاہیے۔ روبینہ آنٹی کو زیادہ زحمت دینا مناسب نہ ہوگا۔“

وہ سب سے ہاتھ ملا کر خدا حافظ کہہ کر باہر آئے تو ماہا نے کہا۔ ”تم سچ مچ جیسے گہری نیند میں چلے گئے تھے۔ میں تمہاری یہ کیفیت جانتی ہوں۔“

”مجھے نہیں معلوم لیکن وہ جو کہہ رہی تھی، میں بالکل صاف دیکھ رہا تھا۔“

”ثمینہ کا کہنا ہے کہ تم وہی سن رہے تھے جو اس نے خاص طور سے تمہارا نام لے کر کہا۔“

”کیا اس نے کچھ اور بھی کہا تھا؟“

”ہاں، وہ بتاتی رہی تھی کہ یہ سب کیا ہوتا ہے۔“ ماہا نے سر ہلایا۔ ”اس کا کہنا ہے کہ ہمارے پاس کچھ حسیات اور بھی ہوتی ہیں لیکن وہ لاشعور اور تحت الشعور کے تحت کام کرتی ہیں۔ ٹرانس کی حالت میں یہ دونوں شعور سے مل جاتے ہیں اور تب انسان دوسری دنیا سے رابطہ کر سکتا ہے۔“

شیراز نے حیرت سے کہا۔ ”میں نے نہیں سنا کہ اس نے ایسا بھی کچھ کہا ہے۔ مجھے تو لگ رہا ہے وہ صرف مجھ سے بات کر رہی تھی۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، تم کتنی دیر ٹرانس میں رہے؟“

”شاید دس منٹ۔“

”تم پورے آدھا گھنٹا ٹرانس میں رہے۔ میرے خدا! میں نے آج تک ایسی باتوں پر یقین نہیں کیا تھا لیکن

شیراز اس تجربے سے گزرا تھا مگر اسے اب بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ گھر واپس آئے تو آنٹی روبینہ ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے آواز بند کر رکھی تھی تاکہ معاذ کی طرف سے خبردار رہیں۔ جاگنے کی کوشش میں ان کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ ماہا نے معذرت کی کہ انہیں کچھ دیر ہوگئی۔ پھر وہ انہیں دروازے تک چھوڑنے گئی۔ معاذ اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ شیراز نے اسے پیار کیا اور اپنے بیڈروم میں آیا۔ ماہا دروازے کھڑکیاں چیک کرتی اور لائٹس آف کرتی ہوئی اوپر آئی۔ اس نے معاذ کے کمرے میں جھانکا اور پھر اپنے کمرے میں آگئی۔ شیراز رات کا لباس پہن کر بستر پر آیا۔ کچھ دیر بعد ماہا بھی کپڑے بدل کر آگئی۔

شیراز نے اس کے بال سہلاتے ہوئے پوچھا۔ ”اسکول جاب کا کیا سوچا ہے؟“

”وہ جنوری سے بلا رہے ہیں مگر میں سوچ رہی ہوں کہ پہلے معاذ کو اسکول میں داخل کرا دوں۔ اسی اسکول میں... وہاں سسٹم بہت اچھا ہے۔ معاذ میرے ساتھ آئے جائے گا۔“

ماہا نے ایجوکیشن میں ماسٹر کیا تھا اور شادی کے بعد بھی وہ امید سے ہونے تک جاب کرتی رہی تھی۔ وہ ہائر کلاسز کو پڑھاتی تھی۔ معاذ اب بڑا ہو رہا تھا اور اسکول جانے کی عمر کو پہنچ گیا تھا۔ ماہا نے اسے گھر میں بہت کچھ سکھا دیا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ وہ بس ایک سال کی اسکولنگ کے بعد پہلی کلاس میں چلا جائے۔ جب وہ اور شیراز معاذ کے لیے اسکول گئے تو انتظامیہ نے ماہا کو بھی جاب کی پیشکش کر دی۔ وہ اچھا پیکیج دے رہے تھے۔ اگرچہ بیس ہزار شیراز کی آمدنی کا ساتواں حصہ بھی نہیں تھے لیکن اپنی کمائی کی بہرحال اہمیت ہوتی ہے۔ شیراز نے کہا۔ ”اگر تم خواہش مند ہو تو کرلو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کسی اور کو رکھ لیں۔“

”میں بھی یہی سوچ رہی ہوں لیکن پھر معاذ کی دیکھ بھال کے لیے کسی کو رکھنا ہوگا۔ کم سے کم تین مہینے کے لیے۔“

”کوئی ملازمہ تلاش کرلو لیکن اعتماد والی ہو۔“ شیراز نے کہا اور سیدھا لیٹ گیا۔ چند منٹ بعد وہ گہری نیند سو چکا تھا۔ رات کسی وقت اسے لگا کہ اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ اس نے ہاتھ پھیلائے اور انگلیاں نیچے ٹیک کر زور لگایا تو اس کا ناخن فرش سے رگڑ کھا کر اکھڑ گیا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ اچانک اٹھ بیٹھا مگر چیخ بھی خواب میں تھی۔ حقیقت میں اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔ اس نے بے ساختہ اپنا ہاتھ دیکھا، اس کا ناخن اپنی جگہ تھا مگر ہاتھ لرز رہا تھا۔ اس نے دیکھا بیڈ شیٹ سمٹی ہوئی تھی جیسے اس نے اسے مٹھی میں جکڑا ہوا ہو۔ برابر میں ماہا بے خبر سو رہی تھی۔ جس زمانے میں وہ اپنی فرم سیٹ کر رہا تھا، اسے بہت زیادہ محنت سے اعصابی کشیدگی کا مرض لاحق ہوا تھا تب ڈاکٹر نے اسے اعصابی سکون کے لیے ایک دوا دی تھی۔ شیراز ٹھیک ہوگیا تھا مگر اب بھی کبھی کبھی اسے دوا کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ لرزتے دیکھا تو اٹھ کر دراز سے دوا کی شیشی نکالی اور گلاس میں پانی نکال کر اس کی مدد سے حلق سے اتار لی۔

اس نے گلاس واپس رکھا تو اسے پانی میں سرخی کی آمیزش دکھائی دی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر واش روم میں آیا اور لائٹ آن کر کے اپنا منہ دیکھا تو اسے خون ہونٹوں پر دکھائی دیا۔ اس نے منہ کھولا تو سامنے اوپر والے دانت سے خون رس رہا تھا۔ اس نے گلاس رکھ کر انگلیوں سے دانت پکڑا تو وہ ہلتا ہوا محسوس ہوا اور ذرا سا زور لگانے سے ہاتھ میں آگیا۔ اس نے بے یقینی سے اپنا دانت دیکھا۔ کل تک اس کا دانت بالکل ٹھیک تھا اور اب یہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا صدمے سے برا حال ہوگیا کیونکہ اسے اپنی شخصیت اور اپنے دانت بہت عزیز تھے۔ اس کے دانت تھے بھی خوب صورت اور سفید چمکتے ہوئے۔ دانت اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر واش بیسن میں گرا۔ اس نے دانت دیکھا اور پھر آئینے میں دیکھا تو اسے اپنے ہونٹ صاف دکھائی دیے اس نے جلدی سے منہ کھولا تو اس کے سارے دانت اپنی جگہ موجود تھے۔ اس نے بے یقینی سے واش بیسن میں دیکھا تو وہاں دانت نہیں تھا اور نہ ہی اب گلاس کے پانی میں خون کی آمیزش تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دانت چھوا اور پھر سر تھام لیا۔

”یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟“

☆☆☆

اگلے دن شیراز دفتر میں تھا اور ایک پارٹی سے بات کر رہا تھا۔ وہ ایک پہاڑی ولا بنوانا چاہتے تھے۔ ان کا کسٹمر غیر ملکی تھا اور وہ شمالی علاقے میں ایک ولا بنوانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے شیراز سے رابطہ کیا تھا اور اسے کام کی پیشکش کی تھی۔ انہوں نے شیراز کو سائٹ وزٹ کرانے کو کہا تھا۔ وہ صرف اس کام کے اسے دس ہزار دے رہے تھے اور اخراجات بھی ان کے ذمے تھے اس لیے شیراز نے ہامی بھرلی۔ انہیں وہاں دو سے تین لگ سکتے تھے۔ شیراز نے ماہا

کو بتایا اور اسے اپنا بیگ تیار کرنے کو کہا۔ ماہا نے اس کے لیے گرم کپڑے نکالے کیونکہ پہاڑوں پر موسم بہت سرد ہو گیا تھا۔ برف باری کا بھی امکان تھا۔ معاذ کو پتا چلا کہ وہ دو دن کے لیے جا رہا ہے تو وہ بے قرار ہو گیا۔ اس نے شیراز سے لپٹ کر کہا۔ ”پاپا! آپ نہیں ہوتے تو مجھے ڈر لگتا ہے۔“

وہ ڈنر کی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ماہا نے چونک کر اسے دیکھا۔ شیراز نے پوچھا۔ ”کیوں بیٹا؟“

”پتا نہیں پاپا۔“ وہ معصومیت سے بولا۔

”آپ فکر مت کرو۔ میں دو دن میں آجاؤں گا... اور آپ کی ماما بھی تو ہیں پاس۔“

”میں ماما کے پاس سوؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ ماہا نے کہا۔ ”لیکن آپ کھانا کھاؤ۔“

”اور آپ نے سونے سے پہلے دودھ بھی پینا ہے۔“ شیراز نے اس کا سر سہلایا۔ ”یہ سارے کام آپ نے میری غیر موجودگی میں بھی کرنے ہیں۔“

معاذ ماں کے مقابلے میں باپ سے زیادہ قریب تھا اور وہ اس کا کہنا بھی فوراً مانتا تھا جبکہ ماہا اسے کچھ کہتی تو وہ حیل حجت یا بحث کرتا تھا۔ صرف ایک ٹی وی ایسی چیز تھی جس کے لیے وہ اپنی ضد منوا کر چھوڑتا تھا۔ رات سونے سے پہلے وہ لازمی ٹی وی دیکھتا تھا۔ کھانے کے بعد ماہا اسے اوپر لے گئی اور شیراز پلیٹیں اٹھانے لگا۔ سنک میں رکھ کر وہ لاؤنج میں آیا اور سامنے والی کھڑکی سے باہر جھانکا تو اسے بی سیون میں اوپری کھڑکیوں کی روشنیاں نظر آئیں۔ اس نے سوچا کہ ثمینہ صادق نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا۔ اسے گزشتہ رات والی بات یاد آگئی۔ خواب کی حد تک تو وہ پریشان نہیں تھا مگر اس کے بعد جو ہوا تھا، وہ اس کے لیے پریشان کن تھا۔ وہ کسی صورت اسے اپنا وہم قرار نہیں دے سکتا تھا کیونکہ اس نے جو دیکھا تھا، وہ بالکل واضح تھا۔ اس نے زور لگا کر دانت نکالا تھا اور اس کے فوراً بعد اس نے دانت اپنی جگہ دیکھا تھا۔

اس سے پہلے کبھی اس کے ساتھ ایسا انوکھا واقعہ نہیں ہوا تھا۔ کیا یہ ثمینہ صادق کی طرف سے ہپناٹزم کے بعد ہوا تھا؟ اچانک کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ بری طرح اچھل پڑا۔ یہ ماہا تھی۔ ”میرے خدا! تم نے تو مجھے ڈرا دیا۔“

”تم بہت دیر سے پردہ اسی طرح تھامے کھڑے تھے۔“ ماہا نے کہا۔ ”سوری، میں نے اچانک چھوا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ شیراز نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”معاذ لیٹ گیا؟“

”نہیں، وہ ٹی وی دیکھ رہا ہے۔“ ماہا نے تشویش سے کہا۔ ”یہ اچھی بات نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ٹی وی اپنا عادی کرلیتا ہے۔“

”میرا خیال ہے آدھے گھنٹے سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ نو بجے بستر پر چلا جاتا ہے۔“

اگلے دن شیراز پارٹی کے ساتھ شمالی علاقے روانہ ہوا۔ پانچ گھنٹے کی ڈرائیو تھی اور جگہ بہت خوب صورت تھی۔ کیونکہ ہل اسٹیشن نہیں تھا اس لیے یہاں سکون اور سناٹا تھا۔ شاید اسی لیے کسٹمر نے یہاں ولا بنوانے کا سوچا تھا۔ اس نے لوکیشن دیکھی اور پھر زمین کا معائنہ کیا۔ اس کی ہدایت کے مطابق وہاں پہلے ہی کھدائی کر دی گئی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ زمین کی نوعیت کیا تھی اور وہ تعمیر کا بوجھ برداشت کر سکتی تھی یا نہیں۔ زمین اچھی اور مضبوط تھی۔ اس میں پتھر بہت زیادہ تھے جو پختہ تعمیر کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ اس نے نقشہ بنانے کے لیے ہاں کر دی۔ پارٹی خوش ہوگئی۔ شیراز کی مالک سے براہِ راست بات کرادی گئی اور اس نے شیراز کا منہ مانگا معاوضہ منظور کرلیا۔ یہ اس کے عام معاوضے سے تقریباً پچاس فیصد زیادہ تھا اور پھر اسے ہر وزٹ کا معقول الاؤنس دیا جاتا اس لیے وہ بہت خوش تھا۔ واپس آکر وہ اسی خوشی میں ماہا اور معاذ کو شاپنگ پر لے گیا۔ سردیوں کا آغاز ہوگیا تھا اور ابھی اس کی بھی شاپنگ کرنی تھی اس لیے شیراز نے مناسب سمجھا کہ یہ کام بھی ابھی نمٹا لے۔ آگے مصروفیات بہت زیادہ تھیں اور ان میں پورا ایک دن صرف شاپنگ کے لیے نکالنا بہت مشکل تھا۔ ماہا اور معاذ بھی خوش ہوگئے۔ اس کے بعد وہ مصروف ہوگیا۔

آنے والا ایک مہینا بہت مصروف گزرا۔ مگر اس نے یہ پروجیکٹ مکمل کرلیا اور نقشہ ولا کے مالک کو پسند بھی آیا تھا۔ اب صرف اس کی فنشنگ باقی تھی۔ انہی دنوں واحد نے اسے اطلاع دی کہ آنے والے اتوار سب برف باری کے لیے نزدیکی ہل اسٹیشن جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ اس کے لیے بس ہائر کی جاتی اور سب ایک ساتھ جاتے۔ صبح جاتے اور شام تک واپسی ہوتی۔ شیراز کا کام نمٹ گیا تھا اس لیے اس نے اوکے کر دیا۔ ماہا اور معاذ بھی پُرجوش ہوگئے کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے پہلی برف باری مس کی ہو ورنہ وہ ہر سیزن میں پہلی برف باری میں جاتے تھے۔ اس بار اس پروجیکٹ کی وجہ سے دیر ہوگئی تھی مگر اب سب جا

رہے تھے اور پکنک بھی ہوتی۔ ہل اسٹیشن پر سب اپنی اپنی مرضی سے تفریح کرتے یا ل کر بیٹھتے۔ صرف آنا جانا ساتھ تھا۔ مگر خواتین نے کہا کہ وہ گھر سے سب لے کر جائیں گی اور سب ایک جگہ ہی بیٹھ کر کھائیں گے۔ اس لیے سب نے ڈشیں اور چیزیں بانٹ لیں۔ ماہا بیف بریانی اچھی بناتی تھی اس نے وہ تیار کی۔ سادہ چائے اور کافی بہت اچھی بناتی تھی، یہ اس کے سپرد کر دی گئیں۔ باقی سب نے کھانے کا سامان بانٹ لیا۔ مسز تنویر نے سب کے لیے ری فریش منٹ پیک تیار کیے تھے۔

ایک بڑی بس ہائر کی گئی جس میں پورا محلہ آرام سے آ گیا تھا۔ دو گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ہل اسٹیشن پہنچے۔ احمد نواز کے ایک واقف کار کا یہاں بنگلا تھا۔ اس نے ایک بڑا کمرا ان کے لیے خالی کر دیا تھا۔ اس میں قالین بچھا تھا اور ساتھ ہی واش روم بھی تھا۔ وہ سامان رکھ کر گھومنے پھرنے کے لیے نکل گئے۔ ان کا گروپ اتنا بڑا تھا کہ سڑک ان سے بھر گئی تھی۔ وہ ہل اسٹیشن کے بازار تک آئے۔ خواتین اور لڑکیاں دکانوں میں گھس گئیں اور مرد مختلف جگہوں پر گپ شپ کرتے رہے۔ بچے اور لڑکے چہل قدمی کرتے ہوئے آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ اچانک شور بلند ہوا۔ شیراز واحد اور احمد نواز کے ساتھ تھا۔ اس نے دیکھا کہ راحیل اور شاہنواز آپس میں بھڑے ہوئے تھے اور شاہنواز راحیل کو رگڑ رہا تھا۔ وہ اس کے مقابلے میں کہیں تنومند تھا۔ وہ تینوں ان کی طرف لپکے۔ احمد نواز اور واحد نے اپنے اپنے بیٹوں کو الگ کیا۔ راحیل ہانپ رہا تھا اور شاہنواز بپھرا ہوا تھا۔ وہ پھر راحیل کی طرف بڑھا مگر احمد نواز نے سخت لہجے میں کہا۔

”بس... تم لوگوں نے بہت اچھا تماشا دکھا دیا ہے۔“

شاہنواز کچھ دیر راحیل کو گھورتا رہا جس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور پھر وہ پلٹ کر چلا گیا۔ راحیل بھی دوسرے لڑکوں کے ساتھ چلا گیا اور کچھ دیر میں سب معمول پر آ گیا۔ احمد نواز کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اسے اپنے بیٹے پر غصہ آ رہا تھا۔ واحد نے اسے تسلی دی۔ ”یار! لڑکے ہیں، گرم خون ہے۔ لڑائی ہو جاتی ہے۔ کل دونوں پھر مل کر گھوم رہے ہوں گے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن اس موقع پر یہ سب کرنا ضروری نہیں تھا۔ یہ بچے نہیں ہیں۔ ابھی یہاں عورتیں ہوتیں تو ان کے موڈ خراب ہو جاتے۔ پکنک کا بیڑا غرق ہو کر رہ جاتا۔“

شیراز اور واحد احمد نواز کو وہاں سے لے گئے اور وہ کچھ دیر میں نارمل ہو گیا۔ شام تک وہ سب بھول بھی چکے تھے کہ وہاں کیا ہوا تھا۔ خواتین کو پتا نہیں چلا تھا۔ کچھ دیر بعد سب کو بھوک لگنے لگی اور انہوں نے بنگلے کا رخ کیا۔ لڑکے ہوٹلوں اور ریستورانز میں چلے گئے تھے۔ خواتین، لڑکیوں اور مردوں نے گھروں سے لایا ہوا کھانا کھایا۔ ہاٹ پاٹ میں سب گرم اور مزے کا تھا۔ یہاں بھی انہوں نے سارے برتن ڈسپوزیبل استعمال کیے تھے۔ واحد نے سب کو وارننگ دی تھی کہ ایک ریپر بھی کہیں نہیں پھینکنا ہے۔ وہ بڑا سا شاپر لایا تھا، سارا کچرا اس میں بھر کر واپس لے جاتے اور راستے میں آنے والے کسی ڈسٹ بن میں ڈالتے۔ واپسی پر سب بہت تھکے ہوئے مگر خوش تھے۔ انہوں نے بہت اچھی تفریح کی تھی۔ آرام دہ اور ہیٹر کے ساتھ بس کا سفر بھی اچھا گزرا تھا۔ معاذ شیراز کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ شیراز نے پوچھا۔ ”آپ کسے دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے ہو۔“

”ردا کو پاپا۔“

”ردا کون؟“ شیراز نے پوچھا مگر معاذ خاموش رہا۔ شیراز نے توجہ نہیں دی۔ وہ جانتا تھا کہ معاذ کسی خیالی وجود سے بات کرتا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی کا نام لیا تھا۔ گویا وہ جس سے بات کرتا تھا، وہ لڑکی تھی اور اس نے اس کا نام ردا رکھا تھا۔ شاید یہ فطری بات تھی۔ اس نے ہم نشینی کے لیے لڑکی کا انتخاب کیا تھا۔ واپسی پر اس نے ماہا کو یہ بات بتائی۔

”ہاں، میں نے بھی دیکھا ہے۔ وہ اکثر خود سے باتیں کرتا ہے۔ لیکن ایسا تو اکثر بچے کرتے ہیں جن کے بہن بھائی نہیں ہوتے یا وہ زیادہ تر اکیلے رہتے ہیں۔“

”اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ معاذ کا کوئی بہن بھائی ہونا چاہیے۔“

ماہا شرما گئی۔ ”خواہش تو میری بھی ہے لیکن جو اللہ کی مرضی... وہی دینے والا ہے۔“

شیراز اور ماہا نے معاذ کے بعد بس دو سال احتیاط کی تھی۔ اس کے بعد احتیاط چھوڑ دی تھی مگر یہ قدرت کی طرف سے تھا کہ معاذ کے بعد ان کے گھر کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ شیراز کے خیال میں ابھی دیر نہیں ہوئی تھی۔ ماہا پھر سے ماں بن سکتی تھی۔ معاذ جلدی سونے چلا گیا۔ وہ برف میں بہت

زیادہ کھیلا تھا اور شیراز کسی قدر فکر مند بھی تھا کہ اسے ٹھنڈ نہ لگے۔ ماہا اسے مکمل پیک کر کے لے کر گئی تھی۔ وہ سونے کے لیے لیٹے تو ماہا کو خیال آیا۔ ”میں سوچ رہی ہوں کہ مہرین سے بات کروں۔ شاید اس کی کوئی جاننے والی ہو جو معاذ کی دیکھ بھال کر سکے۔“

مہرین ماہا کی کالج اور یونیورسٹی کے زمانے کی دوست تھی اور وہ اسی اسکول میں جاب کر رہی تھی۔ ماہا نے جاب چھوڑ دی تھی لیکن وہ کرتی رہی تھی۔ درحقیقت ماہا کو دوبارہ جاب کی پیشکش اس کی وجہ سے ہوئی تھی۔ ”ہاں، وقت کم رہ گیا ہے۔ آج ستائیس دسمبر ہے اور تمہیں پہلی سے جوائن کرنا ہے۔“

”دیکھتی ہوں ورنہ پھر مجھے معاذ کو ساتھ لے جانا ہو گا۔ اسے فی الحال پریپ کلاس میں سیٹ کرا دوں گی۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ اسے تعلیم کے لیے ہی کلاس میں داخل کرایا جائے۔ ورنہ یہ خود کو مس فٹ محسوس کرے گا۔“ شیراز نے کہا۔ خود ماہا کا بھی یہی خیال تھا۔ اگلی صبح شیراز کے دفتر جانے کے بعد ماہا کچن سمیٹ رہی تھی کہ فون کی بیل بجی۔ کارڈلیس میز پر معاذ کے سامنے رکھا تھا۔ اس نے اپنے کھلونے چھوڑ کر کارڈلیس اٹھایا اور کال ریسیو کی پھر بن کر ماں کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے فون لیا۔ دوسری طرف ماہا کی سہیلی مہرین تھی۔ وہ بھی ٹیچر تھی اور اسی اسکول میں پڑھاتی تھی۔

”میں تمہیں کال کرنے جا رہی تھی۔“ ماہا نے کہا اور اسے اپنا مسئلہ بتایا۔ معاذ جو خاموش بیٹھا اپنے کھلونوں سے کھیل رہا تھا، اس نے اچانک کہا۔

”مہرین آنٹی سے کہیں وہ شیما کو بھیج دیں۔“

اسی لمحے مہرین نے کہا۔ ”ایک لڑکی ہے شیما... حال ہی میں گریجویشن کے پیپرز دیے ہیں اور کچھ مہینوں کے لیے فارغ ہے۔ یہاں اسکول میں مونٹیسوری دیکھ چکی ہے۔ اسے بچے ہینڈل کرنا آتے ہیں۔“

ماہا ایک لمحے کو حیران ہوئی پھر اسے خیال آیا کہ شاید مہرین نے شیما کا نام لیا ہو اسی لیے معاذ نے بھی کہا تھا۔ پھر اسے خوشی تھی کہ جو وہ چاہتی تھی وہ ہو گیا تھا اس لیے اس نے اس بات پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ ”اگر تمہیں اس پر اعتماد ہے تو اسے بھیج دو۔“

”میں اسے کہہ دیتی ہوں، وہ رہتی بھی تمہارے علاقے میں ہے۔ میرا خیال ہے وہ پیدل بھی آ سکتی ہے۔“

”پلیز اسے کال کرو کیونکہ میرے پاس صرف تین دن ہیں۔ مجھے اسکول کھلتے ہی جوائن کرنا ہے۔“

”میں آج ہی اسے کال کرتی ہوں، وہ کل تک آ جائے گی۔“ مہرین نے یقین دلایا۔ ”امید ہے تمہیں اس سے شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ وہ سمجھدار اور سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ میں اسے جانتی ہوں اسی لیے تمہیں کہہ رہی ہوں۔“

”میں اسے اچھا معاوضہ دوں گی۔“

”اسے ضرورت بھی ہے۔“ مہرین نے کہا۔

☆☆☆

شیما تقریباً بیس سال کی قبول صورت اور کسی قدر موٹے نقوش والی لیکن دل کش لڑکی تھی۔ قد درمیانہ تھا۔ اس نے کال بیل بجائی تو شیراز نے دروازہ کھولا۔ شام کے چار بج رہے تھے اور وہ ابھی دفتر سے آیا تھا۔ شیما کو دیکھ کر اس کے ذہن میں جھما کا سا ہوا اور وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہ گیا۔ شیما اس کی نظروں سے گھبرائی۔ پھر اس نے کہا۔ ”سر! میں جاب کے لیے آئی ہوں۔“

”شیراز! کون آیا ہے؟“ اسی لمحے ماہا وہاں آ گئی۔ اس نے شیما کو دیکھا اور بولی۔ ”یقیناً تم شیما ہو؟“

شیما نے سکون کا سانس لیا۔ ”جی، مجھے مہرین باجی نے بھیجا ہے۔“

”آؤ اندر آؤ۔“ ماہا نے کہا تو شیراز دروازے سے ہٹ کر اندر آیا۔ ماہا شیما کو لاؤنج میں لے آئی۔ شیراز حیران تھا کہ اس لڑکی کو دیکھ کر اس کی عجیب سی کیفیت کیوں ہوئی۔ وہ لڑکیوں میں دلچسپی لینے والا آدمی نہیں تھا۔ اسے دنیا میں کوئی عورت بہ حیثیت عورت کے اچھی لگتی تھی تو وہ اس کی بیوی تھی۔ پھر یہ لڑکی چھوٹی تھی، بمشکل سے انیس بیس برس کی ہوگی۔ اسے شرمندگی ہوئی۔ وہ کتنی دیر اسے گھورتا رہا تھا۔ وہ نہ جانے کیا سوچ رہی ہو گی؟ شیراز نشست گاہ میں آ گیا۔ وہ سن رہا تھا۔ ماہا اور شیما آپس میں بات کر رہی تھیں۔ ماہا اسے معاذ کے بارے میں بتا رہی تھی۔ شیما نے بتایا کہ اسے تین سے پانچ سال تک کی عمر کے بچے سنبھالنے کا تجربہ ہے۔ آدھے گھنٹے کے انٹرویو کے بعد ماہا مطمئن ہو گئی۔ اس نے شیما کو پورا گھر دکھایا اور معاذ سے ملوایا۔ معاذ اسے دیکھ کر خوش ہوا تھا کہ وہ اس کے ساتھ رہے گی۔ اس نے شیما سے پوچھا۔

”آپ میرے ساتھ کھیلیں گی؟“

”کیوں نہیں...“ شیما نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں کھیلیں گے۔ میرے پاس گڑیا ہے، میں وہ بھی لاؤں گی۔“

شیما کی رضامندی پاکر ماہا نے اس سے تنخواہ کا پوچھا۔ اس نے چھ ہزار کہے تو ماہا مان گئی۔ طے پایا کہ وہ صبح آٹھ بجے آجائے گی اور پھر ایک بجے یا اگر کسی وجہ سے ماہا کو دیر ہو جائے تو اس کے آنے تک رکے گی۔ ماہا نے کہا۔ ''اضافی وقت اوور ٹائم میں شمار ہوگا۔ اس کی الگ سے ادائیگی ہوگی۔''

''تھینک یو۔'' شیما خوش ہو گئی۔ ''مجھے اس جاب کی ضرورت بھی تھی۔''

ماہا اسے کچن میں لے گئی اور اس کی خاطر تواضع کرنے لگی۔ شیما اسے بتا رہی تھی کہ دنیا میں اس کا سوائے ایک ماں اور چھوٹے بھائی کے کوئی نہیں تھا۔ اس کی ماں ایک بڑے گارمنٹ اسٹور میں کام کرتی تھی۔ اس کا باپ سرکاری ملازم تھا اور جب وہ بہن بھائی چھوٹے تھے تب اس کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی سے مرنے سے پہلے وہ ان کے لیے گھر کر گیا تھا۔ پھر شیما کی ماں نے ہمت کی اور ملازمت کر کے ان لوگوں کو پالا اور پڑھایا۔ شیما کی خواہش تھی کہ وہ گریجویشن کا رزلٹ آنے کے بعد کوئی جاب کرے اور ساتھ ہی آگے بھی پڑھے۔ ماہا نے اس کے خیالات کو سراہا۔ مہرین کا کہنا درست تھا، وہ بالکل پاس رہتی تھی۔ ان کی گلی سے گزرنے والی سڑک دوسرے سیکٹر تک جاتی تھی۔ اس کے آغاز میں ہی چھوٹے کوارٹرز والے حصے میں شیما کا گھر تھا۔ جب وہ جانے لگی تو نشست گاہ کے دروازے کے سامنے سے گزری اور شیراز نے اسے دیکھا تو اس کے دماغ میں پھر ویسا ہی جھماکا ہوا۔ یوں لگا جیسے ایک لمحے کو سرخ سی روشنی چمکی ہو۔ اسے باقاعدہ جھٹکا سا محسوس ہوا۔ ماہا دروازہ بند کر کے واپس آئی اور اس سے پوچھا۔

''آپ کو کیسی لگی... یہ معاذ کو سنبھال لے گی؟''

شیراز ہچکچایا۔ ''میرا خیال ہے یہ چھوٹی ہے اگر تم کوئی بڑی عمر کی عورت رکھو...''

''شیراز پلیز... اتنی مشکل سے یہ ملی ہے اور اب دو دن میں کہاں سے میں کوئی عورت تلاش کروں۔ مہرین کے توسط سے آئی ہے۔ مجھے اچھی لگی ہے۔''

''میرا اب بھی یہی خیال ہے۔ اس کام کے لیے کوئی بڑی اور ذمے دار عورت ٹھیک رہے گی۔''

اسی لمحے لاؤنج سے کسی چیز کے گرنے اور ٹوٹنے کی آواز آئی۔ وہ دونوں تیزی سے وہاں آئے تو معاذ صوفے پر ساکت بیٹھا تھا اور سامنے ریک پر رکھا گلدان نیچے گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ ماہا نے معاذ کو گود میں لے لیا۔ وہ ڈرا ہوا تھا۔ ''کچھ نہیں ہوا... کچھ نہیں ہوا۔''

''یہ کیسے گرا؟'' شیراز نے پوچھا۔

''روا نے گرایا ہے۔'' معاذ نے جواب دیا۔

ماہا نے شیراز کو گھورا۔ ''یہ ڈرا ہوا ہے، اس وقت سوال مت کرو۔''

شیراز کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے معاذ سے کہا۔ ''باہر چلیں؟''

معاذ خوش ہو گیا۔ اسے باہر جانا اچھا لگتا تھا۔ شیراز اور ماہا اسے اکیلے جانے نہیں دیتے تھے مگر معاذ اس سے کچھ خفا بھی تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں ماما کے ساتھ جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے آپ ماما کے ساتھ جائیں، میں یہ صاف کرتا ہوں۔'' شیراز بیٹھ کر گلدان کے ٹکڑے چننے لگا۔ ماہا معاذ کو لے کر باہر نکل آئی۔ باہر بہت سرد ہوا چل رہی تھی اور سڑک پر درختوں کے سوکھے پتے اڑ رہے تھے۔ صفائی کرنے والا عملہ روز کچرا لے کر جاتا تھا مگر پتے اتنے زیادہ ہوتے تھے کہ کچھ ہی دیر میں دوبارہ سڑک پر ان کا ڈھیر لگ جاتا تھا۔ معاذ پتوں کے ڈھیر پر پاؤں مارتا ہوا چلنے لگا۔ ماہا اس کے پیچھے تھی۔ کبھی کبھی اس سڑک سے تیز گاڑیاں بھی گزرتی تھیں اس لیے ماہا اور شیراز اسے اکیلے باہر جانے نہیں دیتے تھے۔ معاذ نے سڑک کراس کی اور دوسری طرف چلا گیا۔ ماہا اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اچانک معاذ بی سیون کے سامنے رکا اور اس نے ماہا سے پوچھا۔

''ماما! یہاں کون رہتا ہے؟''

''یہاں ثمینہ آنٹی رہتی ہیں۔''

اسی لمحے ثمینہ کے مکان کا دروازہ کھلا اور وہ باہر آئی۔ اس نے گرم کوٹ پہنا ہوا تھا اور لگ رہا تھا کہ وہ کہیں جا رہی ہے۔ اس نے نیچے ڈرائیو وے پر آ کر فولادی گرل والا دروازہ کھولا اور ماہا سے ہاتھ ملایا۔ ''کیسی ہو... کبھی میرے گھر آؤ۔''

''میں ٹھیک ہوں اور ضرور آؤں گی۔ میں اسکول جوائن کر رہی ہوں اس لیے آج کل کچھ سیٹنگ میں مصروف ہوں۔ آپ بھی چکر لگائیں۔ یہ محلہ ایک خاندان کی طرح ہے، کوئی تکلف نہیں کرتا ہے۔''

''میں ضرور آؤں گی۔'' ثمینہ نے کہا اور جھک کر معاذ سے ہاتھ ملایا۔ ''کیسے ہیں آپ؟''

''آئی ایم فائن۔'' معاذ نے جواب دیا۔

''آپ پڑھتے ہیں؟''

"نہیں، اب اسکول جاؤں گا۔" معاذ نے پھر اعتماد سے کہا۔ ثمینہ اسے کچھ دیر دیکھتی رہی پھر اس نے سیدھے ہوتے ہوئے ماہا سے کہا۔

"تمہارے بچے میں کچھ خاص بات ہے۔ یہ شاید اسے باپ سے ملی ہے۔ جو بات تمہارے شوہر کی آنکھوں میں ہے، وہی اس کی آنکھوں میں بھی ہے۔"

"کیسی بات؟"

"یہ بھی اچھا معمول ہے۔"

"پلیز! یہ بچہ ہے۔" ماہا نے گھبرا کر کہا۔

"بچے ہی اچھے معمول ہوتے ہیں۔ میں نے بتایا تھا کہ بچوں میں لاشعور اور تحت الشعور طاقتور ہوتا ہے اس لیے یہ آسانی سے رابطہ کر لیتے ہیں۔"

"رابطہ... لیکن کس سے؟"

"ان سے جن سے ہم بڑے رابطہ نہیں کر پاتے ہیں۔" ثمینہ نے کہا اور اپنی کار کی طرف مڑ گئی۔ دروازہ کھول کر اس نے ماہا کی طرف دیکھا۔ "اپنے بچے کا بہت خیال رکھا کرو۔"

ثمینہ نے ڈرائیو وے سے کار نکالی اور گیٹ دوبارہ بند کر کے ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتی ہوئی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ ماہا اسے جاتا دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس نے معاذ کے بارے میں ایسا کیوں کہا تھا؟

☆☆☆

ماہا کو اسکول کی اسٹاف وین لینے آئی تھی۔ شیراز اور معاذ نے اسے سیڑھیوں تک آ کر رخصت کیا۔ شیما دروازے پر کھڑی تھی۔ ماہا کے جانے کے بعد شیراز نے معاذ کو اس کے حوالے کیا اور خود اوپر آیا۔ وہ اب دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ دس بجے وہ گھر سے نکلا۔ اس نے گاڑی باہر نکالی اور ملک احمد نواز کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے غیر ارادی طور پر نظر ڈالی تو وہاں ڈرائیو وے میں شاہنواز کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات تھے اور وہ واحد کے مکان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تب اس نے راحیل کو دیکھا جو ڈرائیو وے پر واحد کی گاڑی دھو رہا تھا۔ شیراز کو خیال آیا کہ پکنک سے واپسی پر اس نے ایک بار بھی شاہنواز اور راحیل کو ساتھ ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ وہ یک قالب دو جان تھے۔ صبح سے لے کر رات تک ان کا وقت ایک ساتھ گزرتا تھا۔ اب کوئی گڑبڑ تھی۔ کچھ دیر بعد یہ خیال اس کے ذہن سے محو ہو گیا۔ اب اسے شیما کا خیال تھا۔ کیا وہ معاذ کی ٹھیک سے دیکھ بھال کر سکے گی؟

وہ شام کو آیا تو اس نے معاذ کو بہت خوش پایا۔ اس نے شیراز سے کہا۔ "پاپا! شیما آپی بہت اچھی ہے۔ ردا نے بھی اسے پسند کیا ہے۔"

شیراز کو ردا کی پروا نہیں تھی لیکن اسے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ معاذ نے شیما کو پسند کیا تھا۔ اب بھی شیراز شیما کو دیکھتا تو کبھی کبھی اس کے اندر ویسا ہی جھماکا ہوتا تھا مگر وہ اسے نظر انداز کرنے لگا تھا۔ اس نے اس جھماکے سے بچنے کے لیے یہ طریقہ نکالا کہ شیما کے سامنے کم سے کم آتا تھا۔ وہ صبح آتے ہی معاذ میں لگ جاتی تھی اور جب وہ ناشتے کے لیے اسے نیچے لاتی تو شیراز ناشتے سے فارغ ہو چکا ہوتا تھا۔ وہ اوپر چلا جاتا۔ اب شیما معاذ کو ناشتا کراتی تھی کیونکہ ماہا کو بھی تیار ہونا ہوتا۔ وہ ساڑھے آٹھ بجے چلی جاتی اور اس کے بعد شیراز دفتر جانے تک کمرے میں ہی رہتا تھا۔ جاتے ہوئے جب شیما دروازہ بند کرنے آتی، تب بھی اس کی کوشش ہوتی کہ وہ اسے نہ دیکھے۔

ماہا تین مہینے کے ٹرائل پر تھی کیونکہ اس دوران میں اسکول کا نصاب بدل چکا تھا اور اسے اس سے ہم آہنگ ہونا تھا۔ سالانہ امتحان کی کارکردگی پر اسے مستقل کرنے کا فیصلہ کیا جاتا اور اس صورت میں اس کی تنخواہ بھی بڑھ جاتی۔ اسے اعتماد تھا کہ وہ گیپ پورا کر لے گی۔ سب سے بڑھ کر اسے معاذ کا ساتھ مل جاتا، وہ اس کے ساتھ ہی آتا جاتا۔ وہ خود کو خوش قسمت سمجھ رہی تھی کہ اسے شیما مل گئی تھی۔ وہ معاذ کی بہت اچھی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اسے سکھاتی اور پڑھاتی تھی۔ اس نے معاذ کو بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ ماہا کو یقین تھا کہ اسے آسانی سے پہلی کلاس میں داخلہ مل جائے گا اور اسے پری سیکا ہز نہیں لینا پڑیں گی۔ فروری کے آخر تک سرما کی شدت کم ہو گئی اور بہار کے آثار نظر آنے لگے۔ مرجھا جانے والے درختوں اور پودوں پر نیا سبزہ نمودار ہو رہا تھا۔ محلے والوں نے مل کر آئس پارلر جانے کا پروگرام بنایا۔ کیونکہ انہیں شام کے وقت جانا تھا اس لیے ماہا نے شیما کو روک لیا۔

"تم آج شام تک رک جاؤ۔"

شیما اس سے پہلے کبھی اتنی دیر تک نہیں رکی تھی۔ ماہا نے اسے تسلی دی۔ "تم فکر مت کرو، شام کو میں اور شیراز تمہیں چھوڑ کر آئیں گے۔ تمہیں اکیلے نہیں جانا پڑے گا۔"

"تب ٹھیک ہے۔" شیما نے کہا۔ "شام کے وقت یہ سڑک بالکل سنسان ہو جاتی ہے اور جنگل سے اکیلے گزرنا پڑتا ہے۔"

چار بجے محلے والے گھروں سے نکل آئے اور ٹولیوں

کی صورت میں آئس کریم پارلر کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہاں بہت اچھی کوالٹی کی آئس کریم ہر فلیور میں ملتی تھی۔ پارلر سیکٹر کی مرکزی مارکیٹ میں تھا اور پیدل کا راستہ تھا۔ شیراز اور ماہا کے جانے کے بعد شیما نے دروازہ اندر سے بند کیا اور لاؤنج میں صوفے پر آ گئی۔ معاذ اوپر اپنے کمرے میں اپنے کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ شیما کو بعض اوقات اس کا رویہ عجیب لگتا تھا، جب وہ کسی خیالی چیز سے بات کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہستی سچ مچ موجود ہے۔ شیما جب اس کے ساتھ اکیلی ہوتی اور معاذ خیالی ہستی سے بات کرتا تو اسے خوف محسوس ہوتا۔ اس لیے وہ کبھی کبھی اسے ٹوک دیتی تھی تو وہ چپ ہو جاتا تھا۔ وقت گزاری کے لیے شیما نے ایک رسالہ اٹھا لیا۔ اچانک اسے اوپر سے معاذ کے ہنسنے کی آواز آئی۔ اس نے نظر انداز کیا مگر جب دوبارہ آواز آئی تو وہ اٹھ کر اوپر آئی۔ اس نے معاذ کے کمرے میں جھانکا تو وہاں خلافِ توقع تاریکی تھی۔ باہر سے آتی روشنی میں معاذ کا بیڈ نمایاں تھا اور وہ اکیلا بیٹھا تھا۔ شیما نے پوچھا۔

"آپ ہنس رہے تھے؟"

"ہاں۔" اس نے سر ہلایا۔

"کیوں؟"

"ردا کی بات پر۔"

شیما بری طرح چونکی۔ "کیا... کیا... کس کی بات پر؟"

"ردا کی بات پر۔" معاذ نے بالکل واضح کہا اور اس بار شک کی گنجائش نہیں تھی۔

"تم... ردا سے بات کرتے ہو؟" شیما کی آواز لرز رہی تھی۔

معاذ نے سر ہلایا۔ "ہر روز... ہر وقت۔"

"کہاں کرتے ہو؟"

"یہاں... اپنے گھر میں... ہر جگہ۔"

شیما اندر آئی۔ "تم اب بھی ردا سے بات کر رہے تھے؟"

"ہاں، وہ یہاں موجود ہے۔"

شیما نے جھپٹ کر معاذ کو گود میں لیا اور چلا کر بولی۔ "تم سچ کہہ رہے ہو، وہ یہاں ہوتی ہے؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" معاذ کسمسایا۔ چند لمحے بعد وہ معاذ کو گود میں لیے تیزی سے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔

☆☆☆

شیراز، واحد اور تنویر کے ساتھ چل رہا تھا۔ آج احمد نواز ذرا پیچھے تھا اور وہ اکیلا کسی سوچ میں گم چل رہا تھا۔ واحد حسبِ معمول اپنے محلے کی تعریفوں میں لگا ہوا تھا۔ "کیا اس شہر یا اس پورے ملک میں کوئی ایسا محلہ ہو گا جہاں رہنے والے ہماری طرح ہوں۔ ایک ایک آدمی جیسے چنا ہوا ہو۔"

"اب ایسا بھی نہیں ہے۔" شیراز بولا۔ "اچھے بُرے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔"

"یہاں نہیں ہیں۔" واحد نے یقین سے کہا۔ "یہ میرا یقین ہی نہیں، میرا ایمان بھی ہے۔"

تنویر ہنسا۔ "واحد بھائی نے تو اسے اپنے ایمان کا حصہ بنا لیا۔"

وہ گلی والی سڑک سے نکلے اور سیکٹر کی بڑی سڑک پر آئے۔ یہاں گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ اچانک شیراز کو لگا جیسے اس کے سر میں وہی سرخ جھماکا ہوا ہو جو شیما کو دیکھنے سے ہوتا تھا۔ اس نے سر جھٹکا۔ اس کی کیفیت سے بے خبر واحد اور تنویر آپس میں بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ آگے خواتین کا گروہ تھا جس میں محلے کی تقریباً تمام ہی عورتیں شامل تھیں۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی ٹولیاں الگ تھیں۔ شیراز سوچ رہا تھا کہ ابھی شیما سامنے نہیں تھی پھر ایسا کیوں ہوا؟ اسی لمحے پھر جھماکا ہوا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ جھماکا اتنا تیز تھا کہ ایک لمحے کے لیے آس پاس کا سارا منظر بھی سرخ ہو گیا۔ وہ آئس کریم پارلر کے پاس پہنچ گئے۔ خواتین اندر جا چکی تھیں۔ شیراز نے پارلر میں قدم رکھا تھا کہ تیسری بار جھماکا ہوا۔ اچانک اسے کوئی خیال آیا اور وہ تیزی سے پلٹ کر بھاگا۔ واحد نے اسے آواز دی تو اندر موجود ماہا نے بھی دیکھا اور وہ پریشان ہو کر باہر آئی۔ دوسرے بھی ان کے پیچھے آنے لگے۔ شیراز اب بھاگ نہیں رہا تھا مگر تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ اس نے دوسروں کی آوازوں کا جواب نہیں دیا۔ مگر پھر پیچھے آتی ماہا نے آواز دی۔ "شیراز رکو... کیا ہوا ہے؟"

"معاذ۔" شیراز رکے بغیر بولا۔ معاذ کے نام نے ماہا کا دل بھی دھڑکا دیا۔ سست روی سے یہ فاصلہ دس منٹ میں طے ہوتا تھا۔ شیراز نے موبائل نکالا اور گھر کا نمبر ملایا۔ شیما کا موبائل نمبر ماہا کے پاس تھا مگر وہ اپنا موبائل گھر چھوڑ کر آئی تھی۔ بیل جا رہی تھی اور کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ ایک بار بیل بند ہوئی تو شیراز نے پھر نمبر ملایا اور اس وقت تک ملاتا رہا جب تک وہ گلی میں داخل نہیں ہو گیا۔ پھر اس نے موبائل رکھا اور تقریباً اڑتا ہوا گھر تک پہنچا۔ دو جستوں میں اس نے سیڑھیاں چڑھیں اور کھلے داخلی دروازے سے اندر آیا۔

اس نے چلا کر معاذ کو آواز دی۔ کوئی جواب نہیں ملا تو وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ چند منٹ میں اس نے سارا مکان دیکھ لیا۔ معاذ اور شیما کہیں نہیں تھے۔ وہ باہر نکلا تو اسی لمحے ماہا آ گئی۔ اس کے پیچھے دوسرے لوگ بھی تھے۔ ماہا نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ وہ پاگلوں کی طرح چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“

”معاذ اور شیما اندر نہیں ہیں۔“

واحد نے نزدیک آنے پر سن لیا تھا۔ اس نے دوسروں سے کہا۔ ”آس پاس دیکھو... اپنے گھروں میں بھی دیکھو۔“

سب اپنے اپنے گھروں کی طرف گئے۔ واحد نہیں گیا کیونکہ اس کے گھر میں کوئی نہیں تھا اور وہ مکان لاک کر کے نکلا تھا۔ جن کے گھروں میں کوئی تھا، وہ دیکھ رہے تھے۔ شیراز گلی کے جنگل والے سرے تک آیا۔ دور تک سڑک صاف تھی۔ شیراز نے سڑک کے دائیں طرف موجود جنگل میں دیکھا تو اس کے ذہن میں پھر ویسا ہی جھماکا ہوا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور درختوں میں داخل ہو گیا۔ ماہا اس کے پیچھے تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”یہاں کیوں جا رہے ہو؟“

”معاذ اور شیما یہیں ہیں۔“

درختوں کے بیچ میں راستے نہیں تھے اور عشروں سے جمع ہونے والے گلے سڑے پتوں کا ایک ڈھیر تھا جس نے اسفنج جیسی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس سے عجیب سی بو اٹھ رہی تھی اور وہ اس پر پاؤں رکھتے تو یہ دبتا تھا۔ اس پر چلنا آسان نہیں تھا مگر اس وقت دونوں میاں بیوی کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ معاذ تک پہنچنے کے لیے انہیں پل صراط پر چلنا پڑتا تو وہ اس کے لیے بھی راضی تھے۔ کسی نہ کسی طرح وہ گرتے پڑتے جنگل پار کر کے دوسری طرف موجود سیکٹر کے کمرشل ایریا کے پاس پہنچے۔ یہاں گہما گہمی تھی۔ لوگ اور گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ شیراز چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ماہا روہانسی ہو رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”معاذ کہاں ہے... مجھے میرا بچہ چاہیے۔“

شیراز نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ اس کی نظریں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ پھر اس نے سڑک پار ایک بڑے گارمنٹ اسٹور کی طرف دیکھا تو اس کے اندر سرخ جھماکا ہوا۔ وہ تیزی سے سڑک عبور کرنے لگا۔ ایک کار کا ہارن چلایا اور وہ شیراز سے چند انچ کے فاصلے پر رکی۔ ماہا کی بھی چیخ نکل گئی مگر شیراز کو کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ وہ رکے بغیر تیزی سے سڑک عبور کر کے گارمنٹ اسٹور میں داخل ہوا۔ یہ خاصا بڑا اسٹور تھا جس میں ریڈی میڈ گارمنٹس کا مکمل کلیکشن تھا۔ یہاں شعبے بنے ہوئے تھے۔ مردانہ، زنانہ اور بچکانا گارمنٹس کے الگ الگ شعبے تھے۔ جگہ جگہ ریلنگ پر ملبوسات ہینگ تھے۔ اسٹور میں خاصے لوگ تھے۔ ان کے درمیان کسی کو تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ شیراز چاروں طرف دیکھ رہا تھا پھر اسے کچھ دور کسی کی جھلک دکھائی دی۔ وہ آگے بڑھا۔ ماہا بھی اندر آ گئی۔ وہ شیراز کے پیچھے لپکی۔

شیما نے سر پر گہرے سبز رنگ کا بینڈ لگا رکھا تھا اور شیراز کو اسی کی جھلک دکھائی دی تھی۔ وہ لوگوں کے درمیان سے گزرتا اور راستے کے لیے اپیل اور معذرت کرتا ہوا کئی ریلنگ پار کر کے دوسری طرف پہنچا تو اسے شیما گود میں معاذ کو لیے نظر آ گئی۔ وہ اس کی طرف لپکا اور شیما اسے دیکھ کر اسٹور کے ملازمین کا یونیفارم پہنی ایک ادھیڑ عمر عورت کے پیچھے ہو گئی۔ مگر شیراز نے اس کی پروا کیے بغیر شیما سے معاذ کو چھین لیا۔ اسٹور میں خاصے لوگ تھے۔ اس بھاگ دوڑ اور پھر شیراز کی حرکت نے سب کی توجہ حاصل کر لی تھی۔ سیلز مین شیراز کی طرف بڑھے۔ ایک نے سخت لہجے میں کہا۔ ”یہ کیا حرکت ہے؟ آپ نے بچہ کیوں چھینا ہے؟“

”کیونکہ یہ ہمارا بچہ ہے۔“ ماہا نے کہا۔ وہ وہاں آ گئی تھی۔ اس نے غصے سے شیما کو دیکھا۔ ”میں نے تم پر اعتماد کیا اور تم نے میرا بچہ اغوا کر لیا۔“

”یہ کیا بکواس ہے؟“ ادھیڑ عمر عورت بولی۔ ”شیما ایسا نہیں کر سکتی۔“

”تم کون ہو؟“

”میں شیما کی ماں ہوں۔“ عورت نے کہا پھر اس نے شیما کی طرف دیکھا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہے؟“

شیما جذباتی ہو رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”ہاں، میں معاذ کو لائی ہوں۔“

”دیکھا، اس نے میرے بچے کو اغوا کرنے کا اقرار کیا ہے۔“ ماہا بلند آواز سے بولی۔ ”میں اسے پولیس کے حوالے کروں گی۔“

”کر دو... لیکن اس سے پوچھو... یہ ردا کو دیکھتا ہے... اس سے باتیں کرتا ہے... اسے ردا نظر آتی ہے...“ شیما بول رہی تھی اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی ماں کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اس نے کہا۔

”شیما! کیا کہہ رہی ہے؟“

”میں سچ کہہ رہی ہوں، پوچھو اس سے۔“ شیما

چلائی۔

شیراز خاموش تھا۔ اس نے معاذ کو سینے سے لگایا ہوا تھا۔ ماہا کنفیوز ہو گئی۔ اس نے شیما کی ماں سے پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہے... کس ردا کی بات کر رہی ہے؟“

”ردا میری بڑی بیٹی تھی۔ وہ تین سال پہلے کوچنگ سینٹر سے آتے ہوئے غائب ہو گئی اور آج تک نہیں ملی۔“ شیما کی ماں نے کہا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”ماہا! واپس چلو۔“ شیراز نے کہا۔ شیما کی ماں کی بات سن کر اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا اور وہ فوراً یہاں سے چلا جانا چاہتا تھا۔

”لیکن اس نے جو کیا ہے؟“ ماہا نے شیما کی طرف دیکھا۔

”چھوڑو اسے... واپس چلو۔“

”ایک منٹ... آپ کے پاس تین ہزار روپے ہیں؟“ ماہا نے پوچھا تو شیراز نے نہ سمجھنے کے انداز میں اپنا پرس اس کے حوالے کر دیا۔ ماہا نے اس میں سے تین ہزار روپے نکال کر شیما کی طرف پھینکے۔ ”یہ تمہارے حساب سے زیادہ ہے۔ آئندہ میرے گھر کے سامنے بھی نظر مت آنا۔“

شیما اور اس کی ماں ساکت کھڑے تھے، انہوں نے نوٹوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر شیما نے کہا۔ ”آپ یہ رقم اٹھا لیں، مجھے نہیں چاہیے۔“

شیراز کو ماہا کا رویہ اچھا نہیں لگا تھا، یہ اخلاق کے خلاف تھا۔ اس نے فرش پر پڑے نوٹ اٹھائے اور انہیں شیما کی طرف بڑھایا۔ ”یہ تمہاری تنخواہ ہے، تمہارا حق ہے۔“ اس نے اصرار سے کہا تو اس بار شیما نے رقم لے لی۔ پھر دونوں میاں بیوی معاذ کو لے کر وہاں سے چلے گئے۔

اگلے دن شام کے وقت ہلکی بارش کے بعد آسمان صاف ہو گیا تھا اور محلے والے دھلے ماحول کو انجوائے کرنے کے لیے باہر نکل آئے تھے۔ ایک طرف مرد جمع تھے۔ شیراز ان کے پاس آیا۔ گزشتہ دن کا واقعہ تقریباً سب کے علم میں آ گیا تھا۔ معاذ کی بہ حفاظت واپسی پر سب نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ جب شیراز اور ماہا واپس آئے تو محلے والے آس پاس کا سارا علاقہ چھان کر اب سیکٹر کی طرف جا رہے تھے کہ شاید بچہ غلطی سے ان کے پیچھے نہ آ گیا ہو۔ احمد نواز نے شیراز کی طرف دیکھا۔ ”یہ تم لوگوں نے اچھا کیا کہ اس کے خلاف قانونی کارروائی نہیں کی۔“

”اس نے غلطی کی لیکن یہ جرم نہیں تھا۔“ شیراز نے کہا پھر ہچکچا کر پوچھا۔ ”کیا آپ کو اس کی گم شدہ بہن کا کیس یاد ہے؟“

احمد نواز نے شانے اچکائے۔ ”ہاں، کچھ یاد ہے۔ اصل میں یہ اسی علاقے کے پولیس اسٹیشن کے بارے میں تھا۔ تم جانتے ہو میری ڈیوٹی ہیڈ آفس میں ہے۔ اس لیے بس اتنا پتا ہے جتنا دوسروں کو علم ہے۔ لڑکی انٹر کی طالبہ تھی اور کوچنگ سینٹر سے واپس آتے ہوئے غائب ہوئی تھی۔ پولیس نے کئی مہینے تک اس کیس پر کام کیا لیکن کوئی سرا نہیں ملا اس لیے کام بند کر دیا۔ ممکنہ طور پر لڑکی اغوا کر لی گئی اور پھر ماری دی گئی۔ اس کی لاش بھی کہیں چھپا دی گئی تھی۔ لڑکیوں کا اغوا یا گم شدگی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس جیسے محفوظ شہر میں بھی ہر سال سو سے زیادہ لڑکیاں غائب ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے کم سے کم بیس ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتی ہیں۔ ردا بھی ان میں سے ایک ہے۔“

شیراز نے سوچا... تب وہ معاذ کو کیوں نظر آتی تھی؟ پھر وہ چونک گیا۔ اسے اپنے خیال پر تعجب ہوا۔ وہ معاذ کے خیال کو سچ سمجھ رہا تھا؟

☆☆☆

اس رات وہ لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ان کے موڈ بحال ہونے لگے تھے اور وہ ہلکی پھلکی گفتگو کر رہے تھے۔ البتہ معاذ کو جیسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ آتے ہی اپنے کھلونوں میں مگن ہو گیا تھا۔ شیراز نے اس سے پوچھا۔ ”آپ نے شیما سے کیا کہا تھا؟“

”وہ بکواس کرتی ہے۔“ ماہا بولی۔

”ممکن ہے لیکن وہ اس بارے میں جھوٹ تو نہیں بول سکتی۔ یقیناً اس کی بہن کا نام ردا ہے اور وہ تین سال پہلے... پُراسرار طور پر غائب ہو گئی تھی۔“

”اگر ایسا ہے تو اس کا معاذ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اس نے ایک فرضی کردار بنایا ہوا ہے اور اس کا نام ردا رکھا ہے۔“ ماہا کا لہجہ تیز ہو گیا۔ ”صرف ایک نام سن کر اس نے اتنا بڑا قدم اٹھایا۔ آپ کو اس سے پوچھنا چاہیے تھا کہ اس نے ہمارے بچے کو یوں لے جانے کی ہمت کیسے کی؟“

شیراز نے ایک بار پھر معاذ سے پوچھا۔ ”آپ نے کیا کہا تھا؟... شیما آپ کو کیوں لے گئی تھی؟“

”پلیز شیراز...“ ماہا نے کہنا چاہا۔

”مجھے بات کرنے دو۔“ شیراز کا لہجہ تیز ہو گیا۔

”مجھ سے بات کرو۔“ اچانک معاذ نے کہا تو اس کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ یہ گونجتی ہوئی اور بھاری آواز تھی جو

معاذ نے اس سے پہلے کبھی نہیں نکالی تھی اور نہ آواز کو بچکانا کہا جا سکتا تھا۔ وہ دونوں چونک گئے۔ شیراز بے تاب ہوکر معاذ کے پاس آیا۔

"کیا... کیا کہا تم نے۔"

لیکن اتنی دیر میں معاذ پھر سے اپنے کھلونوں میں مگن ہوگیا تھا۔ شیراز نے اس کا بازو پکڑا۔ "معاذ! میں کیا کہہ رہا ہوں؟" اس کے لہجے میں سختی تھی۔ ماہا آگے آئی اور اس نے معاذ کو گود میں لے لیا۔

"لگتا ہے تم ہوش میں نہیں ہو... یہ بچہ ہے۔ تم اس سے کیا کہلوانا چاہتے ہو؟"

"میں اس سے پوچھ رہا ہوں۔ تم نے اس کی آواز سنی تھی؟"

"میں نے کچھ نہیں سنا اور میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔" ماہا معاذ کو لے کر اوپر آگئی۔ شیراز اس کے پیچھے آرہا تھا اور وہ مسلسل بول رہا تھا۔

"تم مجھے اس سے بات کرنے دو... ماہا! یہ میرا بیٹا ہے... تم یوں درمیان میں نہیں آسکتیں... پلیز! مجھے بات کرنے دو۔"

ماہا نے معاذ کو اس کے بیڈ پر بٹھایا اور جارحانہ انداز میں بولی۔ "نہیں، میرا نہیں خیال..."

"تم اپنا خیال اپنے پاس رکھو۔" شیراز نے اسے ایک طرف دھکیل دیا اور معاذ کے سامنے بیٹھ گیا۔ "معاذ بولو بیٹا... تم نے کیا کہا تھا... تم نے ایسی آواز کیوں نکالی؟"

"شیراز! چھوڑ دو اسے۔" ماہا پھر آگے آئی۔

"مجھے میرے بیٹے سے بات کرنے دو۔" شیراز پلٹ کر دہاڑا۔

"پاپا۔" معاذ اچانک زور سے بولا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "میں نے اس لیے کہا تھا کہ آپ ماما سے لڑ رہے تھے۔"

معاذ نے کہا اور کروٹ لے کر لیٹ گیا مگر اس کا ہلتا ہوا جسم بتا رہا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔ ماہا وہاں سے جا چکی تھی۔

☆☆☆

شیراز کی آنکھ کھلی تو وہ لاؤنج میں صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے ایک ہلکا کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ رات ماہا سے جھگڑے کے بعد وہ نیچے آگیا تھا اور یہیں صوفے پر سو گیا تھا۔ صبح کے نو بج رہے تھے اور ماہا یقیناً جا چکی تھی۔ اس نے اٹھ کر اپنا سلیپر دیکھا۔ ایک سلیپر صوفے کے ساتھ تھا مگر دوسرا غائب تھا۔ اس نے اٹھ کر آس پاس دیکھا۔ پھر میز کے دوسری طرف صوفے تلے جھانکا تو سلیپر وہاں نظر آگیا۔ اس نے سلیپر نکال کر پہنا اور اوپر آیا۔ واش روم سے فارغ ہوکر وہ کمرے میں آیا تو ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر نوٹ پیڈ کا کاغذ لگا ہوا تھا۔ اس پر ماہا کی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا۔ "میں معاذ کو ساتھ لے جا رہی ہوں۔ ناشتا تیار کر کے رکھ دیا ہے۔ چائے بنا لینا۔"

ماہا معاذ کو اپنے ساتھ اسکول لے گئی تھی۔ اس نے جاتے ہوئے شیراز کو بتایا بھی نہیں تھا۔ یہ ناراضگی کا اظہار تھا۔ شیراز کا دفتر جانے کا موڈ نہیں تھا۔ کوئی خاص کام یا اپائنٹ منٹ بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنے اسسٹنٹ کو کال کر کے بتا دیا کہ آج وہ دفتر نہیں آئے گا اس لیے وہ کام دیکھ لے اور کوئی مشکل ہو تو اسے کال کر لے۔ شیراز نیچے آیا اور سیڑھیوں سے اترتے ہی ٹھٹک گیا۔ لاؤنج میں واحد کھڑا تھا اور اس کا چہرہ عجیب سا ہو رہا تھا۔ اس نے ٹوٹے لہجے میں کہا۔ "شیراز! میں تباہ ہوگیا..."

"واحد! کیا ہوا ہے؟" وہ اس کی طرف بڑھا مگر وہ اس کی طرف توجہ دیے بغیر دروازے سے باہر چلا گیا۔ شیراز اس کے پیچھے آیا تو وہ سیڑھیوں پر سر تھامے بیٹھا تھا۔ شیراز اس کے پاس بیٹھا تو وہ بولا۔ "یہ محلہ جسے میں مثالی سمجھتا تھا... یہاں یہ سب ہوتا رہا... میرے خدا..." اس نے ہاتھوں سے منہ چھپا لیا تھا۔

شیراز کی سمجھ میں نہیں آیا کہ واحد ایسا کیوں کہہ رہا تھا۔ اسے صبح صبح کس مسئلے کا سامنا کرنا پڑا تھا جو وہ یوں ٹوٹا ہوا نظر آرہا تھا۔ شیراز سیڑھیاں اتر کر ڈرائیو وے میں آیا اور اس نے پلٹ کر واحد کی طرف دیکھا تو اسے جھٹکا لگا۔ سیڑھیاں خالی تھیں۔ واحد وہاں نہیں تھا۔ اسے نیچے اترنے اور پلٹنے میں صرف دو سیکنڈ لگے تھے۔ واحد اتنی جلدی کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ اسی لمحے گھنٹی کی آواز آئی۔ شیراز گیٹ سے باہر آیا۔ سامنے فٹ پاتھ پر علاقے کا پوسٹ مین چلا آرہا تھا۔ جب وہ کسی کے لیٹر بکس میں کچھ ڈالتا تو ساتھ سائیکل کی گھنٹی بھی بجاتا تھا۔ شیراز واحد کے گھر کی طرف بڑھا۔ اس وقت پوسٹ مین اس کے گیٹ کے ساتھ لگے لیٹر بکس میں ایک لفافہ ڈال رہا تھا پھر وہ احمد نواز کے گھر کی طرف بڑھا۔ واحد کے مکان کا گیٹ کھلا ہوا تھا اور اس کی کار اندر نہیں تھی۔ شیراز سیڑھیاں چڑھ کر داخلی دروازے تک آیا۔ وہ واحد سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی تو وہ بھی کھلا ہوا ملا۔ شیراز ہچکچاہٹ کے ساتھ اندر آیا تو اسے لاؤنج میں راحیل نظر آیا۔ شیراز نے اس سے پوچھا۔

"واحد کہاں ہے؟"

"ڈیڈی۔" وہ عجیب سے انداز میں بولا۔ "پتا نہیں... پر میں جانے والا ہوں۔"

"کہاں؟"

"کیا آپ بھی چلیں گے؟" راحیل نے کہا اور ہاتھ آگے کیا جس میں پستول دبا ہوا تھا۔ اس نے پستول شیراز کی طرف اٹھایا۔ شیراز پہچان گیا، یہ واحد کا پستول تھا۔ وہ خوف زدہ ہوکر پیچھے ہوا اور چلایا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟"

"میں جا رہا ہوں۔" راحیل نے کہا اور اچانک پستول اپنے سر پر رکھ کر گولی چلا دی۔

"نہیں۔" دھماکے کے ساتھ شیراز چلایا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ اس پر ہلکا کمبل پڑا ہوا تھا۔ شیراز نے سکون کا سانس لیا۔ تو یہ خواب تھا۔ اس نے سوچا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی نظر وال کلاک پر گئی۔ صبح کے نو بج رہے تھے۔ پھر اس نے سلیپر کے لیے نیچے دیکھا تو اسے ایک ہی نظر آیا۔ وہ ٹھٹکا پھر اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ اٹھ کر دوسرے صوفے کے نیچے جھانکا۔ وہ خود سے کہہ رہا تھا کہ سلیپر نہیں ہوگا مگر سلیپر وہاں موجود تھا۔ اس نے سلیپر نکالا اور خود کو تسلی دی کہ یہ اتفاق ہے۔ وہ اوپر آیا اور واش روم جانے کے بجائے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے بے اختیار ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے کی طرف دیکھا۔ اس پر نوٹ پیڈ کا کاغذ دیکھ کر اس کا دل دھڑکا۔ وہ تیزی سے پاس آیا اور کاغذ کھینچ کر دیکھا۔ اس پر لکھا تھا۔ "میں معاذ کو لے جا رہی ہوں۔ ناشتا تیار کر کے رکھ دیا ہے۔ چائے بنا لینا۔"

"نہیں... نہیں۔" اس نے خود سے کہا۔ "یہ اتفاق ہے۔ میں نے خواب ہی دیکھا تھا۔"

مگر وہ واش روم جانے کے بجائے تیزی سے نیچے آیا اور لاؤنج میں جھانکا۔ واحد وہاں نہیں تھا۔ اس نے اطمینان کا طویل سانس لیا۔ اس نے خواب ہی دیکھا تھا۔ باقی سب اتفاق تھا۔ اسی لمحے اسے باہر سے پوسٹ مین کی سائیکل کی گھنٹی سنائی دی۔ وہ دروازہ کھول کر برآمدے میں آیا۔ اس نے دیکھا پوسٹ مین اسی طرف آرہا تھا۔ شیراز باہر نکل آیا۔ وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ خواب ہی تھا۔ پھر بھی وہ واحد کے مکان کی طرف بڑھا۔ پوسٹ مین اس کے پاس سے گزر کر احمد نواز کے مکان کے پاس پہنچا۔ اچانک ہی فائر کی دبی دبی آواز آئی اور شیراز بھاگا۔ اس نے یہ فاصلہ لمحوں میں طے کیا اور داخلی دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کھلا ہوگا مگر وہ اندر سے بند تھا۔ اس نے بیل بجائی اور چلّایا۔ "واحد! دروازہ کھولو۔"

اسی لمحے اندر سے سارہ کے چلّانے کی آواز آئی۔ شیراز مسلسل کال بیل بجانے لگا۔ سارہ نے دروازہ کھولا تو وہ شاک میں تھی اور اس کا ہاتھ ایک طرف اٹھا ہوا تھا۔ لاؤنج میں فرش پر راحیل پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا اور اس کے سر کے پاس خون پھیل رہا تھا۔ شیراز نے اندر جاتے ہوئے جھپٹ کر فون اٹھایا پھر وہ سارہ کو اٹھا کر نشست گاہ میں لے گیا۔ وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ ایمبولینس اور واحد ساتھ ساتھ پہنچے تھے۔ جس وقت طبی عملہ راحیل کو ایمبولینس میں منتقل کر رہا تھا، واحد اور سارہ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ راحیل زندہ تھا مگر اس کی حالت بہت خراب تھی۔ واحد کے مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا شیراز سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس نے پہلے سے سب کیسے جان لیا تھا؟ ایمبولینس چلی گئی۔ شیراز نے اٹھ کر واحد کو سینے سے لگا لیا۔ وہ اس سے لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے کہا۔ "میرے خدا... راحیل... ہمارے پاس بس وہی ہے۔"

"حوصلہ کرو، وہ ٹھیک ہو جائے گا۔" شیراز نے کہا۔ "میں گاڑی لا رہا ہوں، ہم اسپتال چلتے ہیں۔"

شیراز شام تک واحد اور سارہ کے ساتھ اسپتال میں رہا۔ اس نے وہیں سے کال کر کے ماہا کو بتا دیا تھا۔ ڈاکٹرز کے مطابق راحیل کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ گولی نے عقبی دماغ کو نقصان پہنچایا تھا اور اس وقت وہ کومے میں تھا۔ اس کی دل کی دھڑکن اور سانس مشینوں کی مدد سے چلائی جا رہی تھی۔ دوسرے لفظوں میں اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ راحیل کو دیکھنے والے ڈاکٹر نے صاف گوئی سے کہا۔ "ایسی صورت میں آدمی کے بچنے کا امکان بہت کم ہوتا ہے، مشکل سے پانچ فیصد... بہر حال ہم دیکھیں گے۔ ایسی کنڈیشن میں بعض اوقات مریض معجزانہ طور پر ہوش میں آجاتے ہیں۔"

یہ جان کر واحد اور سارہ کی حالت مزید خراب ہوگئی۔ ان کو بالکل علم نہیں تھا کہ راحیل نے یہ حرکت کیوں کی۔ وہ کچھ عرصے سے خاموش سا رہنے لگا تھا۔ یونیورسٹی سے آکر گھر میں رہتا تھا۔ اس نے باہر جانا اور دوستوں سے ملنا ترک کر دیا تھا۔ گھر میں بھی وہ زیادہ تر کمرے میں محدود

رہتا تھا۔ مگر یہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح خودکشی کی کوشش کرے گا۔ واحد کا پستول اس کے کمرے میں اس کی الماری کے لاکر میں ہوتا تھا۔ وہ اسلحہ کھلا چھوڑنے کا قائل نہیں تھا۔ نہ جانے کیسے راحیل نے لاکر تک رسائی حاصل کی اور پستول نکال لیا۔ شیراز بہ مشکل انہیں گھر آنے پر راضی کر سکا ورنہ وہ اسپتال سے آنے کو تیار نہیں تھے۔ راحیل انتہائی نگہداشت کے شعبے میں تھا اور وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔

ماہا اس کی منتظر تھی۔ شیراز تھکا ہوا تھا۔ اس نے سارے دن صرف چائے اور پانی پر گزارہ کیا تھا اس لیے وہ کھانا کھا کر سو گیا۔ ماہا، سارہ اور واحد سے ملنے اور افسوس کرنے گئی تھی۔ وہ کچھ دیر میں واپس آ گئی۔ اگلی صبح ناشتے پر شیراز نے اسے تفصیل سے بتایا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ماہا کو اپنے خواب کا بتائے یا نہ بتائے۔ پھر اس نے خاموش رہنے کا فیصلہ کیا۔ ماہا نے بتایا کہ اسکول میں معاذ کو فی الحال پری پ ٹو میں بٹھایا جا رہا ہے۔ دو ہفتے بعد داخلے شروع ہو جاتے تو وہ باقاعدگی سے اسکول جانے لگتا۔ اس معاملے میں ماہا کو کوئی مشکل نہیں ہوئی تھی۔ اسکول انتظامیہ اس سے تعاون کر رہی تھی۔ ناشتے کے بعد اس نے معاذ کو تیار کیا اور وین کے ہارن پر وہ اسے لے کر روانہ ہو گئی۔ شیراز اسے دروازے تک چھوڑنے آیا تھا۔ ان کے جاتے ہی وہ کپڑے بدل کر باہر آیا۔ پہلے اس نے واحد کا معلوم کیا۔ وہ صبح سویرے ہی اسپتال چلا گیا تھا البتہ سارہ گھر میں تھی۔ شیراز اسپتال پہنچا۔ راستے میں اس نے دفتر کال کر کے آج بھی نہ آنے کی اطلاع دے دی تھی۔

واحد ستے ہوئے چہرے کے ساتھ اسپتال کے ویٹنگ روم میں بیٹھا تھا۔ شیراز اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد واحد نے بتایا کہ راحیل کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اس صورت میں وہ آدمی کو دو ہفتے سے زیادہ وینٹی لیٹر پر نہیں رکھتے ہیں۔ اگر راحیل کو دو ہفتے ہوش نہیں آیا تو وہ اسے وینٹی لیٹر سے ہٹانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ واحد نے بتایا کہ اس نے ایک بڑے نیورو سرجن سے رابطہ کیا تھا۔ وہ آج شام راحیل کو دیکھے گا۔ واحد کو امید تھی کہ شاید وہ راحیل کے لیے کچھ کر سکے۔ شیراز کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا پھر وہ وہاں سے نکل آیا۔ اس نے واحد سے یہی کہا تھا کہ اسے دفتر میں ضروری کام ہے لیکن اس کا رخ دفتر کی طرف نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی کار گارمنٹ اسٹور کے سامنے رکی۔ اسٹور صبح دس بجے کھل جاتا تھا مگر گاہکوں کی آمد و رفت بارہ بجے تک شروع ہوتی تھی۔ شیراز اندر آیا تو کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ اسٹور کے ملازمین اسے عام گاہک سمجھے۔ شیراز اس حصے کی طرف بڑھا جہاں شیما اپنی ماں کے ساتھ موجود تھی۔ شیما کی ماں وہاں ریلنگ پر کپڑے ہینگ کر رہی تھی۔ شیراز نزدیک آیا تو وہ اسے دیکھ کر چونکی۔

”تم...“

”میں اس دن کے حوالے سے معذرت کرنے آیا ہوں۔“ شیراز نے آہستہ سے کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ غلطی شیما کی تھی۔“ عورت نے نرمی سے کہا۔ ”میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ بات پولیس تک نہیں لے کر گئے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ شیراز نے کہا پھر ہچکچا کر پوچھا۔ ”کیا میں ردا کے بارے میں پوچھ سکتا ہوں؟“

”کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

”اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

”کاش کہ ہمیں معلوم ہوتا۔“ عورت نے سرد آہ بھری۔ ”وہ کالج میں سیکنڈ ایئر میں پڑھ رہی تھی اور شام کے وقت کوچنگ کی کلاسز لیتی تھی۔ ایک شام وہ کوچنگ سے گھر آنے کے لیے نکلی مگر کبھی گھر نہیں پہنچی۔ پولیس نے کوشش کی۔ ہم پاگلوں کی طرح اسے تلاش کرتے رہے لیکن وہ نہیں ملی۔“ اس کا لہجہ نم تھا۔

”میرا بیٹا معاذ اکلوتا ہے۔ آپ سمجھتی ہیں اکیلے بچے کوئی خیالی دوست بنا لیتے ہیں اور ان سے باتیں کرتے ہیں۔ معاذ نے بھی ایسا ہی ایک دوست بنایا ہوا ہے۔ وہ اسے ردا کہتا ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ صرف اتفاق ہے۔ اس کا آپ کی گم شدہ بیٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”میں سمجھتی ہوں۔“ عورت نے سر ہلایا۔ ”میں پہلے ہی تسلیم کر چکی ہوں کہ بچے کو یوں اٹھا کر لانا شیما کی جذباتی غلطی تھی۔ وہ اپنی گم شدہ بہن سے بہت محبت کرتی ہے اسی لیے بچے کے منہ سے اس کا نام سن کر جذباتی ہو گئی۔“

”میں ایک بار پھر معذرت کرتا ہوں۔“ شیراز نے کہا اور اسٹور سے نکل آیا مگر وہ گھر جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی یہ اتفاق تھا کہ معاذ بھی اس خیالی ہستی کا نام ردا لے رہا تھا؟ وہ گھر پہنچا تو اسی وقت ماہا معاذ کو لے کر وین سے اتر رہی تھی۔ اس نے حیرت سے شیراز کو دیکھا۔

”تم دفتر نہیں گئے؟“

”نہیں، میرا موڈ نہیں تھا اور پھر میں اسپتال گیا تھا۔“ شیراز نے کہا۔ وہ سیڑھیوں سے اوپر آئے۔ ماہا نے داخلی دروازے کا لاک کھولا۔

”راحیل کی حالت کیسی ہے؟“

”تقریباً ویسی ہی ہے۔ آج ایک بڑا نیورو سرجن اس کا معائنہ کرے گا۔“

”اللہ کرے راحیل صحت یاب ہو کر گھر آ جائے۔“ ماہا نے دل سے کہا۔ ”وہ اکلوتا ہے اور اولاد کا دکھ ماں باپ ہی جانتے ہیں۔ جب معاذ غائب ہوا تھا تو مجھے لگا میری جان نکل گئی ہو۔ اب سارہ کی حالت نہیں دیکھی جا رہی ہے۔ تم اب تک اسپتال میں ہی تھے؟“

شیراز نے سوچا اور پھر اسے بتا دیا۔ ”میں شیما کی ماں کے پاس بھی گیا تھا۔“

”کیوں؟“ ماہا نے تیز لہجے میں کہا۔ ”کیا ضرورت تھی؟“

”میں اس سے اس کی گم شدہ بیٹی کے بارے میں معلوم کرنے گیا تھا۔“

”اس کی گم شدہ بیٹی کا ہم سے کیا تعلق... یہ واقعہ تو ہمارے یہاں آنے سے پہلے ہو گیا تھا۔“

”ہاں لیکن مجھے لگتا ہے کوئی نہ کوئی تعلق ہے... معاذ...“

”پلیز شیراز! تم پھر وہی موضوع نکال رہے ہو۔“

”آخر یہ کسی ردا کا نام کیوں لیتا ہے؟“ شیراز کو غصہ آ گیا۔ ”تم جانتی ہو میں نے کیسے جانا کہ شیما معاذ کو لے گئی ہے اور پھر ہم کیسے بالکل درست جگہ پہنچے؟“

”یہ اتفاق تھا۔“ ماہا بولی۔

”یہ اتفاق نہیں تھا۔“ شیراز نے کہا۔ ”میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ وہ کہتے کہتے رکا اور پھر معاذ کی طرف دیکھا۔ ”آپ اپنے کمرے میں جائیں۔“

معاذ سیڑھیوں سے اوپر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد شیراز نے ماہا کو بتایا کہ اس نے شیما کو دیکھ کر کیا محسوس کیا تھا اور کیسے اس کے دماغ میں سرخ جھماکے ہوتے تھے۔ جب وہ آئس کریم پارلر جا رہے تھے، تب اس کے اندر رہ رہ کر جھماکے ہونے لگے تھے اور پھر اسے خیال آیا کہ معاذ گھر پر نہیں ہے۔ وہ اسی لیے واپس آیا۔ پھر سرخ جھماکے ہی اس کی راہنمائی کرتے رہے کہ معاذ اور شیما کہاں ہو سکتے تھے۔ ماہا حیرت سے سن رہی تھی۔ اس نے بے یقینی سے کہا۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ایسا ہوا ہے۔“ شیراز نے بے چینی سے کہا۔ ”یاد کرو ثمینہ نے کیا کہا تھا کہ میں ایک اچھا معمول ہوں، میں رابطہ کر سکتا ہوں اور اس کا مطلب ہے مجھے بہت سی باتوں کا علم ہو سکتا ہے۔ معاذ میرا بیٹا ہے تو اسے بھی علم ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ گم شدہ ردا کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔“

اس بار ماہا بھڑکی نہیں۔ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”کچھ دن پہلے میں معاذ کو لے کر باہر گئی تھی۔ تب ثمینہ سے سامنا ہوا تھا۔ اس نے ایک عجیب سی بات کی تھی کہ معاذ کی آنکھوں میں کوئی خاص بات ہے اور یہ چیز اسے تم سے ملی ہے۔“

ثمینہ کے نام پر شیراز کو خیال آیا کہ یہ سب اس واقعے کے بعد سے شروع ہوا تھا، جب سے ثمینہ نے اسے ہپناٹائز کیا تھا۔ اس کے اندر کوئی تبدیلی آئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کوئی کھڑکی کھل گئی تھی اور اسے کچھ ایسی باتوں کا علم ہو رہا تھا جو مستقبل میں ہونی تھیں اور قبل از وقت اس کے علم میں آ جاتی تھیں۔ مگر وہ دوبارہ وہ سب نہیں چاہتا تھا، ایک ہی تجربہ اس کا دل دہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ اگرچہ اس واقعے میں کچھ کڑیاں غائب تھیں جیسے اس نے واحد کو اپنے گھر کے لاؤنج اور پھر مکان کی سیڑھیوں پر دیکھا تھا۔ وہ بہت دل گرفتہ اور ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہوا تھا۔ پھر اس نے خواب میں جو کیا تھا حقیقت میں سب ویسا ہی نہیں کیا تھا۔ البتہ راحیل کی خودکشی والی بات درست ثابت ہوئی تھی۔ شیراز کو خیال آیا کہ یہ سلسلہ ثمینہ نے شروع کیا تھا، وہی اسے ختم کر سکتی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس سے ملے گا اور اس سے کہے گا کہ اس معاملے میں اس کی مدد کرے۔ مگر اس وقت وہ اپنے گھر پر نہیں ہوتی تھی۔ شیراز کو شام تک انتظار کرنا تھا۔

شام کے وقت موسم خراب تھا۔ آسمان پر بہت گہرے بادل تھے پھر سورج ڈوبتے ہی بارش شروع ہو گئی۔ شیراز برآمدے میں کرسی ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔ تیز ہوا کے ساتھ پانی کی بوچھاڑ اس کے پیروں تک آ رہی تھی مگر اسے پروا نہیں تھی۔ وہ سوچوں میں گم تھا۔ راحیل والے واقعے کے بعد گلی میں ویرانی سی ہو گئی تھی۔ لوگ اب شام کے وقت بھی گھروں سے کم نکلتے تھے۔ پھر بارش کی وجہ سے بالکل سناٹا تھا۔ ساڑھے چھ بجے ثمینہ کی کار نمودار ہوئی اور اس نے اسے سڑک کے کنارے ہی روک دیا پھر تیز بارش سے بچتی ہوئی اپنے مکان کے برآمدے تک آ گئی۔ اس کے اندر جاتے ہی شیراز اٹھا اور بارش کی پروا کیے بغیر سر جھکائے

تیزی سے ثمینہ کے مکان تک آیا۔ برآمدے میں آکر اس نے اپنی جیکٹ اور بالوں سے پانی جھاڑا اور کال بیل بجائی۔ دروازہ ثمینہ نے کھولا اور اسے دیکھ کر حیرت سے بولی۔ ”تم اس موسم میں؟“

”مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”آؤ، اندر آجاؤ۔“ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ شیراز اندر آتے ہی بولا۔

”میں پریشان ہوگیا ہوں جب سے آپ نے مجھے ہپنا ٹائز کیا ہے۔ میرے اندر پتا نہیں کیا ہو رہا ہے۔ اگر کوئی کھڑکی کھل گئی ہے تو میں چاہتا ہوں کہ یہ لعنتی کھڑکی بند ہو جائے۔“ بولتے ہوئے شیراز کی نظر لاؤنج میں بیٹھی ثمینہ کی بیٹی پر گئی تو وہ چپ ہوگیا پھر اس نے کہا۔ ”سوری، میں شاید غلط بول گیا مگر میں اس کرب سے نجات چاہتا ہوں۔“

ثمینہ نے پلٹ کر اپنی بیٹی کو دیکھا تو وہ خاموشی سے اٹھ کر اوپر چلی گئی۔ ثمینہ اسے لاؤنج میں لائی۔ وہ اس کی آمد سے ذرا بھی فکرمند نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شیراز اس کے گھر آتا جاتا رہتا تھا۔ اسے صوفے پر بٹھا کر وہ بولی۔ ”ہاں، اب کہو کیا مسئلہ ہے؟“

شیراز نے کہا۔ ”میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے لیکن...“

”میں سمجھتی ہوں۔“ ثمینہ نے اس کی بات کاٹی۔ ”تمہیں آنے والے وقت کے مناظر دکھائی دیتے ہوں گے۔ تمہاری چھٹی حس بہت زیادہ کام کرنے لگی ہوگی اور تم چیزوں سے خبردار ہو جاتے ہو گے۔ یہی ہو رہا ہے نا تمہارے ساتھ؟“

شیراز حیران ہوا۔ ”ہاں اور میں چاہتا ہوں یہ بند ہو جائے۔ میں کچھ جاننا نہیں چاہتا۔“

ثمینہ سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے پوچھا۔ ”تمہارے اردگرد کچھ غیر معمولی ہو رہا ہے جس کا اثر تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی زندگی پر پڑ رہا ہے۔“

اس بار شیراز نے جواب دیا۔ اس نے ثمینہ کو ردا کے بارے میں بتایا جو معاذ کو نظر آتی تھی اور جو شیما کی بہن تھی۔ وہ تین سال پہلے پراسرار طور پر غائب ہوگئی تھی۔ ثمینہ کے چہرے پر دلچسپی نظر آئی۔ ”تم نے کبھی معاذ سے پوچھا کہ وہ کیسی ہے... آئی مین ردا؟“

”نہیں، میں نے کبھی اس سے یہ نہیں پوچھا۔“

”تمہیں معلوم کرنا چاہیے۔“

”میں نے کہا نا میں کچھ معلوم نہیں کرنا چاہتا۔ پہلے ہی اس بات پر ماما سے میری شدید جھڑپ ہو چکی ہے۔“ شیراز کا لہجہ پھر تیز ہوگیا۔ ”پلیز! اس چیز کو روکو۔“

”ٹھیک ہے، ہم کوشش کرتے ہیں۔“ ثمینہ نے کہا۔ ”تم ہپناٹائز ہونے کے لیے تیار ہو؟“

”ہاں!“

”جسم ڈھیلا چھوڑ کر چند گہرے سانس لو۔“ ثمینہ نے حکم دیا اور شیراز نے تعمیل کی۔ ”اب سنیما ہال کا تصور کرو... وہاں کیا رنگ ہے؟“

شیراز کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے دھیمی اور گہری آواز میں کہا۔ ”سرخ... پورا ہال اور اس کی چیزیں سرخ ہیں۔“

”وہ اب سیاہ ہو رہی ہیں... سیاہ رنگ ہر چیز پر چھا رہا ہے۔“

”سب سیاہ ہو رہا ہے۔“

”سوائے اسکرین کے... وہ بالکل سفید ہے۔“

”اسکرین سفید ہے۔“

”اسکرین پر کچھ لکھا ہے لیکن اسے دیکھنے کے لیے تمہیں اسکرین کے پاس جانا ہوگا۔“

”میں اسکرین کے پاس جا رہا ہوں۔“ شیراز نے کہا مگر وہ پہلے کی طرح پُرسکون نہیں تھا، بے چین ہو رہا تھا۔ ”ہال میں کوئی ہے؟“

ثمینہ نے کہا۔ ”وہاں کوئی نہیں ہے۔“

”نہیں ہے... اگلی نشست پر کوئی بیٹھا ہے۔“

”شیراز! وہاں کوئی نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا... یہ ہال اصل میں تمہارا ذہن ہے اور اس میں صرف تم ہو سکتے ہو۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں، وہاں کوئی ہے...“ شیراز کی سانس تیز ہونے لگی۔ ”وہ... وہ کوئی عورت ہے...“

”اگر ہے تب بھی اسے نظر انداز کرکے اسکرین کی طرف بڑھو۔“

”میں نہیں جا سکتا، مجھے اس کے پاس سے گزرنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے، تم اس کے پاس سے گزرو گے لیکن اس کے پاس رکو گے نہیں۔“

شیراز کو لگ رہا تھا کہ وہ عورت اسے روکے گی۔ وہ رفتہ رفتہ اس کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ اس کے پاس پہنچا عورت نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ عورت نہیں بلکہ لڑکی تھی۔ اس نے نظر کی عینک لگا رکھی تھی

اور اس کے کھلے منہ سے سامنے کا ایک دانت غائب تھا۔ خلافِ توقع اس نے شیراز کو روکنے کے بجائے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ تب شیراز نے اسکرین کی طرف دیکھا اور اسی لمحے اس کی آنکھ کھل گئی۔ خاصا سرد موسم ہونے کے باوجود وہ پسینے پسینے ہو رہا تھا اور اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ ثمینہ نے اسے پانی کا گلاس دیا جو اس نے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ چند لمحے بعد اس کی حالت قدرے قابو میں آئی تو ثمینہ نے پوچھا۔ ”اسکرین پر کیا لکھا تھا؟“

”صرف ایک لفظ۔“ شیراز نے جواب دیا۔ ”کھودو۔“

ثمینہ چونکی۔ ”اور عورت؟“

”وہ عورت نہیں لڑکی تھی۔ شاید سترہ اٹھارہ سال کی... اس نے نظر کی عینک لگا رکھی تھی۔“

”اس نے تمہیں روکا؟“

”نہیں، اس کے برعکس اس نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا تھا۔“ شیراز نے کہا اور پھر پوچھا۔ ”یہ سب کیا تھا؟“

”میں درست طور پر نہیں جانتی۔“ ثمینہ نے گہری سانس لی۔ ”لیکن یہ بات یقینی ہے۔ تمہارا کسی سے رابطہ ہے اور وہ تم سے کچھ چاہتا ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے اسکرین پر نظر آنے والا لفظ مشورہ ہے... وہ مجھ سے کھدائی چاہتا ہے؟“

”شاید۔“ ثمینہ نے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے تمہارے ذہن میں کھلنے والی کھڑکی بند نہیں ہوئی ہے۔“

”کیوں؟“ شیراز نے احتجاج کیا۔

”میں نہیں جانتی۔ اسے کھولنا یا بند کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔“

”پھر کس کے اختیار میں ہے؟“

”تمہارے۔“ ثمینہ نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسے تم نے کھولا ہے اور تم ہی بند کر سکتے ہو۔“

”وہ کیسے؟“

”تم سے رابطہ کرنے والا جو چاہتا ہے، وہ پورا کرے۔“ ثمینہ نے کہا۔ ”میں اس سے زیادہ تمہاری اور کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ امید ہے تم اس معاملے میں مزید مجھے زحمت نہیں دو گے۔“

شیراز نے سر ہلایا۔ ”مجھے بھی امید ہے۔“

وہ گھر واپس آیا تو ماما اسے دیکھ کر فکرمند ہوگئی۔ ”شیراز! کیا ہوا ہے تمہیں؟ اتنا پریشان کیوں لگ رہے ہو؟“

”کیونکہ میں پریشان ہوں۔“ شیراز کہتے ہوئے اوپر کی طرف بڑھا۔ ماما اس کے پیچھے آنے لگی تو اس نے اسے روک دیا۔ ”پلیز! میں کچھ دیر کے لیے تنہائی چاہتا ہوں۔“

ماما کچن میں کھانا بنا رہی تھی۔ وہ واپس چلی گئی۔ شیراز اوپر آیا اور اس نے معاذ کے کمرے میں جھانکا۔ وہ اپنی ڈرائنگ بک پر اسکیچ بنا رہا تھا۔ شیراز اس کے پاس آیا اور بیڈ کے کنارے بیٹھ کر کچھ دیر دیکھتا رہا۔ معاذ پنسل سے بلی کی تصویر بنا رہا تھا اور حیرت انگیز طور پر اس نے بہت اچھا اسکیچ کیا تھا۔ شیراز نے اس کی تعریف کی تو وہ خوش ہوگیا۔

”پاپا! میں نے اچھا بنایا ہے نا؟“

”بہت اچھا، یہ تو بالکل اصلی بلی لگ رہی ہے۔“

”مس بھی کہتی ہیں میں بہت اچھی ڈرائنگ بناتا ہوں۔“ اس نے فخر سے کہا۔ معاً شیراز کو ثمینہ کی بات یاد آئی کہ اس نے معاذ سے ردا کے بارے میں پوچھا کہ وہ کیسی لگتی ہے؟

”آپ ردا کی تصویر بنا سکتے ہیں؟“

معاذ نے سر ہلایا اور ڈرائنگ بک پر جھک گیا۔ وہ پنسل سے خاکہ بنا رہا تھا اور چند منٹ بعد ایک لڑکی کا خاکہ سامنے تھا۔ یہ بہت اچھا تو نہیں تھا مگر اس میں دو چیزیں بالکل نمایاں تھیں۔ ایک لڑکی نے عینک لگائی ہوئی تھی اور دوسرے اس کا سامنے کا ایک دانت غائب تھا۔

☆☆☆

آج چھٹی تھی اسی لیے ماما کی آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ اتوار والے دن وہ الارم نہیں لگاتی تھی۔ صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ وہ ضروریات سے فارغ ہو کر نیچے آئی تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ معاذ بھی اپنے بستر پر نہیں تھا۔ یہ دونوں باپ بیٹے صبح صبح کہاں چلے گئے؟ اس نے سوچتے ہوئے فریج کھولا تو اس میں سامنے اورنج جوس کے کارٹن بھرے ہوئے تھے۔ وہ حیران رہ گئی۔ شیراز یادہ کبھی کبھی ناشتے میں اورنج جوس لیتے تھے مگر اتنی زیادہ تعداد میں کارٹن کبھی ان کے گھر میں نہیں آئے تھے۔ پھر کل رات تک یہ کارٹن فریج میں نہیں تھے۔ وہ چھوٹے کمرے کے ساتھ عقبی صحن کی طرف کھلنے والے دروازے تک آئی اور باہر جھانکا تو دنگ رہ گئی۔ شیراز اور معاذ صرف پینٹ اور نیکر میں زمین کھود رہے تھے۔ وہ باہر آئی۔ ”شیراز! یہ کیا ہو رہا ہے؟“

"کھدائی۔" اس نے جواب دیا۔ وہ ایک تین فٹ گہرے گڑھے میں کھڑا اسے مزید کھود رہا تھا اور نکالی جانے والی مٹی برابر میں ڈھیر کر رہا تھا۔ معاذ چھوٹے سے پلاسٹک کے بنے بیلچے سے مٹی کے ڈھیر کو ایک طرف کر رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اصل کھدائی شیراز نے کی تھی اور معاذ صرف کھیل رہا تھا۔ البتہ اس کھدائی نے باغ کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔ ماہا کے ہونٹ بھنچ گئے۔

"لیکن کیوں؟"

"ایسے ہی۔" شیراز نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "ضروری ہے ہر بات کا کوئی جواز ہو۔"

"شیراز! خدا کے لیے تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"تمہارا مطلب ہے میں پاگل ہو گیا ہوں۔" اس نے بیلچہ زور سے مٹی پر مارا۔ "اپنے پاگل پن میں یہ سب کر رہا ہوں؟"

شیراز کی آنکھیں سرخ اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ساری رات جاگتا رہا ہو۔ ماہا نے گڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ "پھر اس کا کیا مقصد ہے؟"

"میں کچھ تلاش کر رہا ہوں۔" شیراز نے کہا اور دوبارہ بیلچہ سنبھال لیا۔ یہ باغ اسی نے بنایا تھا۔ یہاں ایک کونے میں لگا ہوا لوکاٹ کا درخت خاصا بڑا ہو گیا تھا اور سنگترے کے درخت پر گزشتہ سیزن میں پھل آنا شروع ہو گئے تھے۔ صحن کا خاصا بڑا حصہ گھاس سے ڈھکا ہوا تھا اور دیواروں کے ساتھ پھول دار پودوں کے تختے اور بیلیں تھیں۔ کچن کے ساتھ والے حصے میں انگور کی بیل تھی جو گزشتہ سال لگائی گئی تھی اور اب خاصی بڑی ہو گئی تھی۔ اس کھدائی سے سارے ہی پودے متاثر ہو رہے تھے۔

"کیا تلاش کر رہے ہو؟" ماہا نے کہا۔ "تم بھول رہے ہو کہ جب ہم یہاں آئے تو تم نے سارے صحن میں چار فٹ تک نئی مٹی ڈلوائی تھی۔ پرانی مٹی نکلوا دی تھی۔ اگر یہاں کچھ ہوتا تو اس وقت ضرور ملتا۔"

"ہو سکتا ہے جو میں تلاش کر رہا ہوں، وہ اس سے زیادہ گہرائی میں ہو۔"

ماہا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے معاذ کا ہاتھ پکڑا اور اندر آ گئی۔ اسے نہلا دھلا کر کے کپڑے تبدیل کرائے اور ناشتا بنانے لگی۔ کچھ دیر بعد شیراز اندر آیا اور اس نے فریج سے اورنج جوس کا ایک پیک نکال کر اسے کھولا اور دو گلاسوں میں ڈال کر ایک گلاس ماہا کی طرف کر دیا۔ وہ اخبار دیکھ رہی تھی۔ اس نے گلاس کی طرف توجہ نہیں دی۔

شیراز نے اپنا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور بولا۔ "مجھے افسوس ہے۔ میں سوری کرتا ہوں۔ مجھے تم سے اس طرح بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔"

ماہا نے کہا۔ "مجھے تمہارے طرزِ تخاطب کی فکر نہیں ہے، تم جو کر رہے ہو اس کی فکر..."

"اوہ... تم نے جوس نہیں لیا۔ شاید تمہارا ارادہ نہیں ہے۔" شیراز نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور اس کا گلاس بھی اٹھا کر ایک سانس میں خالی کر دیا۔ ماہا نے اخبار رکھ دیا اور بولی۔

"پلیز شیراز! میں پریشان ہوں۔ ابھی معین کا ایس ایم ایس آیا ہے۔ دادی جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں سانس لینے میں پرابلم ہو رہی ہے۔ وہ بہت تکلیف میں ہیں۔"

"اب نہیں ہیں۔" شیراز نے بے ساختہ کہا اور پھر یوں چپ ہو گیا جیسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔ ماہا نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"کیا... کیا کہا تم نے؟"

شیراز کھڑا ہو گیا۔ "کچھ نہیں... میرا مطلب ہے میں نے جو کہا اس کا کوئی مطلب نہیں ہے۔"

"نہیں تم..." ماہا کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ لاؤنج میں لگے فون کی گھنٹی بجی۔ ماہا نے اٹھ کر کال ریسیو کی تو شیراز باہر جا رہا تھا۔ اس نے سنا ماہا کہہ رہی تھی۔

"معین! ہاں ابھی تمہارا ایس ایم ایس دیکھا ہے... دادی کیسی ہیں... کیا... اوہ نہیں۔"

شیراز باہر آیا۔ کچھ دیر بعد ماہا اندر سے روتی ہوئی برآمد ہوئی۔ "دادی کا انتقال ہو گیا ہے۔"

ماہا کی سگی دادی اس وقت انتقال کر گئی تھیں جب ماہا کے والد صرف دو سال کے تھے پھر ان کی چچی نے ان کی پرورش کی تھی۔ وہ انہیں ماں جیسا احترام دیتے تھے۔ معین ماہا کا بھائی تھا۔ باپ کی وفات کے بعد وہی گھر کا سربراہ تھا۔ شیراز نے نرمی سے ماہا کو بازو میں لے لیا۔ "مجھے افسوس ہے۔"

"ہم ابھی جا رہے ہیں۔" ماہا نے کہا۔

"ہم..." شیراز کہتے کہتے رک گیا۔ "میں یہ چھوڑ کر نہیں..."

"تم میری دادی کے انتقال پر نہیں جاؤ گے؟" ماہا نے بے یقینی سے کہا۔ شیراز کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے نفی میں سر ہلایا تو ماہا چلا اٹھی۔ "کیونکہ تمہارے نزدیک میری اور میرے رشتے داروں کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟"

شیراز نے نرمی سے کہا۔ "ماہا! میں جو کر رہا ہوں، وہ اس گھر اور ہمارے خاندان کے لیے ضروری ہے۔"

"مرضی تمہاری۔" ماہا نے کہا اور پاؤں پٹختی ہوئی اندر چلی گئی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اپنا اور معاذ کا مختصر سامان کار میں رکھ کر جانے کے لیے تیار تھی۔ اس نے شیراز کی طرف دیکھے بغیر اسے خدا حافظ کہا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ ماہا کا میکا دو گھنٹے کی مسافت پر دوسرے شہر میں تھا اور وہ اس سے پہلے بھی کئی بار خود ڈرائیو کر کے جا چکی تھی اس لیے شیراز کو اس کی فکر نہیں تھی۔ معاذ عقبی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور باپ کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔ ان کے جاتے ہی شیراز پھر صحن میں آیا اور کھدائی کرنے لگا۔ نیچے کی مٹی خشک تھی اور بہت سخت تھی۔ اسے نرم کرنے کے لیے وہ پانی سے گیلا کر رہا تھا۔ شیراز شام تک لگا رہا۔ اس نے نصف صحن کھود ڈالا تھا اور تقریباً چھ فٹ تک کھودا تھا مگر کچھ نہیں نکلا تھا۔ اس رات وہ نڈھال ہو کر لیٹا تو اسے صبح تک پتا نہیں چلا۔

واش روم سے فارغ ہو کر اس نے ناشتا کیا اور پھر صحن میں آ گیا۔ اب اس نے دوسرا نصف حصہ کھودنا شروع کیا۔ دوپہر تک وہ اسے بھی تقریباً کھود چکا تھا۔ وہ ہر تین فٹ کے بعد چھ فٹ گہرا گڑھا کھود رہا تھا۔ وہ لوکاٹ کے درخت کے پاس پہنچا اور یہاں کھدائی شروع کی تو ربر پائپ کی لمبائی اس سے پہلے ختم ہو گئی۔ یہ آٹھ فٹ لمبا تھا جبکہ گڑھا بارہ فٹ کی دوری پر تھا۔ اسے یاد آیا کہ تہ خانے میں مزید پائپ رکھا ہوا تھا۔ وہ نیچے آیا اور ریک پر رکھا ہوا پائپ تلاش کر کے واپس آنے لگا تھا کہ اس کی نظر تہ خانے کے فرش پر گئی اور کچھ دیر بعد وہ کدال سے فرش توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر تہ خانے کا فرش بہت مضبوط کنکریٹ کا بنا ہوا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ کام ایسے نہیں ہوگا، اسے مزید اوزاروں کی ضرورت تھی۔ اس نے غسل کر کے کپڑے پہنے اور سیکٹر کی مارکیٹ کے سب سے بڑے ہارڈ ویئر اسٹور پہنچ گیا۔

اس کا تعلق کنسٹرکشن سے تھا اور اسے معلوم تھا کہ اس کام کے لیے کون سے اوزار درکار ہوں گے۔ اس نے کنکریٹ میں سوراخ کرنے والی ایک بھاری ڈرل مشین، ایک بھاری ہتھوڑا اور کچھ دوسرے اوزار لیے۔ وہ واپس آ رہا تھا کہ موسم خراب ہونے لگا۔ موسم کئی دن سے خراب ہی تھا اور اکثر گرج چمک اور تیز طوفانی ہواؤں کے ساتھ بارش ہوتی رہی تھی۔ جب وہ گھر کے سامنے کار سے اترا تو بارش شروع ہو گئی تھی۔ راستے میں کار کے ریڈیو کے مطابق اس پورے علاقے میں کئی شہروں تک طوفان باد و باراں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ بارش کا سلسلہ وقفے وقفے سے کئی دن جاری رہنے کا امکان تھا۔ اس نے سامان تہ خانے تک پہنچایا۔ صبح ناشتے کے بعد اس کا گزارہ بس اورنج جوس پر ہو رہا تھا۔ اس لیے وہ آتے ہوئے اپنے لیے پیزا لیتا آیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ پہلے وہ پیٹ بھرے گا اور پھر کام کرے گا۔

☆☆☆

ماہا کو رہ رہ کر شیراز کا خیال آ رہا تھا۔ اگر دادی جان کی وفات کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ کبھی اسے اس حالت میں چھوڑ کر نہ آتی۔ آج دادی کا سوئم ہو گیا تھا اور آنے والے بیشتر مہمان رخصت ہو گئے تھے۔ ماہا شام سے شیراز کا نمبر ٹرائی کر رہی تھی لیکن کال مغرب کے بعد جا کر لگی تھی۔ اس نے کسی قدر برہمی سے کہا۔ "کہاں تھے تم، میں کتنی دیر سے کال کر رہی ہوں۔"

"سوری۔" شیراز نے معذرت کی۔ "میں ذرا تہ خانے میں کام کر رہا تھا۔"

"اوہ اچھا... ویسے سب ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں، سب ٹھیک ہے میں اب صحن میں کھدائی نہیں کر رہا ہوں۔" شیراز نے جواب دیا۔ "جب تم آؤ گی تو سب پہلے کی طرح ٹھیک ہوگا۔"

"ہاں میں سوچ رہی ہوں آج ہی آ جاؤں۔"

"آج۔" شیراز بے چین ہو گیا۔ "نہیں، موسم بہت خراب ہے۔"

"ابھی دن ہے، میں آرام سے پہنچ جاؤں گی۔ یہاں موسم ٹھیک ہے امید ہے کہ وہاں آتے آتے ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ماہا! میری بات سنو..." شیراز نے کہنا چاہا لیکن اسی لمحے کال کٹ گئی۔ ماہا نے پھر نہیں ملایا کیونکہ بات ہو گئی تھی۔ وہ کمرے سے باہر آئی جہاں معاذ اپنی نانی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ نانی سے مانوس تھا اور یہاں آ کر خوش ہوتا تھا۔ ماہا نے ماں سے کہا۔

"میں واپس جا رہی ہوں۔ گھر زیادہ دیر اکیلا نہیں چھوڑ سکتی اور پھر نئی جاب ہے۔ دو دن سے زیادہ چھٹی نہیں کر سکتی۔ کل لازمی جانا ہوگا۔"

"میں سمجھتی ہوں۔" ماں نے کہا۔

"چلو معاذ تیار ہو جاؤ۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔" اس نے انکار کیا۔ "مجھے ڈر

لگ رہا ہے۔"

"کس سے؟" ماہا نے حیرت سے پوچھا۔

"گھر سے... وہاں کچھ ہونے والا ہے۔"

"بیٹا کچھ نہیں ہو رہا... چلو شاباش چلنے کی تیاری کرو۔"

"اسے یہاں چھوڑ جاؤ۔ ابھی داخلے شروع ہونے میں کچھ دن ہیں۔" ماں نے سفارش کی۔ ماہا نے سوچا اور سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے، اس کا سامان بھی ہے۔ شاید اگلے اتوار کو میں اور شیراز دونوں آئیں۔"

ماہا اس وجہ سے بھی مان گئی تھی کہ تعزیت کے لیے شیراز کا آنا لازمی ہو جائے۔ ابھی تو اس نے بہانہ کر لیا تھا کہ شیراز معروفیت کی وجہ سے نہیں آسکا تھا۔ دوسروں نے اس بات کو محسوس کیا تھا تو شیراز کے آنے سے وہ بھی مطمئن ہو جاتے۔ سب سے سلام دعا کر کے ماہا نکلنے لگی تھی کہ معاذ دوڑ کر آیا۔ اس نے ماہا کا ہینڈ بیگ اٹھا رکھا تھا۔ "ماما! آپ یہ بھول رہی ہیں۔ اس میں آپ کی اہم چیزیں ہیں۔"

"تھینک یو بیٹا۔" ماہا نے اسے پیار کیا اور بیگ لے کر باہر نکل آئی۔

☆☆☆

احمد نواز تنویر کے ساتھ مارکیٹ کی طرف سے پیدل آرہا تھا۔ وہ واحد کے بیٹے کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اس کا معائنہ کرنے والے مشہور نیوروسرجن نے بھی ناامیدی ظاہر کی تھی۔ وہ گلی میں داخل ہوئے اور جب احمد نواز کے گھر کے پاس پہنچے تو انہیں شیراز کے گھر سے بھاری ڈرل مشین چلنے کی آواز آرہی تھی اور پھر ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی بھاری ہتھوڑے سے کنکریٹ توڑ رہا ہو۔ احمد نواز نے تشویش سے کہا۔ "یہ کیا کر رہا ہے؟ کل سے اس کے گھر سے ایسی آوازیں آرہی ہیں۔ اس نے اپنا عقبی صحن بھی کھود ڈالا ہے۔"

"میرا خیال ہے کوئی کنسٹرکشن کا کام کرانا چاہتا ہے۔" تنویر بولا۔

"لیکن یہ تو ایسا لگ رہا ہے جیسے خود ہی توڑ پھوڑ کر رہا ہے۔ ہمارے گھر ملے ہوئے ہیں، اس کا اثر میرے گھر پر نہ آئے۔ تم دھماکے سن رہے ہو ان کی دھمک یہاں تک آرہی ہے۔ یہ دیواریں تڑخا دینے کے لیے کافی ہے۔"

"میرا خیال ہے ان مکانات کی بیس اور دیواریں بہت مضبوط ہیں۔ کچھ سال پہلے آنے والے شدید زلزلے کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔" تنویر نے کہا اور پھر پیشکش کی۔ "ایک کپ چائے کے بارے میں کیا خیال ہے؟" احمد نواز مان گیا اور وہ دونوں تنویر کے گھر کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

شیراز ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا مگر موبائل خاموش تھا۔ موسم کا اثر موبائل سگنلز پر بھی آیا تھا۔ شیراز بہ مشکل لاؤنج میں لگے فون تک آیا اور جب ریسیو اٹھایا تو اسے بھی ڈیڈ پایا۔ اس نے مایوسی سے فون پٹخ دیا۔ وہ ماہا کو نہیں روک سکتا تھا اور یہاں گھر کی حالت۔ اس نے ایک نظر چاروں طرف دیکھا۔ لاؤنج کا فرنیچر کھسکا دیا گیا تھا۔ سیڑھیوں سے باہر عقبی صحن تک مٹی اور دوسرا ملبا بکھرا ہوا تھا۔ کچن گندا ہو رہا تھا کیونکہ شیراز ہاتھ اور چیزیں دھونے کا کام وہیں کر رہا تھا۔ یہ تو اوپر کی حالت تھی۔ تہ خانے کی اس سے زیادہ بری تھی۔ اس کی صورت ہی بدل گئی تھی۔ ماہا یہ سب دیکھتی تو شیراز اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کا کیا ردعمل ہوتا؟ وہ نیچے تہ خانے میں آیا۔ اس نے تمام سامان اپنے اپنے ٹھکانے پر لگایا۔ باقی جہاں سے اس نے فرش توڑا تھا وہاں جا بہ جا کھدائی کی ہوئی تھی۔ مٹی کے جو ڈھیر یہاں نہیں رکھ سکا تھا انہیں بوری میں بھر کر عقبی صحن تک پھینک آیا تھا۔ گھر ہی نہیں وہ خود بھی سر سے پاؤں تک مٹی میں اٹا ہوا تھا۔ یہ مٹی اوپر بیڈ روم اور واش روم تک جا پہنچی تھی اور اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ گھر کے دوسرے حصوں کو صاف کر سکتا۔ اس کی ساری توجہ کھدائی کی طرف تھی۔

تہ خانے کی دیواریں سرخ اینٹوں سے بنائی گئی تھیں۔ نیچے آکر شیراز نے بھاری ہتھوڑا اٹھایا۔ اس کا دستہ تین فٹ لمبا تھا اور اسے کسی کلہاڑی کی طرح استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس نے ہتھوڑا گھما کر فرش پر مارا پھر اٹھا کر پیچھے کیا تھا کہ بے دھیانی میں ہتھوڑا عقبی دیوار سے ٹکرایا اور اس کی کچھ اینٹیں اندر کی طرف کھسک گئیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان اینٹوں کے پیچھے مٹی نہ ہو بلکہ خلا ہو، اسی وجہ سے اینٹیں پیچھے کھسک گئی تھیں۔ شیراز کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہتھوڑے سے چند ہلکی ضربیں لگائیں تو کھسک جانے والی اینٹیں اندر گر گئیں اور تاریک خلا نظر آنے لگا۔ شیراز ایمرجنسی لائٹ اٹھا لایا اور روشنی اندر ڈال کر دیکھا۔ اگلے ہی لمحے وہ پوری جانفشانی سے دیوار سے اینٹیں نکال رہا تھا۔ جیسے جیسے خلا بڑا ہو رہا تھا، دوسری طرف کا منظر واضح ہو رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ میں اس نے دیوار میں دو بائی تین فٹ کا سوراخ کر دیا تھا۔ اس کے دوسری طرف کوئی چیز پلاسٹک شاپر میں لپٹی کھڑی تھی۔ یہ لمبی اور انسان جیسی کوئی چیز تھی۔

شیراز نے ایمرجنسی لائٹ اس طرح رکھی کہ اس کی روشنی سوراخ کے دوسری طرف جا رہی تھی، وہ ایک چاقو لے آیا۔ قریب سے دیکھنے پر اسے احساس ہوا کہ وہ ایک لاش ہی تھی۔ اس نے ہمت کی اور چیز پر لپٹا ہوا شاپر کاٹنے لگا۔ یہ تعمیراتی کام میں آنے والا پلاسٹک شاپر تھا جو بہت مضبوط ہوتا ہے۔ اس کی شیٹ تعمیر سے پہلے پلنتھ میں بچھاتے ہیں تاکہ زمین کی سیم مکان کو متاثر نہ کرے۔ جیسے جیسے شیٹ کی تہیں کٹ رہی تھیں، وہ چیز واضح ہوتی جا رہی تھی اور جب ساری تہیں کٹ گئیں تو اس نے دونوں ہاتھوں سے شاپر پکڑ کر کھولے اور پھر ہڑبڑا کر پیچھے ہٹا۔ شاپر میں ایک ڈھانچا ہو جانے والی لاش تھی۔ اگرچہ اسے ساخت سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کوئی لاش ہی تھی مگر اس حالت میں ہوگی، یہ نہیں سوچا تھا۔

لاش کا چہرہ جس پر عینک ترچھی سی ہو کر ٹکی تھی تقریباً ڈھانچا بن گیا تھا اور اس کے سامنے کا ایک دانت ٹوٹا ہوا تھا۔ یہ کسی لڑکی کی لاش تھی۔ اس کے سر سے اتر جانے والے لمبے بال شانوں پر موجود تھے۔ اس کا لباس بھی نسوانی تھا۔ ورنہ باقی کسی اور چیز سے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ لاش کس کی ہے۔ شیراز نے خود پر قابو پانے کے لیے اوپر آکر پانی پیا۔ اس دوران میں وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ پھر ایک خیال کے ساتھ وہ نیچے آیا اور ایمرجنسی لائٹ کی روشنی میں لاش کے دائیں ہاتھ کا معائنہ کیا۔ لاش کے سیدھے ہاتھ کی درمیانی انگلی کا ناخن ٹوٹا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی شیراز جان گیا کہ وہ کون ہے۔ وہ شیما کی گم شدہ بہن ردا تھی اور اب اسے جاننا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟

شیراز نہیں جانتا تھا کہ روحوں کا معاملہ کیا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات یقینی تھی کہ اس کی راہنمائی ردا نے ہی کی تھی اور اب اسے یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ معاذ جس ردا کا ذکر کرتا تھا، وہ یہی تھی۔ شیراز نے اپنا دانت ٹوٹتے دیکھا تھا۔ خواب میں اسے لگا کہ اس کے دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی کا ناخن اکھڑ گیا ہو۔ یہ سب ردا کی طرف سے اشارے تھے۔ لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ جو سمجھ رہا ہے، حقیقت بھی وہی ہے۔ شیما کا ان کے گھر آنا اور معاذ کا اس کا نام لے کر ماں کو کہنا یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑی تھی۔ ردا یا وہ جو کوئی بھی تھی، اس کا مقصد اس لاش تک ان کی راہنمائی کرنا تھا اور وہ اس میں کامیاب رہی تھی۔ لیکن وہ یہ کس طرح جان سکتا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ اس نے سوچا اور ڈھانچا ہو جانے والی لاش کو دیکھا اور پھر اسے ثمینہ کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ بہت اچھا معمول ہے، وہ رابطہ کر سکتا ہے۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے ہاتھ آگے کیا اور اسے لاش کے خشک ہو جانے والے ہاتھ پر رکھ دیا۔ جیسے ہی اس نے ہاتھ رکھا، اسے ایک جھٹکا سا لگا۔

☆☆☆

لڑکی بہت تیز بارش میں سر جھکائے اور اپنا بیگ سینے سے لگائے سڑک پر جا رہی تھی۔ بارش اتنی تیز تھی کہ آس پاس کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ بادل رہ رہ کر گرج رہے تھے اور بارش جیسے ہر لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ جب وہ گھر سے چلی تو آسمان صاف تھا اور سورج چمک رہا تھا۔ اب بھی سورج نکلا ہوا تھا۔ مگر بہت تاریک بادلوں کے پیچھے چھپا تھا اور ماحول ایسا تھا جیسے بس رات ہونے والی ہو۔ اس وقت وہ جس سڑک سے گزر رہی تھی اس کے دونوں طرف آبادی تھی لیکن آگے جا کر یہ سڑک جنگل کے بیچ سے گزرتی تھی اور اسے وہاں سے گزرتے ہوئے ہمیشہ ڈر لگتا تھا۔ مگر یہ آنا جانا اس کی مجبوری تھی۔ وہ غریب گھرانے کی لڑکی تھی اور اس کی ماں کی اتنی حیثیت نہیں تھی کہ اسے گھر پر ٹیوشن لگا کر دے سکتی۔ اس لیے اسے کوچنگ سینٹر جانا پڑتا تھا۔ ماں کے بعد وہی گھر کی بڑی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ تعلیم مکمل کر کے کہیں جاب کرے اور اپنی ماں کی مشکلات کم کرے جس نے انہیں پالنے کے لیے بہت زیادہ محنت کی تھی۔

وہ پانچ بجے جاتی تھی اور سات بجے تک اس کی واپسی ہو جاتی تھی۔ اگر اسے پتا ہوتا کہ آج بارش کا امکان ہے تو وہ چھتری لے کر نکلتی۔ اب وہ گھر تک بھیگتی ہوئی جاتی۔ وہ تیز قدموں سے چل رہی تھی۔ وہ اس گلی میں داخل ہوئی جس کے بعد آبادی ختم ہو جاتی تھی اور جنگل شروع ہوتا تھا۔ اسے خوف محسوس ہو رہا تھا مگر اسے گزرنا اسی جنگل سے تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ جس خوف سے پریشان تھی، وہ جنگل میں نہیں بلکہ آبادی میں اس کا منتظر تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر رفتار تیز کی اور آخری گھر کے پاس تھی کہ اچانک اس کا پاؤں کسی چیز پر پڑا۔ وہ لڑکھڑائی اور اس کا پاؤں مڑ گیا۔ لڑکی کے منہ سے چیخ نکلی۔ پاؤں میں ٹیس اٹھی اور وہ پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئی۔ یہ گول چکنا پتھر تھا جو بھیگ کر اور چکنا ہو گیا تھا اور اس کا پاؤں اس پر پڑا تھا۔ وہ اپنا پاؤں ٹٹول رہی تھی۔ اس کے ٹخنے میں موچ آگئی تھی۔ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر اس سے کھڑا نہیں ہوا گیا۔ اچانک اسے پاس

سے آواز آئی۔

"اے، کیا ہوا ہے تمہیں؟"

لڑکی چونکی اور اس نے خوف زدہ نظروں سے اس دیو قامت لڑکے کو دیکھا جو اس کے پاس کھڑا تھا اور اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی نے لان کا ہلکا سا سوٹ پہنا ہوا تھا جو بھیگ کر اس کے بدن سے چپک گیا تھا۔ دوپٹا بھی اسے چھپانے سے قاصر تھا۔ اس نے بے ساختہ اپنے سینے پر بیگ رکھ لیا اور کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر تکلیف اتنی شدید تھی کہ وہ گرنے لگی اور اسی لمحے لڑکے نے اسے تھام لیا۔ شاید وہ اسے سہارا دے رہا تھا مگر اسے پکڑتے اور اس کا لمس محسوس کرتے ہی اس کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے اچانک لڑکی کے منہ پر ہاتھ رکھا اور اسے کھینچ کر اس مکان کے اندر لے جانے لگا جس کے آگے وہ گری تھی۔ لڑکی مچلی اور خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر لڑکا بہت طاقتور تھا، اس کی گرفت سخت ناقابلِ شکست تھی۔ لڑکی کی آنکھیں پھیل گئیں اسے اندازہ تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ اس کا بیگ وہیں گر گیا۔ لڑکے نے کسی سے کہا۔

"بیگ اٹھاؤ... جلدی۔"

تب لڑکی نے دوسرے لڑکے کو دیکھا۔ وہ مضطرب تھا مگر اس نے دیو قامت کی بات مانی اور بیگ اٹھا کر پیچھے آنے لگا۔ وہ دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "شانی... یہ کیا کر رہے ہو... اسے چھوڑ دو۔"

مگر لڑکے نے اس کی ایک نہیں سنی۔ وہ لڑکی کو کھینچ کر اس خالی مکان میں لے آیا جس کی دیواروں پر تازہ رنگ و روغن ہوا تھا۔ ابھی کچھ کام باقی تھا اور اسی لیے مکان خالی تھا۔ لڑکا لڑکی کو عقبی چھوٹے کمرے میں لے آیا اور اسے دھکا دے کر فرش پر گرا دیا۔ وہ تڑپ کر اٹھی اور چلائی تھی کہ لڑکے نے اس کے منہ پر پوری قوت سے گھونسا مارا اور وہ پلٹ کر گری تو اس کے منہ سے خون کی دھار کے ساتھ سامنے کا دانت بھی باہر گرا۔ دیو قامت نے اسے سیدھا کر کے اس کا گلا دبوچ لیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ لڑکی کا لباس اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرا لڑکا پاس ہی تھا اور اس نے بیگ نیچے پھینک دیا تھا اور سر پر ہاتھ رکھے مضطرب انداز میں ٹہل رہا تھا۔ دیو قامت کی قوت کے باوجود لڑکی اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے غرا کر دوسرے لڑکے سے کہا۔

"دیکھ کیا رہے ہو؟ اس کے ہاتھ قابو کرو۔"

نوجوان آگے آیا اور اس نے لڑکی کے دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیلاتے ہوئے فرش پر دبا لیے۔ مگر وہ اب بھی دیو قامت سے کہہ رہا تھا۔ "اسے چھوڑ دو... اسے جانے دو۔"

"شٹ اپ۔" دیو قامت غرایا۔ اس وقت اس کے چہرے پر حیوانی تاثرات تھے۔ لڑکی تڑپ رہی تھی۔ پاؤں پٹخ رہی تھی اور ہاتھ اٹھانے کے لیے زور لگا رہی تھی۔ مگر دوسرے لڑکے نے پوری قوت سے اس کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔ اس نے فرش پر انگلیاں گھسیٹیں تو اس کے دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی کا ناخن اکھڑ گیا۔ اسی کشمکش میں ان دونوں کو اندازہ نہیں ہوا کہ اب وہ اپنی عزت بچانے کے لیے نہیں بلکہ اپنی جان بچانے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ دیو قامت کا ہاتھ بہت سختی سے اس کی گردن پر جما ہوا تھا اور اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اچانک وہ ساکت ہو گئی اور اس کا مچلتا ہوا جسم ڈھیلا ہوا تو دوسرے لڑکے نے گھبرا کر کہا۔

"اسے کیا ہوا؟"

"بے ہوش ہو گئی ہے۔" دیو قامت نے بے پروائی سے کہا۔ اس نے لڑکی کا گلا چھوڑ دیا تھا۔

"نہیں، یہ سانس بھی نہیں لے رہی ہے۔" دوسرے لڑکے نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم خود دیکھو۔"

اس بار دیو قامت نے بھی جھک کر دیکھا۔ لڑکی کی آنکھیں کھلی تھیں اور ان سے دہشت جھانک رہی تھی۔ اس کا سانس سچ مچ رکا ہوا تھا۔ اس نے لڑکی کی نبض دیکھی پھر دل کی دھڑکن چیک کی۔ دونوں ساکت تھیں۔ اس نے دوسرے لڑکے کی طرف دیکھا تو وہ رو دینے والے انداز میں بولا۔ "میں کہہ رہا تھا نا... یہ مر چکی ہے۔"

"لیکن کیسے؟" دیو قامت نے سوال کیا۔ اس کے چہرے پر بھی اب حیوانیت کی جگہ ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

"میں نے تو صرف اسے چیخنے سے روکا تھا۔"

"تم نے بہت زور سے اس کا گلا دبایا تھا۔ یہ دیکھو، تمہاری انگلیوں کے نشانات ہیں۔" دوسرے لڑکے نے اشارہ کیا۔ وہ دونوں زیادہ عمر کے نہیں تھے مگر تھے تو جوان لڑکے۔ دیو قامت نے غور سے دیکھا تو واقعی لڑکی کی نازک گردن پر اس کی انگلیوں کے نشانات بہت گہرے ثبت ہوئے تھے۔ اس نے گہری سانس لی اور کھڑا ہو گیا۔ دوسرا نوجوان سر تھام کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس نے دیو قامت سے پوچھا۔

"اب کیا کریں؟"

"ہمیں اس لاش کو چھپانا ہوگا۔" دیو قامت نے کہا۔

"اسے تہ خانے میں لے جانا ہوگا۔" دیو قامت نے کہتے

ہوئے لڑکی کی لاش کسی کھلونے کی طرح اٹھا کر شانے پر ڈال لی اور تہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ دوسرا نوجوان لڑکی کی گر جانے والی عینک اور اس کا بیگ اٹھا کر اس کے پیچھے گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اس لاش کا کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

شیراز کو جھٹکا لگا اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ اس نے لاش کی طرف دیکھا۔ وہ جان گیا تھا کہ ردا کیسے جان سے گئی تھی۔ ڈھانچے کے ساتھ ایک بیگ بھی تھا جس میں یقیناً اس کی کتابیں تھیں۔ شیراز نے گہری سانس لی اور خود سے کہا۔ ''تو یہ بات ہے۔''

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کرے؟ اس واردات کے دونوں کردار اس کے پڑوسیوں اور دوستوں کے بچے تھے۔ یہ وہ نوجوان تھے جنہیں وہ ابھی تک بچہ سمجھتا تھا۔ ان میں سے ایک لڑکا خودکشی کی کوشش کے بعد اسپتال میں زندگی و موت کے درمیان پڑا تھا اور دوسرا بدستور سینہ تانے دندناتا پھر رہا تھا حالانکہ اصل مجرم وہی تھا۔ جب شیراز کی سمجھ میں نہیں آیا تو وہ اوپر آیا اور پھر مکان سے باہر آکر واحد کے مکان کی طرف بڑھا۔ اس نے کال بیل بجائی تو واحد نے خود دروازہ کھولا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ شیراز کو بے اختیار اپنا خواب نظر آیا۔ واحد بالکل اس خواب کی طرح پریشان اور ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔ مگر شیراز سمجھا کہ وہ راحیل کی حالت کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔ ابھی اسے اصل دھچکا نہیں لگا تھا۔ جب اسے معلوم ہوتا کہ اس کا بیٹا کیا بھیانک جرم کر چکا ہے تو نہ جانے اس کی کیا حالت ہوتی۔ اس نے شیراز کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ''دوست... میرے ساتھ آؤ۔ میرے پاس تمہیں دکھانے کو کچھ ہے۔''

واحد کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں آج میرے علم میں نئی نئی باتیں آرہی ہیں۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو، تمہارے پاس مجھے بتانے کے لیے کچھ نہ کچھ ہوگا۔''

''میرے ساتھ آؤ۔''

''ایک منٹ میں ابھی آیا۔'' واحد کہہ کر اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واحد اندر سے آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا تولیے جیسا رومال تھا۔ وہ باہر آئے اور شیراز کے مکان کی طرف بڑھے۔ جب وہ احمد نواز کے مکان کے سامنے سے گزرے تو انہیں پتا نہیں چلا تھا کہ دو آنکھیں انہیں گھور رہی ہیں۔ شیراز کے مکان کے اندر آنے پر واحد نے وہاں بکھری چیزیں اور ملبا دیکھا۔ اس نے شیراز سے پوچھا۔ ''کیا تم نے مکان میں توڑ پھوڑ کی ہے؟''

شیراز نے سر ہلایا۔ ''تب ہی تو میں حقیقت تک پہنچا ہوں۔''

واحد نے سوال نہیں کیا۔ اس کا رویہ لاتعلقانہ سا تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ شیراز کی فرمائش پر یہاں چلا آیا تھا۔ شیراز اسے لے کر تہ خانے میں آیا اور ایمرجنسی لائٹ اٹھا کر اسے سوراخ کے پاس جانے کو کہا۔ واحد کے چہرے پر خاصے سرد موسم میں بھی پسینا آرہا تھا اور وہ یوں سوراخ کی طرف بڑھا جیسے اسے معلوم ہو کہ اسے وہاں دیکھنے کو کیا ملے گا؟ اس نے اندر جھانکا اور گہری سانس لے کر پلٹا۔ شیراز نے کہا۔ ''تم جانتے تھے یہاں کیا دیکھنے کو ملے گا؟''

واحد نے سر ہلایا۔ ''میں نے کچھ دیر پہلے ہی راحیل کی ڈائری پڑھی ہے اور مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ اس نے خودکشی کیوں کی؟''

''اصل قصور اس کا نہیں ہے۔'' شیراز نے کہا تو واحد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟''

''تمہیں یاد ہے، تم نے مجھے معمول بننے کے لیے راضی کیا تھا؟''

''ہاں تو پھر... وہ سب ایک مذاق تھا۔''

''واحد! وہ مذاق نہیں تھا۔ میں اس جگہ اسی وجہ سے پہنچا ہوں۔ میں نے راحیل کو پہلے ہی خودکشی کرتے دیکھ لیا تھا۔ افسوس کہ میں اس واقعے کو ہونے سے نہیں روک سکا۔ تم نہیں جانتے ثمینہ کے عمل نے میرے اندر ایک کھڑکی کھل گئی ہے۔ اب میں بہت سی باتیں جان جاتا ہوں اور بہت سے رازوں سے واقف ہوجاتا ہوں۔''

''یہ بھی ایک راز ہے۔'' واحد نے ردا کی لاش کی طرف دیکھا۔

''راز تھا۔'' شیراز کا لہجہ سرد ہوگیا۔ ''اب یہ راز نہیں رہے گا۔ یہ مظلوم لڑکی مستحق ہے کہ اسے اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچایا جائے اور اس کے ساتھ ظلم کرنے والوں کو سزا ملے۔ اس کے گھر والوں کو پتا چل جائے کہ ان کی لڑکی کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ ان کے دکھی دلوں کو قرار آجائے۔''

واحد بے چین نظر آنے لگا۔ اس نے کہا۔ ''شیراز... میرا بیٹا تقریباً مر چکا ہے۔ کیا اسے بھی مجرم ٹھہرایا جائے گا؟''

شیراز نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نہیں جانتا کہ اسے

مجرم ٹھہرایا جائے گا یا نہیں لیکن میں پولیس کو رپورٹ ضرور کروں گا۔''

''تم ایسا نہیں کروگے۔'' واحد کے لہجے میں التجا آگئی۔ ''خدا کے لیے... ہم پہلے ہی بہت مشکل میں ہیں۔''

شیراز کا دل پگھلنے لگا۔ واحد عمر میں اس سے بڑا تھا مگر دونوں میں بہت گہری دوستی ہوگئی تھی۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا اور اسے یوں ٹوٹتا دیکھ کر اس کا دل نرم پڑ گیا۔ ایک کے بعد دوسرا صدمہ برداشت کرنا اس کے لیے مشکل تھا۔ اگر راحیل زندہ نہ رہتا تب بھی وہ کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہ رہتا۔ واحد ذاتی طور پر بہت شریف انسان تھا۔ شیراز اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ مگر دوسری طرف معاملہ بہت بڑا اور سنگین تھا۔ وہ اسے چھپاتا تو نہ صرف قانون کی خلاف ورزی کرتا بلکہ اس مظلوم لڑکی کا مجرم بھی بن جاتا۔ اس کی ماں اور بہن آج بھی اس کی تلاش میں تھیں اور ان کی تلاش ختم ہونی چاہیے تھی تاکہ ان کے دلوں کو قرار آئے۔ شیراز کشمکش میں تھا اور واحد اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ جب شیراز نے نفی میں سر ہلایا تو اس نے گہری سانس لی۔ ''مجھے معلوم تھا تم نہیں مانوگے... کیونکہ تمہارا بیٹا زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا نہیں ہے۔ تم اس دکھ اور کرب سے نہیں گزر رہے ہو جس سے میں گزر رہا ہوں۔'' واحد کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔

شیراز نے نرم لہجے میں کہا۔ ''پلیز واحد! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو... یہ ضروری ہے۔''

''کچھ ضروری نہیں ہے... یہ تین سال سے یہاں ہے، یہ ہمیشہ یہاں رہ سکتی ہے۔ قیامت تک... اسے کیا فرق پڑے گا؟ یہ مر چکی ہے۔ فرق ہم زندہ لوگوں کو پڑے گا۔ نہیں شیراز! میں تمہیں ایسا کرنے نہیں دوں گا۔ میرا بیٹا پہلے ہی مر چکا ہے۔ میں اس کی لاش کے ساتھ کچھ نہیں ہونے دوں گا۔'' واحد نے کہتے ہوئے ہاتھ میں موجود رومال گرا دیا اور اس میں دبا ہوا چھوٹا سا ریوالور سامنے آگیا۔ اس نے ریوالور شیراز کی طرف کیا تو وہ بے ساختہ ہاتھ اٹھائے پیچھے ہوا۔ اسے لگا کہ واحد اس پر گولی چلا دے گا۔ اسے ختم کرکے وہ اس راز کو ہمیشہ کے لیے راز ہی رہنے دے گا تاکہ اس کے بیٹے پر الزام نہ آئے۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ واحد اس کے ساتھ آیا تھا۔ باہر گرج چمک کے ساتھ بارش جاری تھی۔ اس کے شور میں کسی کو گولی چلنے کی آواز نہ آتی۔ مگر گولی نہیں چلی۔ شیراز نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ کشمکش کا تاثر واحد کے چہرے پر تھا۔ وہ اپنے دوست پر گولی نہیں چلا پا رہا تھا۔ اس کا ہاتھ لرز رہا تھا اور بالآخر جھک گیا۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''شیراز! جاؤ یہاں سے چلے جاؤ۔''

''تم...''

''چلے جاؤ۔'' واحد نے چلا کر کہا۔ ''اس سے پہلے کہ میں فیصلہ بدل دوں۔''

شیراز پیچھے ہٹا اور سیڑھیوں سے اوپر آگیا۔ اسی لمحے کسی نے دروازے پر دستک دی۔

☆☆☆

ماہا نے ہائی وے پر نصف راستہ طے کیا تھا کہ موسم خراب ہوگیا۔ تیز بارش کے ساتھ بجلی بھی رہ رہ کر کڑک رہی تھی اور ہوا بہت تیز تھی۔ ہوا کے ساتھ پانی کی بوچھاڑ آتی تو بعض اوقات کچھ دیر کے لیے ونڈ اسکرین اندھی ہوجاتی تھی۔ اس رفتار سے حادثہ پیش آسکتا تھا۔ مجبوراً اس نے رفتار کم کردی۔ اسے شیراز کی فکر ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ لڑ جھگڑ کر کسی طرح اسے ساتھ لے آتی، اسے چھوڑ کر نہ آتی۔ پتا نہیں اس کے ذہن میں کیا تھا اور وہ کیوں صحن میں کھدائی کر رہا تھا؟ ماہا کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ شیراز اسے جھوٹی تسلی دے رہا تھا۔ گھر میں گڑبڑ تھی اور وہ اس سے چھپا رہا تھا۔ اسی وجہ سے وہ خراب موسم کے باوجود نکل آئی تھی۔ اب ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اتنی جلدی گھر نہیں پہنچ سکے گی۔ ابھی وہ شہر میں داخل بھی نہیں ہوئی تھی اور رات ہو چکی تھی۔

اسے خیال آیا کہ شیراز کو کال کرکے بتا دے۔ اس نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا تو اس کا ہاتھ اس چھری سے ٹکرایا جو وہ سفر کے دوران میں ساتھ رکھتی تھی۔ اگرچہ یہ معمولی سا ہتھیار تھا مگر کسی ناگہانی صورت حال میں وہ خالی ہاتھ تو نہ ہوتی۔ اس نے موبائل نکالا اور شیراز کو کال کرنے لگی۔ مگر جواب میں نیٹ ورک ایرر کنکشن کا پیغام آرہا تھا۔ چند بار ناکام کوشش کے بعد اس نے گھر کا نمبر ملانا چاہا، تب بھی یہی پیغام آرہا تھا۔ اصل میں اس پورے علاقے میں موبائل سگنل ہی کام نہیں کر رہے تھے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ گھر کا فون بھی بارش کے بعد سے خراب ہوگیا تھا۔ طوفان بہت شدید تھا۔ آٹھ بجے کے قریب وہ شہر میں داخل ہوئی۔ اب بیس منٹ کا سفر اور باقی رہ گیا تھا۔

☆☆☆

شیراز لاؤنج میں آیا اور ٹھٹک گیا۔ سائڈ والی کھڑکی

کے شیشے سے اسے باہر احمد نواز کی جھلک نظر آئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے کہ دروازہ کھل گیا۔ وہ واحد کو لے کر آیا تھا تو دروازے کو اندر سے لاک کرنا بھول گیا تھا۔ اسی لیے جب احمد نواز نے ہینڈل گھمایا تو وہ آسانی سے کھل گیا۔ اس کے اندر آنے سے پہلے شیراز تیزی سے آگے آیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ احمد نواز اندر آئے۔ وہ زبردستی مسکرایا۔ "کیا حال ہیں؟ آپ اتنی بارش میں نکل آئے۔"

احمد نواز کی جیکٹ سے پانی ٹپک رہا تھا۔ بجلی چمکی تو شیراز نے دیکھا اس کے پیچھے شاہنواز بھی کھڑا ہوا تھا۔ دونوں باپ بیٹے کا انداز بہت عجیب تھا۔ احمد نواز نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "کئی دن سے تم سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ بیگم بتا رہی تھی کہ ماہا گئی ہوئی ہے؟"

"ہاں... وہ اس کی دادی کا انتقال ہو گیا ہے۔"

"اور تم نہیں گئے؟" احمد نواز نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "یہ تو بہت قریبی رشتہ بنتا ہے۔"

"وہ... ہاں مجھے کچھ کام تھا۔" شیراز نے کہا۔ وہ یوں دروازے پر کھڑا تھا کہ احمد نواز یا شاہنواز اندر موجود افراتفری کو نہ دیکھ سکیں۔

"لگتا ہے تم اب بھی مصروف ہو۔" احمد نواز نے اس کا حلیہ دیکھا۔

"ہاں، میں کام کر رہا ہوں ورنہ آپ کو اندر بلا لیتا۔" شیراز نے کہتے ہوئے دروازہ بند کرنا چاہا لیکن احمد نواز تقریباً اسے دھکیل کر اندر آیا۔

"کوئی بات نہیں، ہم کون سے مہمان ہیں۔ اگر تمہیں ضرورت ہو تو ہم تمہاری مدد بھی کر سکتے ہیں۔" احمد نواز نے کہا۔ اس کا ہاتھ اپنی جیکٹ کی جیب پر تھا۔ شیراز کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اسے ان باپ بیٹے کے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ شاہنواز نے اندر آ کر دروازہ بند کر دیا تھا اور اب اس کے سامنے تن کر کھڑا ہوا تھا۔ اس کا انداز واضح طور پر دھمکی آمیز تھا۔ اندر آتے ہی ان دونوں نے وہ سب دیکھ لیا تھا جو شیراز ان سے چھپانا چاہ رہا تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا۔ نزدیک ہی ریک پر اس کے آفس کی چابیوں کا گچھا تھا۔ اس میں ایک چھوٹا نیل کٹر تھا جس کے ساتھ مختصر سا چاقو بھی تھا۔ اس نے چابیوں کی طرف ہاتھ بڑھا اور بولا۔

"نہیں شکریہ... مجھے مدد کی ضرورت نہیں ہے۔"

احمد نواز نے اس کی بات نہیں سنی۔ وہ لاؤنج اور کچن کا معائنہ کر رہا تھا پھر اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "مکان اور تمہارے حلیے سے لگ رہا ہے تم کھدائی کرتے رہے ہو۔ دو دن سے تمہارے گھر سے کنکریٹ توڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تم کہاں کام کر رہے تھے؟"

"بابا! میرا خیال ہے یہ تہ خانے میں کام کر رہا ہے۔" شاہنواز بدتمیزی سے بولا۔ احمد نواز نے شیراز کو گھورا۔ اس نے بیٹے کی بدتمیزی کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا ورنہ عام حالات میں وہ ایسے لہجے پر شاہنواز کو جھاڑ کر رکھ دیتا۔

"تم کیوں کھدائی کر رہے ہو؟"

"فرش میں سیلن آ رہی تھی، اسے نئے سرے سے بنواؤں گا۔"

"تب یہ کام مزدوروں سے لے سکتے تھے... خود سے کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"وہ... میں فارغ تھا اس لیے سوچا توڑ پھوڑ کا کام خود کر لوں۔"

"بابا! یہ بکواس کر رہا ہے۔ اس نے یقیناً دیوار توڑ دی ہو گی۔" شاہنواز کا لہجہ تیز تھا۔

احمد نواز نے ہاتھ اٹھا کر بیٹے کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور نرم لہجے میں بولا۔ "شیراز! تم سچ نہیں کہہ رہے ہو۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" شیراز نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "تم دونوں باپ بیٹے کس طرح سے مجھ سے گفتگو کر رہے ہو؟"

"یہ یوں نہیں مانے گا۔" شاہنواز نے پھر کہا۔

"تم چپ رہو۔" احمد نواز نے اس بار اسے جھڑکا اور شیراز سے بولا۔ "دیکھو اگر تم نے کچھ دیکھ لیا ہے تو بتا دو۔ میں اب بھی معاملہ سنبھال سکتا ہوں۔"

شیراز نے چابیاں تھام لی تھیں اور نیل کٹر گرفت میں لے لیا تھا۔ "نواز فوراً اپنے بیٹے کو لے کر میرے گھر سے چلے جاؤ۔"

"بابا! میں نے کہا ہے نا یہ اس طرح نہیں مانے گا۔" شاہنواز بے قابو ہو کر اس کی طرف لپکا۔ اس کے نزدیک آتے ہی شیراز اسے جھکائی دے کر دروازے کی طرف لپکا مگر چالاک شاہنواز نے عقب سے اس کے پاؤں پر لات ماری اور وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ ابھی اٹھ رہا تھا کہ پیچھے سے احمد نواز نے اس کے سر پر پستول کا دستہ مارا اور وہ دوبارہ گر گیا۔ احمد نواز بیٹے پر برس رہا تھا کہ اس نے احمقانہ حرکت کی تھی۔

"میں معاملہ سنبھال لیتا۔"

"کس طرح سے؟" شاہنواز تیز لہجے میں بولا۔ "مجھے یقین ہے یہ دیوار ہٹا کر لاش دیکھ چکا ہے۔"

"کاش تو میری اولاد نہ ہوتا۔" احمد نواز نے گہری سانس لے کر کہا۔ "میں کبھی زندگی میں کسی کے ہاتھوں اتنا مجبور نہیں ہوا جتنا تیرے ہاتھوں ہوا ہوں۔"

"بابا! اس کا کیا کرنا ہے؟" شاہنواز نے ایک پُرغرور مسکراہٹ کے ساتھ کہا جیسے اسے معلوم ہو کہ اس کا باپ اس کے آگے مجبور ہے۔ وہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ کسی صورت شاہنواز کو گنوا نہیں سکتا تھا۔ وہی اس کی اگلی نسل کا ضامن تھا۔ احمد نواز نے فرش پر پڑے شیراز کو دیکھا۔

"اب وہ کرنا پڑے گا جو میں نہیں چاہتا تھا۔" اس نے کہتے ہوئے صوفے سے ایک کشن اٹھا کر پستول اس میں دباتے ہوئے شیراز کے سر پر رکھا تھا کہ باہر سے تیز ہارن کی آواز سنائی دی۔ شاہنواز گھبرا گیا۔ اس نے باپ سے کہا۔

"یہ اس کی گاڑی کا ہارن ہے۔"

"اس کا مطلب ہے ماہا آ گئی ہے۔" اب احمد نواز بھی پریشان ہو گیا۔ "اس سے بھی نمٹنا ہو گا اور اگر اس کے ساتھ معاذ ہوا تو...؟ ذلیل شخص تُو نے مجھے کس مصیبت میں ڈال دیا ہے؟" احمد نواز کراہا۔ "میں نے ساری زندگی ایک ہی غلط کام کیا اور وہ بھی تیری وجہ سے... آج اس کا پھل میرے سامنے آ رہا ہے۔"

"بابا! یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔" شاہنواز نے گھبرا کر کہا۔ باہر سے مسلسل ہارن کی آواز آ رہی تھی۔ "کچھ کریں ورنہ وہ آ جائے گی۔"

"لائٹ بجھا دو۔" احمد نواز نے کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔ "ہمیں اس کے اندر آنے کا انتظار کرنا ہو گا۔"

☆☆☆

شہر کی سڑکیں نسبتاً صاف تھیں اور یہاں روشنی بھی تیز تھی اس لیے ماہا نے تیز ڈرائیونگ کی اور آدھے گھنٹے سے پہلے وہ گھر کے سامنے تھی۔ بارش بہت تیز تھی اور گیٹ بند تھا۔ اس نے ہارن دیا کہ شیراز آ کر گیٹ کھول دے۔ لاؤنج روشن تھا یعنی شیراز وہاں یا کچن میں تھا۔ شاید ڈنر تیار کر رہا تھا۔ ایک بار ہارن دینے پر کوئی ردِ عمل نہیں ہوا تو اس نے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ بہت تیز اور طویل ہارن تھا۔ شیراز کہیں بھی ہوتا اسے سنائی دیتا۔ مگر اس بار بھی وہ اندر سے برآمد نہیں ہوا۔ ماہا جھنجلا گئی۔ پتا نہیں شیراز کہاں تھا؟ اب اسے بھیگنا پڑتا۔ یہ سوٹ اس نے چند ایک بار پہنا تھا اور اسے ڈرائی کلین کرایا تھا۔ یہ بھیگ جاتا تو اس کی صورت ہی بگڑ جاتی۔ مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ جھنجلاتی ہوئی کار سے نیچے اتر کر گیٹ کی طرف بڑھی اور ہاتھ اندر ڈال کر کنڈی کھول رہی تھی کہ اچانک لاؤنج کی روشنیاں بند ہو گئیں۔

وہ ٹھٹک گئی اور اس کے اندر خطرے کا احساس جاگا۔ اگر یہ شیراز تھا تو روشنیاں بند کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ماہا نے سوچا اور پلٹ کر کار تک آئی۔ اس کا دروازہ کھولا اور بیگ میں ہاتھ ڈال کر چھری نکال لی۔ پھر وہ دبے قدموں سیڑھیاں چڑھ کر دروازے تک آئی۔ اس نے آہستہ سے ہینڈل پکڑ کر گھمایا تو وہ آرام سے گھوم گیا۔ لاک کھلا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور تاریک راہداری میں جھانکا۔

"شیراز..." اس نے پکار کر کہا۔

کوئی جواب نہیں آیا مگر خطرے کا احساس بڑھ گیا۔ وہ اندر آئی اور اسی لمحے بجلی چمکی تو اس نے فرش پر اوندھے منہ پڑے شیراز کو دیکھا۔ وہ بے ساختہ اس کی طرف لپکی۔ اس پر جھکتے ہوئے چلائی۔ "شیراز! کیا ہوا..."

اسی لمحے اسے نزدیک کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور اس نے بے ساختہ چاقو والا ہاتھ گھمایا۔ وہ شاہنواز تھا۔ چاقو اس کی ران کو چیرتا ہوا چلا گیا۔ اس نے چیخ ماری اور پھر ہاتھ گھمایا۔ الٹے ہاتھ کا تھپڑ بہت قوت سے ماہا کے چہرے پر لگا۔ وہ پلٹ کر گری اور وہیں ساکت ہو گئی۔ احمد نواز ایک طرف سے نمودار ہوا اور اس نے شاہنواز سے کہا۔ "جلدی کرو... ان دونوں کو ٹھکانے لگانا ہے۔"

زخم لگنے کے بعد شاہنواز پر خون سوار ہو گیا تھا۔ اس نے ماہا کے ہاتھ سے گرا چاقو اٹھایا اور اسے شیراز کی پشت میں اتارنا چاہا تھا کہ ایک فائر ہوا اور وہ پلٹ کر پیچھے گرا۔ گولی اس کے سینے سے گزرتی ہوئے داخلی دروازے کے ساتھ کھڑکی کے شیشے کو توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ تہ خانے کی طرف سے ریوالور بدست واحد نمودار ہوا تھا۔ احمد نواز چلّایا اور بیٹے کی طرف لپکا۔ شاہنواز ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ گولی اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر لگی تھی۔

"نہیں۔" احمد نواز چلّایا اور پھر اس نے پستول کا رخ آگے آتے واحد کی طرف کیا تھا کہ شیراز نے چاقو اٹھا کر اس کے پاؤں میں اتار دیا۔ ماہا کی چیخ اسے ہوش میں لے آئی تھی۔ شاہنواز کو گولی لگی تھی تو اس کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ کر وہیں گر گیا تھا۔ ایک دھاڑ کے ساتھ احمد نواز پیچھے گیا اور اس کے پستول کی گولی ہوا میں گئی۔ واحد بچ گیا تھا۔ پھر وہ سنبھل کر پستول سیدھا کر رہا تھا کہ واحد نے اس پر دو فائر کیے۔ ایک گولی نہیں لگی لیکن دوسری احمد نواز کی

دائیں آنکھ سے ذرا نیچے اتر گئی تھی۔ اس کا چہرہ عجیب سا ہوا اور پھر وہ گر گیا۔ یقیناً وہ گرنے سے پہلے مر چکا تھا۔ شیراز نے اٹھ کر لڑکھڑاتے قدموں سے روشنیاں آن کیں۔ واحد کا چہرہ راکھ جیسا ہو رہا تھا۔ اس نے ٹوٹے لہجے میں کہا۔ ”شیراز! میں تباہ ہو گیا۔“

شیراز ماہا کی طرف لپکا۔ وہ ہوش میں آرہی تھی۔ اسے اٹھا کر شیراز نے صوفے پر لٹایا اور اس کے گال تھپتھپانے لگا۔ اس نے دیکھا نہیں کہ واحد گھر سے باہر چلا گیا تھا۔ اس کی کوشش سے ماہا جلد ہوش میں آگئی اور شیراز سے لپٹ گئی۔ وہ اسے ٹٹولتے ہوئے بولی۔ ”تم ٹھیک ہو نا؟“

”ہاں، میں ٹھیک ہوں۔“ شیراز نے اسے یقین دلایا۔ ”اب سب ٹھیک ہے۔ معاذ کہاں ہے؟“

”میں اسے چھوڑ کر آئی ہوں۔ شکر ہے اس نے میرے ساتھ آنے سے انکار کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا اسے گھر آتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔“

”اس نے ٹھیک کہا، وہ بھی خطرہ جان لیتا ہے۔“ شیراز نے کہا۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا تو واحد وہاں نہیں تھا مگر وہ جانتا تھا کہ واحد کہاں ہوگا؟ اس کے خواب کے ایک حصے کی تعبیر اب سامنے آنے والی تھی۔ اس نے پہلے شاہنواز اور احمد نواز کو چیک کیا۔ دونوں مر چکے تھے پھر اس نے ماہا سے کہا کہ وہ پولیس کو کال کرنے کی کوشش کرے اور باہر آیا جہاں واحد سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سر تھام رکھا تھا۔ شیراز اس کے پاس بیٹھا تو وہ بولا۔ ”یہ محلہ جسے میں مثالی سمجھتا تھا... یہاں یہ سب ہوتا رہا... میرے خدا...“

اس نے ہاتھوں سے منہ چھپالیا۔

”اس میں تمہارا قصور نہیں ہے۔“

”میرا قصور ہے۔ میرا ایک ہی بیٹا تھا اور میں اس پر بھی نظر نہیں رکھ سکا۔ مجھے نہیں معلوم تھا میرا بیٹا جسے میں اتنا بڑا نہیں سمجھتا تھا، ایک لڑکی کو بے آبرو کرنے میں شامل ہو گا۔“

شیراز نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ راحیل کا نہیں اصل قصور شاہنواز کا ہے۔ راحیل صرف اس کے ساتھ تھا اور یہ کوئی طے شدہ منصوبہ نہیں تھا۔ وہ لڑکی یہاں سے گزر رہی تھی اور ایسی ہی بارش ہو رہی تھی۔ اس کے پاؤں میں چوٹ لگی اور اس وقت شاہنواز نے اسے دیکھ لیا۔ لڑکی کو اکیلا دیکھ کر اس کی نیت خراب ہو گئی۔ وہ اسے زبردستی اندر لے گیا۔“

”راحیل اس کے ساتھ تھا۔“

”ہاں لیکن اس نے سوائے لڑکی کے ہاتھ پکڑنے کے اور کچھ نہیں کیا تھا۔“

”تو ساتھ دینا اور کسے کہتے ہیں؟“ واحد کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”وہ بھی مجرم ہے۔“

”اگر وہ مجرم ہے تو اسے سزا مل چکی ہے۔“

”ہاں۔“ واحد نے جھکے ہوئے انداز میں کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”اس کی سزا پوری ہو گئی ہے لیکن میری سزا باقی ہے جو میں ساری عمر بھگتتا رہوں گا۔“

واحد سر جھکائے اپنے مکان کی طرف بڑھ گیا اور شیراز اسے جاتا دیکھنے لگا۔ اسی لمحے ماہا باہر آئی۔ اس نے شیراز سے کہا۔ ”میں نے پولیس کو کال کر دی ہے۔ اب تم مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے؟“

”بتاتا ہوں... اب میں تمہیں سب بتا سکتا ہوں۔“

☆☆☆

دو ہفتے بعد شیراز کا مکان پہلے جیسی حالت میں آگیا تھا۔ عقبی صحن کا سبزہ پھر سے اُگ آیا تھا اور تہ خانے کی دیواریں اور فرش بنا دیا گیا تھا۔ پولیس نے واحد کو گرفتار کر لیا تھا مگر ایک دن بعد ہی اسے ضمانت پر رہائی مل گئی تھی۔ ردا کی لاش احمد نواز کے مکان کے تہ خانے میں دیوار ہٹا کر اس کے پیچھے چھپا دی گئی تھی۔ دونوں مکانوں کے تہ خانوں کی دیواروں کے درمیان تین فٹ کی جگہ تھی جس میں مٹی تھی لیکن جب لاش وہاں رکھی تو مٹی نکل گئی تھی اور انہوں نے عجلت میں ایسے ہی دیوار اٹھا دی تھی۔ احمد نواز جان گیا تھا کیونکہ وہ عین اس وقت آگیا جب شاہنواز دیوار اٹھا رہا تھا۔ مگر احمد نواز نے بیٹے کا جرم چھپانے میں اس کا پورا ساتھ دیا۔ اس نے دیوار کے پیچھے لاش ہی نہیں اپنی ساری عمر کی ایمانداری اور مثالی سروس کی ساکھ بھی دفن کر دی تھی۔

جب شیراز نے تہ خانے میں کنکریٹ توڑنا شروع کیا تب ہی احمد نواز اور شاہنواز مشکوک ہو گئے تھے اور جب شیراز واحد کو بلا کر اپنے مکان میں لے گیا تب انہیں یقین ہو گیا کہ شیراز نے لاش دیکھ لی ہے اور نہ صرف شاہنواز بلکہ احمد نواز بھی خطرے میں تھا۔ وہ اس خطرے کا سدباب کرنے کے لیے ان کے پیچھے آئے تھے۔ ان کی بدقسمتی کہ انہیں واحد کا پتا نہیں تھا کہ وہ تہ خانے میں ہے اور مسلح ہے۔ جس وقت وہ دونوں گھر میں زبردستی داخل ہوئے تو واحد سوچ رہا تھا کہ کیا کرے کیونکہ اب لاش لازمی سامنے آتی

اور اس کے بیٹے کا جرم اور گناہ بھی سامنے آجاتا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ شیراز کو مار سکے۔ اس لیے وہ خودکشی کرنے جا رہا تھا اور اس نے اپنے سر پر ریوالور بھی رکھ دیا تھا۔ مگر شیراز اور ماہا کو خطرے میں پا کر وہ اوپر آنے اور ان دونوں باپ بیٹے کو شوٹ کرنے پر مجبور ہو گیا جو اس سارے کیس میں مرکزی مجرم تھے۔

واقعاتی شہادتیں اور راحیل کی ڈائری ان کے خلاف فردِ جرم تھی۔ اگرچہ پولیس نے اپنے پیٹی بند بھائی کو بچانے کی کوشش کی تھی لیکن اعلیٰ عدلیہ نے معاملے کا ازخود نوٹس لے کر اسے ایف آئی اے کے سپرد کر دیا تھا اور ایف آئی اے نے اپنی رپورٹ میں ردا کے قتل کا اصل مجرم شاہنواز کو قرار دیا۔ احمد نواز اس کی اعانت کا مجرم تھا جبکہ راحیل شریکِ جرم قرار پایا تھا مگر اسے عدالت میں پیش کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس واقعے کے دو دن بعد ڈاکٹروں نے راحیل کو مردہ قرار دے کر وینٹی لیٹر سے ہٹا دیا۔ احمد نواز کی فیملی دونوں باپ بیٹے کی لاشیں ان کے آبائی علاقے میں لے گئی تھی۔ واحد نے اپنے بیٹے کو علاقے کے قبرستان میں دفن کیا اور یہ عجیب اتفاق تھا کہ راحیل کی قبر ردا کی قبر سے ذرا ہی دور تھی۔ شیراز، ردا کی تدفین میں شریک تھا۔ ماہا افسوس کے لیے ان کے گھر گئی تھی۔ اس نے شیما کو پیشکش کی کہ اسکول میں چھوٹے بچوں کی کلاسز کے لیے کچھ ٹیچرز کی جاب آئی ہیں اگر وہ کہے تو وہ پرنسپل سے بات کرے۔ شیما مان گئی۔ وہ خوش تھی کیونکہ اسے گریجویشن کا نتیجہ آتے ہی جاب مل رہی تھی۔

☆☆☆

ثمینہ صادق کے گھر کی نشست گاہ میں شیراز، ماہا، واحد دوسرے محلے والے اور شیما بھی موجود تھی۔ شیراز اور سب کے ذہنوں میں اس معاملے کے بارے میں کئی سوالات تھے اور واحد ہستی جو ان کے جواب دے سکتی تھی، وہ ثمینہ صادق تھی۔ شیراز نے اس سے درخواست کی کہ وہ اس سے ایک ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے تو ثمینہ نے انکار کیا مگر پھر وہ مان گئی۔ اس نے شیراز کو کال کی۔ ”آنے والے سنڈے کو میرے گھر میں سب آئیں گے۔“

”یہ پارٹی کا موقع نہیں ہے۔“

”پارٹی نہیں ہوگی۔“ ثمینہ نے آہستہ سے کہا۔ ”میں جانتی ہوں۔ تم اور بہت سے دوسرے لوگ سمجھتے ہو کہ یہاں جو ہوا ہے، اس میں میرا بھی قصور ہے۔“

”میں آپ کو قصوروار نہیں سمجھتا۔“

”اس کے باوجود میں وضاحت کرنا چاہوں گی۔“ ثمینہ نے اصرار کیا۔ ”تو یہ طے ہے کہ سب آرہے ہیں۔“

شیراز نے سوچا اور جواب دیا۔ ”میں سب کا تو نہیں، ہاں اپنا کہہ سکتا ہوں۔ ہم آئیں گے۔“

”مجھے یقین ہے باقی بھی مان جائیں گے۔“ ثمینہ نے کہا۔ ”پہلے تمہیں کال کی تھی۔ جب میں دوسروں کو تمہارے بارے میں بتاؤں گی تو سب آئیں گے۔“

ثمینہ کا دعویٰ درست ثابت ہوا۔ سارے محلے والے وہاں موجود تھے۔ ثمینہ نے درست کہا کہ اس کے بارے میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ یہ سب ثمینہ کے اس عمل کے بعد شروع ہوا تھا جو اس نے شیراز پر کیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ردا کی لاش تہ خانوں کی دیواروں کے درمیان موجود تھی مگر اس تک پہنچنے کی وجہ ثمینہ بنی تھی۔ لاش کی دریافت نے دو گھرانوں کو تباہ کر دیا۔ شیراز نے یہ سب سنا تھا۔ اسے تنویر نے بتایا تھا مگر وہ اس سے متفق نہیں تھا۔ اس نے ثمینہ کے گھر میں موجود افراد سے کہا۔ ”یہ بات طے ہے کہ شاہنواز اور احمد نواز دونوں مجرم تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ راحیل بھی چھوٹے درجے کا سہی لیکن قصوروار تھا اور اتفاق سے یہ تین افراد ہی کیفرِکردار کو پہنچے۔“

تنویر اس سے متفق نہیں تھا۔ ”لیکن ان کے گھر والوں نے جو صدمہ برداشت کیا؟“

شیراز نے گہری سانس لی۔ ”دیکھا جائے تو کوئی بھی فعل انسان کا انفرادی نہیں ہوتا... اس کے پسِ پشت کئی لوگ اور عوامل ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے راحیل اور شاہنواز دونوں کے گھر والے اپنے لڑکوں پر نظر نہیں رکھ سکے کہ ان کی اصل سرگرمیاں کیا ہیں اور ان کا کردار کیا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی شریف لڑکا ایسی حرکت کر سکتا ہے جو شاہنواز نے اس مظلوم لڑکی کے ساتھ کی۔ یہ کھلی غنڈا گردی اور بدمعاشی تھی۔ راحیل نے اس کا ساتھ دیا اور پھر اس کا جرم چھپایا۔ یہ اس کی شرافت تھی کہ اس کا ضمیر اس جرم کا بوجھ برداشت نہ کر سکا اور اس نے خودکشی کر لی۔ شاہنواز جو اصل مجرم تھا، اس کے ضمیر نے اسے مجبور نہیں کیا کیونکہ اس کے پاس ضمیر نام کی چیز ہی نہیں تھی۔ احمد نواز نے اس کا ساتھ دیا۔ حالانکہ وہ نیک نام اور ساکھ والا شخص تھا مگر اولاد کے آگے جھک کر اس نے بھی غلط کام کیا اور اس کی سزا بھگتی۔ میرا خیال ہے جو ہوا، یہ قدرت کی طرف سے تھا۔ اس میں کسی انسان کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔“

”باوجود اس کے کہ ردا کی لاش تم نے دریافت کی۔“

سہیل خان نے کہا۔

''یہ بھی میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔'' شیراز نے وضاحت کی۔ ''میری درخواست پر ثمینہ نے مجھے پھر ہپناٹائز کیا اور مجھے کھدائی کا اشارہ ملا۔''

''ہمارا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد روحیں دنیا سے چلی جاتی ہیں۔'' تنویر نے کہا۔ ''اس کے بعد واپس نہیں آسکتیں۔ اس لیے یہ ماننے والی بات نہیں ہے کہ ردا کی روح ذمے دار ہے۔''

''ردا کا نام کسی نے نہیں لیا ہے۔'' اس بار ثمینہ نے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اگر کسی بھی وجہ سے ایک چھپا ہوا جرم سامنے آگیا اور اس کے ذمے داروں کو سزا ہو گئی تو اس میں اعتراض کرنے والی کیا بات ہے؟''

''اعتراض کسی کو نہیں ہے۔'' تنویر نے کہا۔ ''بات صرف یہ ہے کہ وہ اس محلے کے لڑکے...''

''اس لیے اگر وہ کسی لڑکی کو ریپ کی کوشش میں قتل کر دیں تو انہیں اس کا حق حاصل ہے۔'' ثمینہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''معذرت کے ساتھ... اس واقعے سے اس محلے کا تاثر اتنا مجروح نہیں ہوا جتنا آپ کی اس بات سے ہوا ہے۔ اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے رہائش کے لیے اس جگہ کو کیوں چنا۔''

''ثمینہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' شیراز کا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔ ''مجھے بھی افسوس ہے کہ میں یہاں رہا اور اس کا ایک حصہ رہا۔ ہاں، میں نے قالین کے نیچے چھپا گند سب کے سامنے کر دیا۔ آپ سب چاہتے ہیں کہ اس گند کو چھپا رہنے دیا جاتا؟ اس نام نہاد مثالی محلے کو یونہی مثالی بنا رہنے دیا جاتا؟ کیونکہ ماری جانے والی لڑکی کا اس محلے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' تنویر کھڑا ہو گیا۔ ''یا پھر تم ٹھیک نہیں کہہ رہے ہو۔''

تنویر کے بعد باقی سب بھی ایک ایک کر کے ثمینہ کے گھر سے رخصت ہو گئے۔ کچھ دیر میں صرف شیراز اور ماہا رہ گئے تھے۔ شیراز نے ثمینہ کی طرف دیکھا۔ ''آپ نے ان لوگوں کا رویہ دیکھا... جو ہوا انہیں اس کی وضاحت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، انہیں سارا دکھ اس بات کا ہے کہ اس سانحے کے سامنے آنے پر محلے کا ماحول ختم ہو گیا۔''

ثمینہ نے سر ہلایا۔ ''یہ صرف اسی گلی کا نہیں، اس پورے ملک کا مسئلہ ہے۔ ہم اپنی ذات، اپنے گھر، اپنے محلے اور اپنے شہر سے باہر کے مسائل اور حادثات کو اپنا نہیں سمجھتے۔ ہم انہیں بہت سرسری سا لیتے ہیں۔''

''بہرحال، میں اپنے ضمیر کے سامنے مطمئن ہوں۔'' شیراز نے کہا۔

''یقیناً تم نے بہت اچھا کام کیا ہے اور ایسے ہی لوگ اندر سے توانا ہوتے ہیں تب ہی وہ دوسری دنیا سے رابطے کر پاتے ہیں۔''

''میں مزید کوئی رابطہ نہیں کرنا چاہتا۔'' شیراز نے نفی میں سر ہلایا۔

ثمینہ مسکرائی۔ ''تم بھی ان لوگوں کی طرح بے حس بن جاؤ پھر کوئی رابطہ نہیں ہوگا۔''

☆☆☆

احمد نواز کی فیملی واپس نہیں آئی اور ان کے مکان پر برائے فروخت کی تختی لگ گئی۔ دو مہینے بعد جب کیس ختم ہو گیا تب واحد نے بھی اپنا مکان فروخت کرنے کا فیصلہ کیا۔ شیراز نے سنا تو وہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ ان چند مہینوں میں وہ اپنی عمر سے کئی سال بڑا لگنے لگا تھا۔ پہلے اس کے چہرے پر ہمہ وقت مسکراہٹ نظر آتی تھی اور اب وہ سنجیدہ رہنے لگا تھا۔ ''تم یہاں سے جا رہے ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں نے سوچا ہے کہ میں محلے کے قابل نہیں ہوں۔''

''میرا تو خیال ہے یہ محلہ تمہارے قابل نہیں ہے جسے تم مثالی محلہ کہتے تھے۔'' شیراز نے سنجیدگی سے کہا۔ ''واحد! میرے دل میں تمہاری عزت اس سے کہیں زیادہ ہو گئی ہے جتنی پہلے تھی۔ تم نے بہت حوصلے اور بلند کردار کا ثبوت دیا ہے۔ ورنہ احمد نواز نے جس طرح اولاد کی خاطر جرم میں اس کا ساتھ دیا، ایسا کرنا تمہارے لیے بھی تو مشکل نہیں تھا۔ تمہارا بیٹا بھی باضمیر تھا تب ہی اس نے خودکشی کر لی۔ شاہنواز اپنے باپ کی طرح بے ضمیر تھا اس لیے نہ صرف زندہ رہا بلکہ اپنا جرم چھپانے کے لیے ان باپ بیٹے نے میری اور ماہا کی جان لینے کی کوشش کی اور تم نے ہماری جان بچالی۔''

واحد پھیکے انداز میں مسکرایا۔ ''دوست! میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ میں اس محلے کے قابل نہیں ہوں۔ ہوسکتا ہے تمہاری بات درست ہو لیکن میں اپنے یقین سے اتنی آسانی سے دست بردار نہیں ہوں گا۔''

شیراز ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ اس کے خیال میں واحد کا یہاں سے جانا اپنے یقین سے دست بردار ہونے کے مترادف ہی تھا۔